حالی کی صد سالہ برسی کے موقع پر خصوصی اشاعت

حالی فہمی

سوانح، شخصیت، فن کا تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ

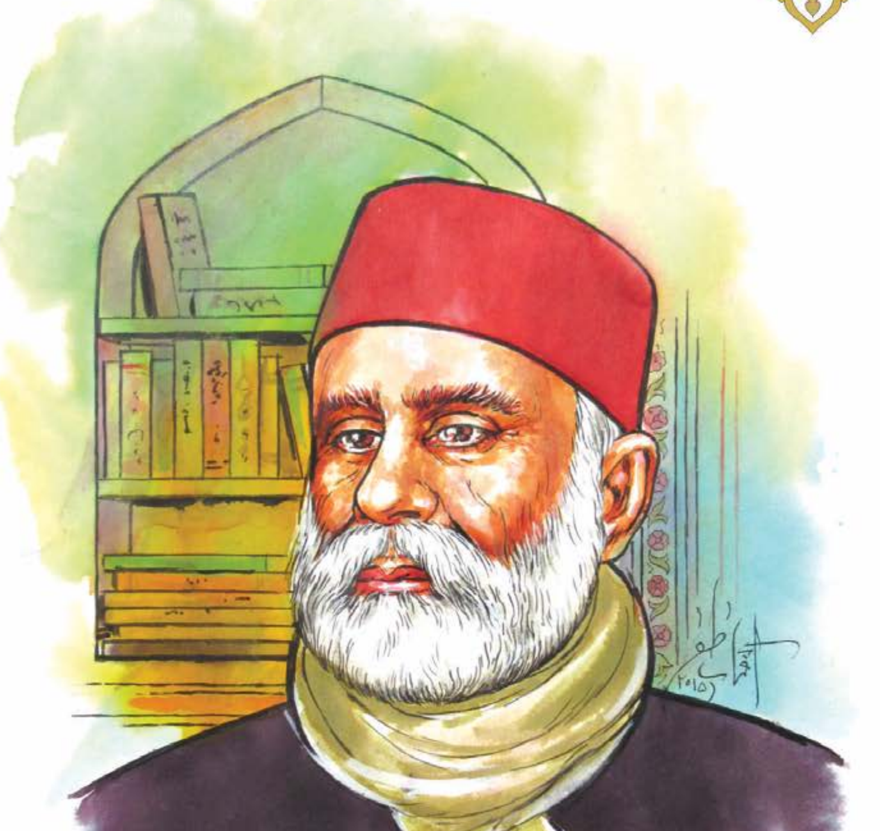

ڈاکٹر سید تقی عابدی

حالی فہمی

مع سوانح شخصیت وفن کا تحقیقی تنقیدی تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

بُک کارنر
جہلم، پاکستان

Hali Fehmi
by Dr. Syed Taqi Abedi
Jhelum: Book Corner. 2016
592p.
1. Urdu Literature
ISBN: 978-969-662-006-8

جملہ حقوق محفوظ ہیں

قانونی مشیر: عبدالجبار بٹ (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)

اشاعت	:	2016ء
نام کتاب	:	حالی فہمی
مصنف	:	ڈاکٹر سیّد تقی عابدی
سرورق	:	ابواِمامہ
مطبع	:	زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

ناشر:
گگن شاہد، امر شاہد
بُک کارنر
پرنٹرز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز،
جہلم، پاکستان

Publisher:
Gagan Shahid & Amar Shahid
Book Corner
Printers, Publishers & Booksellers
Jhelum. Pakistan.
Phone # 0544-614977 / 0544-621953
Cell # 0323-5777931 / 0321-5440882
Email: bookcornershowroom@gmail.com

www.bookcorner.com.pk

Join Us On facebook

www.facebook.com/bookcornershowroom

رو میں ہے رخشِ عمر

نام	:	سید تقی حسن عابدی
ادبی نام	:	تقی عابدی
تخلص	:	تقی
والد کا نام	:	سید سبط نبی عابدی (مرحوم)
والدہ کا نام	:	سنجیدہ بیگم (مرحومہ)
تاریخ پیدائش	:	یکم مارچ 1952ء
مقام پیدائش	:	دہلی (انڈیا)
تعلیم	:	ایم بی بی ایس (حیدر آباد، انڈیا) ایم ایس (برطانیہ) ایف سی اے پی (امریکہ) ایف آر سی پی (کینیڈا)
پیشہ	:	طبابت
ذوق	:	شاعری، ادبی تحقیق وتنقید

شوق	:	مطالعہ اور تصنیف
قیام	:	ہندوستان، ایران، برطانیہ، نیویارک، کینیڈا
شریک حیات	:	گیتی
اولاد	:	دو بیٹیاں (معصوما اور رویا) دو بیٹے (رضا و مرتضیٰ)
تصانیف	:	(53) شہید (1982) جوشِ مودّت، گلشنِ رویا، اقبال کے عرفانی زاویے، انشاء اللہ خاں انشاء، رموزِ شاعری، اظہارِ حق، مجتہد نظم مرزا دبیر، طالع مہر، سلک سلامِ دبیر، تجزیہ یادگار انیس، ابواب المصائب، ذکر دُرّ باران، عروسِ سخن، مصحف فارسی دبیر، مثنویات دبیر، کائنات نجم، روپ کنور کماری، دُرّ بار رسالت ﷺ، فکر مطمئنہ، خوشۂ انجم، دُرِ دریائے نجف، تاثیر ماتم، نجمی مایا، روشِ انقلاب مصحف تغزل، ھو النجم، تعشق لکھنوی، ادبی معجزہ، غالب دیوان نعت ومنقبت، چوں مرگ آید، رباعیات دبیر، سبد سخن، دیوان غالب فارسی، فیض فہمی، مطالعہ دبیر کی روایت، دیوانِ سلام و کلام انیس، رباعیات انیس، رباعیات رشید لکھنوی اور احوال پیری، کلیات حالی، مسدس حالی، حالی فہمی، حالی کی نظمیں، حالی کی غزلیں، قطعات حالی، رباعیات حالی، حالی کے شخصی مرثیے، قصاید حالی، بچوں کے حالی، حالی کی نعتیہ شاعری، دیوان حالی فارسی
زیرِ تالیف	:	تجزیہ شکوہ جواب شکوہ، فانی لا فانی، تجزیہ رباعیاتِ فراق گورکھپوری، دو شاہکار نظمیں، اقبال کے چار مصرعے، رباعیات بیدل، باقیاتِ فیض

فہرست

عکس مولانا حالیؔ		8
عکس مولانا حالیؔ		9
عکس تحریر مولانا حالیؔ		10
یادگار گروپ فوٹو		11
عکس مکتوب سر سید بنام مولانا حالیؔ		12
سر سید احمد خان کا خط حالیؔ کے نام		14
شجرہ مولانا حالیؔ		16
حالیؔ کے چند ہم عصر تصویروں میں		17
پیش لفظ	ڈاکٹر سید تقی عابدی	25
حالیؔ کی کہانی حالیؔ کی زبانی	مولانا الطاف حسین حالیؔ	35
دیباچہ دیوانِ حالیؔ	مولانا الطاف حسین حالیؔ	43
دیباچہ ضمیمہ اردو کلیات نظم حالیؔ	مولانا الطاف حسین حالیؔ	56
دیباچہ مسدس مد و جزر اسلام	مولانا الطاف حسین حالیؔ	60
دیباچہ متعلق بہ ضمیمہ مسدس مدو جزر اسلام	مولانا الطاف حسین حالیؔ	67
دیباچہ مجموعہ نظم حالیؔ	مولانا الطاف حسین حالیؔ	70
حالیؔ کی حیات اور شخصیت	ڈاکٹر سید تقی عابدی	73
حالیؔ کی روایتی شاعری کا تجزیہ	/---/---/---/	116
کلامِ حالیؔ میں خارجی الفاظ اور محاورے	/---/---/---/	135
حالیؔ کے نظریات اور افکار کا مطالعہ	/---/---/---/	138
حالیؔ بحیثیت ترقی پسند شاعر اور ترقی پسند نقاد	/---/---/---/	154
کیا حالیؔ اُردو تنقید کے بنیاد گزار ہیں؟	/---/---/---/	170
کس کس نے حالیؔ کی مخالفت کی؟	/---/---/---/	175
حالیؔ سے منسوب فرضی عربی رسالہ کی حقیقت	/---/---/---/	190

اے بسا آرزو کہ خاک شد /---/---/---/	193
حالیؔ اور اقبالؔ کے تاثرات /---/---/---/	196
حالیؔ کی جھڑپ شیخ واعظ اور مفتی کے ساتھ /---/---/---/	200
حالیؔ مشاہیر کی نگاہ میں /---/---/---/	206
حالیؔ کا مذہبی شعور اور عقیدہ کلام و عمل کی روشنی میں /---/---/---/	213
حالیؔ کے قطعات کا اجمالی تجزیہ /---/---/---/	216
حالیؔ کی غزلوں کا مختصر تعارف /---/---/---/	231
حالیؔ کی رباعیات کا مختصر جائزہ /---/---/---/	235
حالیؔ کے کلام میں سرسید /---/---/---/	241
حالیؔ پنجاب میں /---/---/---/	245
حالیؔ اور تذکرہ آبِ حیات /---/---/---/	249
حالیؔ اور شبلیؔ /---/---/---/	257
حالیؔ کی دلّی /---/---/---/	266
مسدس حالیؔ کا اجمالی تجزیہ /---/---/---/	270
مسدس پر اکابرین کے تاثرات /---/---/---/	319
حالیؔ کی نظمیں ۔۔ تحقیقی گفتگو /---/---/---/	359
برکھا رت، عمدہ منظر نگاری کا شاہکار /---/---/---/	366
دولت اور وقت کا مناظرہ ۔ دو مثبت قدروں کا جمال /---/---/---/	370
نشاط امید، ناامیدی زندگی کی موت ہے /---/---/---/	373
حب وطن ۔ حالیؔ کی وطن دوستی کا مستند حوالہ /---/---/---/	376
زمزمۂ قیصری، ترجمے اور تشریح کی عمدہ مثال /---/---/---/	380
حقوق اولاد، حالیؔ کا تربیتی منظوم سبق /---/---/---/	389
چپ کی داد کا سرسری مطالعہ /---/---/---/	391
قوم کا متوسط طبقہ، قلب ملت ہے /---/---/---/	394
مناظرہ رحم و انصاف، حالیؔ کی تقابلی تخلیق /---/---/---/	397
مناجاتِ بیوہ کا جائزہ /---/---/---/	400

علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے؟	/---/---/---/	405
راست گوئی کی تاثیر	/---/---/---/	407
جواں مردی کا کام۔ انگریزی حکایت سے ماخوذ عمدہ نظم	/---/---/---/	409
اقتباس مسدسِ حالی	/---/---/---/	411
حالؔی کے شخصی مرثیوں کا تجزیہ	/---/---/---/	425
سرسید کا مرثیہ، حالؔی کی زبانی	/---/---/---/	460
حالؔی کی بچوں کی نظموں کا تجزیہ	/---/---/---/	465
قصاید حالؔی کا تجزیہ	/---/---/---/	483
غالب کی نعتیہ غزل پر حالؔی کی شاہکار تخمیس	/---/---/---/	500
قصیدۂ نعتیہ میں حالؔی کی تعلّی	/---/---/---/	514
حالؔی کے نعتیہ قصائد کا منفرد رنگ	/---/---/---/	516
کیا حالؔی کا تخلص خستہ تھا؟ تحقیقی گفتگو	/---/---/---/	523
حالؔی کے کلیات فارسی کا مطالعہ	/---/---/---/	528
حالؔی کی تاریخ گوئی	/---/---/---/	545
حالؔی کی نثر نگاری	/---/---/---/	554
حالؔی کی پہلی تصنیف ''مولود شریف'' پر تبصرہ	/---/---/---/	564
حالؔی کی چار نثری کتابوں پر مختصر گفتگو	/---/---/---/	566
حالؔی کے اخلاقی تعمیری اور سماجی منتخب اشعار	/---/---/---/	572
حالؔی کے عمدہ اشعار نظموں اور قطعوں میں	/---/---/---/	579
حالؔی کے کلام میں اسقام	/---/---/---/	581
خطوط حالؔی کا تعارفی جائزہ	/---/---/---/	584
حالؔی کی اصلاح کا نادر نمونہ	/---/---/---/	586
حالؔی کے مقطعے	/---/---/---/	589
حالؔی کی صد سالہ سالگرہ کا آنکھوں دیکھا حال	/---/---/---/	593
حیاتِ جاوید۔۔ حالؔی کا جاودانہ شاہکار	/---/---/---/	598
کتابیات	/---/---/---/	603

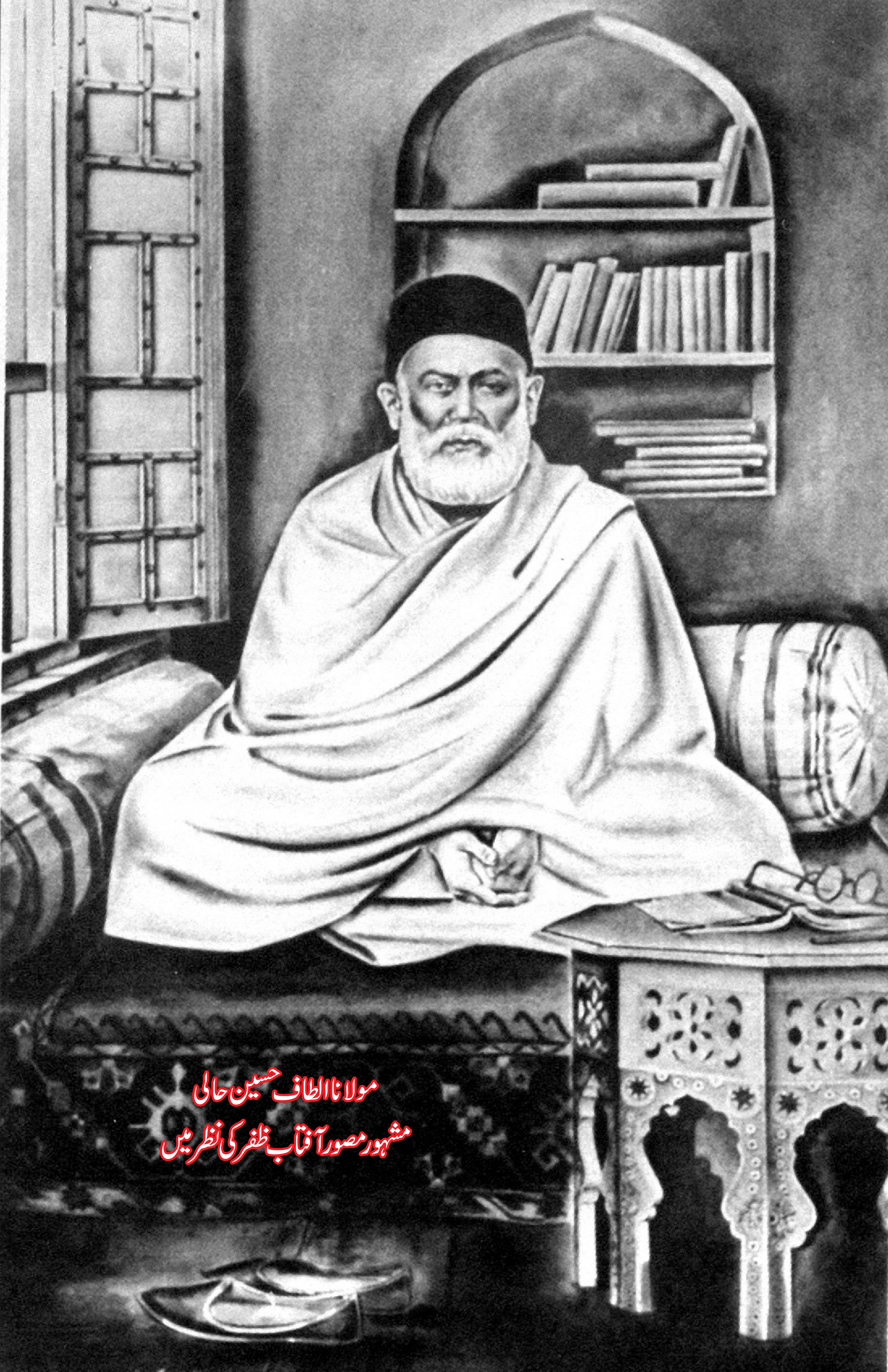
مولانا الطاف حسین حالی
مشہور مصور آفتاب ظفر کی نظر میں

مولانا الطاف حسین حالیؔ

1836ء – 1914ء

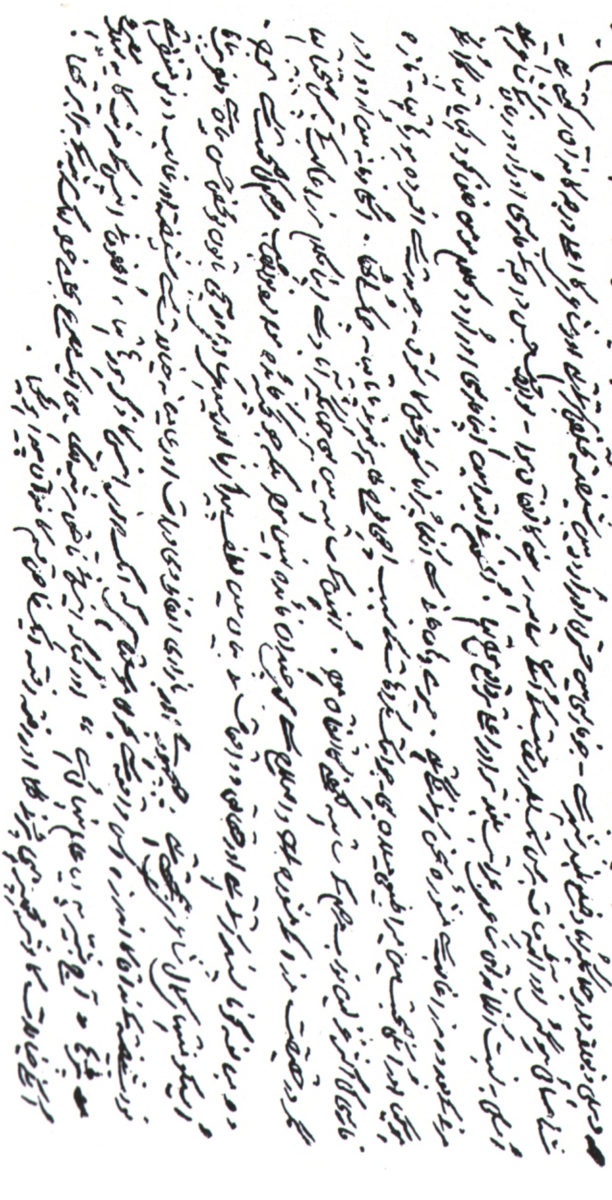

عکسِ تحریر مولانا حالی مرحوم

راست سے چپ (کرسیوں پر) مولانا حالی – ڈپٹی نذیر احمد – محسن الملک – وقار الملک / (استادہ) تھامس آرنلڈ – شبلی نعمانی

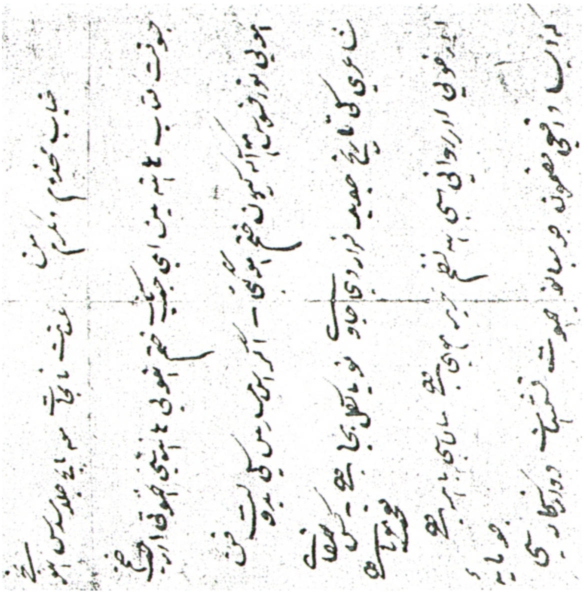

عکس مکتوب سرسید بنام مولانا حالیؔ

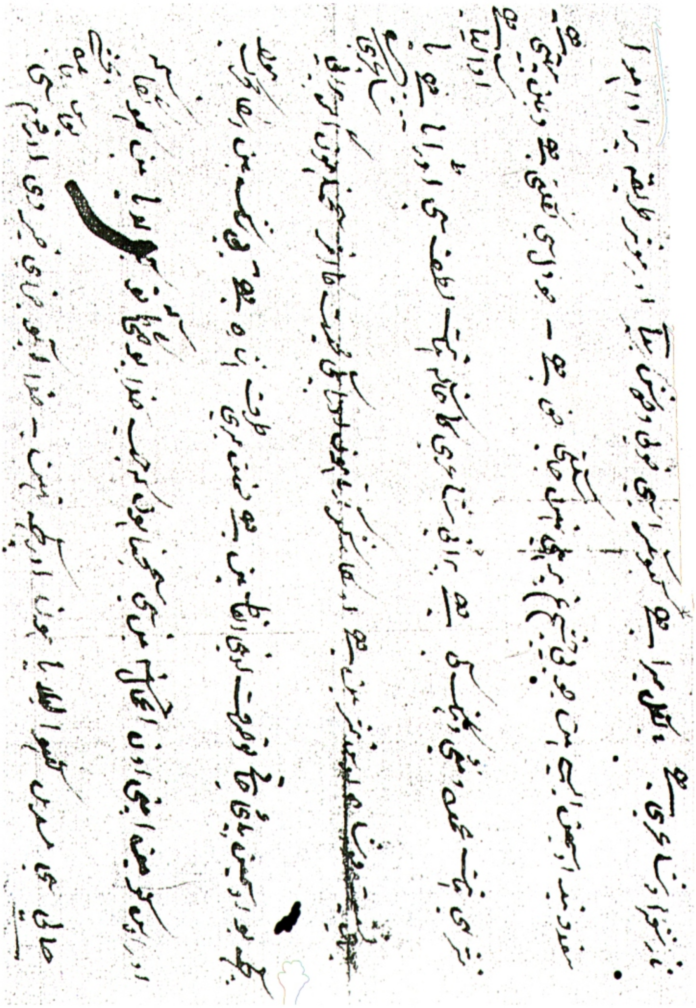

سرسید احمد خان کا خط حالؔی کے نام

جناب مخدوم ومکرم من!

عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہنچے۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی، جب تک ختم نہ ہوئی، ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہاتِ دوراز کار سے، جو مایہ ناز شعرا و شاعری ہے، بالکل مبرا ہے، کیونکر ایسی خوبی وخوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہوا ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جاسکتے۔ حق ہے، جو دل سے نکلتی ہے، دل میں بیٹھتی ہے۔ (دیباچے کی) نثر بھی نہایت عمدہ اور نئے ڈھنگ کی ہے۔ (نظم میں) پرانی شاعری کا خاکہ نہایت لطف سے اُڑایا ہے یا ادا کیا ہے۔ میری نسبت جو اشارہ اس نثر میں ہے اُس کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کی محبت کا اثر سمجھتا ہوں اگر پرانی شاعری کی کچھ بو اس (کتاب) میں پائی جاتی ہے تو صرف اُنہی الفاظ میں ہے جن میں میری طرف اشارہ ہے۔ بے شک میں اس (نظم) کا محرک ہوا اور اُس کو میں اپنے اُن اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب (قیامت میں) خدا (مجھ سے) پوچھے گا کہ تو (اعمال میں سے) کیا لایا؟ میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں، اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے۔ مسجدوں کے اماموں کو چاہیے کہ نمازوں میں اور خطبوں میں اسی کے بند پڑھا کریں۔ آپ نے یہ نہیں ارقام فرمایا کہ کس قدر کتابیں چھپی ہیں اور کیا لاگت لگی ہے اور فی کتاب کیا قیمت مقرر کی ہے۔ نہایت جلد آپ ان جملہ امور سے مجھے مطلع فرمایئے۔ یہ بھی لکھیے کہ بعد تقسیم یا فروخت کس قدر کتابیں اب تک موجود ہیں......

آپ کے اس خیال کا کہ (کتاب کا) حق تصنیف (اشاعت) مدرسۃ العلوم کو دیا جاوے اور رجسٹری کرا دی جاوے، میں دل سے شکر کرتا ہوں۔ مگر میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو، جو قوم کے حال کا آئینہ اور یا اُن کے ماتم کا مرثیہ ہے، کسی قید سے مقید کیا جاوے۔ جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلے سارنگی پر گاویں، قوال درگاہوں میں گاویں، حال لانے والے اس سچے حال پر حال لاویں، اُسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہو گی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ دہلی میں ایک مجلس کروں جس میں تمام اشراف، (دہلی جمع) ہوں اور رنڈیاں نچواؤں، مگر وہ رنڈیاں بھی مسدس گاتی ہوں۔ میں اس کل مسدس کو ''تہذیب الاخلاق'' میں چھاپوں گا۔ میرے اُن استفسار کا جواب، جن پر نشان درج کر دیا ہے، بہت جلد مرحمت ہو۔

والسلام

خاکسار، آپ کا احسان مند تابعدار، سید احمد شملہ

پارک ہوٹل، 10 جون 1879ء

شجرہ مولانا حالؔی

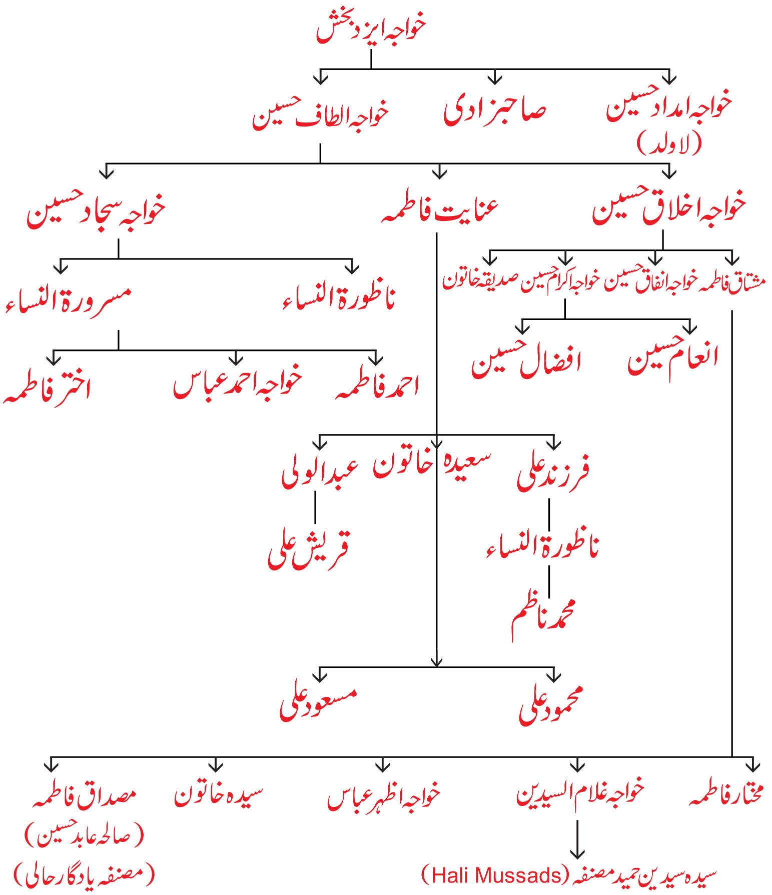

اس شجرے کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حالی کے دونوں بیٹوں خواجہ اخلاق حسین اور خواجہ سجاد حسین کی اولاد نے اُردو کو عمدہ ادیب نقاد افسانہ نگار اور ماہرین تعلیم دیے۔ خواجہ اخلاق حسین کے نواسے اور نواسی خواجہ غلام السیدین مصنف آندھی میں چراغ، صالحہ عابد حسین مصنفہ یادگار حالی، خواجہ غلام السیدین کی بیٹی سیدہ سیدین حمید اور خواجہ سجاد حسین کی بیٹی کے بیٹے خواجہ احمد عباس ہماری ادعا کا ثبوت ہیں۔

حالی کے چند ہم عصر

تصویروں میں

میر مہدی مجروح

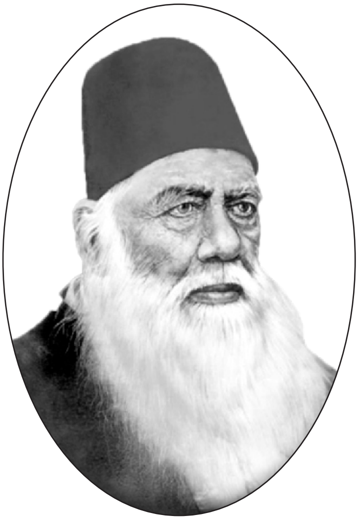

سر سید احمد خان

مرزا اسد اللہ خان غالب

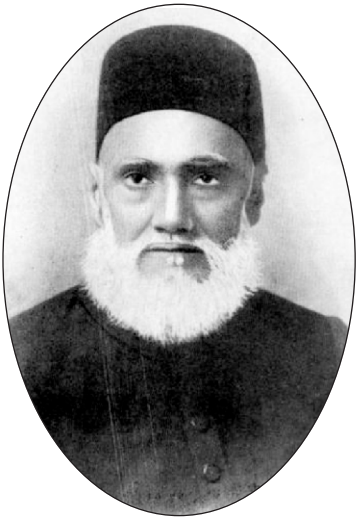

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی

شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد

شمس العلماء ڈاکٹر سیّد علی بلگرامی

نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر

شاد عظیم آبادی

مرزا داغ دہلوی

سر سید حامد علی خاں بہادر

نواب سید کلب علی خان بہادر

پیارے صاحب رشید

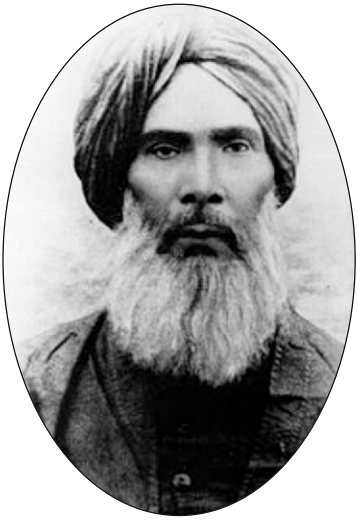

امیر مینائی

ظفر الحسن

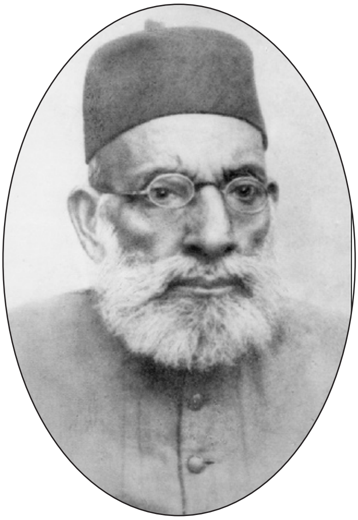

حسرت موہانی

اکبر الہ آبادی

منشی سید محمد سجاد حسین

امداد امام اثر

مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی

لالہ سری رام صاحب

ڈاکٹر علامہ محمد اقبال

نواب محمد علی خاں رشکی جہانگیر آبادی

منشی امیر اللہ تسلیم لکھنوی

بابائے اُردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق

نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی

خواجہ غلام السیّدین صاحب بالقابہ

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی

خواجہ الطاف حسین حالی اور ان کی تصانیف پر تحقیق و تشریحی کتب

حالی فہمی

کلّیاتِ حالی

مُسدسِ حالی

قطعاتِ حالی

رُباعیاتِ حالی

قصاید حالی

بچوں کے حالی

حالی کی غزلیں

حالی کی نظمیں

حالی کی نعتیہ شاعری

حالی کے شخصی مرثیے

دیوانِ حالی فارسی

بُک کارنر
جہلم، پاکستان

پیش لفظ

یہ بھی اُردو شعر و ادب کی نا قدری ہے کہ اس کے مشاہیر شاعروں، ادب کے عظیم ترین محسنوں، اور معماروں کی قدر دانی جیسے ہونی تھی ویسے ہو نہ سکی۔ الطاف حسین حالیؔ، غالبؔ اور شیفتہؔ کے شاگرد، سر سید کے فرماں بردار، محمد حسین آزادؔ شبلیؔ نعمانی ڈپٹی نذیر احمد، صدر یار جنگ شیروانی اور چراغ علی کے مصاحب، علی گڑھ کالج اور تحریک کے اکابرین کے وفا دار، حیدر آباد، رام پور، پٹیالہ کے حکمرانوں روسا اور انگریز حکومت کے مدح شعار ممتاز شاعر تھے۔ وہ اگر چہ ترقی پسند شاعر، تنقید کے بنیاد گزار اور جدید نظم کے پیشوا تھے جنہوں نے تنقید اُردو شعر و ادب میں مقدمۂ شعر و شاعری، نثری کارناموں میں حیات جاوید، یا گار غالبؔ اور حیات سعدیؔ کے علاوہ اُردو، فارسی اور عربی میں تقریباً ساڑھے نو ہزار اشعار چھوڑے ہیں جو ان کے ہم عصروں کے مقابل سب سے زیادہ وسیع اور تقریباً ہر صنف سخن پر محیط ہیں لیکن ان کا اصلی کارنامہ شعر و ادب میں جدت، مقصدیت اور زندگی کی قدروں کو شامل کرنا ہے۔ چناں چہ انہوں نے اگر مرثیۂ غالب سے یادگار غالب تک شعری، علمی، تہذیبی اور تنقیدی قدروں کو روشناس کروایا تو حیاتِ جاوید، مسدس، حقوقِ نسواں اور اولاد کے ساتھ علی گڑھ تحریک کی نظموں سے برصغیر کی قوم اور خوابیدہ ملت میں تعلیمی، سماجی، اقتصادی، اخلاقی اور ملی شعور کو بیدار کر کے ایسی فضا بنائی کہ اس میں آگے چل کر علامہ اقبالؔ، سر راس مسعود، ابوالکلام آزاد، ظفر

الحسن، عبدالحق غلام سیدین جیسے معنوی شاگردوں نے ایک پسماندہ اور بے حس ملت کو دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کی صفوں میں پہنچا دیا۔ اس لیے اگر حالؔی کو اُردو شعر و ادب کا مجدد کہا جائے تو اس میں اعتراض کی گنجائش نہیں۔ حالؔی کا کلام قومی ادبی اور ملی سرمایہ ہے چناں چہ جب تک قوم اور ادب باقی ہے اس کی اہمیت بھی باقی رہے گی۔ حالی کا کلام جتنا مقبول اور موثر کل تھا آج بھی ہے اور کل بھی رہے گا۔ حالی شناسی پر راقم کی درجن بھر کتابیں اسی جذبے کے تحت ان کی سوسالہ برسی کے موقع پر پیش کی جا رہی ہیں جس کا ڈول ہم نے کئی سال قبل اُردو کے اندھے کنویں میں ڈال کر چلو چلو پانی جمع کر کے جام سخن میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کے لیے ہم کسی تحسین اور صلے کے منتظر اس لیے بھی نہیں ہیں کہ ع

ہر بڑے کام کی تکمیل ہے خود اس کا صلہ

دِلّی اور لاہور میں حالی کی غزلوں، نظموں، قطعوں، رباعیوں اور بعض شخصی مرثیوں سے لوگ واقف تھے جنھیں حالی مشاعروں، محفلوں اور جلسوں میں پڑھتے تھے۔ ان کے کلام کے بعض نمونے اُس دور کے گلدستوں، تذکروں، اخباروں اور رسالوں میں گاہے گاہے چھپتے رہے۔ حالؔی کی بعض نظمیں علاحدہ علاحدہ مختلف مقامات پر شائع ہوتی رہیں جن میں مناجات بیوہ، مثنوی حقوق اولاد، شکوۂ ہند، تحفۃ الاخوان، فلسفۂ ترقی اور چپ کی داد وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن باقاعدہ طور پر حالؔی کی زندگی میں مسدس حالی اور تین مجموعے کلام شائع ہوئے۔

مسدس حالی: 1879ء ضمیمہ مسدس حالی: 1886ء مجموعہ نظم حالی: 1890ء میں اور دیوان حالی معہ مقدمہ شعر و شاعری 1893ء میں۔ حالی نے اپنی زندگی کے آخری سال یعنی 1914ء میں اپنی فارسی اور عربی نظم و نثر کا مجموعہ ''ضمیمۂ اردو کلیاتِ نظم حالی'' مرتب کر کے شائع کیا لیکن افسوس زندگی نے وفا نہ کی چناں چہ ضمیمہ تو چھپ گیا مگر کلیات

کی ترتیب اور طباعت نہ ہوسکی۔

حالی کے انتقال کے بعد اگر چہ حالی کے نواسے نے حالی پبلشنگ ہاؤس سے حالی کی مختلف اہم تصانیف کو عمدہ طریقے پر شائع کیا لیکن کلیات نظم حالی کی طباعت میں مشکلات اس لیے رہیں کہ حالی کی بعض نظموں کے حقوقِ اشاعت بعض قومی اداروں اور تاجروں کو حالؔی نے دے رکھے تھے اور وہ ان نظموں کی کلیات میں شمولیت پر راضی نہ تھے۔ چناں چہ اسی وجہ سے مختلف مقامات اور مختلف چھاپہ خانوں سے حالؔی کی تصانیف جن میں علاحدہ علاحدہ رباعیات حالی، قطعات حالی، مسدس حالی اور حالی کی دیگر نظمیں شائع ہوتی رہیں۔

1922ء میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالؔی کا غیر مدون کلام یعنی باقیاتِ حالی کا مجموعہ ''جواہرات حالی'' کے نام سے شائع کیا۔ ''جواہرات حالی'' کی پذیرائی سے متاثر ہوکر شیخ اسماعیل پانی پتی نے ''کلیات نظم حالی'' کو چار جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ انھوں نے پہلی اور دوسری جلد میں ''دیوان حالی'' مطبوعہ 1893ء اور ''جواہرات حالی'' 1922ء میں شائع شدہ کلام کو اصناف وار ترتیب دے کر کلیات 1924ء میں پیش کیا۔ افسوس ہے کہ جلد سوم اور چہارم کبھی شائع نہیں ہوئیں۔ تقریباً چالیس سال بعد افتخار احمد صدیقی نے دو جلدوں میں کلیات نظم حالی کے عنوان سے حالی کا سارا کلام مجلس ترقی ادب لاہور سے شائع کیا جو حالی کے کلام کے موجودہ نسخوں میں معتبر کلیات ہے۔ حالی کے کلام کی کمیابی اور پرانی کتابت کی غلطیوں سے بھرے ہوئے نسخوں کی طباعت حالی شناسی میں خلل انداز ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گزشتہ چالیس پچاس سال میں حالی پر کوئی خاص کارآمد تحقیقی اور تنقیدی کام نہ ہوسکا۔ کچھ عمدہ مقالے، تبصرے اور تجزیے مقدمہ شعروشاعری پر ہر دور میں ہوتے رہے اور یہ صدائیں بھی دو تین دہائیوں سے خاموش ہوگئیں۔ راقم نے حالی شناسی کے فروغ کے لیے حالؔی کے کلام کو صرف نصاب میں شامل

ضروری نہ جانا بلکہ عوام میں بھی اس کے چرچے کو لازم جان کر اس کی فراہمی کا منصوبہ بنایا جس میں اکیسویں صدی کے اُردو ماحول میں حالی کا کلام جدید علمی تحقیقی اور تنقیدی زاویوں پر استوار کر کے تجزیے اور تشریح کے ساتھ ایسی ترتیب اور تدوین کے ساتھ پیش کیا جائے کہ عالم اور عامی اس سے مستفید ہوسکیں۔ چناں چہ حالی کے کلام کے ہر حصے پر دقیق دیدہ ریزی اور مستند حوالوں کی آبیاری سے گلشن تجزیے اور تشریح کو سنوارا گیا۔ کلیات حالی دو جلدوں میں، حالی فہمی، مسدس حالی، حالی کی نظمیں، قطعات حالی، رباعیات حالی، حالی کی غزلیں، حالی کی نظمیں، حالی کے شخصی مرثیے، قصاید حالی، حالی کی نعتیہ شاعری، بچوں کے حالی اور دیوان حالی فارسی اسی گلشن کے پھول ہیں جن کو جدا جدا گل دانوں میں سجایا گیا ہے۔ حالی کے منظوم کلام کی تشریح اور تدوین کے لیے مطبوعہ نسخوں سے استفادہ کیا گیا کیوں کہ حالی کا قلمی غیر مطبوعہ کلام سب کچھ فسادات میں ضائع ہوگیا۔

حالی کی پوتی مشتاق فاطمہ کی صاحبزادی صالحہ عابد حسین اپنے مکتوب بنام ڈاکٹر رفیق حسین مرتب مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتی ہیں۔ ’’فسادات کے بعد حالی مسلم ہائی اسکول جو حالی کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے ان کی یادگار کے طور پر قائم کیا تھا ختم کر کے اُسے جین ہائر سکنڈری اسکول بنا دیا گیا تھا جو اب ڈگری کالج ہو گیا ہے۔ ان کا مکان کسٹو ڈین کے قبضے میں گیا۔ کتب خانہ ان کا تو پہلے ہی اسکول کو دے دیا گیا تھا۔ میرے والد اور چچا کا بہت بڑا کتب خانہ تھا جس میں نادر اور بیش بہا کتابیں تھیں وہ بھی فسادات کی نذر ہوا۔‘‘

حالی کے مطبوعہ کلام کے کئی نمونے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ہم نے کلام میں جہاں اختلاف پایا وہاں حالی کی زندگی میں شائع شدہ کلام کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ دیوان حالی، مسدس حالی، مجموعہ نظم حالی، ضمیمۂ کلیاتِ حالی اور مختلف معروف نظمیں جو

شائع ہو چکی تھیں ان سے استفادہ کیا گیا۔''جواہرات حالی'' اور دیگر نسخوں کو دوسری کتابوں کے حوالوں سے دیکھا گیا ہے حالی کے قدیم کلیات میں جو مسائل تھے جہاں کئی الفاظ ملا کر لکھے جاتے تھے اور بعض نسخوں میں یاں' واں' ترے' مرے کو یہاں' وہاں' تیرے' میرے لکھا گیا جس سے شعر وزن سے ساقط ہو گیا تھا اس کلیات میں ان نقائص سے اجتناب کرنے کے لیے کلیات نظم حالی کی دونوں جلدوں سے بھر پور استفادہ کیا گیا جن کو ڈاکٹر افتخار صدیقی نے مرتب کیا اور ضروری حاشیے درج کیے۔ ڈاکٹر افتخار صدیقی کا کلیات موجودہ نسخوں میں سب سے عمدہ اور نقائص سے پاک ہے۔ ہم نے ان کے بعض حاشیوں کو شامل کر کے (اص) کی علامت کا نشان رکھا ہے۔ حالی کے تمام حاشیوں کو درج کیا ہے جنہیں بعض ناشرین نے کار اضافی جان کر نکال دیا تھا۔

حالی وہ ممتاز شاعر ہیں جنھوں نے روایتی اور جدید شاعری کی ہے۔ جہاں تک حالی کی غزلیات کا تعلق ہے انھوں نے قدیم غزلوں کے نمونۂ کلام کو اپنے دیوان میں رکھا تا کہ قدیم اور جدید کا فرق ظاہر ہو۔ چناں چہ قدیم روایتی غزلوں پر''ق'' کا نشان دیوان میں لگا دیا جس کو کئی ترتیب اور تدوین کرنے والوں نے چنداں اہمیت نہ دی۔ اس کلیات میں ڈاکٹر افتخار صدیقی کے نسخے کی روش اختیار کی گئی ہے۔ تا کہ آیندہ قدیم اور جدید غزلیات میں خلط ملط نہ ہو چنان چہ قدیم اور جدید غزلیات علاحدہ علاحدہ ترتیب دی گئی ہیں۔ ناظرین حالی کی قدیم عشقیہ شاعری اور جدید مقصدی شاعری کو ان علامات کی روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔ حالی اس فکری انقلاب کے بارے میں دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''غرض کہ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی۔ اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا......مگر جب آفتاب

عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا......جس شاعری پہ ناز تھا
اس سے شرم آنے لگی۔''

حالی نے اُردو اور فارسی میں رباعیات کہی ہیں۔ اُردو اور فارسی کی عمدہ رباعیات کے سامنے حالی کی رباعیات معمولی اور پھیکی معلوم ہوتی ہیں۔ حالی کی رباعیات کے مجموعے کئی شائع ہوئے لیکن سب سے اچھا مجموعہ جس میں حالی کی سب سے زیادہ رباعیات ہیں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کا ترتیب شدہ ہے جو انہوں نے حالی کی سو سالہ ولادت کی سالگرہ پر شائع کیا تھا۔ اس کلیات اور مجموعہ رباعیات میں ہم نے اسی نسخے سے استفادہ کیا جسے افتخار صدیقی نے نظم کلیات حالی میں شامل کیا ہے۔ حالی کی اُردو رباعیات کی تعداد ((120 اور فارسی رباعیات کی تعداد ((20 ہے۔ شیخ اسماعیل کے مرتبہ رباعیات کے مجموعے میں کتابت کی غلطیاں اور بعض الفاظ کا املا غلط درج ہونے کے باعث مصرعے وزن سے خارج ہو گئے تھے وہ تصحیح کر کے شامل کر لیے گئے اور مزید ایک قطعہ جو غلطی سے رباعیوں میں شامل تھا خارج کر دیا گیا ہے جس کا پہلا مصرعہ یہ ہے۔

موتی ہزار قصر سمندر میں ہوں نہاں

حالی منکسر المزاج تھے انہیں واعظ اور ناصح بننے میں حیا آتی تھی۔ خود لکھتے ہیں:

''بعض رباعیوں اور قطعوں میں اخلاقی مضامین پیش کیے گئے چنان چہ شاعر کو پندونصیحت کا پیرایہ اختیار کرنا پڑا۔ مگر یہاں شاعر ناصح سے اِس لیے مختلف ہے کہ وہ آپ بیتی بیان کر رہا ہے جب کہ پاک ناصح جگ بیتی کا ذکر کر رہا ہے۔''

ہم نے حالی سے منسوب ''نعتیہ خمسہ'' کو جیسے شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے جواہرات یعنی مجموعۂ باقیاتِ حالی میں شامل کیا تھا اور ''خستہ'' حالی کا تخلص بتایا تھا اس کلیات میں الحاقی کلام بتا کر شامل نہیں کیا۔ یہ نعتیہ خمسہ فارسی میں ہے اور اس کا سن

طباعت 1856ء ہے جب حالی کی عمر مشکل سے اٹھارہ برس ہے۔ افتخار صدیقی مرتب ''کلیات نظم حالی'' بھی اس کو حالی کا کلام نہیں مانتے لیکن اس کے باوجود انہوں نے اِسے شامل کیا ہے۔ ہم نے پورا تحقیقی مضمون اس ضمن میں ''حالی فہمی'' میں ناظرین کی سہولت کے لیے شائع کیا ہے۔

حالی کی زندگی میں جوان کے فارسی اور عربی کلام کے نظم و نثر کا مجموعہ بنام ضمیمۂ اردو کلیات شائع ہوا تھا اُس سے نثر کے حصے کو چھوڑ کر فارسی عربی کا منظوم کلام یہاں شامل کیا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ حالؔی نے سرسید کی تحریک پر مسدس لکھا۔ مسدس کا سب سے پہلا ایڈیشن جون 1879ء میں شائع ہوا جس کو پڑھ کر سرسید نے جو مکتوب لکھا تھا ہم نے اس کو اس دستاویز کا جز بنایا ہے۔ سرسید کا یہ کہنا کہ بارگاہ ایزدی میں خالی ہاتھ نہیں آیا بلکہ مسدسِ حالی لکھوا کر لایا ہوں اس بات کا مکمل ثبوت ہے کہ سرسید مسدسِ حالی کے گرویدہ تھے۔ چناں چہ سرسید نے ''تہذیب الاخلاق'' جلد 1880ء میں پورا مسدس چھاپا۔ حالی کے مسدس کا پہلا ایڈیشن سال بھر میں ختم ہوگیا۔ دوسرا ایڈیشن بھی ایک ہی سال میں ختم ہوا تو مسدس کے تیسرے ایڈیشن میں حالؔی نے مسدس پر نظرِ ثانی کی، کئی مصرعوں کو بدلا، بندوں میں اضافہ کیا اور ضمیمہ کا بھی اضافہ کر کے مسدس کے چھے سال بعد 1886ء میں شائع کروایا۔ حالؔی کے مسدس میں (294) بند ہیں اور ضمیمہ میں ((164 بند ہیں اس طرح کل بندوں کی تعداد ((458 ہے حالی کے سو سالہ ولادت کی سالگرہ پر 1935ء میں ڈاکٹر عابد حسین کے مقدمے کے ساتھ مسدس کا صدی ایڈیشن بڑے اہتمام سے شائع ہوا۔ ہم نے یہاں اسی صدی ایڈیشن کے نسخے سے استفادہ کیا۔

حالی نے اپنے کلام بالخصوص مسدس اور بعض نظموں میں پسماندہ بے حرکت مسلمان قوم کے اسلاف اور اکابرین کے کارناموں کو بیان کر کے یہ تلقین کی ہے کہ تم

اب بھی یہ کام کر سکتے ہو اس طرح ان کا کلام مسلمانوں کی غیرت کی رگ کو پھڑکتا اور سوئی ہوئی قوم کے لیے ایک تازیانہ کا کام کرتا ہے کہ بیدار ہوں اور فلاکت و ہلاکت سے نجات حاصل کرو۔

حالی نے اپنے نظموں کے پہلے مجموعے میں چودہ نظمیں شائع کیں جس میں مدو جزر اسلام، مناجات بیوہ، حقوق اولاد اور شکوہ ہند کو اس لیے شامل نہیں کیا کہ وہ پہلے اور مسلسل شائع ہو رہی تھیں۔ حالی دیباچے میں لکھتے ہیں کہ اس مجموعے میں 1874ء تک کی نظموں کو شامل کیا گیا ہے۔ 1874ء میں جب محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہال رائڈ کی تائید سے ایک مشاعرے کی بنا ڈالی گئی جس میں مصرعہ طرح کے بجائے موضوع دیا گیا تا کہ اُردو شاعری کو فرسودہ عشقیہ اور مبالغہ آمیز مضامین سے نجات دلوائی جائے تو انہوں نے بھی جو نظمیں پڑھیں یعنی برکھارت، نشاط امید، حب الوطن اور مناظرہ رحم و انصاف کو اس مجموعہ کا حصہ بنایا۔ حالی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ انہیں اگرچہ مغربی شاعری کے اصولوں سے واقفیت نہیں لیکن انہیں مبالغہ اور اغراق سے نفرت ہے جس کا ثبوت خود ان کا کلام ہے۔ حالی نے بتایا ہے کہ سائنٹیفک سوسائٹی کے اخبار اور 1872ء کے جاری شدہ تہذیب الاخلاق کے علاوہ مغربی لٹریچر کی ترجمہ شدہ کتابوں نے مسلمانوں کے ذہنوں میں لٹریچر کا انقلاب برپا کر دیا تھا جس کی وجہ سے مغربی طرز کی نظموں کی پذیرائی ہونے لگی۔ حالی کہتے ہیں:

> ’’میں اپنے قدیم مذاق کے دوستوں اور ہم وطنوں سے جو کسی قسم کی جدت کو پسند نہیں کرتے، معافی چاہتا ہوں کہ اس مجموعے میں ان کی ضیافت طبع کا کوئی سامان مجھ سے مہیا نہیں ہو سکا اور اُن صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں، اعتراف کرتا ہوں کہ طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ البتہ میں نے اُردو زبان میں نئی طرز کی

ایک ادھوری اور ناپائدار بنیاد ڈالی ہے۔ اس پر عمارت چننی اور اس کو ایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آیندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے، جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو نا تمام نہ چھوڑیں گے۔

پارۂ در خاک معنی تخم سعی افشاندہ ام
بو کہ بعد از ماشود ایں تخم نخل بار دار''

یعنی میں نے دنیائے معانی کی خاک میں کوشش کے بیج بوئے ہیں تا کہ ہمارے بعد اس کے پھل دینے والے درخت سے لوگ فائدہ اٹھا سکیں۔

حالی نے دیوان کے دیباچہ میں لکھا: ''کچھ نظمیں قوم کی حالت پر لکھی گئیں۔ بعضوں نے پسند کیں اور بعضوں نے ناپسند مگر چوٹ سب کے دل پر لگی۔ کہانی بے مزہ تھی مگر آپ بیتی اور باتیں اوپری تھیں مگر پتے کی۔ پہلا کلام جو عالم جہل و نادانی یا خلاصہ زندگانی کی نشانی ہے وہ بھی کسی قدر تلف ہو جانے کے بعد جس قدر بچا ہے اب تک محفوظ ہے۔ انسان کی طبیعت کا تقاضا ہے کہ جو کام اس کی تھوڑی یا بہت کوشش سے انجام ہوتا ہے عام اس سے کہ اچھا ہو یا برا اور پسند کے لائق ہو یا نہ ہو اس کو بڑے فخر کے ساتھ پبلک میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے اور خاص و عام سے اپنی کوشش کی داد چاہتا ہے۔ان نظموں کو جو پہلے شائع ہو چکی ہیں دیکھ کر ناظرین کو یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں نئی بات کون سی ہے۔ نہ خیالات ہی اچھوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں اور نہ طرز بیان میں کوئی ایسی جدت ہے جس سے کبھی کان آشنا نہ ہوئے ہوں۔ پس ان کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ بے شک طرز ادا جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا وہ بہت کم فرق پائیں گے مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو ان کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ گو محمل نہیں بدلے مگر محمل نشین بدل گئے اور گو پیالے وہی ہیں مگر شراب اور ہے۔''

حالی نے یہ بھی بتایا کہ انسان میں یہ طاقت نہیں کہ وہ کسی چیز کو عدم سے وجود میں لا سکے۔ نئے خیالات سے مراد وہی عام خیالات ہیں جن کو شاعروں نے ترک کر دیا تھا اور معمولی خیالات سمجھ کر چھوڑ دیا تھا جب کہ انہی خیالات میں زندگی کے راز چھپے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ نظموں میں اسلاف کے اقوال واقعات اور حکایات کو بھی بیان کیا گیا۔ طوالت وتکرار حالی کی نظموں کا سب سے بڑا عیب ہے۔ مثلاً: مناجات بیوہ جو حالی کی بہترین نظم ہے اس میں طوالت اور تکرار نے اسے کم اثر کر دیا ہے۔ اگر اس کے بعض حصوں کو نکال بھی دیا جائے تو نظم پر کوئی منفی اثر نہیں پڑ سکتا۔ حالی کو اگر موقع ملتا تو شاید ان نظموں کی تکرار اور طوالت پر نظر ثانی کرتے۔ ہم مطمئن ہیں کہ نسل آیندہ اس کا انتخاب کرے گی۔

جہاں تک کلیات کی ترتیب اور تدوین کا تعلق ہے جو کم از کم تین طرح سے مرتب کیا جا سکتا ہے یعنی اصنافی ترتیب، موضوعاتی ترتیب یا زمانی ترتیب۔ حالی کے پہلے کلیات کو شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اُردو کے قدیم اور مروجہ اسلوب یعنی اصناف سخن کے اعتبار سے جمع کیا۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے کلیات نظم حالی کو موضوعاتی اعتبار سے تقسیم کر کے ہر صنف میں زمانی دور کو بھی ملحوظ رکھا۔ راقم نے بھی کلیات حالی میں اصنافی ترتیب دے کر جہاں منظومات کے سنین کا تعین ہو سکا انہیں تاریخوں کے اعتبار سے مرتب کیا ہے۔ راقم بک کارنر پبلشرز کے رُوحِ رواں جناب امر شاہد کی کاوشوں کا ممنون ہے جنہوں نے حُسنِ یوسف کو بازارِ مصر میں پیش کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر بیدار بخت اور کرنل انور احمد کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے وہ تمام کتابوں کا بندوبست کیا جو میری لائبریری میں نہیں تھیں۔

خیر اندیش

ڈاکٹر سید تقی عابدی

حاؔلی کی کہانی حاؔلی کی زبانی

(جو نواب عماد الملک بہادر مولوی حسین صاحب بلگرامی کی فرمائش سے لکھی گئی)

میری ولادت تقریباً 1253 ھ مطابق 1837 ء میں بمقام قصبہ پانی پت شاہ جہاں آباد سے جانب شمال 53 میل کے فاصلہ پر ایک قدیم بستی ہے؛ میں واقع ہوئی۔ اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے؛ آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرہویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے۔ ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ جن کا سلسلہ نسب 26 واسطوں سے حضرت ابو ایوب انصاری تک اور 18 واسطوں سے شیخ الاسلام تک اور 10 واسطوں سے ملک محمود شاہ انجو لقب بہ آق خواجہ تک جو غزنوی دور میں فارس وکرمان وعراق عجم کا فرمانروا تھا، پہنچتا ہے۔ چونکہ غیاث الدین بلبن اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے اور اس کا بیٹا سلطان محمد علما وشعرا و دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدر دان تھا اس لیے اکثر اہل علم اور

عالی خاندان لوگ ایران وترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کوسفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا چناں چہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں اور معتد بہ آراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور معاش کے اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبہ پانی پت واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا وصدارت وتشخیص رخ بازار اور تولیت ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں اور خطابت عیدین ان سے متعلق کر دی۔ پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انہیں بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔ میں باپ کی طرف سے اسی شاخ انصار سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں؛ کی بیٹی تھیں۔

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا۔ میرے والد نے سن کہولت میں انتقال کیا جبکہ میں نو برس کا تھا۔ اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔ انہوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا۔ مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا ایک بزرگ سیّد جعفر علی مرحوم جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناں شوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر اور تاریخ طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے اُن سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق ہو گیا اُنہیں دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے ان سے صرف ونحو پڑھی۔ مگر چند روز بعد بھائی نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر 17 برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا کہ یہ جو میرے کندھے پر رکھا گیا اب بظاہر

تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں۔ مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف ونحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا۔ مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشوونما پائی تھی وہاں تعلیم کو صرف عربی اور فارسی زبان پر منحصر سمجھا جاتا تھا انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اوّل تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہ آتا تھا اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے۔ نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما مجہلے کہتے تھے۔ دلی پہنچ کر جس مدرسہ میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا وہاں کے مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گذرتا تھا ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ ان لوگوں سے کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ۔

میں نے دلی میں شرح مسلم، ملاحسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چارنا چار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر 1855ء کا ہے۔ دلی سے آکر برس ڈیڑھ تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ 1856ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔ لیکن 1857ء میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات

ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اُٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے (پانی پت میں) بے کاری کی حالت میں گذرے۔ اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلاء مولوی عبدالرحمن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شروع اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہوا جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

جس زمانہ میں میرا دلّی جانا ہوا تھا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انہوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگر چہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حسن اتفاق سے نواب مصطفی خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتیؔ اور اردو میں شیفتہؔ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات برس

تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے۔ اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اوراعلیٰ واقع ہوا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خان کو دکھایا تھا۔ مگر ان کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر وسخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہوگیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانہ میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہؔ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ انہوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ مصرع پڑھا:

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

اور کہا کہ انیسؔ نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص مذاق پیدا ہو گیا۔

نواب شیفتہؔ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک آسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے

ان کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ لاہور ہی میں رہ کر نیل ہالرائیڈ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی 1874ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ میں نے بھی اسی زمانہ میں چار مثنویاں ایک برسات پر دوسری امید پر۔ تیسری رحم وانصاف پر اور چوتھی حُبِّ وطن پر لکھیں۔

اس کے بعد میں لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آیا۔ یہاں آکر اوّل میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی؛ لکھی۔ پھر سرسید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزلی کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی۔ چناں چہ میں نے اوّل مسدس مدو جزر اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں، لکھیں۔

نظم کے سوا نثر اردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً 1867ء میں ایک کتاب تریاق مسموم ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہم وطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا؛ لکھی تھی جس کو اسی زمانہ میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی اُردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا چناں چہ ڈاکٹر لائٹز کے زمانہ

میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا مگر اوّل تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی جبکہ جیولوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا۔ دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔ لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی جس پر کرنیل ہالرایڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپیہ کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔ پھر دلی میں سعدیؔ شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام حیاتِ سعدی ہے اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں پھر شاعری پر ایک مبسوط مضمون لکھ کر بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی لکھا گیا ہے یادگار غالب کے نام سے لکھ کر شائع کی اور اب سرسید احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم حیاتِ جاوید جو تقریباً ہزار صفحہ کی کتاب ہے لکھی جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گرائمر وغیرہ میں نے لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب اخلاق، علی گڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ نیز اُردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوئی جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے۔ اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔ میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سرسید کی وفات پر میں نے 1898ء میں لکھا تھا اور اُردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس

وکٹوریا کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

1305ھ میں جبکہ میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے لیے سر سید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغہ امدادِ مصنفین ایک وظیفہ تعداد پچھتر روپے ماہوار کا میرے لیے مقرر فرمایا اور 1309ھ میں جب کہ میں سر سید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ حیدر آباد گیا تھا۔ اس وظیفہ میں پچیس روپے ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپے سکہ حال کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جو اب تک مجھ کو ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول کا تعلق قطع کر دیا ہے۔

دیباچہ دیوانِ حالؔی

(مولانا حالؔی)

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

ایک زمانہ تھا کہ شاعری اور عشق یا تعشق کو لازم وملزوم سمجھتے تھے اور ایسا سمجھنا کچھ بے وجہ نہ تھا۔ اوّل تو خود شعر کا حدوث ہی دنیا میں اس جوش اور ولولے سے ہوا ہے جو عشق اور محبت کی بدولت انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور شعر کی ذات میں جو ایک آتش گیر مادہ ہے وہ بھی اپنے مشتعل ہونے میں کسی آگ کی اشتعال انگیزی کا محتاج ہے۔ پھر قوم (۱) کا کلام بھی جہاں تک دیکھا گیا ہے اسی خیال کی تائید کرتا ہے۔ با ایں ہمہ حداثت سن یہ کب اجازت دیتی تھی کہ شاہد رعنائے سخن کا نظارہ ایک پیرزال کی صورت میں کیا جائے اور شراب ارغوانی کی جگہ سرکہ بے نمک سے ضیافت طبع کی جائے۔ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔

۱۔ قوم سے یہاں اس کے متعارف معنی مراد نہیں بلکہ قوم سے مراد شعرا ہیں۔

خود بھی یہ سودا اچھلا۔ آنکھیں بند کیں اور اسی شارع عام پر پڑ لیے جس پر راہگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلے کے ساتھ راہ کی ہمواری اور رہ گزر کی فضا چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ مگر جب آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا، وہ تمام سیمیائی جلوے جو خواب غفلت میں حقائق سے زیادہ دل فریب نظر آتے تھے، رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے۔ غزل وتشبیب کی امنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی اور جس شاعری پر ناز تھا اس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھایا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں مگر یہی جواب دیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔

یقولون هل قبل الثلثین ملعب (۱)

فقلت وہل بعد الثلثین ملعب

جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں منہ کو لگا پھر ذرا مشکل سے چھٹتا ہے۔ مگر زمانے کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دل فریب مگر نکمی باتوں پر آفرین سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفرین سننی بہتر ہے اور حاکم وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ وبلبل کی قسمت کو تو بہت رو چکے کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں:

یکرہ بخاں خویش ہم آخر تواں گریست

تا چند بر فلان و بہ بہاں گریستن

کچھ نظمیں قوم کی حالت پر لکھی گئیں، بعضوں نے پسند کیں اور بعضوں نے ناپسند، مگر چوٹ سب کے دل پر لگی۔ کہانی بے مزہ تھی مگر آپ بیتی، اور باتیں اوپری تھیں مگر پتے کی۔ جو نظمیں کسی قدر طولانی تھیں وہ تقریباً تمام چھپ چکی اور شائع ہو چکی

۲۔ یعنی لوگ کہتے ہیں کیا لہو ولعب کا زمانہ تیس برس سے پہلے ہے؟ سو میں نے ان سے کہا: کیا لہو ولعب کا زمانہ تیس برس کے بعد ہے؟

ہیں۔ اب زیادہ تر کچھ بچے کھچے متفرق اور پراگندہ خیالات باقی ہیں۔ جن میں سے کسی قدر قطعہ و رباعی کے لباس میں اور کچھ غزل کے روپ میں ظاہر کیے گئے ہیں۔ ان کے سوا چند ترکیب بند، ایک آدھ مسمط، کچھ قصیدے اور تاریخیں ہیں جن میں سے اکثر خاص خاص طور پر وقتاً بعد وقت شائع ہو چکی ہیں لیکن مصنف کی طرف سے عام طور پر پبلک کی نذر نہیں ہوئیں۔ پہلا کلام جو عالم جہل و نادانی یا خلاصہ زندگانی کی نشانی ہے وہ بھی کسی قدر تلف ہو جانے کے بعد جس قدر بچا ہے اب تک محفوظ ہے۔ انسان کی طبیعت کا مقتضا ہے کہ جو کام اس کی تھوڑی یا بہت کوشش سے سرانجام ہوتا ہے، عام اس سے کہ اچھا ہو یا برا اور پسند کے لائق ہو یا نہ ہو، وہ اس کو بڑے فخر کے ساتھ پبلک میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے اور خاص و عام سے اپنی کوشش کی داد چاہتا ہے۔ جس فخر کے ساتھ وہ اعرابی (۱) جس نے کبھی آبِ شیریں کا مزہ نہ چکھا تھا، ایک کھاری پانی کے چشمے سے مشک بھر کر ہارون رشید کے دربار میں بطور سوغات کے لیے گیا تھا، وہ اس فخر سے کچھ کم نہ تھا جو کولمبس امریکا دریافت کر کے ازبلا کے دربار میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ پس یہ تمام مجموعہ جس میں کچھ نئے اور کچھ پرانے خیالات شامل ہیں، محض ایک امید موہوم پر کہ دیکھیے مردود ہو یا مقبول، ملک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے اور پہلے اس سے کہ کوئی ہم پر ہنسے، ہم اپنے دعووں پر آپ ہنستے ہیں۔

شاید ناظرین کو پچھلے زمانے کے خیالات میں پہلے زمانے کی بہ نسبت حقائق و

۱۔ یہ ایک مشہور حکایت کی طرف اشارہ ہے یعنی ہارون رشید کے زمانے میں ایک بدوی جس نے کبھی دجلہ کے شیریں پانی کا مزہ نہ چکھا تھا، اس کو صحرا میں ایک چشمہ ملا جس کا پانی اگرچہ دجلہ کے پانی سے نسبت نہ رکھتا تھا لیکن جیسا شور پانی کہ وہ بدوی ہمیشہ پیا کرتا تھا، اس سے کسی قدر میٹھا تھا۔ وہ خوشی خوشی اس کی ایک مشک بھر کر بغداد پہنچا اور خلیفہ کے دربار میں اس کو بطور ایک علق نفیس کے پیش کیا۔ خلیفہ نے اس کو چکھا تو بالکل کھاری پانی تھا۔ مگر اس کی بدمزگی بدوی پر ظاہر نہیں ہونے دی اور اس کو انعام دے کر رخصت کیا اور حکم دیا کہ یہ شخص دجلہ کا پانی نہ پینے پائے ورنہ اپنے دل میں شرمندہ ہوگا۔

واقعات کا کچھ زیادہ جلوہ نظر آئے اور جیسے کہ امید کی جاتی ہے، ان خیالات کو سچی شاعری کا ایک نمونہ تصور کیا جائے۔ مگر یہ بات کہ جیسے یہ خیالات کانوں کو سچے معلوم ہوتے ہیں، ایسے سچے دل سے بھی نکلے ہیں یا نہیں خود ہم کو بھی معلوم نہیں، تا بدیگراں چہ رسد۔ جیسا کام محض سچے جوش اور ولولے سے ہوتا ہے ویسا ہی بلکہ بعض اوقات اس سے بہتر محض شہرت اور ناموری کی خواہش، تحسین و آفرین کے لالچ، جلب منفعت کی توقع یا کم سے کم اپنا دل خوش کرنے کے خیال سے بھی ہوسکتا ہے، اور خود کرنے والے کو اپنے کام کا منشا معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اگر چہ ہم اس وقت نہ ہوں گے مگر زمانہ سچ اور جھوٹ کو اور دودھ پانی کو الگ کیے بغیر نہ رہے گا۔ سچ پھولے گا اور پھلے گا اور جھوٹ برسات کے سبزے کی طرح جلد نیست و نابود ہو جائے گا۔

وکم قد رأینا من فروع کثیرۃ
تموت اذا لم تحیہنّ اصول(۱)

ناظرین کو معلوم رہے کہ جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان اور زبان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آ جاتا ہے مگر پہیا اور دھرا باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیے تھے مگر اسلوب بیان میں مطلق فرق نہیں آیا۔ جو تشبیہیں اور استعارے پہلے مدح، ہجا، غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے وہی اب توحید، مناجات، اخلاق اور موعظت میں استعمال ہونے لگے، خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ متأخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات کی پیروی سے دست بردار ہو جائیں مگر ان کے طریقہ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کسی غیر ملک میں نئے وارد ہونے والے سیاح کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ملک میں روشناس ہونے اور

۱؎ ہم نے وہ شاخیں اکثر سوکھتی دیکھی ہیں، جن کی جڑیں اس قابل نہ تھیں کہ اپنی شاخوں کو سرسبز رکھ سکیں۔

اہل ملک کے دل میں جگہ کرنے کے لیے اسی ملک کی زبان میں گفتگو کرنی سیکھے اور اپنی وضع، صورت اور لباس کی اجنبیت کو زبان کے اتحاد سے بالکل دور کر دے، اسی طرح نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرز بیان میں قدما کے طرز بیان سے بہت دور نہ جانا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انہی پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں اور قدما کا دل سے شکر گزار ہو جو اس کے لیے ایسے منجھے ہوئے الفاظ ومحاورات وتشبیہات واستعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔

کچھ تعجب نہیں کہ اس مجموعے کو اور نیز ان نظموں کو جو پہلے شائع ہو چکی ہیں، دیکھ کر ناظرین کو یہ خیال پیدا ہو کہ ان میں نئی بات کون سی ہے؟ نہ خیالات ہی اچھوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں اور نہ طرز بیان ہی میں کوئی ایسی جدت، جس سے کبھی کان آشنا نہ ہوئے ہوں اور وہ یہ سمجھ کر بے اختیار پکار اٹھیں کہ {هٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ} [1]۔ پس ان کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ بے شک طرز ادا میں، جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا، وہ بہت کم فرق پائیں گے مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو ان کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ گو محمل نہیں بدلے مگر محمل نشین بدل گئے ہیں، اور گو پیالے وہی ہیں مگر شراب اور ہے۔

نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مراد نہیں ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں یا کسی کے ذہن کی ان تک رسائی نہ ہو سکے بلکہ ایسے خیالات مراد ہیں جو شاعر و نا شاعر کے دل میں ہمیشہ گزرتے ہیں اور ہر وقت ان کے پیش نظر ہیں مگر اس وجہ سے کہ وہ ایسے پامال اور مبتذل ہیں کہ ان کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور ان کی طرف

۱۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اہل جنت کو کوئی جنت کا پھل کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے {هٰذَا الَّذِیۡ رُزِقۡنَا مِنۡ قَبۡلُ} (یعنی یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا) کیونکہ جنت کے میوے، صورت میں یکساں معلوم ہوں گے مگر ہر ایک کا مزہ اور لذت جدا ہو گی۔

بہت کم التفات کیا گیا اور پایہ شاعری کو ان سے وراء الورا سمجھا گیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت شاعری کا بھید انہی متبذل خیالات میں چھپا ہوا تھا جو بسبب غایت ظہور کے لوگوں کی نظر سے مخفی تھا:

دیکھ اے بلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہے کانٹے میں بھی اک شان ہے

انسان میں جیسا کہ ظاہر ہے، ہرگز یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو عدم محض سے وجود میں لا سکے۔ اس کی بڑی دوڑ یہی ہے کہ وہ موجودات میں سے چند چیزوں کو ترکیب دے کر اس میں ایک نئی صورت پیدا کر دے۔ پس جس طرح عمارت تیار کرنے میں معمار اینٹ، مٹی، چونے کا یا بڑھی ایک تخت کے بنانے میں لکڑی اور لوہے کا محتاج ہے، اسی طرح ضروری ہے کہ شاعر بھی کسی شعر کے ترتیب دینے میں کسی ایسے مسالے کا محتاج ہو جو اینٹ اور مٹی یا لکڑی اور لوہے کی طرح نفس الامر میں موجود ہو۔ وہ مسالہ کیا ہے؟ یہی دنیا کے حالات جو روز مرہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں، خواہ وہ انسان سے علاقہ رکھتے ہوں یا زمین، آسمان، چاند، سورج، پہاڑ، اور دریا جیسی شاندار چیزوں سے یا مچھر، مکڑی اور بھنگے جیسی بے حقیقت چیزوں سے۔ پس جس شاعر نے ان حالات کو معمولی باتیں سمجھ کر چھوڑ دیا اور شعر کی بنیاد محض فرضی اور ناممکن باتوں پر رکھنی چاہی، اس کی مثال اس معمار کی سی ہو گی جو عمارت بنانے کے لیے اینٹ اور مٹی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ ایسے مسالے کی ضرورت سمجھتا ہے جس سے عمارت تیار نہیں ہو سکتی:

ترسم نرسی بہ کعبہ اے اعرابی
کایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

الغرض جب سے شاعری کی لے کھلی، معمولی شکار چھوڑ کر عنقا کی گھات میں

بیٹھنا اور زمین پر ساگ پات کے ہوتے آسمان سے نزول مائدہ کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔ زمانے کے حالات دیکھ کر جو کیفیتیں نفس پر طاری ہوتی رہیں اور جن واقعات کے سننے سے دل پر چوٹ لگتی رہی ان کو وقتاً فوقتاً اپنے سلیقے کے موافق شعر کا لباس پہناتے رہے۔ بعض خیالات بحسب ضرورت وقت، اقوال سلف یا حکایات سلف سے اخذ کیے گئے۔ کہیں ان کو اپنے حال پر رہنے دیا اور کہیں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے اس کو ایک نئی صورت میں جلوہ گر کیا گیا۔ بعض قطعات و رباعیات میں اخلاقی مضامین کنایہ میں ادا کیے گئے ہیں جو شاید کہیں کہیں مطائبہ کی حد کو پہنچ گئے ہوں، مگر انوری وسعدی و شفائی کے مطائبات کے آگے یقینا بے نمک معلوم ہوں گے۔ ریا و مکر و سالوس و عجب و خود پسندی اور اسی قسم کے اخلاق واعظ و زاہد و صوفی و شیخ و ملا پر ڈھالے گئے نہ اس لیے کہ نعوذ باللہ اس فرقہ علیا کی مذمت مقصود تھی بلکہ اس لیے کہ ان اخلاق کے بیان کرنے کا اس سے واضح تو کوئی عنوان نہ تھا۔ سیاہی کا دھبا جیسا اجلے کپڑے پر صاف نمایاں ہوتا ہے ایسا میلے کپڑے پر نہیں ہوتا۔ ظلم اور بے انصافی کے مرتکب اپنی اپنی طاقت کے موافق فقیر اور بادشاہ دونوں ہوتے ہیں، مگر جب ظلم کو زیادہ ہولناک صورت میں دکھانا منظور ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ سلطنت کے لباس میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ریا و عجب و خود پسندی اگرچہ ہر فرد بشر میں کم و بیش پائی جاتی ہے، مگر جب اس کو علم و زہد و مشیخت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ تعجب انگیز اور ڈراؤنی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور یہی شاعر کی علت غائی ہے۔ ایک شاعر جب اخلاقی مضامین بیان کرتا ہے تو اس کو یہ ضرورت اکثر نصیحت و پند کا پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے، اس لیے ہم کو بھی کہیں کہیں ناصح بننا پڑا ہے مگر اصلی ناصح کی نصیحت اور شاعر کے ناصحانہ بیان میں بہت بڑا فرق ہے۔ اصلی ناصح خود برائیوں سے پاک ہو کر اوروں کو ان سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہے مگر شاعر چونکہ برائیوں کی ہو بہو تصویر کھینچ دکھاتا اور گھر کے بھیدی کی طرح

چھپے رستموں کے پترے کھولتا ہے اس لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ زیادہ تر اپنے ہی عیب اوروں پر دھر کر ظاہر کرتا ہے۔ ہر بدی اور گناہ کا نمونہ کم یا زیادہ، پوشیدہ یا علانیہ انسان کے نفس میں موجود ہے۔ پس اگر بدی یا گناہ کے متعلق کوئی پتے کی بات شاعر کی قلم سے مترشح ہوتو جاننا چاہیے کہ وہ اپنے ہی نفس کی چوریاں ظاہر کر رہا ہے:

ہیں عاشقی کی گھاتیں معلوم اس کو ساری

حالی سے بد گمانی بے جا نہیں ہماری

شاید اس موقع پر شاعر کی طرف سے یہ عذر ہو سکے کہ اس میں فطرت انسانی کے دقائق وغوامض سمجھنے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے جس کی مدد سے بعض اوقات ایک رند مشرب اور خراباتی شاعر جس پر پرہیزگاری کی کبھی چھینٹ نہ پڑی ہو، وہ پرہیزگاروں کی سوسائٹی کا ایسا صحیح نقشہ کھینچ دیتا ہے کہ خود اس سوسائٹی کے ممبر بھی اپنی سوسائٹی کا ویسا نقشہ نہیں کھینچ سکتے۔ اسی طرح ایک دوسرا شاعر جس نے پرہیزگاروں اور پارساؤں کے حلقے سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا، وہ رند واوباش کی صحبتوں کا ایسا چربہ اتار دیتا ہے کہ گویا انہی میں سے ایک نے اپنی حالت کی تصویر کھینچی ہے۔ ابونواس نے بارہا خلیفہ سے ایک مصرع سن کر، جس میں رات کے تخلیے اور عیش کی صحبت کی طرف ایک اجمالی اشارہ ہوتا تھا، اس مصرعے کی تضمین میں ایسے واقعات بیان کر دیے ہیں کہ خلیفہ متعجب ہو کر بے ساختہ یہ کہہ اٹھتا تھا: "قاتلك الله كانك كنت ثالثاً[1]" شیکسپیئر جس کے ہمراہی ہرن کا شکار کھیلنے والے اور تماشا کرنے والے تھے اور جس نے کبھی آنکھ کھول کر عالی خاندان اور شریف و پاکیزہ عورتوں کی سوسائٹی نہ دیکھی تھی، اس نے میکبتھ، جولیٹ، کیتھرائن، ڈز چمونا اور بعض اور لیڈیوں کے ایسے اصلی کیرکٹر دکھائے ہیں جن کا اس

ا۔ خدا تجھ کو شرمائے گویا تیسرا ہم میں تو تھا۔ یعنی تو نے ایسے صحیح واقعات بیان کیے ہیں کہ گویا تو بھی ہماری صحبت میں شریک تھا۔

سوسائٹی پر جس میں اس کی عمر گزری تھی، کبھی پر چھاواں تک نہ پڑا تھا۔ ایران میں فردوسی اور ہندوستان میں انیس، رزم کے بیان میں صدہا باتیں ایسی ٹھکا۔ کی لکھ جاتے ہیں، جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعات گویا خود ان پر گزرے تھے۔

اس عذر سے اگرچہ کسی قدر شاعر کی برأت ہو سکتی ہے، مگر پھر بھی اس کو واعظ و ناصح کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ ناصح کی غرض براہ راست ارشاد و ہدایت ہوتی ہے، بخلاف شاعر کے کہ اس کا اصلی مقصد فطرت انسانی کی کرید اور واقعات دہر سے متاثر ہو کر دل کی بھڑاس نکالنی ہے اور بس۔ وہ کسی کے سمجھانے کے لیے نہیں چلاتا بلکہ خود کچھ سمجھ کر چیخ اٹھتا ہے:

ناصح مشفق ہیں یاروں کے نہ مصلح اور مشیر
درد مند ان کے نہ اُن کے درد کے درمیاں ہیں ہم
پھوٹ پڑتے ہیں تماشا اس چمن کا دیکھ کر
نالۂ بے اختیار بلبل نالاں ہیں ہم

پس اگر شاعر کا کوئی قول اس کے فعل کے برخلاف پایا جائے تو اس کو واعظ یا ناصح قرار دے کر یہ الزام نہیں دینا چاہیے کہ {اَتَأۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَ تَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ} (۱) بلکہ اس کی طرف سے یہ عذر کرنا چاہیے کہ {اَنَّهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا يَفۡعَلُوۡنَ}۔ (۲)

انسان کے کلام میں کہیں کہیں اختلاف یا تناقص پایا جانا ایک ضروری بات ہے بلکہ اس کے کلام کی پہچان ہی یہ بتائی گئی ہے کہ کما قال اللّٰہ تعالیٰ: {وَلَوۡ كَانَ مِنۡ

۱۔ ''کیا تم حکم دیتے ہو لوگوں کو نیکی کا حالانکہ تم اپنی جانوں کو بھولے ہوئے ہو۔''
۲۔ ''تحقیق وہ کہتے ہیں مگر کرتے نہیں۔''

عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴾ [۱] مگر جس طرح ایک فلسفی یا مورخ کی تصنیف میں اختلاف پایا جانا اس تصنیف کو عیب لگاتا ہے، اس طرح شاعر کے کلام کو عیب نہیں لگتا بلکہ اس کا بے ساختہ پن ظاہر کرتا ہے جس کو شاعری کا زیور سمجھنا چاہیے۔ فلسفی یا مورخ ہر ایک چیز پر اس کے تمام پہلو دیکھ کر ایک مستقل رائے قائم کرتا ہے اور اس لیے ضروری ہے کہ اس کا بیان جامع و مانع ہو۔ لیکن شاعر کا یہ کام نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ ہر ایک شے کا جو پہلو اس کے سامنے آئے اور اس سے کوئی خاص کیفیت پیدا ہو کر اس کے دل کو بے چین کر دے، اس کو اسی طرح بیان کرے۔ پھر جب دوسرا پہلو دیکھ کر دوسری کیفیت پیدا ہو جو پہلی کیفیت کے خلاف ہو، اس کو اس دوسری کیفیت کے موافق بیان کرے۔ وہ کوئی فلسفہ یا تاریخ کی کتاب نہیں لکھتا کہ اس کو حقائق و واقعات کے ہر پہلو پر نظر رکھنی پڑے بلکہ جس طرح ایک فوٹو گرافر ایک ہی عمارت کی کبھی روکار کا، کبھی پچھیت کا، کبھی اس ضلع کا، کبھی اُس ضلع کا جدا جدا نقشہ اتارتا ہے، اسی طرح شاعر حقائق و واقعات کے ہر ایک پہلو کو جدا جدا رنگ میں بیان کرتا ہے۔ پس ممکن ہے کہ شاعر ایک ہی چیز کی کبھی تعریف کرے اور کبھی مذمت اور ممکن ہے کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے اور بری چیز کی تعریف، کیونکہ خیر محض کے سوا ہر خیر میں شر کا پہلو اور شر محض کے سوا ہر شر میں خیر کا پہلو موجود ہے۔ عقل، علم، زہد، دولت، عزت اور آبرو عموماً ممدوح و مقبول سمجھی جاتی ہیں مگر شعرا نے ان کی جا بجا مذمت کی ہے۔ اسی طرح دیوانگی، نادانی، رندی، فقر، ذلت اور رسوائی عموماً مذموم و مردود کی جاتی ہیں لیکن شعرا ان کے اکثر مداح رہے ہیں۔

شاعر ایک ہی چیز کی کبھی ایک حیثیت سے ترغیب دیتا ہے اور کبھی دوسری

۱۔ ’’جس طرح کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ: خدا کے سوا اگر یہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو ضرور اس میں بہت اختلاف پاتے۔‘‘

حیثیت سے اس سے نفرت دلاتا ہے۔ وہ کبھی قدما کے مقابلے میں اس لیے کہ وہ استاد اور موجدِ فن تھے، اپنے تئیں ناچیز و بے حقیقت بتاتا ہے اور کبھی اس لیے کہ اس نے ان کی دولت میں کسی قدر اپنی کمائی بھی شامل کی ہے جو ان کے پاس نہ تھی، اپنے تئیں ترجیح دیتا ہے۔ وہ کبھی دنیا کی اس لیے تحقیر کرتا ہے کہ وہ دارالغرور و دارالمحن ہے اور کبھی اس کی بڑائی و عظمت اس لیے بیان کرتا ہے کہ وہ مزرعہ آخرت ہے۔ وہ کبھی ایک ہی گورنمنٹ کی، اس کی خوبیوں کے سبب سے ستائش کرتا ہے اور کبھی اس کی ناگوار کارروائیوں کے سبب شکایت۔ مگر وہ کبھی ان حیثیتوں کی تصریح نہیں کرتا جن پر اس کے مختلف بیانات مبنی ہوتے ہیں۔ جب ایک پہلو کو بیان کرتا ہے تو گویا دوسرے پہلو کو بالکل بھول جاتا ہے۔ وہ ایک نادان بچے کی طرح کبھی بے اختیار رو پڑتا ہے اور کبھی ہنسنے لگتا ہے۔ مگر نہ اس کے رونے کا منشا معلوم ہوتا ہے نہ ہنسنے کا۔ پس ممکن ہے کہ شاعر کے کلام میں ایسی بے جوڑ باتیں دیکھ کر لوگ متعجب ہوں مگر جب تک شاعر کا سا دل ان کے پہلو میں اور ویسا ہی سودا ان کے دماغ میں نہ ہو، ان کا تعجب رفع ہونا مشکل ہے:

بہ زیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگران نخوردہ گزند را چہ خبر

یہ چند اصول جو اوپر بیان کیے گئے ہیں، ان سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نکتہ چینوں کی زبان بند کرنی مقصود ہے، کیوں کہ جس طرح فوارہ روکنے سے زیادہ زور کے ساتھ اچھلتا ہے، اسی طرح نکتہ چینوں کی زبان بند کرنے سے اور زیادہ اُچھلتی ہے۔ دوسرے، نکتہ چینوں سے کان اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ جس طرح توپ خانے کا گھوڑا توپ کی آواز سے کان نہیں ہلاتا، اسی طرح مصنف نکتہ چینوں کے شور و غل کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ پس ان کی زبان بند کرنے کی نہ طاقت ہے نہ ضرورت۔ البتہ ضرورت وقت اس امر کی مقتضی تھی کہ دیباچے میں یہ چند باتیں جتا دی جائیں۔ ظاہر

ہے کہ سویلزیشن، جس کو شعر و شاعری کا قاتل کہا جاتا ہے، اس کا پرچھاواں اس ملک پر بھی پڑنے لگا ہے۔ شعر جس کو مدرسے میں لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ (۱) اس کو روز بروز زیادہ تر مدرسے ہی کے ساتھ پالا پڑتا جاتا ہے۔ تعلیم ایسے عقل و دانش کے پتلے جوق در جوق اور فوج در فوج پیدا کر رہی ہے جو شعرا کے نزدیک ذوق معنی سے ایسے ہی بے بہرہ ہیں جیسے شعرا اُن کے نزدیک عقل و دانائی سے۔ ان پر شعرا اتنا بھی اثر نہیں کرتا جتنا کہ عرب کے اونٹ پر حدی خوان کی آواز اثر کرتی ہے۔ غرضیکہ شاعرانہ مذاق یوماً فیوماً ملک سے مفقود ہوتا جاتا ہے اور ایسی علامتیں موجود ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ ہماری شاعری کا چراغ بہت جلد ہمیشہ کے لیے گل ہونے والا ہے۔ نہ پرانی شاعری باقی رہتی نظر آتی ہے اور نہ نئی شاعری آگے چلتی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں دیوان شائع کرنا اور شاعری کے متعلق کچھ اصول بیان کرنا ایسی بات تھی جیسے چین میں عبرانی بائبل شائع کرتی۔ اسی لیے مقدمے میں مطلق شاعری رکسی قدر تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے اور چند باتیں جو خاص اس مجموعے سے علاقہ رکھتی تھیں، وہ اب دیباچے میں بیان کی گئیں۔ لیکن اگر غور کیجیے تو ان میں سے کوئی چیز بھی ضروری نہ تھی۔ مقدمہ اور دیباچہ لکھنا تو درکنار، سرے سے شعر کہنے کی کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی: ع

آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست

مگر مدبر السموات والارض نے اس خرابہ آباد نما کی رونق اور بہار ہماری اسی غفلت و نادانی پر موقوف رکھی ہے کہ دن رات یہاں کے گورکھ دھندوں میں اُلجھے رہیں، دھوکے کو حقیقت اور خواب کو بیداری سمجھیں، اور جس کوشش و جاں فشانی کے ساتھ کہ مکڑی عمر بھر اپنے بودے اور کمزور جالے کے پورنے میں سرگرم رہتی ہے، اسی

ا۔ یہ اشارہ ہے اس مشہور مقولے کی طرف کہ ”شعر مرا بہ مدرسہ مبر۔“

کوشش و جاں فشانی کے ساتھ ہم بھی اپنی بے بنیاد اور پادر ہوا عمارتیں چنتے رہیں، یہاں تک کہ فنا ہو جائیں۔

در کارخانه که بنایش به غفلت است
هشیار زیستن نه زقانون حکمت است
نروح و نغدوا لحاجاتنا
وحاجة من عاش لا تنقضی
ویسلبه الموت اثوابه
ویمنعه الموت ما یشتهی
تموت مع المرء حاجاته
وتبقیٰ له حاجة ما بقیٰ[1]

ا۔ ترجمہ: ہم اپنے کاموں میں صبح وشام سرگرم ہیں اور جو شخص زندہ ہے اس کا کام ختم نہیں ہوسکتا۔ موت ہی اس کے کپڑے اُتروائے گی اور موت ہی اس کی خواہشوں کا خاتمہ کرے گی۔ انسان کی خواہشیں اُس کے ساتھ ہی مریں گی۔ جب تک وہ زندہ ہے، کوئی نہ کوئی خواہش اُس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔

دیباچہ

ضمیمہ اردو کلیات نظم حالی

(مولانا حالی)

تیرہویں صدی ہجری کے وسط تک ہندوستان کے مسلمان بالطبع فارسی زبان میں نظم و نثر لکھنے اور خط و کتابت کرنے کے عادی تھے۔جس شخص کو ادب سے مناسبت ہوتی تھی وہ اکثر فارسی زبان کی شاعری اور انشا پردازی میں طبع آزمائی کرتا تھا۔اس کا سبب کچھ تو اسلاف کے طریقے کی پیروی کا خیال ہوتا تھا جو عموماً فارسی زبان میں تصنیف و تالیف کرتے تھے اور کچھ یہ وجہ تھی کہ اُردو جو اُن کی مادری زبان تھی زیادہ تر بول چال میں اور کسی قدر شعر و سخن میں محدود تھی اور ہر شخص کا یہ کام نہ تھا کہ پہلے ہی پہل شارع عام کے خلاف ہر قسم کی تحریروں میں اُردو زبان کو استعمال کر سکے۔ بڑے بڑے ذی علم اور لائق اصحاب اُردو زبان میں خط و کتابت کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ چنانچہ اُردو زبان کے قواعد تک فارسی ہی میں لکھے گئے اور اُردو کے شاعروں کا تذکرہ بھی فارسی ہی میں قلم بند کیا گیا۔

ایک اور وجہ اُردو زبان کا رواج نہ ہونے کی یہ تھی کہ اہل علم اور لائق اشخاص اُردو میں تصنیف و تالیف یا خط و کتابت کرنے کو اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔ چنانچہ مذہبی اور

علمی کتابیں اکثر عربی زبان میں اور کبھی کبھی فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ زمانے کے انقلاب سے وہ میلان کم ہونا شروع ہوا اور آخر کار یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ دونوں زبانوں میں تصنیف و تالیف کرنا یا نظم و نثر لکھنا موقوف ہی نہیں ہوا بلکہ بمقابلہ اُردو زبان کے محض فضول سمجھا جانے لگا۔ عربی علم ادب تو بہت دن پہلے سے ملک سے رخصت ہو چکا تھا مگر غالب مرحوم اور اُن کے معاصرین کے بعد فارسی شاعری اور انشا پردازی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

مذکورۂ بالا انقلاب سے تقریباً سولہ سترہ برس پہلے راقم کو فارسی نظم و نثر لکھنے کا خیال پیدا ہوا تھا لیکن ایک عرصے تک وہ خیال میلان طبع کی حد سے آگے نہیں بڑھا۔ حسن اتفاق سے 1863ء میں میرا تعلق جناب غفران مآب نواب محمد مصطفی خاں مرحوم و مغفور، رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کی سرکار میں، جو کہ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے، ہو گیا اور اس تعلق کی وجہ سے تقریباً آٹھ نو برس ان کی خدمت میں رہنے کا اتفاق ہوا۔ چونکہ جناب ممدوح کا قیام 1857ء کے بعد سے جہانگیر آباد میں رہنے لگا تھا، جہاں مخاطب صحیح کم یاب تھا، اس لیے وہ فکر شعر کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے تھے۔ لیکن جب راقم وہاں رہنے لگا تو رفتہ رفتہ جناب ممدوح کا شوق از سر نو تازہ ہو گیا۔ اگرچہ اس وقت تک مجھ کو فارسی یا اُردو میں فکر شعر کرنے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا، مگر جناب ممدوح کو ادھر متوجہ دیکھ کر میرے دل میں بھی تحریک پیدا ہوئی۔

فارسی یا اُردو کی جس زمین میں وہ غزل لکھتے، مجھے بھی اپنے ساتھ شریک فرماتے۔ انھی دنوں میں تنہائی اور قلت مشاغل کے سبب عربی ادب کی ہوس دل میں چٹکیاں لینے لگی۔ اگرچہ علم ادب کسی اُستاد سے باقاعدہ پڑھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا، اور نہ کسی ادیب سے صلاح لینے کا موقع ملا تھا، مگر چونکہ لٹریچر سے فی الجملہ مناسبت تھی، کبھی کبھی

ڈکشنریوں کی مدد سے ادب کی آسان آسان کتابیں دیکھنے لگا۔ شدہ شدہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ عربی نظم ونثر پر خودرو مبتدیوں کی طرح ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہوئی۔ غرض کہ فارسی اور اُردو کے ساتھ عربی نظم ونثر میں بھی حیناً فحیناً خامہ فرسائی کرتا رہا۔ آخر وہ زمانہ آپہنچا کہ فارسی اور عربی کے مخاطب صحیح ملک میں نایاب ہو گئے اور دونوں زبانیں ہندوستان کی مردہ زبانوں میں شامل ہونے کے قابل ہوگئیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ مادری زبان کے سوا دوسری زبان میں جو نظم یا نثر لکھی جاتی ہے، گو کہ وہ کیسی ہی بے عیب ہو، اہل زبان کی نظر میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی، الا ماشاء اللہ۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اہل وطن کے نزدیک قبولیت کا درجہ حاصل کر لے۔ لیکن جب اہل وطن کسی ملکی انقلاب کے سبب اُس غیر زبان سے بے گانہ محض ہو جائیں اور اس کی جگہ ملک میں دوسری زبان قائم ہو جائے تو رفتہ رفتہ اس کی شاعری اور انشا پردازی کا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہو جاتا ہے۔

یہی حال آج کل ہندوستان میں فارسی اور عربی لٹریچر کا ہے۔ دونوں زبانوں کی نظم ونثر کے مسودے جو کبھی کبھی کے لکھے ہوئے پڑے تھے، اُن کی نسبت متردد تھا کہ اُن کو کیا کیا جائے۔ قوم میں کوئی ایسی محفوظ لائبریری نظر نہ آتی تھی جہاں افراد قوم کے ورکس (Works) اچھے یا برے، احتیاط کے ساتھ رکھے جائیں۔ پھر اہل وطن کا ان دونوں زبانوں سے عموماً نا آشنا ہونا اپنے اس قدیم شعر کا مضمون یاد دلاتا ہے:

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا

لیکن مذکورہ بالا مسودات، کچھ تو اس وجہ سے کہ بڑی کاوش سے لکھے گئے تھے، اور زیادہ تر اس خیال سے کہ قومی خصوصیات کی یادگار تھے، ان کو رائیگاں کھونا گوارا نہ ہوا۔ چنانچہ تمام پرچے جس قدر بہم پہنچ سکے ادھر اُدھر سے فراہم کیے گئے اور ذیل کی

ترتیب کے ساتھ اس مجموعے میں جو ''کلیاتِ نظم'' اُردو کے آخر میں بہ طور ضمیمے کے ملحق کیا جائے گا، داخل کر دیے گئے۔ یعنی اوّل نظم فارسی، اس کے بعد نثر فارسی، پھر نظم عربی، اُس کے بعد نثر عربی۔

یہ ضمیمہ اگرچہ کم و بیش فارسی اور عربی دونوں زبانوں کی نظم و نثر پر مشتمل ہے، مگر عربی کلام اس قدر قلیل ہے کہ اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ حق یہ ہے کہ اگر اس میں ایک قصیدہ حضرت مولانا و مقتدانا شاہ عبدالغنی النقشبندی المجددی قدس سرہ کی شان میں نہ ہوتا، جو تقریباً 1283 ہجری (1866ء۔ مرتب) میں مدینہ منورہ بھیجا گیا تھا اور جس کی نسبت جناب ممدوح نے بعض ادبائے مدینہ کی پسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا، تو راقم کو ہرگز یہ جرأت نہ ہوتی کہ اپنا عربی کلام اس ضمیمے میں داخل کرنے کی مبادرت کرتا۔

از مقام: پانی پت حالیؔ

دیباچہ

مسدس مد و جزر اسلام

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزمِ شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

بچپن کا زمانہ جو کہ حقیقت میں دنیا کی بادشاہت کا زمانہ ہے، ایک ایسے دل چسپ اور پُر فضا میدان میں گزرا جو کلفت کے گرد و غبار سے بالکل پاک تھا۔ نہ وہاں ریت کے ٹیلے تھے، نہ خار دار جھاڑیاں تھیں، نہ آندھیوں کے طوفان تھے، نہ بادِسموم کی لپٹ تھی۔

جب اس میدان سے کھیلتے کودتے آگے بڑھے تو ایک اور صحرا اس سے بھی زیادہ دل فریب نظر آیا جس کے دیکھتے ہی ہزاروں ولولے اور لاکھوں امنگیں خود بخود دل میں پیدا ہو گئیں۔ مگر یہ صحرا جس قدر نشاط انگیز تھا اسی قدر وحشت خیز تھا۔ اس کی سرسبز جھاڑیوں میں ہولناک درندے چھپے ہوئے تھے اور اس کے خوش نما پودوں پر سانپ

اور بچھو لپٹے ہوئے تھے۔ جوں ہی اس کی حد میں قدم رکھا ہر گوشے سے شیر و پلنگ اور مار و کژدم نکل آئے۔ باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابل دید تھی مگر دنیا کی مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی، خود آرائی کا خیال آیا، نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی۔ نہ وصل کی لذت اٹھائی، نہ فراق کا مزا چکھا:

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

البتہ شاعری کی بدولت جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشتِ جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالۂ نیم شبی سے ربع مسکوں کو ہلا ڈالا، کبھی چشم دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا، آہ و فغاں کے شور سے کرّوبیاں کے کان بہرے ہوگئے، شکایتوں کی بوچھاڑ سے زمانہ چیخ اٹھا۔ طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہوگیا۔ جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا، یہاں تک کہ آپ اپنے سے بدگمان ہوگئے۔ جب شوق کا دریا اُمڈا تو کشش دل سے جذب مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا۔ بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اٹھے۔ گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ میدان قیامت میں اکثر گزر رہوا، بہشت و دوزخ کی سیر کی، بادہ نوشی پر آئے تو خُم کے خُم لنڈھا دیے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ کبھی خانہ خمار کی چوکھٹ پر جبہہ سائی کی، کبھی مے فروش کے در پر گدائی کی۔ کفر سے مانوس رہے، ایمان سے بے زار رہے۔ پیر مغاں کے ہاتھ پر بیعت کی، برہمنوں کے چیلے بنے، بت پوجے، زنار باندھا، قشقہ لگایا، زاہدوں پر پھبتیاں کسیں۔ واعظوں کا خاکہ اُڑایا۔ دیر اور بت خانے کی تعظیم کی، کعبہ اور مسجد کی توہین کی۔ خدا سے شوخیاں کیں، نبیوں سے گستاخیاں کیں، اعجاز مسیحی کو ایک کھیل جانا، حسن یوسفی کو ایک تماشا سمجھا۔ غزل کہی تو پاک شہدوں کی بولیاں بولیں،

قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور بادخوانوں کے منہ پھیر دیے۔ ہر مشت خاک میں اکسیر اعظم کے خواص بتلائے، ہر چوب خشک میں عصائے موسوی کے کرشمے دکھائے، ہر نمرود وقت کو ابراہیم خلیل سے جا ملایا، ہر فرعون بے سامان کو قادر مطلق سے جا بھڑایا۔ جس کے مداح بنے اُسے ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوں کو اپنی تعریف میں کچھ مزا نہ آیا۔ غرض نامہ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی:

چو پرسش گنہم روز حشر خواہد بود
تمسکات گناہان خلق پارہ کنند

بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے۔ جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں:

شکست رنگ شباب و ہنوز رعنائی
دراں دیار کہ زادی ہنوز آنجائی

نگاہ اُٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لیے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا۔ جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین میں حدود رہی ہو، ان سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا۔ اس کے سوا بیس برس کی بے کار اور نکمی گردش میں ہاتھ پاؤں چور ہو گئے تھے اور طاقت رفتار جواب دے چکی تھی۔ لیکن پاؤں میں چکر تھا اس لیے نچلا بیٹھنا بھی دشوار تھا۔ چند روز اسی تردید میں یہ حال رہا کہ ایک قدم آگے پڑتا تھا دوسرا پیچھے ہٹتا تھا۔ ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے، ایک دشوار گزار رستے میں رہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے

تھے، تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں۔ بہت سے ابھی اس کے ساتھ آفتاں وخیزاں چلے جاتے ہیں۔ مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں، پیروں میں چھالے پڑے ہیں، دم چڑھ رہا ہے، چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ لیکن وہ اُولو العزم آدمی جو ان سب کا رہنما ہے، اسی طرح تازہ دم ہے۔ نہ اُسے رستے کی تکان ہے، نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پروا ہے، نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے۔ اس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا ہے، وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور کام کر گئی۔ بیس برس کے تھکے ہارے خستہ وکوفتہ، اسی دشوار گزار رستے پر پڑ لیے۔ نہ یہ خبر ہے کہاں جاتے ہیں، نہ یہ معلوم ہے کہ کیوں جاتے ہیں۔ نہ طلب صادق ہے، نہ قدم راسخ ہے، نہ عزم ہے، نہ استقلال ہے، نہ صدق ہے، نہ اخلاص ہے۔ مگر ایک زبردست ہاتھ ہے کہ کھینچے لیے جاتا ہے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

زمانے کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی۔ نہ یاروں کے اُبھاروں سے دل بڑھتا تھا، نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا، مگر یہ ایک ناسور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے بخارات دورنی جن کے رکنے سے دم گھٹا جاتا تھا، دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی رخنہ ڈھونڈتے تھے۔ قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے (جو اپنی قوم کے سوا تمام ملک میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور جس طرح خود اپنے پر زور ہاتھ اور قوی بازو سے بھائیوں کی خدمت کر رہا ہے، اسی طرح ہر اپاہج اور نکمے کو اسی کام میں لگانا چاہتا ہے) آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے:

رو چو انساں لب بجنباں در دہن
ور جمادی لاف انسانی مزن

قوم کی حالت تباہ ہے۔عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے ہیں۔علم کا خاتمہ ہو چکا ہے، دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے، پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امراء جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، غافل اور بے پرواہ ہیں۔علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے، زمانے کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے تو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے،قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہوگا، مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیال گزرتے رہے ہیں، ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے۔ پہلے خیال کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے:

درفیض ست منشیں از کشائش نا اُمید ایں جا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید ایں جا

(وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ۔)

''اور وہ ایسا خدا ہے کہ جب لوگ نا اُمید ہو جاتے ہیں تو مینہ برساتا ہے اور

اپنی رحمت پھیلاتا ہے۔‘‘ ہر چند اس حکم کی بجا آوری مشکل تھی اور خدمت کا بوجھ اُٹھانا دشوار تھا مگر ناصح کی جادو بھری تقریر جی میں گھر کر گئی۔ دل سے ہی نکلی تھی دل میں جا کر ٹھہری۔ برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور باسی کڑہی میں ایک اُبال آیا۔ افسردہ دل، بوسیدہ دماغ، جو امراض کے متواتر حملوں سے کسی کام کے نہ رہے تھے، اُنہی سے کام لینا شروع کیا اور ایک مسدس کی بنیاد ڈالی۔ دنیا کے مکروہات سے فرصت بہت کم ملی اور بیماریوں کے ہجوم سے اطمینان کبھی نصیب نہ ہوا مگر ہر حال میں یہ دھن لگی رہی۔ بارے الحمد للہ کہ بہت سی دقتوں کے بعد ایک ٹوٹی پھوٹی نظم اس عاجز بندے کی بساط کے موافق تیار ہوگئی اور ناصح مشفق سے شرمندہ نہ ہونا پڑا۔ صرف ایک اُمید کے سہارے پر یہ راہِ دور دراز طے ہوگئی ہے ورنہ منزل کا نشان نہ اب تک ملا ہے اور نہ آیندہ ملنے کی توقع ہے:

خبرم نیست کہ منزل گہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے مے آید

اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اوّل عرب کی اُس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا ہے۔ پھر کوکبِ اسلام کا طلوع ہونا اور نبی اُمی ﷺ کی تعلیم سے اس ریگستان کا دفعتاً سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس ابر رحمت کا اُمت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اُن کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آ کر وہ اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔ اگرچہ اس جاں کاہ نظم میں جس کی دشواریاں لکھنے والے کا دل اور دماغ ہی خوب جانتا ہے، بیان کا حق نہ مجھ سے ادا ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے مگر شکر

ہے کہ جس قدر ہو گیا اتنی بھی اُمید نہ تھی۔ ہمارے ملک کے اہل مذاق ظاہراً اس روکھی پھیکی سیدھی سادی نظم کو پسند نہ کریں گے، کیوں کہ اس میں تاریخی واقعات ہیں یا چند آیتوں اور حدیثوں کا ترجمہ ہے یا جو آج کل قوم کی حالت ہے اُس کا صحیح صحیح نقشہ کھینچا گیا ہے۔ نہ کہیں نازک خیالی ہے، نہ رنگیں بیانی۔ نہ مبالغے کی چاٹ ہے، نہ تکلف کی چاشنی ہے۔ غرض کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے اہل وطن کے کان مانوس اور مذاق آشنا ہوں اور کوئی کرشمہ ایسا نہیں ہے کہ ''لاعین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر'' (نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی بشر کے دل میں گزرا) گویا اہل دہلی ولکھنؤ کی دعوت میں ایک ایسا دستر خوان چنا گیا ہے جس میں ابالی کھچڑی اور بے مرچ سالن کے سوا کچھ نہیں۔ مگر اس نظم کی ترتیب مزے لینے اور واہ واہ سننے کے لیے نہیں کی گئی بلکہ عزیزوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لیے کی گئی ہے۔ اگر دیکھیں اور پڑھیں اور سمجھیں تو اُن کا احسان ہے ورنہ کچھ شکایت نہیں۔

حافظ وظیفہ تو دعا گفتن است و بس
در بند آں مباش کہ نشنید یا شنید

مولانا الطاف حسین حالؔی

1296ھ مطابق 1879ء

دیباچہ

متعلق بہ ضمیمہ مسدس مدو جزر اسلام

حدیث درد دلاویز داستانے ہست
کہ ذوق بیش دہد چوں دراز تر گردد

''مسدس مدو جزر اسلام'' اول ہی اول 1296ھ میں چھپ کر شائع ہوا تھا۔ اگرچہ اس نظم کی اشاعت سے شاید کوئی معتد بہ فائدہ سوسائٹی کو نہیں پہنچا مگر چھ برس میں جس قدر قبولیت و شہرت اس نظم کو اطراف ہندوستان میں ہوئی وہ فی الواقعہ تعجب انگیز ہے۔نظم بالکل غیر مانوس تھی اور مضمون اکثر طعن و ملامت پر مشتمل تھے۔قوم کی برائیاں چن چن کر ظاہر کی گئی تھیں اور زبان سے تیغ و سنان کا کام لیا گیا تھا۔ ناظم کی نسبت قوم کے اکثر ابرار واخیار مذہبی سوئے ظن رکھتے تھے۔تعصب عموماً کلمہ حق سننے سے مانع تھا، بایں ہمہ اس تھوڑی سی مدت میں یہ نظم ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ ہندوستان کے مختلف اضلاع میں اس کے سات آٹھ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔بعض قومی مدرسوں میں اس کا انتخاب بچوں کو پڑھایا جاتا ہے۔مولود شریف کی مجلسوں میں جا بجا اس کے بند پڑھے جاتے ہیں۔ اکثر لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے اور آنسو بہاتے ہیں۔اس کے بہت سے بند ہمارے واعظوں کی زبان پر جاری

ہیں۔ کہیں کہیں قومی ناٹک میں اس کے مضامین ایکٹ کیے جاتے ہیں۔ بہت سے مسدس اسی کی روش پر اسی بحر میں ترتیب دیے گئے ہیں۔ اکثر اخباروں میں موافق و مخالف ریویو اس پر لکھے گئے ہیں۔ شمال مغربی اضلاع کے سرکاری مدارس میں عام قبولیت کی وجہ سے اس کو تعلیم میں داخل کر دیا گیا ہے۔ یہ اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم نے اس کی طرف کافی توجہ کی ہے، مگر اس پر مصنف کو کچھ فخر کرنے کا محل نہیں ہے۔ اگر قوم کے دل میں متاثر ہونے کا مادہ نہ ہوتا تو یہ اور ایسی ایسی ہزار نظمیں بے کار تھیں۔ پس مصنف کو اگر فخر ہے تو صرف اس بات پر ہے کہ اس نے زمین شور میں تخم ریزی نہیں کی اور پتھر میں جونک لگانی نہیں چاہی۔ اس نے ایک ایسی جماعت کو مخاطب گردانا ہے جو بے راہ ہے پر گم راہ نہیں ہے۔ وہ رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں مگر رستے کی تلاش میں چپ و راست نگراں ہیں۔ ان کے ہنر مفقود ہو گئے ہیں مگر قابلیت موجود ہے۔ ان کی صورت بدل گئی ہے مگر ہیولیٰ باقی ہے۔ ان کے قویٰ مضمحل ہو گئے مگر زائل نہیں ہوئے۔ ان کے جوہر مٹ گئے ہیں مگر جلا سے پھر نمودار ہو سکتے ہیں۔ ان کے عیبوں میں خوبیاں بھی ہیں مگر چھپی ہوئی۔ ان کے خاکستر میں چنگاریاں بھی ہیں مگر دبی ہوئی۔

یہ نظم جس میں قوم کی گزشتہ اور موجودہ حالت کا صحیح صحیح نقشہ کھینچنا مدنظر تھا، اگرچہ مشرق کی عام نظموں کی بہ نسبت مبالغے سے خالی تھی لیکن فروگذاشت سے خالی نہ تھی۔ دوست کی نگاہ نکتہ چینی اور خوردہ گیری میں وہی کام کرتی ہے جو دشمن کی نگاہ کرتی ہے۔ دونوں یکساں عیبوں پر خوردہ گیری اور چشم پوشی کرتے ہیں مگر دشمن اس غرض سے کہ عیب ظاہر ہوں اور خوبیاں مخفی رہیں اور دوست اس خوف سے کہ مبادا خوبیوں کا غرور عیبوں کی اصلاح سے باز رکھے۔ مصنف بھی جو کہ دوستی کا دم بھرتا ہے، شاید محبت اور دل سوزی ہی سے قوم کی عیب جوئی پر مجبور ہوا اور ہنر گستری سے معذور رہا۔ مگر یہ

اسلوب جس قدر غیرت دلانے والا تھا اسی قدر مایوس کرنے والا بھی تھا۔ مصنف کے دل کی آگ بھڑک بھڑک کر بجھ گئی تھی اور اس کی افسردگی الفاظ میں سرایت کر گئی تھی۔ نظم کا خاتمہ ایسے دل شکن اشعار پر ہوا جن سے تمام امیدیں منقطع ہو گئیں اور تمام کوششیں رائگاں نظر آنے لگیں۔ شاید اس خرابی کا تدارک کچھ نہ ہوسکتا اگر قوم کی توجہ مصنف کے دل میں ایک نئی تحریک پیدا نہ کرتی اور قوم کو ایک نئے خطاب کا مستحق نہ ٹھہراتی۔ گو قوم نہیں بدلی مگر اس کے تیور بدلتے جاتے ہیں۔ پس اگر تحسین کا وقت نہیں آیا تو نفرین ضرور کم ہونی چاہیے۔ بعض احباب کی تحریک نے ان خیالات کی تائید کی اور ایک ضمیمہ مقتضائے حال کے موافق اصل مسدس کے آخر میں لاحق کیا گیا۔ ضمیمے کو طول دینا مصنف کا مقصود نہ تھا لیکن اس مضمون کو چھیڑ کر طول سے بچنا ایسا ہی مشکل تھا جیسے سمندر میں کود کر ہاتھ پاؤں نہ مارنا۔

قدیم مسدس میں جستہ جستہ تصرف کیا گیا ہے۔ شاید بعض تصرفات کو ناظرین اس وجہ سے کہ قدیم اسلوب مانوس ہو گیا تھا، پسند نہ کریں۔ مگر مصنف کا فرض تھا کہ دوستوں کی ضیافت میں کوئی ایسی چیز پیش نہ کرے جو خود اس کے مذاق میں ناگوار معلوم ہو۔ نظم نہ پہلے پسند کے قابل تھی اور نہ اب ہے۔ مگر الحمد للہ کہ درد اور سچ پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔ امید ہے کہ درد پھیلے گا اور سچ چمکے گا۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم!!

مولانا الطاف حسین حالیؔ

1303ھ مطابق 1886ء

دیباچہ مجموعہ نظم حالؔی

(مولانا حالؔی)

1874ء میں جبکہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا، مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہالرائیڈ، ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے میں ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔ اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ دروبست عشق اور مبالغے کی جاگیر ہوگئی ہے، اس کو جہاں تک ممکن ہو، وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے۔ یہ تحریک اگر پندرہ برس پہلے کی جاتی تو شاید اس پر کوئی ثمرہ مترتب نہ ہوتا، کیونکہ جو لوگ ہندوستان میں اردو نظم پر تھوڑی یا بہت قدرت رکھتے تھے وہ عشقیہ مضامین کی ممارست سے شاعری کو عاشقی کا مرادف جانتے تھے اور مبالغے کو شعر کے ذاتیات میں داخل سمجھتے تھے۔ وہ واقعہ نگاری اور تصویر حقائق کو منصب شاعری کے خلاف تصور کرتے تھے۔ انہوں نے مغربی انشا پردازی کا کوئی نمونہ بھی اپنی زبان میں نہیں دیکھا تھا جس پر وہ اپنی شاعری کی بنیاد رکھنے کے قابل ہوتے۔ لیکن یہ تحریک خوش قسمتی سے ایسے وقت ہوئی جبکہ اردو زبان میں مغربی خیالات کی روح پھونکی جا رہی تھی۔ لٹریچر میں بہت سی کتابیں اور مضامین انگریزی سے اردو

میں ترجمہ ہو گئے تھے اور ہوتے جاتے تھے۔ دیسی اخباروں میں بھی جن میں سے سینٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کا اخبار خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل ہے؛ میں انگریزی آرٹکلوں کے ترجمے ہونے لگے تھے۔ ان اسباب سے مغربی طرز تحریر اور مغربی طرز بیان آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ 1872ء میں سرسید احمد خاں نے پرچہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا جس کے سبب سے اُن مسلمانوں کے خیالات میں جو لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے تھے، بہت جلد ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ اُردو فارسی انشا پردازی کا قدیم طریقہ اُن کی نظر میں نہایت سخیف اور سبک معلوم ہونے لگا اور اپنی شاعری کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ اگرچہ مغربی شاعری کا کوئی عمدہ نمونہ اس وقت اُردو زبان میں موجود نہ تھا اور نہ اب تک موجود ہے۔ لیکن وہ جو مشہور ہے کہ ''دیوانہ را ہوئے بس است'' جدت پسند طبیعتوں پر جس قدر مغربی انشا پردازی کی لے اب تک کھلی تھی، وہی اُن کو لے اڑی۔ بہت سے موزوں طبع اور بعضے کہن مشق بھی جن پر قدیم شاعری کا رنگ چڑھ چکا تھا، اس مشاعرے میں شریک ہونے لگے۔ اگرچہ یہ صحبت مدت تک جمی رہی لیکن راقم صرف چار جلسوں میں شریک ہونے پایا تھا کہ بہ سبب ناموافقت آب و ہوا کے لاہور سے تبدیل ہو کر دہلی چلا آیا۔ مجھ کو مغربی شاعری کے اصول سے نہ اُس وقت کچھ آگاہی تھی اور نہ اب ہے۔ نیز میرے نزدیک مغربی شاعری کا پورا پورا تتبع ایک ایسی نامکمل زبان میں جیسی کہ اردو ہے، ہو بھی نہیں سکتا۔ البتہ کچھ تو میری طبیعت مبالغے سے اور اغراق سے بالطبع نفور تھی اور کچھ اس نئے چرچے نے اس نفرت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔ اس بات کے سوا میرے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے انگریزی شاعری کے تتبع کا دعویٰ کیا جا سکے یا اپنے قدیم طریقے کے ترک کرنے کا الزام عاید ہو۔

چار مثنویاں جو اس مجموعے میں سب سے اوّل درج کی گئی ہیں یعنی برکھا رت،

نشاط اُمید، حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف، اسی مشاعرے کی نظمیں ہیں جو مشاعروں کی ترتیب کے موافق اس کتاب میں داخل کی گئی ہیں۔ان کے بعد جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو مشاعرہ مذکور سے کچھ تعلق نہیں ہے۔محض یہ تقاضائے وقت و مقتضائے طبیعت یا بہ تحریک بعض اکابر قوم وقتاً بعد وقتٍ وحیناً بعد حین ترتیب پا کر ان میں سے چند عام طور پر شائع ہو گئی ہیں، اور چند بالکل شائع نہیں ہوئیں اور کچھ اخباروں وغیرہ کے ذریعے سے بعض احباب پبلک کی نذر کی ہیں۔

میرے اکثر دوست مدت سے متقاضی تھے کہ تمام ہفوات ایک جگہ جمع کر کے نکتہ نواز دوستوں سے داد اور نکتہ گیر یاروں سے اپنے کلام کی اصلاح میں امداد لوں۔لیکن جو نظمیں عام طور پر شائع ہو رہی ہیں جیسے مدو جزر اسلام، مناجات بیوہ، حقوق اولاد، شکوۂ ہند وغیرہ کو اس مجموعے میں داخل کرنے کی کچھ ضرورت نہ تھی اور دیوان غزلیات و قطعات و رباعیات وغیرہ میں ابھی کچھ اور بڑھانا باقی ہے، اس لیے ان کو چھوڑ کر باقی اکثر نظمیں جو 1874ء سے اب تک لکھی گئی ہیں، سب ہدیہ ناظرین کی جاتی ہیں۔

میں اپنے قدیم مذاق کے دوستوں اور ہم وطنوں سے جو کسی قسم کی جدت کو پسند نہیں کرتے، معافی چاہتا ہوں کہ اس مجموعے میں ان کی ضیافت طبع کا کوئی سامان مجھ سے مہیا نہیں وہ سکا اور اُن صاحبوں کے سامنے جو مغربی شاعری کی ماہیت سے واقف ہیں، اعتراف کرتا ہوں کہ طرز جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔البتہ میں نے اُردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائدار بنیاد ڈالی ہے۔اس پر عمارت چننی اور اس کو ایک قصر رفیع الشان بنانا ہماری آیندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے، جن سے اُمید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے۔

پارۂ در خاک معنی تخم سعی افشاندہ ام
بو کہ بعد از ماشود ایں تخم نخل بار دار

حالؔی کی حیات اور شخصیت

نام:

خواجہ الطاف حسین

تخلص:

حالؔی۔ (بعض افراد نے لکھا کہ آغاز شاعری میں حالؔی خستہ تخلص کرتے تھے جو صحیح نہیں)

تاریخ ولادت:

بقول حالؔی ''میری ولادت تقریباً 1253ھ مطابق 1837ء میں ہوئی۔'' (1253ہجری سال اپریل 1837ء سے شروع ہوتا ہے۔ چناں چہ حالؔی اپریل اور دسمبر 1837ء کے درمیان پیدا ہوئے)۔

نوٹ:...... تذکرۂ حالی میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالؔی کی تاریخ ولادت 1253ھ مطابق 1836ءلکھی ہے جو صحیح نہیں۔

مقام ولادت:

پانی پت ضلع کرنال

والد:

خواجہ ایزد بخش متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ انگریز سرکار کے پرمٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ چالیس سال کی عمر میں انتقال کر گئے اس وقت حالؔی صرف نو سال کے تھے۔

والدہ:

حالؔی بچپن ہی سے والدہ کی توجہ تربیت اور محبت سے محروم رہے حالؔی کی ولادت کے فوری بعد ان کی والدہ کا دماغی توازن بگڑ چکا تھا چناں چہ ان کی تربیت اور پرورش ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے کی۔

دادا:

خواجہ بوعلی بخش

پردادا:

خواجہ محمد بخش

جد:

خواجہ ملک علی جو ہرات کے بادشاہ میرک علی کے بیٹے تھے اور غیاث الدین

بلبن کے دورحکومت میں ہندوستان آئے۔بلبن نے ان کےعلم وفضل وکمال سے متاثر ہوکر کرنال کے قصبہ پانی پت میں جا گیرعطا کی اور یہ خاندان 1276 ہجری سے پانی پت میں مقیم ہو گیا۔

خاندان:

حالؔی کا شجرہ دادھیال سے بیالیسویں پشت میں حضرت ابوایوب انصاری سے ملتا ہےاور نانھیال سے چھتیسویں پشت میں حضور اکرمa سے جا ملتا ہے اِسی بنا پر صالحہ عابد حسین نے لکھا کہ حالی کی ماں سیدانی تھی۔ حالؔی لکھتے ہیں میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی جو یہاں سادات شہدا پور کے نام سے مشہور ہیں؛ بیٹی تھیں۔

بھائی بہن:

حالؔی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین اور دو بڑی بہنیں امتہ الحسین اور وجہہ النساء تھیں۔ چونکہ حالی سب سے چھوٹے تھے اور ان کی ماں ذہنی توازن کھو چکی تھیں اس لیے بڑے بھائی اور دونوں بڑی بہنوں نے حالی کی تربیت اور دیکھ بھال اپنے ذمہ لے لی۔ بقول حالؔی: ’’میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا۔ میرے والد نے انتقال کیا جب کہ میں نو برس کا تھا۔‘‘

تعلیم:

(ا) بقول حالؔی: ’’میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کونہیں پایا۔انہوں نے مجھ کوقرآن حفظ کرایا۔‘‘

صالحہ عابد حسین ’’یادگار حالی‘‘ میں لکھتی ہیں۔ ’’پرانے زمانے کے دستور کے

موافق ساڑھے چار سال کی عمر میں الطاف حسین کی بسم اللہ ہوئی۔ الطاف حسین کو پانی پت کے ایک جید قاری حافظ ممتاز حسین کے پاس قرآن شریف کی تعلیم کے لیے بٹھایا گیا۔ اُن کو پڑھنے کا بچپن سے بے حد شوق تھا اور حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا چناں چہ انہوں نے جلد ہی قرآن شریف حفظ کر لیا۔ وہ بچپن سے قرآن شریف اس قدر خوش الحانی اور صحت کے ساتھ پڑھتے کہ بڑے بڑے قاری اور عالم تعریف کرتے تھے۔

(ب) سید جعفر علی سے جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے حالؔی نے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے دلچسپی ہو گئی۔ یہ انہی کی صحبت کا اثر تھا کہ حالؔی کے مزاج میں جو فطری شاعری کی اپج تھی اُسے ابھرنے کا موقع بھی ملا۔

(ج) حاجی ابراہیم حسین انصاری سے عربی صرف ونحو پڑھی جو لکھنو سے تحصیل علم کے بعد پانی پت میں مقیم تھے۔

(د) دلی پہنچ کر جامع مسجد کے قریب حسین بخش کے مدرسہ میں داخلہ لیا اور مولوی نوازش علی سے کچھ کتابیں صرف ونحو اور منطق کی پڑھیں۔
دلی ہی میں شرح مسلم، ملاحسن اور میبذی پڑھنا شروع کیا۔

(ھ) دلی میں ڈیڑھ سال رہ کر پانی پت واپس ہوئے اور مولوی عبدالرحمان، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی سے بغیر کسی خاص ترتیب اور نظام کے منطق، فلسفہ کبھی حدیث اور تفسیر پڑھتے رہے۔ حالی لکھتے ہیں: ’’بھائی بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر (17) برس کی تھی۔ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں

نوکری تلاش کروں۔مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہوکر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس وہاں رہ کر عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ دلی سے آکر برس ڈیڑھ تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ 1856ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔لیکن 1858ء میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا تو میں پانی پت واپس چلا آیا اور قریب چار برس کے بے کاری کی حالت میں گزرے۔ یہاں علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔

دلی کالج سے بےزاری:

جس وقت حالی دلّی گئے اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا لیکن اس ڈیڑھ سال کی مدت میں حالؔی نے کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ کالج کے طلبا سے ملاقات کی جن میں محمد حسین آزاد، ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال ڈپٹی نظیر احمد اور ذکاء اللہ وغیرہ جیسے طالب علم موجود تھے جس کی وجہ سے حالؔی کا پانی پت کا ماحول اور ان کی محدود سوسائٹی تھی جہاں تعلیم کو صرف عربی اور فارسی زبان پر ہی منحصر سمجھا جاتا تھا۔

انگریزی تعلیم کو صرف سرکاری نوکری کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا اسی لیے یہ افراد انگریزی مدرسوں کو جاہلوں کے مدرسے یا مجہلے کہتے تھے۔

تلاش علم:

صالحہ عابد حسین کہتی ہیں:

''حالؔی کی شادی تو ہو گئی مگر علم کی پیاس کم نہیں ہوئی۔ بیوی خوش حال گھرانے کی تھیں۔ الطاف حسین نے اُس کو غنیمت جانا کہ ابھی بیوی کا بار ان کے اوپر نہیں۔ اس فرصت سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ دلّی جا کر جو اس اجڑی حالت میں علوم و فنون کا مرکز تھی؛ تحصیل علم کریں۔ دلّی اگرچہ پانی پت سے صرف پچپن میل ہی ہے۔ ریل اس وقت تک جاری نہیں ہوئی تھی۔ اونٹ گاڑی یا بیل گاڑی پر یا پیدل سفر کرنا ہوتا تھا۔ الطاف حسین جانتے تھے انہیں دلّی جانے کی اجازت نہ ملے گی۔ ایک دن جب ان کی بیوی میکے گئی ہوئی تھیں وہ بغیر کسی سے کچھ کہے سنے اور بغیر کسی سامان کے پا پیادہ دلّی کی طرف روانہ ہو گئے۔ شاید راستے میں اونٹ گاڑی اور بیل گاڑی میں کچھ مسافت طے کی ہو۔ علم کا یہ سچا شیدائی جب دلی پہنچا تو بالکل خالی ہاتھ تھا خدا ہی جانے یہ کٹھن زمانہ کس طرح کاٹا۔ کیسے گزر بسر کے قابل پیسہ کمایا۔ اُس زمانے کا مفصل حال کہیں دستیاب نہیں ہوتا۔''

راقم کی نظر میں سچ بات یہ بھی ہے کہ ہم صرف سکّے کے ایک رخ یعنی علم کی طلب اور اس کے حاصل کرنے کی قربانیوں کو دیکھ رہے ہیں لیکن سکّے کے دوسرے رخ پر ایک تازہ شادی شدہ دلہن کے احساسات جذبات اور دنیا بھر کے تشویش ناک خیالات کا ذمہ دار کس کو ٹھہرایا جائے؟ اس بات کا امکان ہوسکتا ہے کہ حالؔی اپنے اس

عمل سے شرمندہ تھے جس کا نتیجہ ان کی تخلیقات میں آگے چل کر عورتوں کی کسمپرسی اور حقوق پر بیوہ کی مناجات اور چپ کی داد جیسی نظمیں اور ساری عمر اپنی بیوی کی تعریف اور توقیر رہی ہو۔

شریکِ حیات:

بقول حالیؔ:

''بھائی بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہُّل پر مجبور کیا اس وقت میری عمر سترہ (17) برس کی تھی۔''

خواجہ امداد حسین نے ماموں کی بیٹی اسلام النساء سے شادی کر دی۔ صالحہ عابد حسین نے جو خود حالیؔ کے خاندان کی فرد ہیں خاندان کے بزرگوں کے بیانات اور خواجہ غلام السبطین مرحوم کی غیر مطبوعہ ڈائری کے حوالے سے حالی اور ان کی بیوی کے حالات یادگار حالی میں جمع کیے ہیں۔ ہم کچھ مستند واقعات کا ذکر اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے میاں بیوی کے تعلقات کے علاوہ دونوں کے حسن اخلاق پر روشنی پڑتی ہے اور انہی واقعات سے حالیؔ کے معاملات کی صفائی بھی ہو جاتی ہے کیوں کہ حالی حقوق نسواں کے حامی تھے اور یہ حمایت گھر سے شروع ہوتی ہے۔

بی اسلام النساء بڑی با سلیقہ، منظم، ہمدرد، فیاض اور خدمت گزار خاتون تھیں۔ تقریباً نصف صدی کی مشترک زندگی میں حالیؔ کی اور اُن کی کبھی اَن بن نہیں ہوئی۔ انہوں نے کبھی اپنے شوہر کی علمی اور قومی زندگی کی مصروفیتوں میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کی۔ البتہ وہ بڑے تیز مزاج کی تھیں اور جب غصہ آتا تھا تو آپے سے باہر ہو جاتی تھیں لیکن پھر بڑی جلدی پشیمان بھی ہو جاتی تھیں۔ برخلاف اس کے حالی کا مزاج اتنا ہی نرم واقع ہوا تھا۔ اِس لیے کبھی لڑائی جھگڑے کی نوبت نہیں آتی تھی۔

واقعہ:

خواجہ غلام السبطین مرحوم نے اپنی (غیر مطبوعہ) ڈائری میں اسی قسم کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے۔ ایک مرتبہ محرم کی نو تاریخ کو حالؔی اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور اپنے سالے میر فیاض حسین کے ساتھ کہیں تانگے میں بیٹھ کر گئے۔ بیوی کو حالؔی کی یہ بات سخت ناگوار گزری (واضح رہے کہ حالؔی سنی تھے اور بیوی شیعہ اور اس خاندان میں انتہائی روا داری تھی اور اس قسم کی شادیاں بلا تامل ہوتی تھیں) اتفاق سے تانگا الٹ گیا۔ جب یہ لوگ واپس آئے تو سیدانی کا جلال انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ انہوں نے میاں، بیٹے اور بھائی کو دل کھول کر بُرا بھلا کہا کہ نبیa کے نواسے پر تو قیامت کا وقت پڑ رہا ہے، اُن کے بچے بھوک پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور تم سواریوں میں بیٹھے سیر کر رہے ہو۔ اچھا ہوا تانگا الٹ گیا وغیرہ وغیرہ۔ میر فیاض حسین اور خواجہ سجاد حسین کو یہ بات ناگوار گزری کہ مولانا کو ایسی سخت باتیں کہی جائیں لیکن فرشتہ منش حالؔی نے صرف اتنا کہا: ''سیدانی غصے میں ہے اور حق پر۔ غلطی ہماری ہی تھی کہ آج کے دن سواری پر بیٹھے، وہ جو کہتی ہیں بجا ہے۔''

خواجہ سجاد حسین کی بیوی، اُن کے ماموں کی بیٹی تھیں اور وہ بھی اپنی پھوپی اور باپ کی طرح تیز مزاج تھیں اور ساس بہو میں اکثر نوک جھونک ہوتی رہتی تھی۔ حالؔی اوپر کے کمرے میں بیٹھے لکھتے ہوتے اور یہ ساری باتیں سنتے مگر ایک لفظ نہ بولتے۔ بیوی کا بہت خیال کرتے تھے اور بہو کو بھی بہت چاہتے تھے، اکثر ان ہی جھگڑوں میں شام ہو جاتی تو وہ اپنا کام ختم کر کے اٹھتے اور کمرے کی کھڑکی کھول کر مسکراتے ہوئے شیریں لہجے میں جھک کر کہتے۔ ''بس بی بس ...... اب تو شام بھی ہو گئی۔ اب تو لڑائی تغاری (مٹی کا کونڈا جسے پانی پت میں تغاری کہتے تھے) کے نیچے دبا دو۔ اس وقت تو

بھٹیاریاں بھی نہیں لڑتیں۔''

کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی ازدواجی زندگی کامیاب تھی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے اور اپنے اپنے فرائض پوری ذمے داری سے ادا کرتے تھے۔ دونوں کی زندگی کے دھارے الگ الگ تھے لیکن کہیں نہ کہیں آ کر مل بھی جاتے تھے۔

بی اسلام النساء کبھی اپنے شوہر کے کسی کام میں رکاوٹ نہیں ڈالتی تھیں۔ وہ جہاں چاہیں رہیں جو چاہیں کریں وہ دخل نہ دیتی تھیں اور گھر کی ساری فکریں اور پریشانیاں، ساری ذمہ داریاں بھی، جس حد تک پرانے زمانے کی کوئی عورت اٹھا سکتی تھی، نہایت خوش اسلوبی سے اٹھاتی تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے حقوق سے جَو بھر دستبردار نہ ہوتی تھیں اور اگر شوہر کی کوئی بات ناگوار ہوتی تو اس کے اظہار میں ذرا سا تامل نہ کرتیں۔

شادی بیاہ، نسبت ناتے اور ہر قسم کے اہم کام جو اولاد اور اولاد کی اولاد سے متعلق ہوتے، اُن میں حالؔی کی رائے سے زیادہ ان کی بیوی کی رائے کو اہمیت حاصل تھی۔ حالؔی کو جو وظیفہ ملتا تھا وہ سارے کا سارا بیوی کے ہاتھ میں رکھ دیتے اور پھر اس کے بارے میں الٹ کر نہیں پوچھتے تھے۔ ان کے ذاتی خرچ کے لیے زیادہ تر خواجہ سجاد حسین اُن کو کچھ روپے بھیج دیتے تھے۔

حالؔی نجی خطوں میں اکثر اپنی بیوی کا ذکر کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں ان کا کس قدر پاس تھا بیٹوں، بھتیجوں، پوتیوں وغیرہ کو ان کی طرف سے خاص طور پر سلام و پیام، دعا پیار اور اُن کی صحت کا حال لکھتے اور اُن کو باقاعدہ خط لکھتے رہنے کی تاکید کرتے۔ ہر خط میں کسی نہ کسی طرح اُن کا ذکر ضرور آتا ہے۔ اُن کا ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کے بدلے میں حالؔی اور خواجہ سجاد حسین ایک دکان لینا چاہتے تھے۔ مگر یہ

تجویز مولانا کی بیوی کو پسند نہ تھی۔ اس بارے میں انہوں نے کئی خطوں میں بیٹے کو لکھا کہ بغیر ان کی مرضی کے دکان نہیں لینی چاہیے۔ ''اگرچہ مناسب تو یہی تھا مگر مستورات کی بغیر مرضی کے تبادلہ نہیں ہوسکتا، خصوصاً تمہاری والدہ اس کے بہت خلاف ہیں۔''

ایک اور خط میں لکھتے ہیں: ''تمہاری والدہ اب اچھی ہیں اور کمزوری کے باوجود گھر کا سارا کام کاج کیے جاتی ہیں۔''

تمہاری والدہ نے باوجود کمزوری کے سب روزے رکھے اور باوجود اس کے سارا کام اگلے اور پچھلے کو خود کرتی رہیں۔ 1900ء میں بی اسلام النساء کا ہیضے سے انتقال ہوگیا۔ اُن کے انتقال پر مولانا حالی نے خواجہ سجاد حسین کو جو اطلاعی اور تعزیتی خط لکھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں اپنی بیوی کی کتنی قدر تھی۔

''پرسوں تمہاری والدہ کو دس بجے رات کے اس کا (ہیضے کا) اثر ہوا اور کل نو بجے رات انتقال ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔ اگرچہ اس حادثہ ناگہانی سے جو صدمہ سب عزیزوں اور متعلقوں اور ہمسایوں اور راہ چلتوں کو ہوا ہے، اُس کا بیان کرنا مشکل ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کی اولاد کو سب سے زیادہ صدمہ ہوا ہے اور ہوگا۔ مگر میری جان! والدین کا اولاد کے سامنے گزر جانا والدین کی خوش نصیبی اور اولاد کا قدیم ورثہ ہے۔ تمہاری والدہ کی جیسی عمدہ زندگی اور عمدہ موت ہوئی ہے اُس کی ہر شخص کو تمنا ہونی چاہیے۔ خدا کا شکر ہے کہ انہوں نے سعادت مند اولاد چھوڑی ہے اور ان کو بفضلہٖ تعالیٰ اچھی حالت میں چھوڑا ہے۔ ایک زمانے کو اپنا مداح اور ثنا خوان اور شکر گزار چھوڑا ہے۔ وہ اپنی حقیقی اور اصلی نیکیوں کی تمام عشیرہ میں ایک عمدہ مثال تھیں۔ انہوں نے ہر ادنیٰ اور اعلیٰ کی خدمت گزاری سے مخدومیت کا درجہ حاصل کیا تھا۔ آخر وقت میں جب تک اُن کو ہوش رہا برابر خدا کی یاد اُن کے وِردِ زبان رہی۔ جس شخص کی ایسی عمدہ زندگی اور ایسی عمدہ موت ہو اُس سے زیادہ کون خوش نصیب ہوسکتا ہے۔''

حالیؔ کا ضبط دیکھیے کہ ذکر محض مرحومہ کی خوبیوں کا ہے۔ اپنے رنج و غم کے بارے میں ایک حرف نہیں۔ پھر بھی اُس کے ایک ایک لفظ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ حالیؔ کی بی بی کیسی اعلیٰ سیرت کی مالک تھیں اور حالیؔ کے دل میں اُن کی کتنی قدر و منزلت تھی۔ حالیؔ کو بیٹوں کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں سخت رنجیدہ ہیں تو کس طرح صبر کی تلقین کرتے ہیں۔ ''تم کو چاہیے کہ اپنی والدہ کی محبت اور خوبیوں کو بہت مت یاد کیا کرو اور اس دعا کا ورد رکھو۔ ''الٰہی مجھے اپنی محبت اپنی جان سے اور اپنے کنبے سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ دے۔'' خدا ہم سب کو اپنی محبت عنایت کرے کہ یہی ہر ایک رنج و غم کا بہترین علاج ہے۔''

اولادیں:

حالیؔ کے یہاں چھے بچے پیدا ہوئے۔ تین بچے جن میں اعتقاد حسین اور رقیہ بیگم شامل تھیں بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی زندہ رہے۔

(ا) خواجہ اخلاق حسین، پیدائش قبل از: 1857ء۔ وفات: 2/فروری 1924ء

(ب) عنایت فاطمہ، پیدائش: 1859ء۔ وفات: 1915ء

(ج) خواجہ سجاد حسین، پیدائش: 1861ء۔ وفات: جولائی 1946ء

خواجہ اخلاق حسین کو حالیؔ کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے گود لے لیا تھا اسی لیے حالیؔ ان کو برادر زادہ کہتے تھے۔ خواجہ اخلاق حسین کی چار اولادیں تھیں۔ بڑی بیٹی مشتاق فاطمہ تھیں جن کی شادی خواجہ غلام الثقلین سے ہوئی۔ اُردو ادب کے مایہ ناز ادیب خواجہ غلام السیدین اور معروف ادیبہ صالحہ عابد حسین ان ہی کی اولاد تھے۔ دو بیٹے خواجہ احقاق حسین، خواجہ اکرام حسین اور چھوٹی بیٹی صدیقہ النساء اخلاق حسین کی آخری اولاد تھی۔

خواجہ اخلاق حسین کی اولاد نے اُردو شعر و ادب کی شمع جلائی رکھی ہے اور اس کی روشنی آج بھی ہمیں نظر آتی ہے۔ محترمہ سیدہ سیدین اور پروفیسر صغریٰ مہدی کا تعلق اسی خاندان سے ہے حالؔی کی بیٹی عنایت فاطمہ کی شادی خواجہ عبدالعلی سے ہوئی۔ ان کے دو بیٹے خواجہ فرزند علی اور خواجہ عبدالولی اور ایک بیٹی سعیدہ بیگم تھیں۔

حالؔی کے خطوط کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالؔی اپنی گھریلو زندگی سے پریشان رہتے تھے جس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو ان کے داماد خواجہ عبدالعلی کچھ محنتی آدمی نہ تھے وہ ہمیشہ مختلف شہروں میں معمولی جگہ پر ملازم تھے اور اپنی بیوی بچوں سے لا پروا اور بیگانہ تھے اور ان کے خاندان کا سارا بوجھ حالؔی پر تھا۔ دوسری اہم وجہ حالؔی کے نواسے عبدالولی کو مرگی کی بیماری تھی جس نے حالؔی کا سکون چھین لیا تھا۔ حالؔی کی حالت ان کے ایک خط سے ظاہر ہے جو انہوں نے اپنے شاگرد عبدالرحیم خاں بیدل کو لکھا تھا۔ ''عبدالولی جس کے علاج کو دہلی گیا تھا اس کے صرع کے دورے تو رک گئے مگر جنون بڑھتا جاتا ہے میرا ناک میں دم ہے۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ زندگی وبال ہوگئی ہے۔ یہ یقین ہو گیا ہے کہ زیست کے برس دو برس جو باقی ہیں بہت بری طرح سے گزریں گے۔''

حالؔی ذہنی اور مالی طور پر بہت پریشان تھے اور آخری عمر میں کسی سکون کے مقام کی تلاش میں تھے تاکہ اپنی نظم اور نثر کی تحریروں کو ترتیب دے سکیں لیکن انہیں اس کی فرصت نہ تھی۔ حالؔی نے اپنے نواسے کی بیماری پر ہزاروں روپیہ صرف کیا لیکن افاقہ نہ ہوا نواسے کا مزاج جنون کی کیفیت اختیار کرتا گیا اور بعض اوقات وہ آپے سے باہر ہو جاتا۔ چناں چہ ایک مرتبہ خواجہ عبدالولی نے مولانا سے گستاخی کی اور انہیں شدید دھکا دیا جس سے مولانا گر پڑے۔ خواجہ سجاد حسین اُس وقت موجود تھے اُن کا مزاج بڑا حلیم تھا لیکن وہ کسی کی بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے بھانجے کو ڈانٹا

اور ایک طمانچا بھی مارا۔ حالؔی کو یہ بات بہت ناگوار گزری اور جب تک خواجہ سجاد حسین نے بھانجے کو منا نہیں لیا حالؔی نے اپنے لائق بیٹے سے بات چیت نہیں کی۔ وہ اس بیماری کے مارے غم زدہ نوجوان کی ذراسی دل آزاری کبھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

حالؔی کے دوسرے نواسے خواجہ فرزند علی نے حالؔی کی تصانیف کی اشاعت کا بندوبست کیا۔ چناں چہ حالؔی کی تصنیف مولود شریف کی پشت پر خواجہ فرزند علی کی حسب ذیل تحریر ہے: ''ایک عرصے سے پانی پت میں ایک مطبع جاری کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مولانا حالؔی کی زندگی میں ان کے دوست جناب مولانا وحید الدین صاحب سلیم نے ایک مطبع اس نام کا جاری کیا تھا جو چند سال نہایت مفید کام کرنے کے بعد بند ہو گیا۔ اب میں نے اپنے نانا صاحب (مولانا خواجہ الطاف حسین صاحب حالی) مرحوم و مغفور کی یادگار میں ایک نیا مطبع بنام حالی پریس جاری کیا ہے اس کا مقدم مقصد یہ ہے کہ مولانا حالؔی مرحوم کی تمام تصانیف ایک سلسلے کی صورت میں اور ایک تقطیع پر چھپوائی جائیں اور ان کی تصحیح کا پورا اہتمام کیا جائے۔''

حالؔی کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کا شمار اینگلو اورینٹل کالج کے پہلے تعلیم یافتوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ اسکولوں کے انسپکٹر جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ خواجہ سجاد حسین کی کاوشوں سے بہت سے اہم مسودے حالی کی تصانیف کے محفوظ ہو گئے اور شائع ہو کر عوام کی دسترس میں آئے۔

حالؔی اور فیملی:

حالؔی صحیح معنی میں کنبہ پرور تھے۔ وہ صرف اپنے بیمار نواسے کی بیماری سے متفکر نہ تھے بلکہ اپنے دوسرے نواسوں، نواسیوں، پوتوں اور پوتیوں سے بھی پوری طرح پیار و محبت کرتے تھے اور انہیں تمام لڑکوں اور لڑکیوں کی صحت، تعلیم اور جذبات کا

خیال رہتا ذیل کے چند واقعات ہماری بات کے ثبوت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

☆ حالؔی ہمیشہ لڑکوں اور بچوں کے خط کا جواب اُسی پابندی سے دیتے جیسے بڑے آدمیوں کے خطوں کا۔ اُن کا طرزِ تحریر یوں بھی سادہ، شستہ اور آسان ہے لیکن عورتوں اور بچوں کو جب خط لکھتے تو خاص طور پر وہ لہجہ اور زبان استعمال کرتے تھے جس کو وہ اچھی طرح سمجھ سکیں اور ساتھ ہی اس کی کوشش بھی کرتے تھے کہ بہت خوش خط اور صاف صاف لکھیں تاکہ انہیں پڑھنے میں آسانی ہو۔

خواجہ فرزند علی کو لکھتے ہیں: ''میری جان اب کے لکھنے پڑھنے میں ایسی کوشش کرو کہ امتحان کے موقع پر پورا پورا اطمینان رہے۔''

☆ خواجہ فرزند علی مولانا کے بڑے نواسے کھیل کود کے بڑے شوقین تھے۔ اسکول کی بندشوں سے گھبراتے اور کتابی تعلیم سے بھاگتے تھے۔ مولانا کو اُن کی تعلیم کی بڑی فکر رہتی تھی اور وہ ہر طرح اس کی کوشش کرتے تھے کہ اُن کا دل لکھنے پڑھنے میں لگے۔ خواجہ سجاد حسین اور خواجہ تصدق حسین کے نام سینکڑوں خطوں میں ان کا ذکر ہے۔ مولانا حالؔی نے ہر ممکن کوشش کی کہ وہ اعلیٰ تعلیم پائیں آخر اس کی طرف اُن کی توجہ نہ دیکھ کر انہیں ایف۔ اے کے بعد انجینئرنگ میں بھیج دیا تھا جہاں انہوں نے کامیابی حاصل کی۔ خواجہ فرزند علی مرحوم بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ: ''دیکھو مولانا حالؔی کو مجھ سے کتنی محبت اور میرا کتنا خیال تھا کہ تقریباً ہر خط میں میرا ذکر موجود ہے۔''

☆ مولانا حالؔی کے بڑے بیٹے خواجہ اخلاق حسین ایک صوفی منش بزرگ تھے اور وہ بھی خاندانی معاملات اور بچوں کی تعلیم وغیرہ کی کچھ زیادہ فکر نہ کرتے تھے۔ اس لیے اُن کے دونوں بیٹوں خواجہ احقاق حسین اور خواجہ اکرم حسین

کی تعلیم و تربیت کی ساری ذمہ داری بھی مولانا حالؔی ہی پر تھی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''حقن (احقاق حسین) انگریزی میں تو چل نکلا ہے۔ مگر حساب میں ابھی تک صفر ہے۔ ابھی دھیان اور توجہ لکھنے پڑھنے میں پیدا نہیں ہوئی۔ لیکن خصلتیں عمدہ معلوم ہوتی ہیں۔ اطاعت اور حکم برداری مزاج میں بہت ہے، کاہل نہیں ہے اور روز بروز قریب ہوتا جاتا ہے، گھر جانے کا کبھی نام نہیں لیتا۔ جس بات کو منع کرو پھر نہیں کرتا...... اگر اس کے دل میں کچھ شوق اور توجہ پیدا ہو جائے تو اسے علی گڑھ ظہور حسین وارڈ میں داخل کر دیا جائے۔''

☆ رشتے کے ایک پوتے کے فیل ہونے کی خبر سنی تو بہت افسوس ہوا۔ اُن کے والد کو خط لکھا جس میں اظہار افسوس کے ساتھ ہی کس دل سوزی سے لکھتے ہیں: ''طالب علم کتنا ہی بدشوق ہو مگر فیل ہونے کا رنج وملال سب کو یکساں ہوتا ہے۔ جہاں تک ہو سکے اس کی دلجوئی کرنا چاہیے اور ملامت ونفرین سے احتراز کرنا چاہیے...... کہہ دینا رنج کی کوئی بات نہیں ہے۔ نہایت استقلال سے پھر کوشش کرو۔ ان شاء اللہ ضرور کامیاب ہو گے۔''

☆ خواجہ غلام السیدین اُن کی پوتی کے بڑے بیٹے ہیں۔ اس لیے خاندان بھر کے لاڈلے تھے۔ جب ماں اپنے دادا کے ہاں جاتیں تو نیچے کے مکان میں دادی کے پاس ٹھہرا کرتی تھیں۔ اوپر دیوان خانے میں مولانا حالؔی رہتے تھے۔ سیدین مولانا سے بہت مانوس تھے۔ جب وہ نیچے سے اوپر چلے جاتے تو یہ نیچے سے پکارتے ''بابا'' اور مولانا آواز سن کر نیچے اترتے، بچے کو پیار کرتے اور پھر اوپر چلے جاتے۔ سیدین پھر پکارتے ''بابا'' اور وہ پھر اسی طرح نیچے آتے پیار کرتے اور چلے جاتے۔ بچوں کو تو کسی بات کی تکرار میں

مزہ آتا ہے۔ والدہ مرحومہ سنایا کرتی تھیں کہ سیدین جتنی مرتبہ انہیں ''بابا'' کہہ کر بلاتا وہ اس ضعیفی کے عالم میں ہر مرتبہ نیچے اُتر کر آتے اور اُسے پیار کرتے تھے۔

☆ سیدین صاحب کی چھوٹی بہن سیدہ خاتون (مرحومہ) بڑی پیاری، بھولی اور ذہین بچی تھی اور مولانا حالیؔ اس بچی کو بے حد چاہتے تھے۔ انہوں نے سیدہ خاتون پر ایک چالیس بیت کی نظم بھی لکھی ہے۔ جو علاوہ ذاتی لحاظ سے دلچسپ ہونے کے اُن کے مشاہدے کی باریکی پر بھی روشنی ڈالتی ہے:

سیدہ کیسی پیاری بچی ہے صورت اچھی ، سمجھ بھی اچھی ہے
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان پر ہے اچھے بُرے کی سب پہچان

اس نظم کو پڑھ کر جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچی سے مولانا کو کس قدر لگاؤ تھا۔ وہاں یہ اندازہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ بچوں کی طبیعت اور نفسیات کو بھی خوب سمجھتے تھے:

جھوٹ موٹ اُس کو گر ڈراتے ہیں بات ڈر کی کوئی سناتے ہیں
پکے پن سے یقین نہیں کرتی دیر تک ہے نہیں نہیں کرتی

اور

اوپری شکل سے ہے گھبراتی ہے مگر جلد سب سے ہل جاتی

اوپر تلے کے بھائی بہن میں جو مزیدار لاگ ہوتی ہے۔ اُس کا ذکر دیکھیے:

پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اُس کو کیوں کہ اُوپر تلے کے ہیں دونوں
پس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا اور وہیں اس نے ہاتھ پھیلایا
جا لپٹی ہے دوڑ کر ماں سے بھائی سے کہتی ہے ہٹو یاں سے

اور کس پیار بھرے انداز میں بچی کی توتلی زبان کی تعریف کرتے ہیں:

یوں تو تھی جب ہی پیاری اس کی زبان جب کہ کرنے لگی تھی وہ غوغاں

پھر تو آتا ہے اس پہ اور بھی پیار ہوتی جاتی ہے جس قدر ہشیار
نہیں منہ سے نکلتے پورے بول بولتی ہے سدا ادھورے بول
لوٹ جاتے ہیں ہنستے ہنستے سب زرگری اپنی بولتی ہے جب

اس پوری نظم کو پڑھیے ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی بچوں کی سیدھی سادی پیاری زبان میں اُن سے باتیں کر رہا ہے۔

☆ حالؔی بچوں سے بہت محبت کرتے تھے اگر چہ وہ خاندانی رشتہ دار ہو یا ہمسایہ یا بیگانہ یہ فرشتہ صفت انسان کے درجنوں واقعات آج ایک صدی سے زیادہ وقت گزرنے پر بھی دل کو تڑپا دیتے ہیں اور ان کے اخلاق کا کلمہ پڑھوا دیتے ہیں۔

پانی پت میں ایک مرتبہ حالؔی کسی جگہ سے تانگے میں بیٹھے گزر رہے تھے کہ دیکھا ایک بھنگی کا چھوٹا سا لڑکا نالی میں گرا پڑا ہے اور کیچڑ اور گندگی میں لت پت پڑا چلاّ رہا ہے۔ آس پاس بہت سے آدمی جمع کھڑے دیکھ رہے تھے اور رام رام کر رہے تھے مگر کوئی اُسے اٹھاتا نہیں۔ مولانا نے فوراً اپنا تانگا ٹھہرایا۔ پاس گئے بڑی آہستگی سے اُسے نالی میں سے نکالا۔ اپنے ہاتھ سے اُس کے کپڑے اتارے اور اس کے ماں باپ کا پتا پوچھ کر خود وہاں چھوڑ کر آئے۔ چلتے ہوئے لوگوں سے کہا: ’’جس رام کا نام آپ جپ رہے ہیں اگر چاہتے تو اُسی رام کا جلوہ اس ننھے بچے میں آپ کو نظر آ سکتا تھا۔‘‘ یہ ایک جملہ ایک کتاب پر بھاری ہے۔

اخلاق و کردار:

یہ سچ ہے کہ حالؔی کے اخلاق اور کردار کا کلمہ دوست دشمن سب نے پڑھا ہے۔ حالؔی ایک بلند مرتبہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی تھے۔ وہ عملاً میر

انیسؔ کے شعر کے مصداق تھے۔

کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی
چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

حالیؔ معمولی سے معمولی شخص کی عزت اور شخصیت کا خیال رکھتے تھے۔ کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا دشنام دینا، کوسنا، غصہ کرنا، دھتکارنا وغیرہ تو ایک طرف کبھی کسی سے آواز بلند گفت گو نہ کی۔ حالیؔ بچوں میں بچے، بیماریوں میں مسیحا، دردمندوں کے ہمدرد، غریبوں کے مددگار اور حاجت مندوں کے سہارا تھے۔ اگرچہ ان کی آمدنی قلیل تھی لیکن ان کا دل کشادہ تھا کیوں کہ ان کی فطرت میں قناعت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ کہتے ہیں:

خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے

انگریزی محاورہ ہے، "It is Difficult to be humble when you are great" مگر حالی نے اپنے کردار اور عجز و انکسار سے یہ ثابت کر دیا کہ عظیم شخص وہی ہے جس کے اخلاق اور کردار بلند ہوں۔ چونکہ اُردو ادب میں یہ گوہر نایاب خاص طور پر شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں میں خال خال ہے اِس لیے ہم چند معتبر اور مستند واقعات جو حالیؔ کی فرشتہ صفت شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں یہاں پیش کرتے ہیں۔

شاعروں کی چشمک اور معرکہ آرائیوں سے اُردو کے قارئین بے خبر نہیں ہیں۔ تعلّی شاعر کا پیدائشی حق تو ہے لیکن مشاعروں کی سیاسی تجلی اور بازی گری نے ادبی اور شعری آموزش گاہ کو شعرا کا دنگل بنا دیا ہے اس ماحول میں حالی کی سیرت کو دیکھیے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کہتے ہیں: خواجہ اکرام اللہ مرحوم نے دہلی کے ایک مشاعرے کا حال مجھے سنایا تھا، جس میں خواجہ حالیؔ مرحوم اور داغؔ مرحوم دونوں شریک

ہوئے تھے۔ طرح تھی۔ ''خبر کہاں''، ''نظر کہاں''، داغ مرحوم کی غزل مشہور ہے:

اس مبتدا کی دیکھیے نکلی خبر کہاں

مشاعرے میں سب غزلیں پڑھ چکے تھے۔ خواجہ صاحب اور داغؔ مرحوم باقی رہ گئے تھے۔ پہلے شمع خواجہ صاحب کے سامنے آئی اور اُنھوں نے اپنی غزل سنائی:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں

حالیؔ نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اَب آئے ہو وقتِ صبح ، رہے رات بھر کہاں؟

اکرام اللہ خاں مرحوم کہتے تھے، غزل تمام مشاعرے پر چھا گئی اور مدح و تحسین کا ایسا ہنگامہ گرم ہوا کہ لوگوں نے خیال کیا، اب داغ مرحوم کے لیے کچھ نہیں رہا۔ خود داغؔ نے کہا۔ ''اس غزل کے سننے کے بعد میری غزل خود میری نگاہ سے گر گئی، جی چاہتا ہے، پرچہ چاک کر دوں۔''

ایک عرصے کے بعد خواجہ صاحب مرحوم سے نیاز حاصل ہوا تو میں نے غدر کے بعد کے مشاعروں کا تذکرہ چھیڑ دیا اور خصوصیت کے ساتھ اس مشاعرے کا حال دریافت کیا۔ خواجہ صاحب حالات بیان کرنے لگے اور تفصیلات کی رو میں دور تک نکل گئے۔ لیکن پھر اچانک انہیں احساس ہوا کہ اب مجھے غزل کی مدح و تحسین کے واقعات بیان کرنے پڑیں گے، اس لیے کہتے کہتے یک قلم رک گئے۔ اَب میں ہر چند اصرار کر کے پوچھتا ہوں، فرمایئے، اس کے بعد کیا ہوا؟ لیکن وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ ''جی ہاں! بس غزل پڑھی گئی اور مشاعرہ ختم ہو گیا۔'' میں نے بار بار پوچھا: آپ کی غزل پر داغؔ مرحوم نے کیا خیال ظاہر کیا تھا؟ لیکن ''جی ہاں، کیا کہا جائے۔'' کے سوا اور کوئی جواب نہیں ملا ''جی ہاں'' کی ''ہاں'' کو وہ جس طرح تمدید کے ساتھ ادا کرتے تھے، اُسے قید کتابت میں لانے کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں پاتا کہ ''جی ہاں'' کی ''ہاں'' پر

ایک لمبی مد کھینچ دوں۔

حالیؔ کے پڑپوتے خواجہ غلام الحسنین اپنے مضمون ''حالیؔ'' میں لکھتے ہیں:

''خوش قسمتی سے مجھے تینتیس سال تک دہلی اور پانی پت میں مولانا کی خدمت سے فیض یاب ہونے کی عزت حاصل رہی۔ اگرچہ مجھے اس مدت میں بوجہ ملازمت سررشتہ، تعلیم ساڑھے چار سال تک پانی پت سے باہر رہنے کا اتفاق ہوا۔ تاہم تعطیلات میں اور رخصت لے کر بھی اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور چونکہ مجھ کو مولانا سے قرابت قریبہ حاصل تھی اس لیے کسی وقت بھی ان کی خدمت میں کوئی رکاوٹ میرے لیے نہیں تھی، خواہ مولانا اندر تشریف رکھتے ہوں، یا باہر مردانہ مکان میں۔ اور بعض اوقات گھنٹوں ان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ ان وجوہ سے مولانا کی نشست و برخاست، اخلاق و آداب، عادات و خصائل، المختصر ان کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی کے متعلق اصلی حالات معلوم کرنے کے بے شمار مواقع جو مجھے حاصل ہوئے کسی کو حاصل نہ ہوئے۔ اس کے علاوہ میں نے مولانا کے کلام کا مطالعہ بھی بہت کچھ کیا ہے اور جو کچھ ان کے کلام میں پایا ہے، وہی ان کی عملی زندگی میں دیکھا۔ لہٰذا میرے بیان کا دارومدار سنی سنائی پر نہیں، بلکہ ذاتی مشاہدات اور ان واقعات پر ہے جن کی تصدیق خود مولانا کے قلم یا زبان سے ہو چکی ہے۔

مولوی عبدالحق صاحب اپنے ایک مضمون میں مولانا حالیؔ کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک بڑے شخص کا قول ہے کہ ادیب کا کلام اس کے دماغ کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر اس معیار پر مولانا حالیؔ کے کلام کو جانچا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی سیرت اور ان کی حیات سرتاپا ان کے کلام میں موجود ہے۔ وہ مجسم ہمدردی اور مجسم درد تھے اور یہی ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ان کا ہر ایک مصرع درد بھرا تڑپتا ہوا جگر

> پارہ ہے۔ ہماری زبان میں اور بھی ایسے شاعر ہوئے ہیں جن کے کلام میں عجیب اثر اور درد ہے۔ لیکن ان کا درد ذاتی اور محدود ہے۔ حالؔی کا درد ساری قوم کا درد ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کے پُر درد نغموں نے قوم کے دلوں کو ہلا دیا۔ سوتوں کو جگا دیا اور کاہلوں کو ہوشیار کر دیا۔''

میرے بھائی آنریبل خواجہ غلام الثقلین مرحوم جو ہر بات کو نہایت گہری نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے مولانا کی وفات پر جو 31/دسمبر 1914ء کو واقع ہوئی، اپنے اخبار ''عصر جدید'' میں ان کی سیرت کے متعلق نہایت جچی تلی رائے لکھی تھی جس پر میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں:

> ''مولانا یونانی خیالات کی رُو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان اور صوفیہ خیالات کی رُو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔ کبھی کسی کی برائی ان کی زبان سے نہیں سنی گئی۔ ہر شخص کے عیب کی نرم تاویل کرنا پسند فرماتے تھے۔ عزیزوں سے محبت رکھتے تھے۔ غریبوں کی امداد کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ کسی مذہب کے قائل سے سچ اور عمدہ بات سنتے تھے تو اس کی قدر کرتے اور تعریف کرتے تھے۔ مذہباً نہایت بے تعصب تھے۔ آپ بلند خیال، بے نفس، محب اہل بیت اور صوفی منش سنی تھے۔ مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کو نہایت مکروہ سمجھتے تھے اور طریقِ نماز کے علاوہ اور کسی طرح اختلاف کے اظہار کو پسند نہ کرتے تھے۔ ان کی اولاد اور خاندان میں دونوں طریقہ کے لوگ موجود ہیں اور وہ کسی کو یہ نہ کہتے تھے کہ وہ کیا طریقہ اختیار کرے۔ ان کے پاس

بیٹھنے اور باتیں سننے سے نہایت بد باطن شخص بھی روحانی فیض پاتے تھے۔ عدل اور میانہ روی مولانا کی خاص صفت تھی۔ اس کے ساتھ رحم ومروّت۔ پانی پت بلکہ اس تمام علاقے کو فخر ہوسکتا ہے کہ ایسا انسانِ کامل اس میں پیدا ہوا جس نے خود کو کبھی غیر معمولی آدمی بھی نہ سمجھا۔ اخلاق میں، عادات میں، برتاؤ میں، مروّت میں، فیاضی میں اعلیٰ درجہ کا اعتدال تھا۔ عزیزوں اور اولاد کی محبت، تعلیم کا خیال، عالم کی خیر خواہی، نیک آدمیوں کی قدر دانی میں ان کی مثال ضرور ملے گی مگر کم۔ آخر زمانے میں جبکہ دماغ بیکار ہو گیا تھا اور لوگ اپنی عادت کے موافق مختلف خیالات سے جنگ کی خبروں کا ذکر کرتے تھے تو مولانا مرحوم جب بہت سے آدمیوں کے مقتول ہونے کا ذکر سنتے تھے تو اس قدر تاسف سے آہ کرتے تھے گویا خود اپنے کسی عزیز کے مرنے کی خبر سنی ہو۔ خدمت گار اُن کو الگ روتے ہیں کہ ایسا آقا دیکھا نہ تھا۔ یہی حالت رشتہ داروں اور اہل شہر کی ہے۔ قوم میں بھی کچھ کم افسوس نہ ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔''

بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے حالی کی سیرت میں دو خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ ایک سادگی دوسرے درد دل یہ دونوں خصوصیتیں ان کے کلام میں بھی ہیں، سیرت میں ہیں۔ دراصل ان کا کلام اور ان کی سیرت ایک دوسرے کا عکس ہیں۔

نواب عماد الملک کہتے تھے سرسید کی جماعت میں بحیثیت انسان کے حالی کا مرتبہ بہت بلند تھا اس بات میں سرسید بھی نہیں پہنچتے تھے۔

حالی ہر چھوٹے اور بڑے سے خلوص اور محبت سے ملتے تھے وہ بڑوں اور

چھوٹوں کا ادب کرتے تھے علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں جب عبدالحق اور حمید الدین حالی سے ملنے گئےتو وہ تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔حمید الدین نے کہا کہ آپ تعظیم کر کے ہمیں شرمندہ کرتے ہیں تو کہنے لگے: ''آپ لوگوں کی تعظیم نہ کروں تو کس کی تعظیم کروں۔آیندہ آپ ہی تو قوم کے ناخدا ہونے والے ہیں۔''

اپنی کتابوں پر جو اصلی معنوں میں تصنیف ہوتی تھیں ہمیشہ ''مرتبہ'' لکھا مولفہ یا مصنفہ کا لفظ نہ لکھا۔رفتار و گفتار، رہن سہن ملنے ملانے میں اتنی سادگی اور خاکساری تھی کہ ملنے والے کو مشکل سے یقین ہوتا کہ یہ اُردو کا عظیم شاعر و ادیب حالؔی ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حالؔی نے اپنے ہم عصروں کی کتابوں پر عمدہ ریویو کیے انہیں سراہا لیکن اُنہی ہم عصروں نے سوائے سرسید کے حالی کی تصانیف پر خاموشی اختیار کی جس کا حالی نے کبھی نوٹس نہیں لیا بلکہ ان کی حمایت میں کہتے اور لکھتے رہے۔

مولوی ظفر علی خان نے ''دکن ریویو' میں شبلی کی کتاب پر بے جا شوخی سے کام لیا تو حالؔی نے محبت بھرے جملوں سے نصیحت کرنی شروع کر دی۔ میں تنقید سے منع نہیں کرتا تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گےتو ہماری اصلاح کیوں کر ہو گی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔

1903ء میں جب مولوی فضل الحسن حسرت موہانی نے علی گڑھ سے ''اُردوئے معلیٰ'' جاری کیا تو جدید شاعری کے اِس مجدد اعظم پر بھی اعتراضات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔مولانا کے پاس اگرچہ 'اردوئے معلیٰ'' باقاعدہ پہنچتا تھا مگر نہ آپ نے کبھی اعتراضات کا جواب دیا اور نہ مخالفت پر ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔نواب محسن الملک مرحوم کے اصرار پر مولانا حالؔی بھی اس میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے اور حسب معمول سید

زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرتؔ موہانی دو دوستوں کو ساتھ لیے ہوئے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں، اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے سے حسرتؔ کو دیکھا۔ اِن مرحوم میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانہ میں گئے اور ''اردوئے معلیٰ'' کے دوتین پرچے اُٹھالائے۔ حسرتؔ اور اُن کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں اور اُٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے۔ مگر زین العابدین کب جانے دیتے۔ خود پاس بیٹھ گئے، ایک پرچے کے ورق اُلٹنا شروع کیے اور مولانا حالیؔ کو مخاطب کر کے حسرتؔ اور اُردوئے معلیٰ کی تعریفوں کے پل باندھ دیے۔ کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور ''واہ! خوب لکھا'' کہہ کر داد دیتے تھے حالیؔ بھی ''ہوں ہاں'' سے تائید کرتے جاتے تھے۔ مگر حسرتؔ کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے، ارے مولانا یہ دیکھیے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے اور کچھ اِس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کیے ''سچ تو یہ ہے کہ حالیؔ سے بڑھ کر مخرب زبان کوئی ہو نہیں سکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے کو اردو کی خدمت سے روکیں اتنا ہی اچھا ہے۔''

فرشتہ منش حالیؔ ذرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ ''نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا ایک بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔''

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرتؔ سے پوچھا کہ حالیؔ کے خلاف اب بھی کچھ لکھو گے؟ جواب دیا کہ جو کچھ لکھ چکا ہوں اسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔

حالیؔ کے اخلاق اور کردار کے جو دوست اور دشمن مداح تھے وہ ان کی انسانیت تھی۔ افسوس کے ساتھ اس تلخ حقیقت کو دہرانا پڑتا ہے کہ بڑے بڑے لوگوں میں انسانیت کے جوہر کی کمی دیکھی گئی ہے۔ حیدرآباد دکن کی علمی اور ثقافتی تہذیب کے

نمایاں شخص عماد الملک سید حسین بلگرامی جو سرسید کے قریبی دوست بھی تھے کہتے تھے، سرسید احمد خان کی جماعت میں کوئی شخص انسانیت کے اعتبار سے حالی کے پایہ کا نہ تھا اور اس خاص بات میں خود سرسید احمد خاں بھی انہیں نہیں پہنچتے تھے۔

حالیؔ نے خود انسانیت کی تعریف سرسید احمد خان کے فارسی مرثیے میں کی ہے جو سچ کہیں تو حالیؔ ہی پر صادق آتی ہے:

چیست انسانی! تپیدن از تپ ھمسایگان
از سموم نجد در باغِ عدن پژماں شدن

(انسانیت کیا ہے! ہمسایوں کے رنج اور زحمت سے رنجیدہ رہنا۔ جنت میں بھی نجد کی گرم و زہریلی ہوا کے احساس سے افسردہ اور مرجھائے ہوئے رہنا)

خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس
درشبستاں تنگ دل از محنت زنداں شدن

(اپنے کو تمام کم ترینوں سے کم تر سمجھنا اور قفس کی تکلیف دہ زندگی کے احساس سے محل میں بھی بے چین رہنا)

آتش قحطی کہ در کنعان بسوزد باغ و کشت
برفراز تخت مصر از تاب آں بریاں شدن

(وہ قحط کی آگ جس سے مصر کے باغ اور کھیت جل چکے اس کی گرمی اور جلن سے تخت شاہی مصر پر بھی بھن جانا)

بی مڑیا کی نگہداشت:

حالیؔ ایک فرشتہ صفت انسان تھے۔ غدر میں دلی اجڑی اور کئی شریف خاندانوں کی عورتیں پانی پت کے گردونواح میں عزت و جان بچانے کے لیے زندگی بسر

کرنے لگیں۔ ان ستم زدہ بدبخت افراد میں بی مڑیا بھی شامل تھی جنھوں نے حالؔی کے گھر میں پناہ لی اور ساری عمر حالؔی کے کنبے کے ساتھ گزار دی۔ صالحہ عابد حسین یادگار حالی میں لکھتی ہیں کہ ایک اسّی (80) سالہ بوڑھی بی مڑیا کو خود انہوں نے دیکھا تھا جو غدر میں دس سال کی تھیں، عقد ہو چکا تھا رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ شوہر، ماں باپ عزیز و اقارب سب مارے گئے اور اس اکیلی کم سن لڑکی نے حالؔی کے گھر میں پناہ لی اور ساری عمر چھوٹے موٹے کام جیسے سلائی، کشیدے کاری وغیرہ کر کے اپنا خرچ چلاتی رہیں اور عزت وخودداری سے زندگی گزار دی۔ حالؔی کے انتقال کے بعد ان کی پوتی مشتاق فاطمہ نے بی مڑیا کی اس طرح خدمت کی جیسے ایک بیٹی اپنی ماں کی خدمت کرتی ہے۔ ان واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالؔی صرف جذباتی شاعری ہی نہیں کرتے تھے بلکہ عملی طور پر جس قدر بھی ہو سکے عورتوں کے مسائل کو حل کرنے میں پیش پیش رہتے۔

نوکروں سے برتاؤ:

حالؔی کے دو خاص ملازم تھے۔ نانوں خان اور عطاء اللہ۔

حالؔی ان دونوں ملازموں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ کبھی کبھار نانوں خان جب سجاد حسین کے ساتھ دوسرے شہر جاتا تو اس کی نگہداری کی تاکید کرتے اور نانوں خان کو خط لکھنے کی تاکید بھی کرتے۔ ایک مرتبہ نانوں خاں غلطی سے کروسین تیل گھی سمجھ کر پی گیا۔ حالؔی نے فوراً ڈاکٹر کو بلوایا اور نواب لوہارو کے ہاں کی دعوت کو جانا ملتوی کر دیا۔ عطاء اللہ مزاج کا سخت اور بہت اونچا سنتا تھا لیکن وہ بھی حالؔی کا چہیتا تھا جس کو حالی اپنی جاکٹ رضائی اور کھانے پینے کی اشیا دیتے رہتے تھے۔ حالؔی کے انتقال کے بعد یہ دونوں ملازمین دن رات ان کے گن گاتے رہتے تھے۔

مولانا روم نے بہت صحیح انہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے:

دل بدست آرد کہ حج اکبر است
از ھزاراں کعبہ یک دل بہتر است

مذہب:

حالؔی کی پڑپوتی صالحہ عابد حسین یادگارحالی میں لکھتی ہیں۔ حالؔی عقیدتاً حنفی سنی مسلمان تھے اور حالؔی کی بیوی شیعہ تھی۔ وہ حنفی المذہب سنی تھے لیکن اہل بیت اطہار سے اور جناب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے انہیں بڑے بڑے شیعوں سے زیادہ عقیدت تھی۔ ان کا یہ شعراس احترام اورعقیدت کا پورا ثبوت دیتا ہے

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے وہ تیری محبت تری عترت کی وِلا ہے

پانی پت میں صرف اُن کے خاندان کے شیعہ حضرات ہی نہیں بلکہ شہر بھر کے شیعہ اُن کے مذہبی عقیدے کی بھی اُسی طرح عزت کرتے تھے جس طرح ان کی ذات کی۔ جب حالؔی کی وفات ہوئی تو شاید پہلی مرتبہ پانی پت میں شیعوں اور سنیوں دونوں نے ایک ہی شخص کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے بعد یہی واقعہ مولانا حالؔی کی پوتی کی وفات پر ہوا جو اپنے دادا ہی کی طرح بے تعصبی اور عالی ظرفی میں ضرب المثل تھیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حالؔی کو وہ گہری عقیدت اور والہانہ عشق تھا جس کا ثبوت ہر اُس شعر سے مل سکتا ہے جو انہوں نے ہادی برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں کہا ہے۔ انہوں نے جہاں کہیں اس موضوع پر لکھا ہے قلم توڑ دیا ہے۔ ''مسدس حالؔی'' کے چند نعتیہ بند اردو شاعری کے سارے نعتیہ کلام پر بھاری کہے جا سکتے ہیں

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بَر لانے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

غریبوں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

قناعت:

قناعت ایک خداداد انسانی قدر ہے جسے انسان اپنے نفس کی پاکیزگی سے نمو دیتا ہے میر انیسؔ نے کہا تھا

کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے
فقیر ہوں پہ نہیں حاجتِ سوال مجھے
کسی کے سامنے کیوں ہاتھ جا کے پھیلاؤں
مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

انسان کو جینے کے لیے معاش اور روزگار کی ضرورت ہے۔ زندگی کی گاڑی کا ایندھن یہی روپیہ اور مال ہے جس سے پیٹ کی آگ بجھائی اور بدن کی ضروریات کو پورا کیا جاتا ہے۔ حالیؔ کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اوائل زندگی سے آخری عمر تک کبھی حریص وطمع نہیں کیا بلکہ قانع رہے جو کچھ بھی انہیں روزگار نے فراہم کیا۔ انیسؔ کا شعر حالیؔ کی وضع داری اور قناعت پر صادق ہوتا ہے:

کیا قبول قناعت سے بحرِ عالم میں
صدف کی طرح میسر جو آب و دانہ ہوا

واقعہ:

جب حیدر آباد کے نواب سر آسمان جاہ نے حالیؔ کی شعری اور ادبی کاوشوں سے متاثر ہوکر انہیں ماہانہ وظیفہ دینے کا فیصلہ کیا تو سرسید نے پوچھا آپ کو گذر بسر کرنے

کے لیے کتنا وظیفہ چاہیے۔ حالؔی نے جواب دیا۔ مجھے اینگلو عربک اسکول سے جو ساٹھ روپے ماہوار ملتے ہیں تو حیدر آباد کے سکہ رائج الوقت کے پچھتر روپے ہوتے ہیں یہی میری زندگی بسر کرنے کے لیے کافی ہے۔

☆ لاہور کے قیام کے دوران ڈاکٹر لٹز کی ارضیات پر کتاب کا عربی سے اُردو میں ترجمہ کیا جو بعد میں گورنمنٹ کالج کے نصاب میں شامل رہی۔ حالؔی نے اس ترجمہ اور کتاب کو کالج کے لیے بغیر کسی معاوضہ کے انجام دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ حالی لاہور میں غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور تھوڑے سے پیسوں کی خاطر اپنے وطن اور اہل وعیال سے دور تھے اور خاندان کی ساری ذمہ داریاں حالؔی پر تھیں۔

☆ حالؔی نے اپنی تصنیفات سے مالی فائدہ نہیں اٹھایا۔ سوائے ایک آدھ کتاب کی رجسٹری یا حقوق محفوظ کروائے ہوں گے ان کی تمام تر کتابیں پبلشرز جب چاہتے شائع کر کے فائدہ اٹھا لیتے۔ مسدس حالؔی کے درجنوں ایڈیشن شائع ہوئے لیکن حالی کو کوڑی بھی نہیں ملی شاید اُردو ادب میں اس قسم کے استحصال کی دوسری مثال نہ ہو۔

☆ حالؔی نے اپنی تمام تر زندگی ایک معمولی مکان میں گزار دی۔ آخری عمر میں چھوٹے بیٹے سجاد حسین جو گورنمنٹ کے بڑے عہدے پر فائز تھے ایک قطعہ زمین لے کر نسبتاً آرام دہ گھر بنایا جس کے اوپری حصے میں حالؔی رہتے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ حالؔی کے ہمدرد عالی شان بنگلوں اور کوٹھیوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وقار الامرا نے حیدر آباد میں اپنے رہنے کے لیے ایک عظیم الشان محل فلک نما بنوایا تھا جس کا ذکر حالؔی نے اپنی نظم میں بھی کیا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے حالؔی کا یہ مکان دیکھا ہے جس کے مالک اُس وقت

ایک سردار صاحب تھے۔ ہمیں پتا نہیں اس عظیم شخص نے جس گھر میں پچیس برس گزارے ہوں وہ اب کس حالت اور کس کی تحویل میں ہے۔ کیا عمدہ ہوتا اگر اس گھر کو حالی میوزیم میں تبدیل کر کے ان کے نادرات کے ساتھ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جاتا۔ پروفیسر عزیزالدین ڈایریکٹر رام پور لائبریری نے راقم کو بتایا کہ انہوں نے گورنر قدوائی کی مدد سے اس مکان کو حالی میوزیم میں محفوظ کروایا ہے۔

☆ حالؔی کی مالی حالت خستہ اور کمزور ہونے کی وجہ سے بہت سے کام وہ اپنی زندگی میں نہ کر سکے۔

(ا) حالؔی دلّی میں ایک مطبع کھولنا چاہتے تھے تاکہ فارسی عربی اور اُردو کی عمدہ نایاب اور کم یاب کتابوں کو عمدہ طریقے پر شائع کر سکیں لیکن پیسہ نہ ہونے سے یہ خواب شرمندہ تعبیر رہا۔

(ب) حالؔی ایک عمدہ میگزین نکالنا چاہتے تھے لیکن یہ کام بھی مالی مشکلات نے انجام ہونے نہ دیا۔

(ج) حالؔی اپنی تصانیف بھی اچھی طرح سے شائع نہ کر پائے۔ حالؔی کے انتقال کے بعد ان کے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور نواسے خواجہ فرزند علی نے حالی پریس قائم کر کے حالؔی کی کتابوں کو شائع کیا۔

☆ مختلف واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ حالؔی کو جو کچھ بھی ملتا تھا وہ اپنے اقربا رشتہ دار اور غریبوں میں صرف کر دیتے تھے۔ جب کبھی کسی شہر جاتے وہاں سے تحفے سوغات خصوصاً خاندان کی لڑکیوں اور عورتوں کے لیے ضرور لاتے۔ یادگار حالؔی میں کئی واقعات ملتے ہیں۔

☆ حالؔی کے ملازم عطاء اللہ کے واقعات میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے تذکرۂ

حالی میں لکھا ہے کہ حالؔی اپنے بنوائے کپڑے عطاء اللہ کو دے دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سردی کے موسم میں جب عطاء اللہ نے حالی سے کہا کہ رات کو بڑی سردی لگتی تو حالؔی نے اپنی نئی بنوائی ہوئی رضائی عطاء اللہ کو دے دی جب اُس نے کہا کہ یہ تو آپ نے کل ہی بنوائی ہے کوئی پرانی رضائی دے دیجئے تب حالؔی نے کہا یہ تم لے لو ہم اور بنوالیں گے۔

مسافرت:

حالؔی پانی پت میں پیدا ہوئے اور وہیں دفن ہوئے۔ تقریباً زندگی کا ایک چوتھائی حصہ مختلف شہروں میں گزرا۔ زندگی کا پہلا سفر پانی پت سے دلّی کا پیدل کیا جو حصول علم کا آغاز تھا اور آخری سفر فرید آباد کا تھا جو ان کی تخلیقات کی جمع آوری کا تکملہ تھا۔ حالؔی سات سال جہانگیر آباد، چار سال لاہور اور کئی سال دہلی میں اور متعدد بار مقیم رہے۔ علی گڑھ حیدر آباد کراچی الہٰ آباد بھوپال آگرہ بمبئی کے علاوہ ایک درجن سے زیادہ مقامات پر جاتے آتے رہے۔ صحت کی کمزوری، سفر کی تکالیف ان کے مقاصد میں حائل نہ ہوسکیں۔

شمس العلماء کا خطاب:

حالؔی کو جون 1904ء میں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔ حالؔی کو 1875ء میں ان کی تصنیف مجالس النساء پر چار سو روپے کا انعام دیا گیا تھا۔ ان دونوں واقعات میں تیس سال کا فرق ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ تحریر کہ شمس العلماء کا خطاب اور انعام حالؔی کو جون 1904ء میں پیش کیا گیا صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ خود ڈاکٹر خلیق انجم نے یہ بھی لکھا ہے کہ: ’’کوشش کے باوجود مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حالؔی کو شمس العلماء کا

خطاب اور چار سو روپے کا انعام دونوں ایک ساتھ ملے تھے یا الگ الگ۔“
حالیؔ اگرچہ اس خطاب کے بہت پہلے ہی سے حق دار تھے لیکن بعض مصلحتوں کی وجہ سے یہ خطاب انہیں عمر کے آخری حصے میں نصیب ہوا۔ حالیؔ کو جب یہ خطاب ملا تو وہ فکر مند اور نگران بھی رہے چناں چہ اپنے چھوٹے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو لکھتے ہیں:

”خطاب کی تحریک جہاں تک معلوم ہوئی ہے برخوردار تصدق حسین نے معرفت ڈائریکٹر صاحب کے دربار تاجپوشی سے بہت پہلے کی تھی۔ کیوں کہ انہوں نے ڈائریکٹر صاحب کو دینے کے لیے میرے پاس سے میری سب کتابیں اس زمانے میں منگوائی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر آرنلڈ نے ڈائریکٹر صاحب کو میرے حالات سے بخوبی مطلع کر دیا تھا اور اس باب میں بھی تصدق حسین برخوردار نے بہت کچھ تائید کی تھی۔ کیوں کہ خطاب کے شائع ہونے کے بعد انہوں نے مجھے لکھا تھا کہ میں نے ڈائریکٹر صاحب کو اور آرنلڈ صاحب کو اسی معاملے کے متعلق ولایت چٹھیاں بھیجی ہیں۔ ...... اس سے پہلے سائم صاحب کے زمانے میں ماسٹر پیارے لال صاحب نے میرے اور مولانا نذیر احمد صاحب کے لیے ضروری تحریک کی تھی۔ مگر اس وقت معلوم نہیں کیوں التوا ہوا۔

اگرچہ گورنمنٹ کی طرف سے یہ ایک ایسا اعزاز ہے جس کی ہمارے ہم چشم آرزو رکھتے ہیں۔ مگر مجھے تو ایک مصیبت معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں کسی حاکم یا افسر سے کبھی نہ ملتا تھا

اور ایسے مواقع سے ہمیشہ الگ تھلگ رہتا تھا۔ مگر اب جب کوئی حاکم ضلع پانی پت میں آوے گا یا جب کوئی نیا ڈپٹی کمشنر کرنال میں بدل کر آوے گا لا محالہ وہاں جانا پڑے گا۔ آج چوتھا روز ہے کہ ٹامسن صاحب ڈپٹی کمشنر کرنال کی خدمت میں حسب تحریر برخوردار تصدیق حسین کے گیا تھا وہ چوں کہ نہایت مہذب اور خلیق ہیں بہت اچھی طرح ملے اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں آج ہی پانی پت جاتا ہوں وہاں تفصیلی ملاقات ہو گی۔ چناں چہ وہ تین روز سے یہاں آئے ہوئے ہیں اور کل اُن کے ملنے کو جاؤں گا۔ انہوں نے میری کتابوں کے دیکھنے کی بھی خواہش کی ہے وہ بھی اِدھر سے اُدھر سے مانگ تانگ کر لے جاؤں گا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ درگاہ قلندر صاحب اور کابل باغ وغیرہ عمارتِ قدیمہ کے دیکھتے وقت مجھے بھی بلایا جاوے گا۔ بھلا میں کہاں اور یہ دردِ سر کہاں؟"

پوشاک:

حالؔی کے بیٹے سجاد حسین کہتے ہیں۔ حالؔی کی پسند نفیس تھی۔ کپڑا خریدتے تو بہت دیکھ بھال کر کے رنگ ڈیزائن اور قسم سب موزوں ہو۔ جوانی میں باریک اور نفیس کپڑا پہننا پسند کرتے تھے چونکہ سودیشی کے حامی تھے اس لیے اگر پانی پت کی بنی ہوئی باریک کھدر مل جاتی تو اس کے کپڑے پہن کر خوش ہوتے۔ عام طور سے کرتا پاجامہ اور اچکن پر سردیوں میں چوغہ یا روئی کا دگلہ پہن لیتے گلے میں مفلر اور سر پر گول سی ٹوپی بھی پہن لیتے۔

خوراک:

حالؔی کی خوراک کم اور سادہ تھی۔ ترکاریاں بہت پسند تھیں۔ پھلوں میں آم اور خربوزوں کے عاشق تھے۔ آم کی شناخت تھی اور اچھے آم خریدتے تھے۔ چائے اور بسکٹ ہمیشہ تیار رکھتے۔ پان تمباکو اور افیون کی گولیاں کھاتے حقے کا استعمال بھی ہر روز کرتے رہتے۔ آخری عمر میں دانتوں کی تکلیف کی وجہ سے پان کھانے میں کمی کر دی تھی۔ خوراک میں انتخاب اور اعتدال تھا جو آخری عمر تک برقرار رہا۔

آغاز شاعری:

ہمیں تحقیق اور تلاش کے باوجود یہ صحیح طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ حالؔی نے کس عمر میں شعر کہنا شروع کیا اور ان کا پہلا شعر یا پہلی غزل کون سی ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ حالؔی فطری شاعر تھے چناں چہ دہلی جانے سے پہلے ہی یہ شاعری کا پودا ان کے دل و دماغ میں نشوونما پانے لگا جس کا ایک سبب پانی پت میں موجود حالؔی کے استاد سید جعفر علی تھے جو ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد بھی تھے جن سے فارسی لٹریچر کی کتابیں پڑھی تھیں اس وقت حالی کی عمر پندرہ سولہ برس سے بھی کم تھی۔ اس کی دوسری وجوہات میں حالی کا حافظہ، گیرائی اور مشاہدے کی گہرائی کے علاوہ بچپن ہی سے رنج و مصائب سے دو چار ہونے کے سبب دل و دماغ کا سوز و گداز بھی تھا۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ حالؔی جب پہلی بار ڈیڑھ سال دلی میں رہے اس وقت ادبی اور شعری محفلوں میں شرکت کرتے تھے غالباً دوسری بار جب 1861ء میں ملازمت کی تلاش میں دلی آئے تو شعر و سخن کی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔ دہلی میں محمد اکرام خان شیدا کا دیوان خانہ ادبی مرکز بنا ہوا تھا جہاں شعر و سخن کی محفلیں ہوتی تھیں

جن میں سید انور، سید ظہیر اور مرزا سالک کے ساتھ حالؔی بھی شریک بزم رہتے۔ حالؔی اپنی کہانی میں لکھتے ہیں:

"جس زمانہ میں میرا دلی جانا ہوا تھا۔ مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انہوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔"

حالؔی کی اس تحریر سے یہ پتا چلتا ہے کہ انہوں نے تئیس (23) چوبیس (24) برس کی عمر میں شعر گوئی شروع کی۔ غالبؔ کی نصیحت نے حالؔی کو پابند مشق سخن کر دیا تھا لیکن بعد میں وہ ہمیشہ فکر شعر گوئی میں مشغول ہو گئے۔ اس زمانے میں وہ دلّی کے ماحول سے متاثر رہ کر عشقیہ شعر کہتے اور عاشقانہ اشعار پسند کرتے تھے۔

پڑھنے کا انداز:

حالؔی کے شعر پڑھنے کا انداز فطری اور پر تاثیر تھا۔ وہ تحت اللفظ پڑھتے تھے اور آواز میں دلکشی تھی۔ مولوی عبدالحق نے انہیں کئی جگہ پڑھتے سنا تھا چناں چہ اپنی

کتاب ''چند ہم عصر'' میں لکھتے ہیں: آج کل تو ہمارے اکثر شاعر لَے سے یا خاص طور پر گا کر پڑھتے ہیں اُن کا ذکر نہیں، لیکن جو تحت اللفظ پڑھتے ہیں ان میں بعض طرح طرح سے چشم و ابرو، ہاتھ، گردن اور دوسرے اعضا سے کام لیتے اور بعض اوقات ایسی صورتیں بناتے ہیں کہ بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ مولانا سیدھے سادے طور سے پڑھتے تھے البتہ موقع کے لحاظ سے اس طرح ادا کرتے ہیں کہ اس سے اثر پیدا ہوتا تھا۔ ایک بار علی گڑھ کالج میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ تھا۔ مولانا کا مزاج کچھ علیل تھا انہوں نے اپنی نظم پڑھنے کے لیے مولوی وحید الدین سلیم صاحب کو دی، جو بلند آواز مقرر اور پڑھنے میں کمال رکھتے تھے۔ سلیمؔ صاحب ایک بند ہی پڑھنے پائے تھے کہ مولانا سے نہ رہا گیا نظم ان کے ہاتھ سے لے لی، اور خود پڑھنی شروع کی، ذرا سی دیر میں ساری مجلس میں کہرام مچ گیا۔

شیفتہ کی مصاحبت:

حالیؔ کی زندگی میں نواب مصطفی خان شیفتہ کی صحبت غالبؔ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے جیسا کہ انہوں نے خود اپنے قلم سے اپنی کہانی میں لکھا ہے:

> ''غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حسن اتفاق سے نواب مصطفی خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتیؔ اور اردو میں شیفتہ تخلّص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اُردو زبان کے

شاعر تھے۔ اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انہوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا۔ مگر ان کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورہ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانہ میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر در حقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہؔ اور غالبؔ دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہؔ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کا ذکر ہو رہا تھا۔ انہوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ مصرع پڑھا۔

آج شبیر پہ کیا عالمِ تنہائی ہے

اور کہا کہ انیسؔ نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور

رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔''

حالؔی کی تحریر سے شیفتہ سے تعلقات کے علاوہ ان کی شخصیت اور ان کے فن پر بھی روشنی پڑتی ہے اسی راستے سے حالؔی کو غالبؔ کی منزل ملی اور غالب نے حالؔی کی شعری اور فکری دنیا میں وہ تبدیلیاں لائیں جو ایک خستہ شاعر کو خالی سے حالی بنا دیا۔ غالب کا مشہور قطعہ جو حالؔی کی نصیحت کے جواب میں لکھا گیا اس کا مخاطب مصطفی خان شیفتہ ہی ہے۔

تو ای شیفتہ و حسرتی لقب داری — ہمی بہ لطف تو خود را امیدوار کنم
چو حالؔی از من آشفتہ بی سبب رنجید — تو گر شفیع نگردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرض محال — براں سرم کہ دراں عمر این دو کار کنم
یکی ادای عبادت عمر پیشینہ — دگر بہ پیش گاہی حالی اعتذار کنم

یعنی تو جو شیفتہ اور حسرتی لقب رکھتا ہے میں صرف تیری محبت اور لطف پر بھروسہ رکھتا ہوں حالؔی مجھ سے خفا اور بغیر کسی وجہ کے رنجیدہ ہے اگر تو سفارش نہ کرے تو کہہ میں کیا کروں۔ اگر دوبارہ مجھے اس دنیا میں پیدا کیا جائے تو میں صرف دو کام کروں گا ایک گذشتہ عمر کی عبادت جو میں نے نہیں کی اور دوسرے حالؔی سے معذرت خواہی۔

حالؔی کی ملاقات شیفتہ سے دلّی میں ہوئی تھی اور پھر حالی جہانگیر آباد میں جو شیفتہ کی جاگیر تھی سات آٹھ سال مقیم رہے۔ صالحہ عابد حسین اور مالک رام نے لکھا ہے کہ شیفتہ نے اپنے چھوٹے بیٹے نقش بند خان کی اتالیقی کے لیے حالؔی کا استخدام کیا جس کی شدت سے تردید کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں۔ ''مالک رام صاحب نے حالؔی کے بارے میں شیفتہ کی جو رائے نقل کی ہے مجھے اس کا علم نہیں کہ اس کا ماخذ کیا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ مالک رام صاحب کے بیان کی بنیاد حالؔی سے ان کی عقیدت اور حالؔی کے خاندان کے لوگوں سے ان کے ذاتی تعلقات ہیں...... مالک رام صاحب اور صالحہ عابد حسین کو یہ محسوس ہوا کہ اگر حالؔی کو شیفتہ کا مصاحب بتایا جائے تو

اردو ادب میں حالؔی کی قدر و قیمت کم ہو جائے گی حالاں کہ حالؔی یہ نہیں سوچتے تھے۔ انہوں نے خود کہا ہے کہ وہ شیفتہ کے مصاحب تھے۔ اگر وہ شیفتہ کے چھوٹے بیٹے نقش خان یا ان کے بچوں کے اتالیق ہوتے تو اس کا ذکر ضرور کرتے۔ شیفتہ کا مصاحب ہونا حالؔی کے لیے نہیں مالک رام اور صالحہ عابد حسین کے لیے شرم کی بات تھی۔''

راقم کی نظر میں مصاحب ہونا یا اتالیق ہونا شخصیت کے علم وفضل اور عمر کی نسبت سے ہوتا ہے۔ حالؔی سات آٹھ سال جہانگیر آباد میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہ تھے۔ مصاحبت ان دنوں کچھ شام کے گھنٹوں پر مبنی تھی۔ یہ سچ ہے کہ حالؔی اپنی کہانی میں سات آٹھ جملوں میں شیفتہ کی مصاحبت کی سات آٹھ سالہ مصروفیات کو مکمل اور مستند طور پر بیان نہیں کر سکتے تھے ان دنوں کی گزارشات کو گھر کے افراد ہی بہتر بتا سکیں گے۔ صالحہ نے اپنے والدین سے جو سنا ہے ہم کو اُسے صحیح ماننا پڑے گا جب تک کہ کسی مستند حوالے سے اس کی تردید کی جا سکے۔ حالؔی بچپن سے ہی تعلیم کے شیدا تھے وہ ایک عمدہ معلم بھی تھے اور انہوں نے ساری عمر تعلیم اور علم کے فراہم کرنے میں صرف کر دی یہ تو شیفتہ کے لیے مایہ افتخار ہے کہ حالؔی جیسا عمدہ انسان ان کی صحبت میں رہا اور شیفتہ کے بچوں کے لیے باعث فخر کہ حالی ان کے اتالیق رہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شیفتہ کی صحبت نے حالؔی کی فکری اور شعری جہتوں کو مہمیز کیا۔ ان کی فکر سے مولویت کم کی اور وسعت نظری سے ہم کنار کیا۔ حالؔی مالی لحاظ سے آسودہ خیال رہے چناں چہ ان کے انتقال کے بعد پھر روزگار کی تلاش میں لاہور میں پناہ لی۔ شیفتہ ہی کے ذریعے غالب کے قریب پہنچے اور غالب کی مصاحبت اور استادی کے فیض سے مستفید ہوئے۔ غدر کے زمانے اور اس کے بعد بھی جہانگیر آباد نسبتاً ایک ایسا مقام تھا جہاں حالؔی اپنے فن اور شخصیت کو سنوار رہے تھے۔ کیا خوب ہوتا کہ حالؔی یادگارِ شیفتہ لکھ دیتے تاکہ ہمیں ان مسئلوں میں الجھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

بیماریاں:

حالؔی جوانی سے کئی امراض سے دو چار تھے اس کی وجوہات ان کی صحت کی دیکھ بھال سے غفلت، ورزش وغیرہ سے دوری اور پان تمباکو اور حقے کا استعمال تھا۔ چونکہ طبیعت میں اعتدال تھا اس لیے ان تمام مسائل کے باوجود اپنے زمانے اور مقام کے لحاظ سے اچھی عمر بسر کی۔

☆ جوانی میں اسہال نے بہت کمزور کر دیا تھا۔ اسی زمانے سے انہیں بواسیر کی بھی شکایت تھی۔

☆ نزلہ، کھانسی، دمہ اور سانس کی تنگی شاید تمباکو اور حقے کے استعمال کے باعث برونکائیٹس کے سبب ہو۔ حالؔی کے داہنے بازو میں درد و سوزش کی وجہ سے پلاسٹر وغیرہ بھی لگایا گیا تھا۔

☆ سوزش سینہ اور درد معدہ قلب کی وجہ سے ہوسکتا تھا۔

☆ دانتوں کی تکلیف، مسوڑوں میں سوجھن وغیرہ دانتوں کی حفاظت سے غفلت اور پان وغیرہ کے باعث تھی۔

☆ کم خونی بے وجہ فصد کھولنے کے باعث تھی۔

☆ سانس کی تنگی قلب کی نارسائی، کم خونی اور دمے کے باعث تھی۔

☆ نیند کا کم ہونا دماغی Stress یا کم قوتی کا سبب ہوسکتی ہے۔

☆ حالی کی بینائی میں کمی رعشہ بھی اعصاب کی کمزوری کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔ کم بینائی موتیا اترنے یا Catract کے باعث تھی۔ چناں چہ انہوں نے دو مرحلوں میں پٹیالہ اور لکھنو کے سرجنوں سے عمل جراحی کروا کر عینک کے استعمال سے کسی حد تک اپنی بینائی کو برقرار رکھا جس کے سبب وہ اپنی تصنیف

وتالیف کے علاوہ روز مرہ کے کام مکتوب نگاری وغیرہ خود انجام دیتے تھے۔

حالؔی نے اپنے خطوں میں اپنی صحت سے غفلت اور بیماریوں کا ذکر کیا ہے۔ حالؔی کی طبیعت میں جو کسی کام کرنے کی سچی لگن تھی وہ انہیں ان تمام مشکلات اور بیماریوں کے باوجود اُس کام کو بدرجہ احسن انجام دینے میں مددگار ثابت ہوئی۔

مرض الموت:

مولانا اسماعیل پانی پتی، خواجہ عبدالحمید اور صالحہ عابد حسین کی تحریروں سے حالؔی کے آخری زمانے کے حالات سے واقفیت ہوتی ہے۔ آخری وقت حالؔی اپنے اطراف اور ماحول سے واقف تھے۔ کوئی بات کرتا تو سمجھ جاتے تھے اور چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی جو بعد میں بے بسی میں تبدیل ہو جاتی کیوں کہ جواب نہیں دے سکتے تھے۔ بعض اوقات ایک دو لفظ کہہ لیتے۔ یہ تمام علامتیں شدید دماغی Deppression اور Dementia کی ہوسکتی ہیں جو روز بروز بد سے بدتر ہوتی گئیں اور آخر کار 31 دسمبر 1914ء رات کے 1 بجے حالی اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

تجہیز و تکفین:

انتقال کے بارہ گھنٹے بعد یعنی یکم جنوری 2 بجے دن حالؔی کو حضرت شاہ شرف الدین بوعلی قلندر کی درگاہ میں مدفون کر دیا گیا۔ صالحہ عابد حسین لکھتی ہیں: ''جب حالؔی کی وفات ہوئی تو شاید پہلی مرتبہ پانی پت میں شیعوں اور سنیوں دونوں نے ایک ہی شخص کی نماز جنازہ پڑھی اور اس کے بعد یہی واقعہ مولانا حالؔی کی پوتی کی وفات پر ہوا جو اپنے دادا کی طرح بے تعصبی اور عالی ظرفی میں ضرب المثل تھیں۔ حالؔی کے لوح مزار پر علامہ اقبالؔ کا فارسی شعر کندہ ہے۔

طوافِ مرقد حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بجان ہا فگند شوری کہ من دارم

یعنی حالیؔ کی قبر کا طواف اہل فہم کو جچتا ہے کیوں کہ ان کے کلام کی آواز لوگوں کی زندگی میں انقلاب بپا کر دیتی ہے جس سے میں واقف ہوں۔

راقم نے اس پورے قطعہ کو جو اقبال نے حالیؔ کی سوسالہ سالگرہ کے موقع پر پانی پت میں پڑھا تھا ایک جداگانہ مضمون میں ترجمہ کے ساتھ پیش کیا ہے تا کہ حالیؔ سے اقبال کی عقیدت ظاہر ہو جائے۔ اقبال نے حالیؔ کی موت کے مضمون کو بھی بانگِ درا کا جز قرار دیا ان کی نظم حالی وشبلی میں لکھتے ہیں:

شبلیؔ کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گل ستاں
حالیؔ بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

ملک بھر میں حالیؔ کے انتقال پر جلسے، مجالس منعقد کیے گئے۔ کئی نامور اشخاص نے منظوم اور نثری خراج عقیدت پیش کیا۔ بعض عمدہ قطعہ تاریخ وفات بطور نمونہ یہاں درج کی جاتی ہیں۔

حامد حسن قادری نے ہجری اور عیسوی میں وفات کی تاریخیں نکالیں۔

تاریخ از کلام پاک

1333 ہجری

فبشرہ بمغفرۃ

1914 عیسوی

حالیؔ کی فاتحہ خوانی چہلم 21 فروری 1915ء کو پانی پت میں شاندار پیمانے پر منائی گئی جس میں ملک بھر کے مشاہیر شریک ہوئے اور یہ طے پایا کہ حالیؔ کی یاد میں ہائی اسکول قائم کیا جائے۔

منظوم کلام:

جدول اشعار حالی

شمارہ	عنوان	تعداد	زبان	ہیئت	تعدادشعر
۱	قطعات اُردو	۶۷	اُردو	قطعہ	۴۷۰
۲	رباعیات اُردو	۱۶۱	اُردو	رباعی	۳۲۲
۳	غزلیات اُردو	۱۲۳	اُردو	غزل	۱۲۶۱
۴	قصاید اُردو	۸	اُردو	قصیدہ	۳۲۶
۵	منظومات سپاس مدح دعائیہ اُردو	۱۹	اُردو	قطعہ	۳۲۰
۶	شخصی مراثی اُردو	۷	اُردو	متفرق ہیت	۳۸۱
۷	نظمیں اُردو	۳۳	اُردو	قطعہ/مثنوی/متفرق	۳۲۹۵
۸	بچوں کی نظمیں اُردو	۱۴	اُردو	متفرق ہیت	۳۶۷
۹	مسدس مع ضمیمہ اُردو	۱	اُردو	مسدس	۱۳۷۴
۱۰	قطعات تاریخ اُردو	۸	اُردو	قطعہ	۳۸
۱۱	تراجم اُردو	۴	اُردو	متفرق ہیت	۲۶۳
۱۲	متفرقات اُردو		اُردو	متفرق ہیت	۱۰۳
۱۳	اشعار فارسی		فارسی	متفرق ہیت	۶۸۷
۱۴	اشعار عربی		عربی	متفرق ہیت	۱۱۵

تعداد کل اُردو اشعار: 8518

تعداد کل فارسی اشعار: 687

تعداد کل عربی اشعار: 115

تعداد کل اشعار مطبوعہ: 9320

حالؔی کی روایتی شاعری کا تجزیہ

حالی نے خود عشق نہیں کیا مگر عشق کی نقالی کی جس کی جھلک ان کے کلام میں کہیں کہیں نظر آتی ہے۔ حالی نے خود مسدس کے دیباچہ میں لکھا:

''باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابل دید تھی مگر دنیا کے مکروہات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی نہ خود آرائی کا خیال آیا اور نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی۔ نہ وصل کی لذت اٹھائی نہ فراق کا مزا چکھا۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے　　　اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

البتہ شاعری کی بدولت چند روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشتِ جنوں کی وہ خاک اُڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔ کبھی نالہ نیم شبی سے رُبع مسکوں کو ہلا ڈالا، کبھی چشم دریا بار سے تمام عالم کو ڈبو دیا۔ آہ و فغاں کے شور سے کروبیان کے کان بہرے ہو گئے۔ شکایتوں کی بوچھاڑ سے زمانہ چیخ اُٹھا، طعنوں کی بھرمار سے آسمان چھلنی ہو گیا۔ جب رشک کا

تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا۔ یہاں تک کہ آپ اپنے سے بدگمان ہو گئے۔ جب شوق کا دریا اُمڈا تو کشش دل سے جذب مقناطیسی اور قوت کہربائی کا کام لیا۔ بارہا تیغ ابرو سے شہید ہوئے اور بارہا ایک ٹھوکر سے جی اُٹھے۔ گویا زندگی ایک پیراہن تھا کہ جب چاہا اُتار دیا اور جب چاہا پہن لیا۔ میدان قیامت میں اکثر گزر ہوا بہشت و دوزخ کی اکثر سیر کی۔ بادہ نوشی پر آئے تو خُم کے خم لنڈھا دیے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ کبھی خانہ خمار کی چوکھٹ پر جبہہ سائی کی اور کبھی مے فروش کے در پر گدائی کی۔ کفر سے مانوس رہے، ایمان سے بیزار رہے، پیرمغاں کے ہاتھ پر بیعت کی، برہمنوں کے چیلے بنے۔ بُت پوجے، زُنّار باندھا، قشقہ لگایا، زاہدوں پر پھبتیاں کہیں، واعظوں کا خاکہ اُڑایا، دیر اور بتخانے کی تعظیم کی، کعبے اور مسجد کی توہین کی۔ خدا سے شوخیاں کیں نبیوں سے گستاخیاں کیں، اعجاز مسیحی کو ایک کھیل جانا، حُسن یوسفی کو ایک تماشا سمجھا۔ غزل کہی تو پاک شہیدوں کی بولیاں بولیں، قصیدہ لکھا تو بھاٹ اور بادخوانوں کے منہ پھیر دیے، ہر مشتِ خاک میں اکسیر اعظم کے خواص بتلائے، ہر چوب خشک میں عصائے موسوی کے کرشمے دکھائے، ہر نمرود وقت کو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے جا ملایا، ہر فرعون بے سامان کو قادر مطلق سے جا بھڑایا۔ جس کے مداح بنے اُسے ایسا بانس پر چڑھایا کہ خود ممدوح کو اپنی تعریف میں کچھ مزہ نہ آیا۔ غرض نامۂ اعمال ایسا سیاہ کیا کہ کہیں سفیدی باقی نہ چھوڑی۔“

یہ سچ ہے کہ حالی کی بعض قدیم غزلوں میں روایتی شاعری کی جھلک باقی ہے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں معلوم کہ حالی نے اپنی کتنی قدیم شاعری کو تلف کر دیا یا پرانی غزلوں سے کتنے قدیم اشعار نکال دیے کیوں کہ حالی بیسویں صدی کے شعرا کی طرح انیسویں صدی کے نصف آخر میں شائع نہیں ہو سکتے تھے۔ حالی نے روایتی غزل کو جب جدید غزل سے بدلا تو اُسے مسلسل مضمون دے کر غزل نما نظم کر دی۔ دوسرے غزل کو وسعت دے کر صرف غم جاناں کے داخلی عشقیہ مضامین نہیں غم دوراں کے خارجی مضامین سے بھر دیا۔ اگر عشقیہ مضامین بھی باندھے تو ان میں مضمون کی بالیدگی اور الفاظ کی پاکیزگی پر توجہ دی۔ مشاعروں میں جہاں داغ اور امیر مینائی کی دل کش عشقیہ آواز غزل کا لہجہ منائی جاتی تھی۔ جس میں شوخی دل ربائی اور لگاوٹ کا چٹخارہ محفل کا مزہ بن چکا تھا۔ حالی اپنی جدید روش سے دست بردار نہیں ہوتے تھے اور وہی جدید طرز کی غزل سناتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے علامہ شبلی کے حوالے سے ایک مشاعرہ کی روداد لکھی ہے۔ جس سے ہمارے بیان کی تائید ہوتی ہے۔

> ''۱۸۹۲ء میں سرسید مرحوم ایک وفد حیدرآباد لے گئے تھے تاکہ علی گڑھ کالج کے لیے مزید اعانت کی درخواست کریں۔ وفد میں خواجہ صاحب اور مولانا شبلی مرحوم بھی تھے۔ وہاں لوگوں کو خیال ہوا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک مشاعرہ منعقد کرنا چاہیے۔ چناں چہ مشاعرہ قرار پایا اور یہ تجویز ہوئی کہ کسی خاص طرح کی پابندی نہ رکھی جائے۔ ہر شخص اپنا منتخب اور تازہ کلام سنائے۔ داغؔ مرحوم نے اپنی وہ غزل سنائی تھی جو اُن کے تیسرے دیوان مہتاب داغ میں ہے:
>
> اِدھر لا ہاتھ، مُٹھی کھول، یہ چوری یہیں نِکلی

داغؔ کی زبان، منتخب غزل اور پھر ان کے پڑھنے کا ہنگامہ خیز انداز، سارا مشاعرہ بے خود ہو گیا اور تعریف کرتے کرتے لوگوں کے گلے پھٹ گئے۔ اس کے بعد شمع خواجہ صاحب کے سامنے آئی۔ مولانا شبلی مرحوم کہتے تھے کہ

''میں پہلو میں بیٹھا تھا میں نے مجلس کا رنگ دیکھا تو خیال کیا کہ یہاں نئی شاعری کا رنگ جم نہیں سکتا اگر خواجہ صاحب نے اس طرح کی کوئی چیز سنائی تو یقیناً بے مزہ اور پھیکی محسوس ہو گی اور لوگ بے کیف ہو جائیں گے۔''

میں نے ان کے کان میں کہا:

''آپ اپنے قدیم کلام میں سے کوئی چیز سنائیں۔ نئی شاعری کا یہ موقع نہیں۔''

لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور کہا:

''جو کچھ ہو مگر ''از قاعدہ نہ باید گزشت''

یہ حکیم علوی خاں کا مشہور لطیفہ ہے جو محمد شاہ کا شاہی طبیب تھا۔ یعنی مریض بچے یا نہ بچے مگر علاج قواعد فن کے مطابق کرنا چاہیے۔ خواجہ صاحب کا مطلب یہ تھا کہ مشاعرے میں رنگ جمے یا نہ جمے مگر اپنا اصول نہیں چھوڑنا چاہیے۔

چناں چہ انہوں نے اپنی نئی قسم کی غزلوں میں سے وہ غزل پڑھی جو دیوان میں موجود ہے۔ ''کمال تیرا''، ''جمال تیرا''

ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رعبِ جمال تیرا

مولانا شبلی مرحوم کہتے تھے کہ

''باجود اس کے کہ ابھی ابھی داغؔ کی شوخ عاشقانہ غزل تمام مجلس میں تہلکہ مچا چکی تھی مگر ایسا معلوم ہوا جیسے جوشِ مدح و تحسین کی ایک نئی سرگرمی لوگوں میں ابھر آئی ہو۔ ہر شعر کی تعریف کی گئی۔''

داغؔ مرحوم نے کہا:

''مولانا! یہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ اس رنگ میں آپ کا کوئی سہیم نہیں۔''

خواجہ صاحب مرحوم کی ایک غزل ہے:

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے، نہ در کی صورت

مقطع ہے:

ان کو حالیؔ بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں!
دیکھنا آپ کی، اور آپ کے گھر کی صورت

حالیؔ غالبؔ اور شیفتہ کے انتقال کے کچھ سال بعد تک مشاعروں میں شرکت کرتے تھے اور ان مشاعروں میں عموماً روایتی غزل جس میں عشقیہ مضامین کی لطیف اور سنبھلی ہوئی کیفیت تھی سناتے اور داد و تحسین حاصل کرتے۔ قدیم غزلوں میں رندی شاہد بازی چوما چاٹی کے اشعار نظر نہیں آتے لیکن عشق کے زخم کی خراش دل گداز اور تعلّی کے ساتھ غزلوں میں موجود ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ عشقیہ مطالب لکھنے کے لیے خود شاعر کو عشق کرنا لازم قرار دیا جائے۔ شاعری اپنی قوت دروں اور اپنے جذب اندرون سے جذبات کو درک کرتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔

ٹپکتا ہے اشعار حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا
ہیں عاشقی کی گھاتیں معلوم اس کو ساری
حالی سے بدگمانی بے جا نہیں ہماری
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
حالی کی سُن لو اور صدائیں جگر خراش
دل کش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد
قیس ہو کوہ کن ہو یا حالی
سرسری دل کی واردات نہیں

حالی اپنی شاعری پرنازاں ہیں کہ انہوں نے جادو بیانی کی ہے اور عشقیہ مال کی ایک ایسی دوکان کھولی ہے جس سے گاہک ناواقف ہیں۔ لوگ اس دولت بے بہا کے قدرداں نہیں۔

لذت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جا کے حالی جادو بیاں سے ہم
ایسی غزلیں سُنی نہ تھیں حالی
یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

کبھی اپنی معروف عشقیہ غزل سے محفل کو زعفران بنا دیتے ہیں اور غزل کے ہر شعر کو عشق کے حلقۂ زنجیر کی طرح ایک دوسرے سے جوڑ کر غزل کو سہ آتشہ کر دیتے ہیں۔ کس نے کہا کہ حالی کی شاعری سپاٹ بے رنگ اور بے مزا ہے وہ ذرا جستجو کرے تو ان کے دفتر میں خوب سے خوب تر جنس ملے گی۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھنا ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں
یا رب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
ہوتی نہیں قبول دُعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں
حالی نشاط و نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

حالی کے چند اور روایتی عشقیہ اشعار یہ ہیں:

ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوق دید بھی
جائے گا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں

....

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

....

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
الفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

....

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا
افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دلکش
شعر و سخن کو تو نے جادو بنا کے چھوڑا

....

جنت میں تو نہیں اگر اے زخم تیغ عشق
بدلیں گے تجھ کو زندگی جاوداں سے ہم

....

حالی زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اس مرد مسلماں میں نہیں

....

تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی
حالی نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

....

جی اس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہے کہ حالی کو کوئی کام ہے درپیش

....

قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

....

حالی کی شاعری کلاسیک اور جدید شاعری کا حسین امتزاج ہے۔ وہ غالب کے شاگرد، شیفتہ کے مصاحب ہونے کے ساتھ ساتھ نئے نغموں کی تلاش اور غرب کی اصلیت سادگی اور جوش کے طرف دار ہیں۔ مقطوں میں حالی نے اپنی شاعری کا رجحان اور مقصد بتا دیا۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میرؔ کا
ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا
حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر ہو چکی

حالی کی روایتی شاعری آج بھی ان کی غزلوں میں موجود ہے۔ جو تقریباً ۱۸۷۴ء سے پہلے کی تھی۔ حالی نے ان غزلوں پر ''ق'' قدیم کی علامت لگا دی تا کہ ان کے دیوان کی سیر کرنے والا دیکھ لے کہ تقریباً چالیس سال کی عمر میں حالی نے شاعری کی اصلاح کا باقاعدہ اعلان کر کے عمل بھی کیا۔

حالی کی جدید اور انقلابی اصلاحی شاعری میں آخری عمر تک روایتی شاعری کے محاسن موجود رہے۔ حالی کہتے ہیں:

> ''زمانہ کا نیا ٹھاٹھ دیکھ کر پرانی شاعری سے دل سیر ہو گیا تھا اور جھوٹے ڈھکوسلے باندھنے سے شرم آنے لگی تھی نہ یاروں کے ابھاروں سے دل بڑھتا تھا نہ ساتھیوں کی ریس سے کچھ جوش آتا تھا مگر یہ ایک ایسے نامور کا منہ بند کرنا تھا جو کسی نہ کسی راہ سے تراوش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے بخارات درونی جن کے

رکنے سے دم گھٹا جاتا تھا دل و دماغ میں تلاطم کر رہے تھے اور کوئی
رخنہ ڈھونڈ ھتے تھے۔‘‘

حالی نے غم دل کو بیچ کر غم دوراں اور غم انساں خریدا۔ نفس نے غیرت دلائی حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زباں سے کچھ کام نہ لینا شرم کی بات ہے۔ روایتی شاعری سے افادیتی شاعری کی طرف رجحان منتقل ہوا۔

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

پھر حالی نے نئے نئے موضوعات پر شعر کہنا شروع کیا۔ پرانے ساغروں میں نئ شراب بھری۔ انجمن پنجاب کے نظموں کے مشاعروں اور لاہور کے نیچریوں کے میل جھول نے ان کو نئے راستوں پر گامزن کیا۔

گورنمنٹ بک ڈپو لاہور کی ملازمت نے مغربی شعری اور ادبی قدروں سے روشناس کروایا۔ حالی نے اپنی جدید اسلوب نگاری میں حقیقت، سلاست اور افادیت کے ذریعہ نئ معنویت کا احساس فراہم کیا۔ انہوں نے اپنی نظموں میں غزل کے تغزل و تخیل، قصیدے کے طمطراق، مرثیے کے اخلاق و استقلال کے ساتھ مثنوی کے تسلسل کو جگہ دی۔ قدیم تلمیحات کو نئے معانی دیئے۔ پرانی تراکیب تشبیہات اور استعارات کو دور حاضر کے جدید رنگ و آہنگ میں پیش کر کے تاثیر کو دو آتشہ کیا جس کا نشہ ان کے مسدس اور اصلاحی نظموں میں ایسا رچا بسا ہے کہ پڑھنے اور سننے والا مست ہو جاتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ یہ حالت حالی کے تمام تر کلام کی شناخت نہیں بلکہ اصلیت اور سادگی اور مقصد کی پیش کش کی خاطر نظم سپاٹ خشک اور یکسانیت کا شکار ہو گئی ہے۔ ہمیں یہاں

بیدل دہلوی کا شعر یاد آ رہا ہے:

شعر گر اعجاز باشد بی بلند و پست نیست
در ید بیضا ہمہ انگشتہا یک دست نیست

''یعنی جس شعر میں اثر کی معجز نمائی ہوتی ہے۔ وہ بلند اور پست نہیں ہوتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ کی سب انگلیاں یکساں نہیں ہیں۔''

تو پھر حالی کے تمام اشعار ایک سطح کے کیسے ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ حالی کی شاعری خصوصاً ان کے قصاید اور کچھ نظموں پر تنقیدی کام نہ ہونے کے برابر ہے لیکن جن چند نظموں جن میں کلمۃ الحق، تعصب اور انصاف، دولت اور وقت، پھوٹ اور ایکے وغیرہ شامل ہیں۔ قوم کے سوئے ہوئے اور کھوئے ہوئے اقدار کا ذکر کرتے ہوئے ان کی باریابی اور ان کے فواید اور اسلاف میں ان کی موجودگی کا دلکش بیان موجود ہے۔ چناں چہ ان نظموں سے جھوٹ، فریب، پھوٹ دشمنی، کاہلی بزدلی، نااتفاقی اور تکفیری خیالات کو پروان چڑھایا گیا ہے۔ جو اُردو نظم کا کامیاب تجربہ تصور کیا گیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حالی کی ان موضوعاتی نظموں کا ایک ایک کر کے تجزیہ کیا جائے اور پھر ان سب کو اقدار انسانی کی اکائی جان کر مورد بحث لایا جائے تا کہ مقصدی اور افادیت کی شاعری سے حالی کا رشتہ استوار کر کے اس مسئلہ کو بھی عیاں کیا جائے کہ حالی ایک ترقی پسند شاعر تھے۔ وہ صرف انگریزی سرکار کے مداح اور نغمہ خواں نہ تھے بلکہ برصغیر کی اقوام کے درد کی دوا بھی بتاتے تھے جن میں بعض مسائل کی رسیدگی خاطر خواہ نہ تھی۔ جیسے حالی نے اپنی نظم شکوہ ہند میں مسلمانوں کی کسمپرسی اور زوال کو برصغیر کے رسم و رواج عادات و اطوار تہذیب و تمدن اور آب و ہوا سے ربط دیا ہے جو صحیح نہیں۔

حالی ایک شاعر باعمل تھے جو کہتے تھے وہ کرتے تھے یا کم از کم کرنے کی

کوشش کرتے تھے۔ جدید اُردو شاعری اور اُردو تنقید نگاری کے بنیاد گزار کی زندگی میں شعری تخلیقات اور فکری رجحانات میں انقلابات آئے چناں چہ پہلے خود منقلب ہوئے اپنے کو بدلا پھر دوسروں کو نصیحت اور تاکید کی۔ حالی نے پرانی خستہ گھسی پٹی بے جان عشقیہ شاعری کے خلاف بغاوت کرنے سے پہلے خود بھی اسی محفل کی رونق بنے رہے۔ جس کی یادبود وہ غزلیں ہیں جو حالی نے قدیم کے اشارے ''ق'' لگا کر اپنے دیوان میں شامل کیا۔ جہاں تک حالی کی شہرت اور شناخت غزلوں کے حوالے سے ہے۔ ان میں بیشتر وہی غزلیں اور اشعار ہیں جو اُس زمانے کی تخلیقات ہیں جہاں حالی با آواز بلند کہہ رہے ہیں:

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

اُس دور میں حالی نہ صرف مقصدی شاعری سے دور تھے بلکہ ادب برائے ادب کے قائل تھے۔ جیسا کہ خود حالی نے اپنی کہانی میں ہمیں بتایا ہے کہ تقریباً چالیس برس کی عمر میں وہ مقصدی یا پیامی شاعری کی طرف صرف مائل نہ ہوئے بلکہ پرانی فرسودہ شاعری سے بے زار بھی ہو گئے۔

دلی کی محفلوں کا وہ زمانہ جہاں حالی کا طوطی بول رہا تھا۔ غالبؔ، شیفتہؔ، صہبائیؔ، ظہیرؔ اور رشید کی مصاحبت ان کا طرہ امتیاز تھا۔ خاکساری کی جگہ تعلّی، انکساری کی جگہ بڑائی ان کی اکثر انتیس (۳۰) پرانی غزلوں کے مقطوں سے ببانگ دہل اعلان کر رہی ہے کہ یہ وہ حالی نہ تھا۔ جو بعد میں فرشتہ بن کر اُردو کے فلک پر پرواز کرنے لگا کچھ مقطے قدیم غزلوں کے دیکھیے:

حالی کی ہیں اگر یہی شیوا بیانیاں   بے گا نہ کوئی نام ظہیر و رشید کا

(حالی کے ہم عصر استاد شعرا ظہیر دہلوی اور پیارے صاحب رشید لکھنوی)

شب انجمن میں حالی جادو بیاں نہ تھا
بزم سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار

مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت
سمجھ کر کرو قتل حالی کو دیکھو

پوچھیں گے جا کے حالی جادو بیاں سے ہم
لذت ترے کلام سے آئی کہاں سے یہ

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں
بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر

مری قیمت مری گفتار سے پوچھ
متاع بے بہا ہے شعر حالی

آخر اپنا کہا کیا تو نے
حالی اٹھا ہلا کے محفل کو

۱۸۷۴ء تک حالی کی شعری بضاعت محدود تھی۔ غالب اور شیفتہ کی صحبت اور شاگردی کی وجہ سے بڑے بڑے لوگوں سے ملاقاتیں اور شعری محافل میں شریک ہونے کی سعادت نے انہیں ادب اور ادیب شناس بنا دیا تھا۔ جس تخلیق نے انہیں برصغیر کے مختلف شہروں میں معروف کیا وہ غالب کے انتقال پر ۱۸۶۹ء میں ان کا غالب کا مرثیہ اور قطعہ تھا اس کے علاوہ اسی دور میں گورنمنٹ بک ڈپو لاہور کی خدمات اور کچھ موضوعاتی نظمیں اور ان کا چرچا علی گڑھ گزٹ اور تہذیب الاخلاق میں حالی کی قدردانی کا باعث ہوا۔ اب حالی صرف دلی کے مشاعروں کے لٹیرے نہیں بلکہ محمد حسین آزاد کی پنجاب تحریک اور سرسید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک کے سپرے بن کر ان دونوں کی بین بجا رہے تھے۔

جس کا اثر لاہور دکن لکھنو اور بنگال میں بھی محسوس کیا جا رہا تھا۔ ایسے موقع پر خان بہادر ڈپٹی کلکٹر ڈھاکہ عبدالغفور نساخ نے ۱۸۷۴ء میں اپنے تذکرۂ سخن شعرا کے لیے حالی سے منتخب اشعار طلب کیے۔ حالی نے اپنی پسند سے غزلوں کے پچیس (۲۵) اشعار بھیجے جو تذکرے میں موجود ہیں۔ ان شعروں کو پڑھنے سے نہ صرف حالی کا رجحان شعری معلوم ہوتا ہے بلکہ خود حالی کا ذوق شعری اور انتخاب کا پتا چلتا ہے جو اُس زمانے کے مذاق سے جدا نہ تھا۔ ان پچیس شعروں سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ حالی نے جب ان

غزلوں کو اپنے دیوان کا جز کیا تو کئی اشعار میں تبدیلیاں کیں اور سچ تو یہ ہے کہ آج بھی انہی غزلوں کے اشعار حالی کی عشقیہ شاعری کی دولت محبوب ہوتے ہیں۔

حالی کی تیس (۳۰) قدیم غزلوں کے مجموعی اشعار کی تعداد (۳۱۰) ہے۔ بعض اشعار جو حالی نے اپنی بیاض سے دیوان میں شامل نہیں کیے تھے۔ انہیں بھی شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے کلیات کا جز قرار دیا ہے۔ حالی کی ان قدیم غزلوں کا مطالعہ ہمیں اُس دور کے شعری انجمنوں، حلقوں، اساتذہ اور محفلوں سے آگاہ کرتا ہے۔ ہم یہاں نساخ کے تذکرے سے وہ اشعار پیش کرتے ہیں۔ جو حالی نے بھیجے تھے تاکہ حالی پر کام کرنے والے اسکالرس کو حالی کے ذہنی انقلاب کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ حالی کے ان اشعار سے ان کی عربی استطاعت اور مطالعے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

دوزخ اگر وسیع تو رحمت وسیع تر لاتقنطوا جواب ہے ''ہل من مزید'' کا

دیوان حالی میں پہلا مصرعہ یوں بنا دیا گیا ہے۔

دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر

اس شعر میں حالی ''لاتقنطوا من رحمۃ اللہ'' یعنی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو (سورۂ الزمر آیہ ۵۳) ''ھل من مزید'' (دوزخ پکارے گی) کیا کوئی اور (گناہ گار) ہے۔

کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھ کو خبر ہوتی میر ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں جانتے ہیں وہ ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور مرا شکر ان کا گلہ ہو گیا

نہیں بھولتا ان کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا

لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل وہ دشمن دیں مہرباں ہے اب

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ کچھ اور بات ہے
عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

یہ شعر دیوان میں تھوڑی تبدیلی سے یوں ہے:

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

ہوتی نہیں قبول دُعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

خوشی میں بھی نہیں رہنا خوش آتا ایک حالت پر
کہاں تک جی نہ گھبرائے الٰہی دردِ ہجراں میں

خلوت خاص میں رہ رہ کے عدو سیکھ گئے
وہ اشارے کہ تری جنبش مژگاں میں نہیں

ہم نے کی سیر چمن غور سے اے بلبل زار
بات چبھتی ہوئی کوئی گل و ریحاں میں نہیں

کس طرح اس کی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں

بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

خوبی رو کے لیے زشتی خو بھی ہے ضرور
سچ تو یہ ہے کہ کوئی تجھ سا طرح دار نہیں

حالی انصاف کر آخر سنے انساں کب تک
طعنِ اغیار ہیں کچھ آپ کے اشعار نہیں

مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں
بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

وفا شرط الفت ہے لیکن کہاں تک
دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے

شوق بڑھتا گیا جوں جوں رکے اس شوخ سے ہم
یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے

ہم بھی آدابِ شریعت سے تھے آگاہ مگر
کبھی برتی نہ ہو جو رسم وہ کیا یاد رہے

چارہ گر کار بہ اندازۂ تدبیر نہیں
کی جیو ہمت اگر وقت دُعا یاد رہے

یہ ریمارک کے حالی کی جدید شاعری پندوواعظ واقعات اور حکایات کردار

سازی اور انسانی قدروں کی نشوونما جیسے مطالب میں قید ہو کر شعری لطف سے خالی بیانیہ لوری ہو گئی ہے۔ بظاہر درست معلوم ہوتا ہے۔ مگر حالی چوں کہ فطری شاعر تھے جس کی سند خود غالب نے دی تھی وہ کلاسیک عشقیہ اور صوفیانہ میدانوں میں بھی اپنے قلم کو دوڑا سکتے تھے۔ جس کا ثبوت حالی کا قدیم کلام ہے۔ اگر یہ قدیم کلام کے نمونے ہماری دسترس میں نہ ہوتے تو حالی پر یہ الزام بھی تراشا جاتا کہ وہ ایسی خوشگوار شاعری کی تخلیق کے اہل نہ تھے۔ شاید حالی نے اسی لیے قدیم نمونوں کو نمایاں کر کے دانستہ طور پر نادیدہ نگاہوں کے سامنے رکھا جن کا مشغلہ ہمیشہ آنکھیں بند کر کے منہ کھولنا رہا ہے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے کہ حالی دوسرے ہم عصر شاعروں کی طرح نشۂ تعلّی سے مخمور تھے۔ حالی کے مزاج میں عجز و انکساری چالیس سال کے بعد آئی۔ چناں چہ انہوں نے ۱۸۷۰ء میں جب قصیدہ نعتیہ لکھا جو غالب کے مرثیے کے ایک ڈیڑھ سال بعد کی تخلیق ہے تو اس میں جو تمہید باندھی وہ سراسر سرکش تعلّی کی جست و خیز کو ظاہر کرتی ہے۔

حالی نے اس قصیدہ کو اپنے دیوان میں بائیس سال بعد ۱۸۹۳ء میں شامل کیا تو حاشیے میں اس قصیدے کی تمہید کے بارے میں لکھا:

> ''اس قصیدے کی تمہید ۱۲۸۷ھ یا ۱۲۸۸ھ (مطابق ۷۱-۱۸۷۰ء) کے ہذیانات میں سے ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مومن، ذوق، آزردہ، غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے۔ انہی دنوں میں سیتارام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا۔ مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوے سے لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اصرار کے مشاعرے میں نہ

آئے۔ بیسوا اپنے خریدار کی بے التفاتی سے شاید ایسی کھسیانی نہیں ہوتی جیسا کہ شاعران لوگوں کی بے التفاتی سے جن کو وہ سچ مچ اپنے شعر کا قدرداں سمجھتا ہے۔ اسی خام خیالی کے جوش میں اس قصیدے کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اگر یہ لوگ ہماری قدر نہیں کرتے تو آپ ہی اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں کیوں کہ اس زمانے کے خیالات کے موافق اس بات کا یقین تھا کہ جس طرح آج کل تجارت کی گرم بازاری اشتہارات کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اسی طرح شاعری بھی منوانے سے مانی جاتی ہے۔ لیکن جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھ گیا تو دفعتاً اپنی غلطی پر تنبہ ہوا لہٰذا قصیدے کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا تا کہ فخر کے لیے ایک وجہ پیدا ہو جائے۔''

(حالی)

ہم یہاں ان اشعار کو اس لیے بھی پیش کر رہے ہیں کہ حالی جوانی اور دلی کے ماحول کی گرانی کے باعث اپنی تعریف اور تمجید میں دوسرے ہم عصروں سے بہت آگے تھے۔ سونے پر سہاگا یہ ہے کہ یہ اشعار نعتیہ قصیدے کی تمہید بھی ہیں۔

میں بھی ہوں حسن طبع پر مغرور
مجھ سے اٹھیں گے ان کے ناز ضرور
خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ
مجھ سے برتر ہے میری طبع غیور
خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے
میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور

نہ گنو اہل عصر میں مجھ کو
میں بہت کھینچتا ہوں آپ کو دور
چشمۂ آب خضر کی مانند
چشم اہل جہاں سے ہوں مستور
دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت
مجھ کو پروا نہیں کہ ہوں مشہور
مثل یوسف دکھائے جوہر ذات
جس کو بِکنا ہو مفت یاں منظور
جیسے شہباز ہو قفس میں اسیر
ہوں زمانے کے ہاتھ سے مجبور
کبک و قمری کو رخصت پرواز
بال و پر مفت صعوہ و عصفور
جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں
اس سے شکوہ نہیں کہ ہے معذور
لذت مے سے جو نہ ہو آگاہ
اس کو کیا قدر خوشۂ انگور
جس کی آنکھیں نہ ہوں وہ کیا جانے
روز روشن ہے یا شب دیجور
پہلے ہو گی کسی کو قدر ہنر
اٹھ گیا اب جہاں سے یہ دستور

آپ اپنے سخن سے ہوں محظوظ
دل اصحاب گو نہ ہو مسرور
در یکتا ہوں اور ہوں بے آب
ماہ کامل ہوں اور ہوں بے نور
کاش واں دیکھتے مجھے کہ جہاں
متنبیؔ تھا مادح کافور
کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز
انوری ہے نہ عرفی و شاپور
کون دیکھے مرے چمن کی بہار
مر گیا عندلیب نیشاپور
شرح نقطے کی گر کروں تحریر
تنگ ہو عرصۂ نقوش و سطور
ترک عشق بتاں کریں عشاق
مجھ سے سن پائیں گر ستایش حور

حالیؔ (۴۱) اکتالیس اشعار کی تعلّی کر کے گریز کرتے ہیں:

لوں ملائک سے داد حسن کلام
گر لکھوں نعت سرور جمہور

کلامِ حالؔی میں خارجی الفاظ اور محاورے

حالی اُردو شعر و ادب کے پہلے ممتاز شاعر ہیں جنہوں نے سب سے زیادہ انگریزی، پنجابی اور ہندی الفاظ استعمال کیے۔ انگریزی الفاظ سے اُس زمانے کے اُردو افراد کماحقہٗ واقف نہ تھے اس لیے ان کے حاشیے میں معنی بھی ٹانک دیئے۔

☆ مسلمانوں کو ''گڈ سبجکٹ'' بننا یہ سکھاتا ہے۔ (Good Subject۔ اچھا انسان)

☆ فرقہ ہے ''کنسرویٹوان'' میں جو ایک (Conservative۔ قدامت پسند)

☆ پر لبرل کی ہے خلاف ان کے رائے۔ (Liberal۔ آزاد خیال)

☆ آگے سب ایک لیول پر قوی اور ناتواں۔ (Level۔ سطح)

☆ سیوا کروان کی انہیں پروان چڑھاؤ۔ (سیوا۔ ہندی مدد)

☆ ''ڈیم فول'' اس کو بھی سننا کہیں پڑتا ہے ضرور (احمق۔ Dam-fool)

☆ کیسا ان آلام سے رہتا نچنت۔ (نچنت۔ بے فکر، ہندی)

☆ ہے کنگ ڈم سے آساں میڈم کو بس میں لانا۔ (حکومت۔ Kingdom۔ Madam بیگم)

☆ نیٹو ہیں جو کہ ملک میں تعلیم یافتہ۔ (یومی، مقامی۔ Native)

حالی محاورے اقوال برجستہ فقرے اور ضرب المثل مصرعوں میں خوب مصرف کرتے ہیں۔

یاں گیا بلی کے بھاگوں ٹوٹ اگر چھینکا کہیں
پڑ گئی پشتوں تلک واں فاقہ مستوں کی بنا
کہتے ہیں غیر اس کو ہم جنسوں میں اپنے دیکھ کر
یہ وہی کوا ہے لیکن ہنس کی چلتا ہے چال
ایک انار اور اس کو تکتے سیکڑوں بیمار ہیں
لے گی کس کس کی خبر تو قوم غافل ہے اگر
طبل ظاہر کی نمایش کے نہ بجتے تھے وہاں
جو برستے تھے زیادہ نہ گرجتے تھے وہاں
آ کے دنیا میں بہت پاؤں نہ پھیلاتے تھے
اک مسافر کی طرح رہ کے چلے جاتے تھے
ہنس کی چال حماقت سے چلا جو کوا
اپنی بھی چال گیا بھول بہ قول حکما
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر
تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ورنہ
کتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

حالی نے چھ سو سے زیادہ فارسی اور سو سے زیادہ عربی اشعار لکھے ہیں۔ راقم نے ان فارسی عربی اشعار کو سلیس نثری ترجمے کے ساتھ دیوان حالی فارسی میں شائع کیا

ہے۔ یہاں بعض عربی فارسی شعر جو اُردو شاعری کا حصہ ہیں اور بعض اشعار صنعت ذوالللسانس میں بطور نمونہ درج ہیں:

یا ملکیَّ الصفات یا بشریّ الُقویٰ
فیک دلیلً علی انکَ خیر الوریٰ
لَا ابَالِی بِاَن یُعَاتَبنی
کُل نَاسٍ و اَنتَ عَنِّی راض
مُنعمو بَذلِ خیر میں یہ دیر
اپنا مطلب اور اُس پہ سو اغماض
ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع
هَل لَنَا فِی نِزا عِنَا مِن قَاض
تجھ سے ہوئی زندہ خلق جیسے کہ باراں سے خاک
خلقک خصبُ الزمان بعثک مَحیَاالوریٰ

حالؔی کے نظریات اور افکار کا مطالعہ

الطاف حسین حالی ایک باشعور مستقل شخصیت تھے۔ وہ عجز و انکساری سے مجسم ہوتے ہوئے اپنی فکر کے آپ مختار تھے۔ جس میں وہ کسی دوسری شخصیت کے مقلد نہ تھے۔ مزاج کی نرمی گوشہ نشینی کی زندگی بحث ومباحثہ سے دوری نام ونمود سے پرہیزگاری سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ سرسید احمد خان کی لئے کی بانسری تھے یا حالی کی افتاد طبع اور کچھ منکسرالمزاجی سے لکھی گئی ان کی تحریروں سے یہ سرخی بنانا کہ حالی امام نہیں بلکہ مقلد تھے۔ حالی کے ساتھ سراسر زیادتی ہے۔ حالی کی ۷۷ سالہ زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ وہ ایک نظام العمل اور ایک مکمل نظام الاوقات کے ساتھ خاص نظریات کے نظام فکر سے وابستہ تھے۔ اگرچہ تجربات اسباب اور حالات سے ناواقفیت کے سبب انہیں اپنے منصوبوں میں تبدیلی کرنی پڑی لیکن

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں

دنیائے ادب میں ایسے کتنے لوگ ہیں جو تعلیم اور حصول علم و دانش کے لیے اپنی شادی کے کچھ عرصے بعد گھر چھوڑ کر مکتب کے فرش پر ڈیڑھ سال گزار دیتے ہیں۔ یہاں ہم اس عمل کی تائید یا تعریف نہیں بلکہ تحلیل اور تاویل کر رہے ہیں۔ کس شاگرد

غالب کو یہ جرأت ہوئی کہ غالب کی نجی زندگی پر طومار لکھ کر خدائے سخن کو بندگی کا سبق دے۔ یہاں ہم چھوٹا منہ بڑی بات نہیں بلکہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کا ذکر کر رہے ہیں۔ اُردو شعر و ادب میں کتنے ایسے شاعر گزرے ہیں جنہوں نے اپنے شعری دیوان پر مقدمہ شعر و شاعری لکھنے میں دس سال صرف کیے اور ورڈسورتھ کے لیریکل بلڈس کے طویل دیباچے کی طرح ایک عمدہ مضمون نفس شاعری پر لکھ کر شائع کیا۔ اُردو کے کس شاعر نے ایک طویل نظم ملت کو جگانے راہ راست پر لانے اور عزت نفس کی زندگی گزارنے کی تعلیم اور تاکید کے لیے لکھی جو عامی اور عالم کے لیے شمع ہدایت اور درس عبرت ثابت ہوئی۔ برصغیر کے کس مفکر نے تعلیمات نسواں اور ستی، بچپن کی شادی کی رسموں پر پابندی کے لیے دامے درمے سخنے کام کیا۔ وہ کون سا شاعر تھا جس نے غالب سے اقبال تک کے شعری سلسلۃ الذہب کو جوڑے رکھا اور مولانا روم کے شعر کی تفسیر بن کر آیا۔

تو برای وصل کردن آمدی نے برای فصل کردن آمدی

ان تمام سوالوں کا جواب اگر حالی کی شخصیت اور فن ہے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ حالی کی حیات شخصیت اور فن پر کام مطمئن بخش نہ ہو سکا۔ جس کا قرض اُردو کے کاندھوں پر باقی ہے۔ آج سے (٦٥) پینسٹھ سال قبل صالحہ عابد حسین نے ''یادگار حالی'' کی تمہید میں لکھا تھا:

> ''یہ میں جانتی ہوں کہ یہ کتاب دراصل کسی بڑے ادیب کو لکھنی چاہیے تھی۔ میں چاہوں تو ایسے کئی بزرگوں کے نام بتا سکتی ہوں جو اس کام کو مجھ سے بہتر کر سکتے ہیں اور جن پر اُردو زبان اور ادب کا اتنا حق ضرور ہے کہ وہ اس کے ایک رکن رکین کی زندگی اور ادبی کارناموں پر ایک مفصل اور معقول کتاب لکھیں لیکن

چونکہ انہوں نے اس کام کو نہیں کیا میں نے فرض کفایہ کے طور پر
اس کو اپنے ذمہ لیا۔ اس خدمت کا سب سے بڑا محرک میری وہ
پرخلوص عقیدت ہے جو مجھے حالی سے ہے۔''

یہ سچ ہے آج اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی صالحہ عابد حسین کی شاہکار تصنیف ''یادگار حالی'' یادگار نقش ہے۔ چناں چہ اُسی وقت ابوالکلام نے اس کتاب کی وقعت اور اہمیت کو درک کر لیا تھا ورنہ وہ یہ نہ لکھتے:

''حالی پر اس وقت تک کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی گئی جو قابل ذکر
ہو............ یہ سوانح عمری کا ایک ایسا قیمتی مواد ہے جس سے زیادہ
مستند مواد ہمیں نہیں مل سکتا۔''

اُردو ادب کے ادیبوں کا ایک خطرناک کھیل اہم شخصیتوں کی سیرت اور شخصیت کے بارے میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ کوئی اہم دستاویز یا صحیفہ تیار کر رہے ہیں جس کے لیے انہوں نے مواد جمع بھی کر لیا ہے اس طرح سے دوسرے کام کرنے والوں پر خاموشی کا منتر پڑھ پھونک دیتے ہیں۔ چناں چہ نہ کام خود کرتے ہیں نہ اوروں کو کرنے دیتے ہیں بلکہ تمام مواد دیمک کا رزق بنا دیتے ہیں۔ اس طرح کا المیہ بھی حالی کے ساتھ ہوا۔ صالحہ عابد حسین نے لکھا کہ

''شیخ اسماعیل پانی پتی جنہوں نے حالی کی نگرانی میں تعلیم و تربیت
حاصل کی اور حالی کی سیرت پر مستند اور ضخیم کتاب لکھنے کا
پروپیگنڈہ اور مزید اس کے لیے مواد بھی جمع کر چکے تھے۔''

لیکن صالحہ عابد حسین کے خط کے جواب میں لکھا کہ

''میری عمر اب نوے (۹۰) سال سے زیادہ ہے۔ بیمار ہوں اس
کتاب کو مرتب کرنے کے لیے ایک پورے اسٹاف اور بہت

سے روپے کی ضرورت ہے۔ امید نہیں کہ یہ کام انجام دے سکوں۔‘‘

ہم نے حالی کی شخصیت حیات اور سیرت کے نقوش ہمیں جہاں کہیں ملے اُسے محراب ادب میں سجا دیئے خوش قسمتی سے حالی کا پورا کلام مجموعہ کی شکل میں موجود ہے اور

چُھپ نہیں سکتا ہے شاعر شعر کے چھپنے کے بعد

ہمیں حالی کے فن پر پورا مواد دستیاب ہے جس کی روشنی میں حالی کے فن کے مختلف نِکات ان کے نظریات جس سے ان کے شعور کا پتا بھی ہو سکے۔ چناں چہ ہم نے اس تحریر میں حالی کے کلام میں مختلف نظریات اور قدروں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

حالی اور سرسید کی فکر میں صرف عورتوں کی تعلیم کے بارے میں اختلاف نہ تھا بلکہ سارے طریقہ تعلیم اور طرح تعلیم کے بارے میں بھی فرق تھا۔ سرسید اعلیٰ تعلیم، جس میں یونیورسٹیز کی ڈگریاں دی جاتی تھیں کے طرف دار تھے۔ ان کے ذہن میں متوسط طبقہ سے زیادہ اشراف طبقہ کی تعلیم کی اہمیت تھی وہ بی اے، ایم اے اور اس سے آگے کی تعلیم کے خواہاں تھے۔ سرسید کے مجموعہ ہائے لکچر مطبوعہ 1892ء کے بموجب وہ عورتوں کی انگریزی تعلیم کے مخالف تھے وہ ان کے لیے اخلاق اور دینیات کی تعلیم ہی کافی سمجھتے تھے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ عورتوں سے پہلے مردوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ سرسید معمولی گھرانے اور ادنیٰ حیثیت کے مسلمان لڑکوں کے لیے بھی انگریزی تعلیم کو ضروری خیال نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے ٹیکنیکل ایجوکیشن کی بھی شدید مخالفت کی اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ اس سے ہائی ایجوکیشن میں خلل پڑے گا۔ حالی ابتدا سے ہی سرسید

سے تعلیم کے مسئلے پر اختلاف رکھتے تھے۔ 1876ء میں حالی لکھتے ہیں:

’’بہ نسبت اس کے کہ ایک مدرسہ فزیکل سائنس کی تعلیم کے لیے قائم کیا جائے بہتر ہے کہ ایک تعلیم خانہ صنعت اور دست کاری کے لیے کھولا جائے کیوں کہ پہلی صورت کی بہ نسبت دوسری صورت عام خواہشوں کو زیادہ پورا کرنے والی ہے۔‘‘

حالی قوم کو ٹیکنیکل تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے تھے وہ جانتے تھے بہت سے آزاد پیشے اگر تعلیم سے آراستہ نہ ہوں گے تو ترقی نہیں کر سکتے کیوں کہ سائنٹفک دور میں ادنیٰ سے ادنیٰ پیشے میں بھی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے۔

حالی کہتے ہیں:

ضرورت علم و دانش کی ہے ہر فن اور صناعت میں
نہ چل سکتی ہے اب بے علم نجاری نہ معماری
کوئی پیشہ نہیں اب معتبر بے تربیت ہرگز
نہ فصّادی نہ جراحی نہ کحالی نہ عطاری
جہاں علم تجارت میں نہ ماہر ہوں گے سوداگر
تجارت کی نہ ہو گی تا قیامت گرم بازاری

حالی ادنیٰ سے ادنیٰ پیشے کو تعلیم اور ٹیکنیکل تربیت سے جوڑتے ہیں تاکہ وہ مغربی دنیا کے ترقی یافتہ جنس کا مقابلہ کر سکے۔ اسی لیے جب بچوں کی نظم جو پیشوں کے متعلق ہے ایک بچہ ماں سے کہتا ہے:

’’میں بڑھئی بنوں گا۔‘‘

وہ بڑھئی نہیں جو گلیوں میں پکارتا پھرے بلکہ وہ جو آیندہ چل کر کارخانہ بنائے۔ یعنی حالی اشعار میں بین السطور تعلیم کی ضرورت بتا رہے ہیں۔

جب کہ اماں جوان ہوں گا میں اک بڑھئی مستری بنوں گا میں
نہ بڑھئی وہ ہے جس کا نام بڑھئی جو کہ پھرتے ہیں کہتے ''کام بڑھئی''
اس ہنر میں بنوں گا میں استاد اور کروں گا نئے نئے ایجاد
کارخانہ خود اک بنا لوں گا بیسوؤں کاریگر بٹھا لوں گا

حالی نے جو ایک نامکمل طنزیہ لغت بنائی ہے اُس میں یونیورسٹی کو کلرک سازی کا کارخانہ کہا ہے۔ وہ اُن تعلیمی اداروں کو جہاں طالب علموں کو خود مختارانہ آزاد کام کرنے کے قابل نہیں بنایا جاتا مایوس ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ

''ان طالب علموں میں عملی قوت اور اپنے تعلیم و ہنر کے بھروسے پر کام کرنے کا مادہ اتنا ہی رہتا ہے جتنا کالج کے داخلے کے زمانے میں تھا۔''

''ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کی دوڑ بی اے یا ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد یہ ہے کہ مڈل پاس کیے ہوئے طلبہ کی طرح سرکاری نوکری کے لیے ادھر ادھر سلسلہ جنبانی کرتا پھرے اور ذریعوں اور سفارشوں کی تلاش میں ایک مدت تک سرگرداں و پریشان رہے۔''

حالی نے 1907ء کے کراچی کے خطبۂ صدارت میں کھل کر اپنے موقف کا اعلان کیا کہ جو مسئلہ سرسید مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں صحیح سمجھتے تھے۔ اس کے نتائج پورے نہ ہوئے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ جب کالج کی تعلیم ختم ہوگی تو وہ ذریعہ معاش اپنی طبیعت کے مناسب اور اپنی حالت کے موافق دیکھیں گے اور خود اختیار کرلیں گے۔ اس لیے انہیں کوئی خاص پیشہ یا صنعت کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ جس کا نتیجہ آج سرکاری ملازمتیں نہ ملنے سے بے چینی پیدا ہوگئی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہر

تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو جب دل خواہ سرکاری ملازمت مل سکے البتہ صنعت وحرفت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ جس قدر تعلیم یافتہ بڑھتے جائیں اسی قدر ان کی مانگ زیادہ ہوتی جائے گی۔

حالی مسدس میں اور ''ننگ خدمت'' نظم میں ذہنوں میں رچے بسے فاسد خیالات کو نکال کر صحیح طرز فکر کو جاگزیں کر رہے ہیں۔

پیشہ و حرفہ کو اخلاف کا شیوہ سمجھے
ننگ خدمت کو شرافت کا تقاضا سمجھے
عیب گننے لگے نجاری و حدادی کو
بیچنے پھرنے لگے جوہرِ آزادی کو

پھر کہتے ہیں:

گھر سے نکلیں کہیں آدابِ سیاست سیکھیں
الغرض مرد بنیں جرأت و ہمت سیکھیں
پیشہ سیکھیں کوئی فن سیکھیں صناعت سیکھیں
کشت کاری کریں آئینِ فلاحت سیکھیں

سچ تو یہ ہے کہ اُردو میں صنف شاعری ان مسائل کے لیے استعمال ہی نہیں ہوتی تھی۔ یہاں حالی سو سال قبل اُردو شاعری کو نئی ڈگر پر ڈال رہے ہیں۔ شاعری کسی مقصد اور زندگی کی ضرورت کی نشان دہی کر رہی ہے جس کا نعرہ پچاس سال بعد ترقی پسند شاعروں نے عالی ترین ہوٹلوں، عمدہ ترین موٹروں، بہترین ضیافتوں، قیمتی شرابوں سے نشہ میں چور ہو کر گبڈ ین کے لوٹ اور ڈاسن کے وبوٹ پہن کر زمین پر بیٹھے ہوئے کسانوں مزدوروں کلرکوں اور صنعت کاروں کے درمیان لگایا جو دوسری صبح خود فروختہ اخباروں نے افق کی طرح سرخیوں میں پھیلا دیا۔

حالی مسلسل قوم کو صنعت وحرفت کی طرف توجہ دلوا رہے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو صنعت وحرفت کی طرف متوجہ کریں کبھی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ہمارے نوجوانوں کو نئے طریقۂ زراعت کی تعلیم دلانی ضروری ہے۔

حالی مسلمان قوم کو تجارت کی طرف راغب کرنا چاہتے ہیں۔ تجارت سنت محمدی ﷺ بھی ہے۔ تجارت آزاد اور عزت دار پیشہ بھی ہے۔ تجارت اگر ایمانداری سے کی جائے تو عبادت ہے جس سے کئی دوسرے لوگوں کی شرکت بھی ہو سکتی ہے۔ وہی قومیں دنیا میں ترقی کر سکیں جنھوں نے تجارت کی کشتیوں کو سمندروں میں دوڑایا۔ تجارت ایک ایسا تجربہ ہے جو انسان کو انسانی قدروں سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ تجارت سے اقتصادی، اخلاقی، سماجی، علمی اور عملی قوتوں کو نمو حاصل ہوتی ہے۔ حالی نے اپنے مقالے میں تجارت کو ترقی سے جوڑا ہے کہ

> ”تجارت اور ترقی ہمیشہ اور ہر جگہ لازم وملزوم رہی ہیں۔ انسان کے اندرونی قویٰ کی ترقی علوم وفنون کی ترقی معلومات عامہ کی ترقی اخلاق کی ضوابط وقوانین کی ترقی آزادی کی ترقی غرض کہ ہر طرح کی ترقی ہی ترقی اس سے پیدا ہوئی ہے۔“

حالی کے کچھ خطوط سے پتا چلتا ہے کہ وہ بھی تجارت کرنا چاہتے تھے وہ دہلی میں ایک پرنٹنگ پریس قائم کرنا چاہتے تھے جو ان کی صحت اور سرمائے کے فقدان کی وجہ سے نہ کر سکے۔ حالی کے نواسے نے حالی پبلی شنگ پریس قائم کیا جہاں حالی کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ تجارت پر حالی کے نثری حوالے اشعار سے زیادہ ہیں۔ ایک دو شعر یہاں پیش کر رہے ہیں۔

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں
نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں

جو روشن ہیں تحصیل حکمت کی راہیں
تو ہموار ہیں کسب دولت کی راہیں
حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

حالی اگرچہ مبالغہ کے سخت مخالف تھے لیکن ان کے بہت سے اشعار میں مبالغے کی چاشنی نظر آتی ہے۔ وہ ایک باہُنر موچی کو افلاطون کے علم سے برتر کہتے ہیں:

کمال کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے
یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی

حالی نے جو اپنی گفتگو میں طبیعیاتی علم کے حصول کی مخالفت کی تھی اس کی بابت ممتاز حسین، حالی کے شعری نظریات کے تنقیدی مطالعہ میں لکھتے ہیں:

''اسے ابھی تک لوگ سمجھ نہیں پائے ہیں کہ ہر ٹیکنالوجی کے پیچھے طبیعاتی علم بھی ہوتا ہے۔ طبیعاتی علوم کے حصول کے بغیر دور حاضر میں کوئی بڑی چیز صرف مستری بننے سے نہیں بنائی جا سکتی۔ حالی طبیعاتی علوم سے بھی خوف زدہ تھے اور اس لبرل تعلیم سے جو ذہن کو جلا بخشتی ہے۔ اس کے برعکس سرسید صرف ٹیکنالوجی نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم لبرل تعلیم کے حصول پر خاص طور پر زور دیتے تھے سرسید نہ تو تجارت کو کلچر کا کوئی آلہ کار قرار دیتے ہیں اور نہ فن کفش دوزی یا ٹیکنیکل تعلیم کے زیادہ گن گاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مغرب میں علوم وفنون کی ترقی، نو آبادیاتی لوٹ کھسوٹ، نئی دنیا کی دریافت اور بھاپ کی طاقت سے چلنے والے جہازوں اور ترقی یافتہ ہتھیاروں اور فوجی ڈسپلن کی وجہ سے جو دولت سمٹ سمٹا کر یورپ کے ملکوں میں گئی۔ اس سے نہ صرف وہاں کے لوگوں

کے معیارِ زندگی بلند ہوا بلکہ عمومی حیثیت سے ایک رجائیت کا احساس بھی پیدا ہوا اور یہ خیال مشرق میں بھی غالب آتا گیا کہ ترقی کا واحد راستہ پیرویٔ مغرب میں ہے۔ یعنی سرمایہ دارانہ ترقی کی راہ پر چلنے میں ہے مگر تصویر کا یہ ایک رُخ ہے اس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ یورپ سرمایہ دارانہ رشتوں میں روز بروز جکڑے جانے اور لوٹ کھسوٹ اور غارت گری میں زیادہ سے زیادہ ملوث ہونے اور دولت کی پرستش کی وجہ سے انسانی رشتوں اور اخلاقی تصورات سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ جس قدر زیادہ سرمایہ جمع کرتا جا رہا ہے اتنا ہی وہ اندر سے کھوکھلا، بے روح آدمی، تہی نفس آدمی یا ایک جارحیت پسند حیوان بنتا جا رہا ہے اور اس عمل میں وہ حسن و خیر کی اقدار سے، مروت اور انسانیت کی اقدار سے بے گانہ محض ہوتا جا رہا ہے۔ حالی نے مغرب کے جس آدمی کو خلافتِ ارضی کا تاجِ فضیلت پہنایا تھا اس کی اس روحانی پستی کو انہوں نے نہیں دیکھا۔ دنیا کے کسی بھی شاعر نے تاجر یا بحری قزاقوں کے گیت نہیں گائے ہیں اور نہ تجارت کے باب میں یہ قصیدہ پڑھا ہے کہ یہ انسان کو عقل اور اخلاق سکھاتی ہے۔ لیکن حالی نے یہ سارے کام کیے اور مغرب کی ہنرمندی سے اس حد تک مرعوب ہوئے کہ یہ بھی لکھا کہ ''کفش دوزی کا فن علم افلاطون سے بہتر ہے۔''

حالی اس فریب میں مبتلا ہو گئے کہ مغرب کی طاقت کا سرچشمہ اس کی تجارت اور سرمایہ کاری میں ہے جبکہ حقیقت یہ نہ تھی۔ مغرب

کی ترقی اس کے علوم وفنون کی ترقی کی رہین منت ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس کے لیے دولت بھی درکار تھی اور اسے سرمایہ داروں نے اپنے مفاد کے لیے مہیا کیا۔ حالی مغرب کے اس نئے اخلاق کی اسپرٹ کو اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔ وہ مشرق کی غلامی کا مداوا مغربی تجارت اور سرمایہ کاری میں ڈھونڈتے رہے نہ کہ مغربی علوم وفنون اور اس ذہنی ترقی میں جس نے انسان کو زندگی کی نئی قدروں سے آشنا کیا۔''

حالی نے اپنے کلام میں برصغیر کی مختلف قوموں سے اتحاد کی دعوت دی۔ حالی جانتے تھے انگریز حکمرانوں اور ہندوستانی مسلمانوں میں فاصلے اور نفرت کی دیوار کھڑی ہو چکی ہے۔ مسلمان جو کبھی اس زمین پر حاکم اور حکمران تھے۔ اب محکوم بے مقام اور بے نشان ہے۔ برصغیر جو کسی دور میں دارالسلام تھا۔ اب وہابی تحریکوں نے دارالحرب قرار دیا ہے۔ انگریزوں کی پالیسی اور حکومت بھی برصغیر کے مختلف قوموں میں نفاق اور تفرقہ ڈالنے میں مصروف ہے۔

غدر سے بارہ سال قبل ہندوستان کے گورنر جنرل نے لکھا تھا کہ

''مسلمان بنیادی طور پر ہمارے مخالف ہیں اس لیے ہمیں ہندوؤں کو اپنا طرف دار بنانا چاہیے۔''

چناں چہ یہ پالیسی غدر کے بعد اور بھی سخت ہوگئی۔ پہلے مسلمان فوج، پولیس، عدالت اور سرکاری محکموں میں بڑی تعداد میں ملازم تھے۔ اب یہ تمام راستے ان پر بند ہو چکے تھے اور تقریباً تمام تر آسامیاں برصغیر کی دوسری قوموں خصوصاً ہندوؤں کو دی جاتی تھیں۔ جس کی ایک اور وجہ مسلمانوں کی جدید تعلیم سے دوری تھی۔ وہ انگریزی ذرائع تعلیم سے ناواقف تھے۔

سرسید کی تحریک نے انگریزوں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی کوشش کی وہ ایک طرف مسلمانوں کے دلوں سے انگریزوں کی نفرت کو دور کرنے کے لیے تحریروں اور تقریروں کے علاوہ تعلیمی پروجکٹ بنا رہے تھے تو دوسری طرف انگریزوں کے شک وشبہات کو کہ مسلمان غدار اور باغی قوم ہے دور کر رہے تھے۔ انگریز بھی اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ برصغیر میں اقتدار باقی رکھنا ہو تو مسلمانوں سے میل دوستی ضروری ہے۔

حالی سرسید کی کارروائیوں سے باخبر تھے اور تائید کرتے تھے۔ سرسید نے اپنے خطبات اور اپنی تفسیر القرآن میں ثابت کیا کہ

''اسلام فساد اور غدر کی اجازت نہیں دیتا جس نے ان کو امن دیا ہو
مسلمان ہو یا کافر اس کی اطاعت واحسان مندی کی ہدایت کرتا ہے۔''

سرسید نے مسلمانوں اور عیسائیوں کو نزدیک کرنے کے لیے بائبل کی تفسیر ''تبیین الکلام'' اسلام کے اصول کے مطابق لکھی۔ مسلمانوں کے دوسرے گروہوں کے برخلاف سرسید نے ڈاکٹر ہنر کی کتاب Our Indian Muslman اس بات کی تاکید کی کہ انگریزوں کی سرکار سے علاحدہ رہ کر دشمنوں کی مدد کرنا کسی بھی مسلمان کا مذہبی فرض نہیں۔ سرسید نے اپنے اسی مشن کو کامیاب کرنے کے لیے 1858ء میں اسباب بغاوت ہند میں مولانا فضل حق خیرآبادی کے فتویٰ کو جعلی بتایا اور یہ سرسید کا کھلا جھوٹ تھا کیوں کہ خود مولانا فضل حق خیرآبادی نے انگریزی عدالت میں کہا کہ

''وہ فتویٰ صحیح ہے۔ میرا لکھا ہوا ہے اور اب بھی میری رائے یہی ہے۔''

جس پر انگریزوں نے انہیں کالے پانی کی سزا دی۔ 1863ء کی سائنٹفک سوسائٹی کا قیام، انگریزی مدرسے کی بنیاد 1870ء میں تہذیب الاسلام کی اشاعت، 1869ء میں لندن کا سفر، 1875ء میں علی گڑھ اسکول، انڈین کانگریس سے دوری،

رسالہ احکام طعام اہل کتاب اور محمد حسین آزاد کے توسط سے موضوعی شاعری سب کچھ انگریزوں سے دوستی اور ہندوؤں اور برصغیر کی دوسری قوموں سے اتحاد بڑھانے کے لیے کیے گئے۔ حالی شاید ایک آدھ مسئلہ سے اختلاف رکھتے ہوں لیکن بظاہر انہوں نے سرسید کے تمام منصوبوں کی تائیدی لکھی ان کا سب سے بڑا کارنامہ موضوعاتی نظمیں اور مسدس کے علاوہ رسالوں میں تائید مضامین ہیں۔

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

وطن کی محبت قوموں کے درمیان سب سے بڑی اتحاد کی طاقت ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں انڈین کانگریس کے ساتھ دوسری ملکی انجمنیں بن چکی ہیں۔ وطن دوستی کی فضا سے حالی کام لیتے ہیں۔

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں — اے وطن تو تو ایسی چیز نہیں
تیری اک مشت خاک کے بدلے — لوں نہ ہر گز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا
تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو — بودھ مذہب ہو کہ ہو برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی — جین مت ہووے یا کہ بیشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو انکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد — شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر — کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر

حالیؔ قوم کی ترقی کا راز اس کی یک جہتی اتحاد و اتفاق اور ایک دوسرے سے ہمدردی میں جانتے ہیں۔ انہیں تاریخ کا درس دیا ہے انہیں برصغیر کے تجربات اور دوسری مشرقی قوموں کی روداد معلوم ہے۔ مسلمان ایک بڑی کثیر قوم ہونے کے باوجود کیوں ترقی نہ کرسکی؟

ایک کو جب ایک کی پروا نہ ہو جب قوم میں
ہے حماقت قوم کی کثرت پہ ہونا شادماں
قوم کس گنتی میں ہے وہ دل نہ ہوں جس کے ملے
گو کہ وہ کثرت سے اپنی گھیر لے سارا جہاں
ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں جن کے دل وہ قوم کیا
ہے وہ اک مقتل، لہو روتا ہے جس پر آسماں
یاد رکھو پڑ گئی جس ملک یا ملت میں پھوٹ
ہیں وہ اس مہماں سرا میں کوئی دن کے میہماں
غزنوی، غوری، مغل، سادات، لودی اور غلام
رہ گئے نوبت بہ نوبت ہند پر جو حکمراں
دن برے جب آئے اور باہم لگے سر پھوڑنے
صفحۂ ہستی سے اُن کا مٹ گیا نام و نشاں
دین کہتے ہیں جسے وہ خیر خواہی کا ہے نام
ہے مسلمانو! یہ ارشاد رسول ﷺ انس و جاں!
ہیں نمازیں اور روزے اور حج بے کار سب
سوز امت کی نہ چنگاری ہو گر دل میں نہاں

جس کا تم بھرتے ہو کلمہ، جس پہ پڑھتے ہو درود
نام پر جس کے عزیزو! تم فدا کرتے ہو جاں
جیتے جی اُمت کی لو دل کو رہی اس کے لگی
وقت آخر اُمت اُمت اُس کے تھا وردِ زباں
بھائی بھائی ہو گئے ہو دین کی برکت سے تم
ہے غضب گر بھائیوں پر ہوں نہ بھائی مہرباں
کھول کر دیکھو کتاب اللہ کی کہتی ہے کیا
''کلمہ پڑھ لینے سے کچھ حاصل نہیں بے امتحاں''
دین کا دعویٰ اور اُمت کی خبر لیتے نہیں
چاہتے ہو تم سند اور امتحاں دیتے نہیں
اُن سے کہہ دو، ہے مسلمانی کا جن کو ادّعا
قوم کی خدمت میں ہے پوشیدہ بھید اسلام کا
وہ یہی خدمت، یہی منصب ہے جس کے واسطے
آئے ہیں دنیا میں سب نوبت بہ نوبت انبیا

حالی نے جب وطن میں اتحاد کا رنگ گہرا کیا ہے۔ انسانی قدروں کو بلاتفریق مذہب و ملت اونچا کیا ہے۔ سوائے مرثیہ کے اُردو شاعری نہیں بلکہ کسی اور زبان کی شاعری میں بھی اس شدت اور پرزور طریقہ پر ان نکات پر گفتگو نظر نہیں آتی۔ حالی نے لفظ قوم یہاں برصغیر کی عوام کے لیے استعمال کیا جسے بعد میں سرسید نے صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص کیا۔

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی   اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
اہل دولت کو ہے یہ استغنا   کہ نہیں بھائیوں کی کچھ پروا

قوم پر ان کا کچھ نہیں احساں
ان کا ہونا نہ ہونا ہے یکساں
اب نہ سید کا افتخار صحیح
نہ برہمن کو شدر پر ترجیح
قوم کی عزت اب ہنر سے ہے
علم سے یا کہ سیم و زر سے ہے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو
قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

حالی کے ان اشعار کو اُس دور کے ماحول میں دیکھنا ہوگا جہاں ہر قوم وملت کا کنواں جدا ہوتا۔ بستیاں جدا ہوتیں ایک کی ایک کو خبر نہ تھی۔ محمود اور ایاز ایک صف تو کیا ایک چھت کے نیچے جمع نہ ہوتے تھے۔ ایسے تاریک ماحول میں حالی شمع اخلاق وانسانیت جلا رہے ہیں۔

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ
ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
نوکروں کی تمہارے جو ہے غذا
ان کو وہ خواب میں نہیں ملتا
کھاؤ تو پہلے لو خبر ان کی
جن پہ پپتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ
کہ ہے اترن تمہاری جن کا بناؤ
ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر
ہے کوئی ان میں خشک اور کوئی تر
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ
تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ
علم کو کر دو کو بکو ارزاں
ہند کو کر دکھاؤ انگلستاں

حالی اپنی قوم کو جو ناامیدی کا شکار ہیں۔ امید کی زندگی سے روشناس کرتے ہیں۔ یہ وہی شاعر کرسکتا ہے جس کا کلام تمام قوموں کے لیے ہو۔

اے میری امید میری جان نواز
اے مری دل سوز میری کارساز
نوح کی کشتی کا سہارا تھی تو
چاہ میں یوسف کی دل آرا تھی تو
رام کے ہمراہ چڑھی بن میں تو
پانڈوں کے ساتھ پھری بن میں تو
جی میں یہ آتا ہے کہ سم کھائیے
پھاڑ کے یا کپڑے نکل جائیے
اور کان میں پہنچی تری آہٹ جو ہیں
رخت سفر یاس نے باندھا وہیں

حالؔی بحیثیت ترقی پسند شاعر اور ترقی پسند نقاد

کیا حالی انگریز پرست تھے؟

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ترقی پسند شاعری انیسویں صدی سے شروع ہو چکی تھی۔ حقوق بشر کی حفاظت، غریبوں اور زحمت کشوں کی حمایت، ظالموں متکبروں اور ستم گر حکمرانوں سے نفرت اور ارضیت آدمیت سے محبت نظیرا کبر آبادی اور منیر شکوہ آبادی کے علاوہ مرثیوں کے تخلیق کاروں نے ان شعری قدروں کو اجاگر کیا ہے۔ غالب دہلوی ہماری شاعری کا پہلا بڑا اور حساس ترقی پسند شاعر ہے۔ جو ہمیں اُس دور کی ترقی کے راستوں کی نشان دہی اور رہنمائی کرتا ہے۔ غالب نے جو سرسید کی مرتب کردہ کتاب آئین اکبری کی تقریظ پر مثنوی لکھی وہ ایک ایسی دستاویز ہے جس میں زندگی کی ترقی اور پسماندگی کی نجات کی تلقین اور تاکید ہے۔جس کا مثبت اثر سرسید کی شخصیت میں نمایاں ہوا۔ غالب نے کہا تھا:

''انگریز صاحبوں کو دیکھو ان کے طریقے کار اور کاموں کو دیکھو۔
کتنے مفید کام کر رہے ہیں۔''

صاحبانِ انگلستاں رانگر — شیوہ و انداز انیاں رانگر

ان کے شہر راتوں میں روشن ہیں ان کی صنعتی ترقی سے ان کے ملک فردوس زمین بن چکے ہیں۔ ان کے دخانی جہازوں کو دیکھو جو پانی پر دوڑ رہے ہیں۔ ان کے مواصلاتی نظام کو دیکھو کہ الفاظ فضاؤں میں پرواز کر رہے ہیں۔ مردہ پرستی چھوڑ کر زندگی کو سنوارا جائے۔

از دخان زورق برفتار آمدہ
باد و موج این ہر دو بی کار آمدہ
نغمہ ہا بی زخمہ از ساز آورند
حرف چون طائر بہ پرواز آورند
مردہ پروردن مبارک کار نیست
خود بگو کان نیز جز گفتار نیست

اس (۳۷) اشعار کی تقریظ نے سرسید کی زندگی میں ایک انقلاب بپا کر دیا اگرچہ اُس وقت سرسید نے جذبات میں آ کر اس تقریظ کو آئین اکبری میں شامل نہیں کیا لیکن اس کے بعد پھر انہوں نے ایسا بے کار کام نہیں کیا اور وہ قوم کی تعلیم و تربیت اور انگلستان کی ترقی اور تمدن کی طرف متوجہ اور مشغول ہو گئے۔

غالب کے شاگرد حالی نے بھی مسدس میں کچھ بندوں میں انگریزوں کی مشینی اور صنعتی دور کی ترقیوں کا ذکر کر کے عوام میں اقتصادی، سماجی اور سیاسی احساس کو بیدار کیا۔

کُھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں — نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیل حکمت کی راہیں — تو ہموار میں کسب دولت کی راہیں
نہ گھر میں غنیم اور دشمن کا کھٹکا — نہ باہر ہے قزاق و رہزن کا کھٹکا
مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں — گھروں سے سوا چین ہے منزلوں میں

ہر اک گوشہ گلزار ہے جنگلوں میں
شب و روز ہے ایمنی قافلوں میں
سفر جو کبھی تھا نمونہ سفر کا
وسیلہ ہے وہ اب سراسر ظفر کا
پہنچتی ہیں ملکوں سے دم دم کی خبریں
کھلی ہیں زمانے پہ عالم کی خبریں
نہیں واقعہ کوئی پنہاں کہیں کا
ہے آئینہ احوال روئے زمیں کا

ترقی پسند قدروں کی قدر خود ترقی پسند ہے۔ شاید اُردو کے بعض شعرا نے انگریز حکومت کے ان اقدامات کو دل و جان سے قبول کیا ہو مگر حالی نے نہ صرف ان انسانیت سوز رسومات اور حالات کی پابندی پر جشن منایا بلکہ اس فکر کو برصغیر کے نادان اور جاہل افراد تک پہنچایا۔

اس عہد نے وہ خوں بھرے ہاتھ کیے قطع
جو پھیرتے تھے بیٹیوں کے حلق پہ خنجر
اس عہد نے کی آ کے غلاموں کی حمایت
انساں کو نہ سمجھا کسی انسان نے کم تر
دی اس نے مٹا ہند سے یوں رسم ستی کی
گویا وہ ستی ہو گئی خود عہد کہن پر
نابود کیا اس نے زمانے میں ٹھگی کو
اک قہر تھا اللہ کا جو نوع بشر پر

غالب کے شاگرد سرسید کے مصاحب الطاف حسین حالی ترقی پسند فکری، سماجی، ادبی اور تنقیدی شعور کے مالک تھے۔ وہ زوال پذیر بوسیدہ جاگیرداری نظام اور نیا ابھرتا ہوا توانا ترقی پسند سسٹم کو دیکھ رہے تھے۔ جس میں صنعت و حرفت جدید تعلیم و تربیت تجارت اور قوموں کے درمیان معاشرت کو بڑا دخل تھا جو حالی قوم کی اصلاح اور ترقی کے لیے حیاتی سمجھتے تھے۔ انہوں نے مختلف مقامات پر اپنے کلام بخصوص مسدس مدوجزر اسلام میں مسلمانوں کی کھوئی ہوئی حکومت سطوت اور عظمت کا صرف ماتم نہیں کیا بلکہ اس گم شدہ قدروں کو حاصل کرنے کا عزم بھی کیا جس کے لیے انہیں جدید ماحول کے مطابق ترقی پسند اقدامات بھی ضروری تھے۔ قدیم فرسودہ ڈگر پر رہ کر جدید منزل تک رسائی نہ ممکن تھی۔ وہ اپنے ایک مضمون میں جو ''زمانہ'' میں شائع ہوا مسلمانوں

سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

''اے ہندوستان کے مسلمانو! کیا تم ابھی اُسی عالم میں ہو جس میں تمہارے آباؤ اجداد زندگی بسر کر گئے ہیں؟ اور کیا تم اُسی کھیتی کے پروان چڑھنے کے منتظر ہو جس میں تمہارے بزرگوں نے تخم افشانی کی تھی؟ مدت ہوئی کہ وہ عالم گزر گیا اور وہ کھیتی دریا برد ہو گئی۔ ذرا آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ تم کون ہو اور کہاں ہو، تمہاری گرہ میں جو دام ہیں۔ وہ بازار میں آج پھوٹی کوڑی کو نہیں چلتے۔ تمہاری دوکان میں جو مال ہے اسے کوئی مفت بھی نہیں لینا چاہتا۔ تمہارے چراغ میں جو تیل تھا وہ جل گیا اور تمہاری کھیتی میں جو پانی تھا وہ سوکھ گیا۔ دیکھو تمہاری ناؤ بودی ہے اور دریا دم بدم چڑھتا جاتا ہے۔ تمہارا قافلہ پیادہ ہے اور منزلیں کٹھن آتی جاتی ہیں۔''

اب زمانہ بدل چکا ہے۔ مسدس کا ترقی پسند شاعر اپنی قوم کو جو پستی، کاہلی، جہل اور غفلت سے روٹی کپڑا اور مکان سے محروم ہو چکی ہے اور دوسری طرف ایک چھوٹی جماعت جو لوٹ کھسوٹ بے غیرتی اور عیاشی میں غرق ہو کر باعث ننگ و شرم رہ گئی ہے اپنی حق بیانی سے متوجہ کرنے کی پیہم کوشش کر رہا ہے۔

بہت آپ کو کہہ کے مسجد کے بانی — بہت بن کے خود سیّد خاندانی
بہت آگ چلموں کی سلگانے والے — بہت گھاس کی گٹھریاں لانے والے
بہت آستانوں کے خدام بن کر — پڑے مانگتے کھاتے پھرتے ہیں در در
مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں — ہنر اور پیشے کو جو خوار سمجھیں
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں — فرنگی کے پیسے کو مردار سمجھیں

دوسری جماعت کا حال یوں ہے:

امیروں کا عالم نہ پوچھو کہ کیا ہے — خمیر ان کا اور اُن کی طینت جدا ہے
دواؤں میں مشک ان کی اٹھتا ہے ڈھیروں — وہ پوشاک میں عطر ملتے ہیں سیروں
چھپاتے ہیں اوباش جن خصلتوں کو — نہیں کرتے اجلاف جن حرکتوں کو
وہ یاں اہل دولت کو ہیں شیر مادر — نہ خوف خدا ہے نہ شرم پیمبر
وہ جو کچھ کہ ہیں کہہ سکے کون ان کو — بنایا ندیموں نے فرعون ان کو

حالی ان فرعونوں اور نادانوں کو کہہ رہے ہیں تمہیں خواب غفلت سے جاگنا ہو گا زمانہ بدل چکا ہے۔ سماجی، سیاسی، عمرانی، اقتصادی، تعلیمی اور ادبی انقلاب کا ساتھ دینا ہو گا۔

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارا — کہ ہے آتشی میں مری یاں گزارا
نہیں پیروی جن کو میری گوارا — مجھے ان سے کرنا پڑے گا کنارا
سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی — چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی
تمہیں اپنی مشکل کو آساں کرو گے — تمہیں درد کا اپنے درماں کرو گے
تمہیں اپنی منزل کا ساماں کرو گے — کرو گے تمہیں کچھ اگر ہاں کرو گے
چھپا دست ہمت میں زور قضا ہے — مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے
سراسر ہو گو سلطنت فیض گستر — رعیت کی کود تربیت میں ہو یاور
مگر کوئی حالت نہیں اس سے بدتر — کہ ہر بوجھ ہو قوم کا سلطنت پر
ہو اس طرح ہاتھوں میں اس کے رعیت — کہ قبضہ میں غسال کے جیسے میت
وہی گر تجارت کے اس کو سمجھائے — وہی صنعت و حرفت اس کو بتائے
وہی کشتگاری کے آئیں سکھائے — وہی اس کو لکھوائے وہ ہی پڑھائے
ملا جس رعیت کو ایسا سہارا — کیا آدمیت نے اُس سے کنارا
یہ برکت ہے دنیا میں محنت کی ساری — جہاں دیکھے فیض اسی کا ہے جاری

یہی ہے کلید در قفل باری — اسی پر ہے موقوف عزت تمہاری
اسی سے ہی قوموں کی یاں آبرو سب — اسی پر ہیں مغرور میں اور تو سب

ہم نے تعلیمی، ادبی، شعری اور تنقیدی ترقی پسندی کے بارے میں مفصل گفتگو مختلف عناوین کے تحت کی ہے۔ جو حالی کی فکری شعور کا نتیجہ ہے۔ چناں چہ ان مطالب کی تکرار کی یہاں ضرورت نہیں۔ یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ جو بیج حالی نے برصغیر کی سنگلاخ زمین میں ترقی پسندی کا بویا تھا اُس کے پھل نہ صرف مسلمان معاشرے بلکہ دوسری اقوام کے ادیبوں اور شاعروں کے کاموں میں نظر آنے لگے۔ چناں چہ عورتوں کے حقوق، غیر فطری اور غیر انسانی رسومات کا انسداد کے علاوہ جدید علوم، صنعت و حرفت، صحافت، آزادی اور اخوت، حقوق بشر اور قومی اصلاح اور تنظیم کے راستے نمودار ہوئے اور برصغیر کے ذہنوں کی نشوونما کے اثر سے پچاس سال بعد ۱۹۳۰ء کے دہے میں روشن دماغوں نے اس تحریک کو ایک تنظیم میں منتقل کیا جسے انجمن ترقی پسند تحریک کہا گیا۔

برصغیر میں حالی پہلے شاعر ادیب اور ریفارمر تھے جنہوں نے جاگیرداری نظام اور سرمایہ داری کی مخالفت کر کے محروم اور مزدور طبقات کی حمایت کی۔ وہ نہ صرف پیشہ ورانہ زندگی کی تاکید کرتے ہیں بلکہ انہی سے زندگی کی گاڑی کی حرکت بتاتے ہیں۔

شرف جس سے نوع بشر کو ملا ہے
سب اس باغ کی جن سے نشوونما ہے
جو بوئیں نہ وہ تو ہوں جاں دار بے جاں
جو چھانٹیں نہ وہ تو ہوں جنگل گلستاں
یہ چلتی ہے گاڑی انہیں کے سہارے
جو وہ کل سے بیٹھیں تو بے کل ہوں سارے

حالی کو اس بات کا یقین ہے اور یہ قرآن کا وعدہ بھی ہے کہ دنیا کی باگ ڈور ایک دن محروموں زحمت کشوں اور زمین کے مستضعفوں کے ہاتھ ہوگی۔

نہیں جانتے وہ یہ عادت خدا کی کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

قصر و ایواں ہوں مبارک تم کو اے محنت کشو
عیش کے بندے بہت ہونے کو ہیں بے خانماں
یاد رکھو ہوں گے اب حقدار ان کے جانشین
ہاتھ سے حق کھو دیے اپنے جنھوں نے رائیگاں
ہوں کے مزدور اور کمیرے انکے اب قائم مقام
پھرتے ہیں بے کار جن کے کودک و پیر و جواں

حالی کا سودیشی تحریک کی تائید کرنا مزدوروں اور کاریگری کی ہر قسم سے حمایت کرنا اور ان کی ہمت افزائی اور عزت کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ان تمام افراد کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ کسی بھی چیز کے محتاج نہ ہوں بلکہ خام جنس جس کی ضرورت کسی بھی صنعت کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہے خود اپنی سرزمین سے محنت و مشقت کر کے حاصل کریں۔ وہ جانتے تھے جو چیز شیروں کو لومڑی بنا دیتی ہے وہ احتیاج اور ضرورت ہے۔

آنچہ شیراں را کند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

وہ دیکھ رہے تھے کہ ہندوستانی غریب سے غریب اور انگریز تاجر امیر بنتے جا رہے ہیں۔

نہ پاس ان کے چادر نہ بستر ہے گھر کا نہ برتن ہیں گھر کے نہ زیور ہے گھر کا
نہ چاقو نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا

جو مغرب سے آئے نہ مال تجارت — تو مر جائیں بھوکے وہاں اہل حرفت
جو سینے کو وہ ایک سوئی منگائیں — وہ مشرق سے مغرب میں لینے کو جائیں
ہراک شئے میں غیروں کے محتاج ہیں وہ — مکینکس کی رو میں تاراج ہیں وہ

حالی کی یہ صدائے بازگشت پھر ملک کے گوشے کناروں میں سنی جانے لگی۔ دل سے نکلی ہوئی بات دل میں اثر کرنے لگی۔ اب تحریکوں میں تنظیموں میں انجمنوں میں مشاعروں اور مناظموں میں حالی کے افکار کی تقلید ہونے لگی۔ کبھی اقبال نے، کبھی جوش نے، کبھی نجم نے اس لے میں نغمہ سرائی کی اور جب محفل میں سامعین کی آمدورفت ہوگئی تو ترقی پسند مصنفین کے تحت پر سب قوال اپنے ہاتھوں میں ساز اور اپنے گلوں میں بھاری آواز لے کر قوالی میں مصروف ہو گئے لیکن کسی کے قول میں بھی حالی کا ذکر نہ تھا۔ وہ حالی کو اس بزم سے اس لیے خالی کر رہے تھے کہ حالی نے اپنے کچھ اشعار میں انگریزی راج نقالی اور ڈفالی کی تھی۔

حالی ایک طرف قدیم فرسودہ رسومات پیشوں اور بے سود علموں کو جدید ترقی یافتہ علوم اور صنعتوں سے بدل دینے کی ترغیب کر رہے تھے تو دوسری طرف وہ قدیم علوم اور پیشے جو جدید مغربی تہذیب کے اثر سے خطرے میں پڑ چکے تھے۔ لوگ ان کی طرف توجہ نہیں کر رہے تھے ان کی تشہیر و ترویج کی طرف بھی کوشاں تھے۔ چناں چہ طب یونانی جو ہزاروں سال پہلے یونان سے نکلی لیکن اسلامی حکومتوں کے دور میں اسے ترقی نصیب ہوئی اس کی بقا کے بارے میں ہمیں جگاتے ہیں۔ راقم نے طب یونانی اور یونانی حکیموں کے بارے میں حالی سے پہلے کسی اُردو شاعر کو اسی طرح کے مضمون کو نظم کرتے نہیں دیکھا۔ چند نمونے کے اشعار حالی کی نظم گدایانِ قوم تصنیف ۱۹۰۰ء یہ ہیں:

زندہ طبابت ہے ہماری ابھی
فیض کا چشمہ ہے یہ جاری ابھی

ہند میں اسلام کی ہے یادگار
اس کا ہے پبلک میں وہی اعتبار
ملک میں ہے اس کی ضرورت بہت
قوم کو ہے اس سے عقیدت بہت
جانتے ہیں اس کو پسندیدہ سب
اس کے علاجوں کے ہیں گرویدہ سب
یہ بھی ہے معلوم کہ دنیا میں آج
سب سے سوا ہم میں ہے اس کا رواج
اس کے مصنف ہیں مسلماں تمام
غیر کا تم اُن میں نہ پاؤ گے نام
اس نے جنم خواہ کہیں ہو لیا
پرورش اسلام نے اس کو کیا
عہد سے عباسیوں کے آج تک
فن یہ ہمارا تھا نہیں اس میں شک
پر نظر آتی نہیں اب اس خیر
روز بروز اس کا ہے اب حال غیر
جاتا ہمارے ہی نہیں ہاتھ سے
ڈر ہے کہ دنیا سے نہ وہ چل بسے
حاذق الملک اس کا مربی تھا جو
کنج لحد میں وہ رہا جا کے سو

اب نہ رہا اس کا سہارا کوئی
اس کے چمن کا چمن آرا کوئی
چاہیے اب قوم سنبھالے اُسے
نزع کی حالت سے نکالے اُسے
طب کو گر اپنی نہ سنبھالیں گے ہم
اک بڑی دولت کو گنوا دیں گے ہم

(حاذق الملک۔حکیم عبدالمجید خان بانی مدرسہ طیبہ دہلی)

یہ جو اعتراض حالی پر کیا جاتا ہے کہ وہ انگریز پرست تھے اور اس کی تائید میں ان کے کلام سے چھانٹ چھانٹ کر کچھ اشعار اور مصرعے پیش کیے جاتے ہیں۔ اُس میں تھوڑی بہت حقیقت ضرور ہے کہ حالی نے ایک غاصب قوم کو جو تبیض نژاد، رنگ، قوم اور زبان میں مشہور تھی اور ملکہ وکٹوریا کے مرثیے میں بھی کیے۔ اس مسئلہ پر انصاف کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمیں اُس ماحول اور اُس زمانے کی سیاسی دنیا کو بھی دیکھنا چاہیے۔ برصغیر کی اکثریت مسلمان سلطنتوں کی نابودی کا جشن منا رہی تھی۔ چناں چہ غدر کے فوری بعد وہ سب انگریزوں کے ساتھ ہو گئے اور ان کی سماجی ادبی رفاہی علمی تعلیمی تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے یہ اور بات ہے کہ بعد میں اکثریت کا ایک خاص گروہ جس کی سرکردگی گاندھی جی اور ان کے رفقا نے انگریزوں کی مخالفت کی اور اُس وقت انگریزوں کو یہ محسوس ہوا کہ برصغیر جاگ رہا ہے اور

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگی

ایسے پرآشوب دور میں سرسید کی حکمت عملی نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ انگریزوں سے مخالفت کرنے کے بجائے اکثریت کی طرح ان کے سماجی رفاہی اور تعلیمی

کاموں سے فائدہ اٹھایا جائے تا کہ عزت نفس کی زندگی بسر کر جائے۔ انگریزوں میں سب جفاکش ظالم غاصب اور قاتل نہ تھے بلکہ کئی شریف انسان برٹش ظلم کے کم از کم زبان سے قائل ضرور تھے۔ برصغیر میں امن وامان کی برقراری ضروری تھی کیوں کہ یہ بھی دنیا کا اصول ہے کہ جب اچھے لوگ گردن موڑ لیتے ہیں تو بُرے لوگ اپنا کام کر جاتے ہیں۔ کوئی بھی حکمراں کی کرسی کبھی خالی نہیں رہتی اگر شریف لوگ اُس کرسی کو پسند نہ کریں تو رذیل اور بدمعاش اُس پر بیٹھ جاتے ہیں۔

حالی دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی طرح اس کوچہ سے بغیر صدا وشور گزر سکتے تھے اور اس سے اپنے شخصی فایدے بڑھا سکتے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ صرف اچھے کام کرنے کا انعام نہیں بلکہ اُن کاموں کے بارے میں بھی سوال کیا جائے گا جس کو نہیں کیا گیا اور جس کے کرنے میں قوم کا فائدہ تھا؟ اسی لیے حالی نے یہ بڑا پتھر یک وتنہا اٹھا کر محراب انسانیت میں سجا دیا جس کی وجہ سے حالی ہر دور کے حالی ہوئے۔

برصغیر کی بے روزگاری، بے کاری، غربت اور افلاس کی ایک بڑی وجہ ترقی یافتہ قوموں کی استعمار گیری تھی۔ یورپ کے کارخانوں سے بنا بنا مال برصغیر میں استعمال ہوتا۔ یہاں صرف مصرف کنندہ ہوتے تھے اور تولید دھندے سب امیر یورپ کے تاجر تھے۔ اُردو ادب کا پہلا شاعر جس نے اس طرف عوام کی توجہ مبذول کی حالی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض مقامات پر حالی نے انگریزوں کی مدح سرائی کر کے آزادی کے پرستاروں کو شرمندہ کیا ہے۔ یہاں حالی انگریز حکمراں اور شاہ وملکہ کی توصیف کر کے ظالم کی تائید کر رہے۔ ہم یہاں جشن جوبلی کے کچھ اشعار پیش کرتے ہیں جو کسی مزید توضیح اور تشریح کے محتاج نہیں۔

یہ عہد کہ گزرے ہیں برس جس کو پچاس اب
ست جگ سے ہے یہ ہند کے حق میں کہیں بہتر
وہ دور تعصب تھا یہ ہے دورۂ انصاف
وہ جنگ کا موجد تھا یہ ہے صلح کا رہبر
اے نازش برطانیہ اے فخر برنزک
اے ہند کے گلے کے شباں ہند کی قیصر
سچ یہ ہے کہ فاتح کوئی تجھ سا نہیں گزرا
محمود نہ تیمور نہ دارا نہ سکندر
تسخیر فقط اگلوں نے عالم کو کیا تھا
اور تو نے کیا ہے دل عالم کو مسخر
بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا
سنکھ اور اذاں گونجتے ہیں روز برابر
گو منتِ قیصر سے ہے ہر قوم گراں بار
احساں مگر اسلام پہ اس کے ہیں گراں تر
گر برکتیں اس عہد کی سب کیجیے تحریر
کافی ہے نہ وقت اس کے لیے اور نہ دفتر
قیصر کے گھرانے پہ رہے سایۂ یزداں
اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایۂ قیصر

تعجب یہ ہے کہ حالی یہ نظم جشن جوبلی مسدس کے بعد لکھ رہے ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ مسدس حالی کی تاریخی معلومات کے لیے کم از کم پانچ ہزار صفحات کا مطالعہ درکار ہے جو یقیناً حالی نے کیا ہوگا۔ اس عہد کی کون سی برکتیں تحریر کریں، اودھ کی بربادی، دہلی کی تاراجی، مسلمانوں کی نابودی، بے گناہوں کی سزا وغیرہ وغیرہ اگر ان حالات کو رقم کریں تو

کافی ہے نہ وقت اس کے لیے اور نہ دفتر

انگریز غاصب قوم کے لیے حالی کا یہ کہنا اگر غلط بیانی اور جھوٹی مدح نہیں تو پھر کیا ہے:

خیر کے پتلے ہیں انگلش قوم کے سب مرد و زن
تم زمیں کے ہو نمک مصلح ہو تم اقوام کے
ہے تمہاری قوم کی خصلت پہ مشہور زمن
نوع انساں کی مدد کرنا تمہارا ہے شعار
تقویت دینا ضعیفوں کو تمہارا ہے چلن

ملکہ وکٹوریا کے بارے میں یہ شعر دیکھیے:

تم نے پھیلائی ہے اور پھیلاؤ گے نیکی سدا ہیں گھرانے کی تمہارے نیکیاں ضرب المثل

یہ تو سکے کا ایک رخ تھا۔ حالی کے خیالات آخری عمر میں بدل چکے تھے۔ سرسید تو آخری سانس تک انگریزوں پر بھروسہ کرتے رہے لیکن حالی نے انگریزوں کے ریاکارانہ رویے اور سازشی معاملات سے آگہی پیدا کر لی تھی اب وہ دیکھ رہے تھے کہ

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا ہے
دیکھ کے اس کے سارے تمہارے آگے یاد احسان
ہمیں

کبھی کہتے ہیں:

وہ دن گئے کہ نازاں تھی قوم سلطنت پر اب قوم کو خدا کا یا اپنا آسرا ہے
بنے آج جو گلہ باں ہیں ہمارے وہ تھے بھیڑیے آدمی خوار سارے

وہ حالی جو انگریزوں کی وفاداری کی بانسری بجا رہے تھے اب وہ ہمیں مشاطہ کی زبانی کہہ رہے ہیں:

ہے ان کی دوستی پر ہم کو تو بدگمانی وہ ہم کو دوست سمجھیں یہ ان کی مہربانی

کبھی کہتے ہیں:

پاؤ گے نہ کوئی قاف سے لے تا قاف
حق تلفیوں کے دل میں نہ ہوں جس کے شگاف
گر غور سے سنیے غل ہے یہی چار طرف
انصاف انصاف آہ انصاف انصاف

حالی نے جس کو رہنما سمجھا وہ رہزن نکلا جس کو مسیحا سمجھا وہ ایسا جلاد نکلا جو

مرنے کے بعد بھی مردہ کو کوڑے لگا رہا تھا۔

درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص
قافلے گزریں وہاں کیوں کر سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن اور رہنما ایک ہی شخص

حالی نے اس طرح اپنی غلطی کا اعتراف اور انگریز کے حقیقی چہرے کی نقاب کشی کی۔

حالی کے سیاسی، سماجی، اجتماعی، علمی، شعری، حقوقی، اخلاقی، مذہبی، اقتصادی اور رفاہی شعور میں برصغیر کے مسلمانوں کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اس کا مطلب یہ نہیں کہ حالی کوتاہ نظر اور فرقہ پرست تھے بلکہ جس طرح ایک ذمہ دار باپ اپنی اولاد میں سب سے زیادہ توجہ اپنے کمزور نادان نااہل اور کاہل بچہ پر دوسرے بچوں کی نسبت صرف کرتا ہے اُسی طرح حالی برصغیر میں مسلمانوں کو اپنے داخلی اور دوسری قوموں کے عاید شدہ خارجی مسائل میں گرفتار دیکھ رہے تھے۔ تفرقہ مسلمانوں کی سب سے بڑی اور مہلک بیماری تھی۔ حالی تاریخ داں تھے۔ وہ جانتے تھے بڑی بڑی اسلامی حکومتیں صرف اور صرف نااتفاقی باہم جنگ وخوں ریزی کے باعث مٹ گئیں جن کے کھنڈر آج بھی اپنی بے زبانی سے کہانی سنا رہے ہیں۔

حالی نے ایک واعظ کی طرح سے صرف آدرش نہیں دیا بلکہ عملاً اس کا ثبوت بھی دیا۔ جیسا ہم نے پہلے بھی بیان کیا ہے حالی اُردو ادب کے وہ پہلے شاعر ادیب مصلح اور دانش ور ہیں جنہوں نے کھل کر اُن متعصب سود جو خود پرست مولویوں پر اعتراض کیا ہے جو قوم میں تفرقہ پھیلا رہے تھے سادہ افراد کے ذہنوں کو تعصب کی ہوا سے آلودہ کر رہے تھے مسلمانوں کے رفاہ گروں مصلحوں پر کفر کے فتوے صادر کر رہے تھے۔

اخبارات رسالے کتابچے اور کتابیں نفرت اور عداوت پھیلانے کے لیے لکھی جا رہی تھیں۔

سرسید احمد خان، ڈپٹی نظیر احمد، شبلی نعمانی اور دیگر مسلمان دانش مندوں کے لیے مکہ و مدینہ سے کفر کے فتوی منگوائے جا رہے تھے۔ تعلیمی محاذوں میں مسلمان ایک دوسرے کے دست و گریباں ہو رہے تھے قصہ مختصر عرب قبیلوں کی طرح لڑائی یہاں قلمی جنگ بن چکی تھی ایسے نازک موقع پر بھی حالی نے سرسید کی حمایت میں ''سیداحمدخاں کی مخالفت کی وجہ'' سیداحمدخاں کی تصانیف کی تردید ''تکفیراہل اسلام'' کئی نظموں اور غزلوں کے اشعار کے علاوہ ''مرثیہ سرسید'' میں سرسید کی عظمت اور ان کی خدمات کا تذکرہ کرکے ان کو کافر قرار دینے والوں کو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا اہتمام کیا۔

حالی کا موقف دنیا بھر کے مسلمانوں سے امیر مینائی کے شعر کا مصداق تھا۔

خنجر چلے کسی پر تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

حالی کے زمانے میں ترکی خلافت اور اس کی مذہبی پیشوائی باقی تھی۔ محمد عبدہٗ، قطب الدین اور جمال الدین افغانی کی تحریکات پھیل رہی تھیں جن سے انگریزوں کو تشویش تھی جس کا نتیجہ بلقان اور طرابلس میں جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ سرسید نے انگریز وفاداری کے تحت انگریزوں سے وفاداری کو شرعی طور پر جائز قرار دے کر ترکی کے خلیفہ کی مذہبی پیشوائی کو ناجائز بتایا۔ حالی اگرچہ پیشوائی کو جائز نہ کہہ سکے مگر ترکی خلافت کی بھرپور حمایت کی اور جنگ بلقان اور طرابلس کی جنگ میں مسلمانوں کی حمایت کی۔

انگریز حکمران چونکہ ترکی خلافت کے اثر کے شاکی تھے۔ حالی نے اپنی نظم میں اشاروں اور استعاروں میں پوری داستان سنا دی۔

رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا ہیں دگرگوں زمانے کے انداز
چھپتے پھرتے ہیں کبک و شیہو سے گھونسلوں میں عقاب اور شہباز
دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس اور یاروں کے یار ہیں غماز
وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر موج ہائل ہے اور ہوا ناساز
یا تھپیڑے ہوا کے لے ابھرے یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز
کام اسے اپنے سونپ دو حالی نہیں جس کا شریک اور انباز

اسی طرح حالی جنگ بلقان اور طرابلس کی ترکی کی حمایت میں جب ظفر علی خان گئے تو ان کی تائید میں کہتے ہیں:

ہاں اس میں نہیں مبالغہ کچھ سنتا بھی ہے اے ظفر علی خان
نازاں ہے وہ درس گاہ تجھ پر تعلیم پہ جس کی تو ہے نازان
کاش ایسے جنے سدا وہ فرزند جو قوم کے درد کے ہو درمان
بلقان و طرابلس میں ناگاہ اٹھا ستم و جفا کا طوفان
ڈالا یہ تری پکار نے غل جی اٹھے وہ مردے جو تھے بے جان
اسلام کی سمجھے اب حقیقت جو نام کے تھے فقط مسلمان
مشرق میں ہوں درد دل سے بے چین مغرب میں سنیں جو رنج اخوان

کیا حالی اُردو تنقید کے بنیاد گزار ہیں؟

اُردو تنقید اگرچہ مغربی تنقید سے متاثر رہی۔ انیسویں صدی کے اواخر سے آج تک کئی ناقدوں نے اِسے کم و زیادہ غربی تنقیدی قدروں سے جوڑنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود اُردو تنقید کا اپنا مزاج باقی رہا۔ پہلے اس کا علمی اور ادبی معیار کم اور فنی اور جذبی انحصار زیادہ تھا اسی لیے گفتگو صرف مدح اور قدح تک کی جاتی تھی۔ ہر بالغ نظر اپنے نظریات کا محافل، مشاعروں، مقدموں، تقریظوں، دیباچوں اور تذکروں میں دو ٹوک فیصلہ کر دیتا جس کی وجہ سے دو اختلافی خیالات ایک شخصیت یا صنف کے بارے میں ہمیں نظر آتے ہیں جن سے کنفوژن پیدا ہوا۔ غزل کی صنف ہی کو لیجیے۔ بیسویں صدی میں وہ صنف جو اُردو شاعری کا معیار اور آبرو سمجھی جاتی تھی اور جسے غزل کے شعرا جن میں فانی اور جگر شامل ہیں۔ اصل شاعری کہتے تھے اُسے کلیم الدین احمد نے نیم وحشی صنف اور عظمت اللہ خان نے گردن زدنی کے لایق قرار دیا اور نظم جسے عوام نے قافیہ پیمائی کا نتیجہ جانا اسے شاعری کی جان تصور کیا۔

میر نے جرأت کی شاعری کو چوما چاٹی کی شاعری، تو ایک طرف خان آرزو نے سودا کی شاعری کو ''حدیث قدسی'' کا مرتبہ دیا۔ شیفتہ جن کی ادبی مصاحبت سے حالی حالی بنے جن کو دکھائے بغیر غالب نے شعر کو داخل دیوان نہ کیا وہ بھی اپنے تذکرے

میں آدھے درجن شاعروں پر جو ریویو لکھے وہ سب دوستی اور قربت کی دین ہے۔فکری اور تنقیدی اصول بنائے جاتے اور صرف اپنی پسند کو کسی دلیل اور جواز کے بغیر پیش نہ کرتے تو مثال قائم ہو سکتی تھی لیکن اس کے برخلاف وہ نظیرا کبرآبادی جیسے عمدہ شاعر کو یہ کہہ کر کہ یہ سوقیانہ کلام ہے۔شاعری کی سلطنت سے باہر کر دیں، آئین تنقید میں ناجائز اور شریعت شاعری میں حرام ہے۔

تخلیق اور تنقید کا ساتھ چولی اور دامن کا ساتھ ہے۔تخلیقی وجود کے ہمراہ تنقیدی شعور ہوتا ہے اگر چہ یہ شعور ہر تخلیق کار کی ''ہمت اوست'' سے بندھا رہتا ہے اور اس کا تعلق بھی زیادہ تر لاشعور ہی سے رہتا ہے۔ بڑا شعری یا ادبی کارنامہ فن پارہ ایک عمدہ تنقیدی شعور کے بغیر وجود میں نہیں آ سکتا۔شعر کا سب سے پہلا نقاد خود شاعر ہوتا ہے۔ٹی ایس ایلیٹ کہتا ہے: ''ایک عمدہ تخلیقی فن پارے کے لیے ایک عمدہ تخلیقی ذہن درکار ہوتا ہے۔ جب ایک تخلیقی ذہن دوسرے سے بہتر ہوتا ہے تو اکثر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو بہتر ہوتا ہے وہ تنقیدی صلاحیت زیادہ رکھتا ہے۔''

یہ سچ ہے کہ تخلیق کو تنقیدی شعور جو خود تخلیقی کیفیت ہے جدا نہیں کیا جا سکتا اسی لیے ہڈسن کہتا ہے: ''سچی تنقید بھی چوں کہ اپنا مواد اور جذبہ زندگی سے لیتی ہے اس لیے اپنے رنگ و عمل میں وہ بھی تخلیقی ہے۔''

مشرق کے شعر و ادب میں زمانے قدیم سے جب نقاد کا وجود اور علمی ادبی تنقید کی باقاعدہ تعلیم و تربیت نہ تھی خود ایک کہنہ مشق استاد شاعر اس مسند تنقید پر بیٹھ کر عمومی اور خصوصی شعری محافل میں، دیباچوں، مقدموں اور تذکروں کی تحریروں میں تنقیدی اور ادبی تاثیرات بیان کرتا تھا۔ جسے عوام اور خواص کی تائید حاصل رہتی اور وہ خود اس بات کا اقرار بھی کرتا

مستند ہے مرا فرمایا ہوا

جہاں تک اُردو شعر و ادب کا تعلق ہے۔ سب سے پہلا تنقیدی تذکرہ میر تقی میر کا نکات الشعرا ہے۔ دوسرے درجنوں تذکرے جو قیام الدین قایم چاند پوری کے تذکرے ''مخزن نکات'' لچھمی نرائن شفیق کے چمنستان شعرا سے محمد حسین آزاد کے تذکرے آبِ حیات تک نظر آتے ہیں۔ اپنے اپنے طور پر جداگانہ تنقیدی دستاویزیں ہیں جن میں شعرا کے مختصر حالات، نمونہ کلام کے ساتھ زبان اور بیان پر کچھ گفتگو جو زیادہ تر الفاظ و محاورات اور تشبیہات اور استعارات تک محدود ہے۔

حالی سے پہلے غیر منظم اور سرسری اُردو تنقید کی روایت موجود تھی۔ شاعر خود اپنے فن کا ناقد بھی ہے۔ چناں چہ عمدہ تخلیقاتی سرمایہ بغیر تنقید کے وجود میں نہیں آیا اگرچہ یہ تنقید شخصی اور لاشعوری ہی کیوں نہ ہو۔ شعری محافل اور مشاعرے بھی ایک حد تک تنقیدی دبستان کا کام انجام دیتے جہاں شعر کے حُسن و عیب، زبان و بیان اور مضمون و خیال سے آگاہی ہوتی۔

شعری بیاضوں، تذکروں، مقدموں اور دیباچوں میں بھی کسی نہ کسی طرح شاعر کی شخصیت اور اس کے فن پر کچھ پسندیدہ اور کچھ ناپسندیدہ گفتگو تحسین اور تعریض کی شکل میں نظر آتی لیکن باقاعدہ تنقیدی اصولوں کو مرتب کر کے، شعر اور شاعری کی اصلیت پر نظریات قائم کر کے مغربی لٹریچر کے تنقیدی رویوں سے استفادہ کر کے، حالی نے اپنے تجربوں اور ماحول کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر بڑی عقل مندی، متانت اور سنجیدگی کے ہمراہ اپنی بصیرت اور شعری افادیت کو قطعیت کے ساتھ مقدمے شعر و شاعری میں شائع کر کے منطقی اور علمی تنقید کا آغاز کیا۔ اسی بنا پر وہ اُردو تنقید نگاری کے بانی اور مقدمۂ شعر و شاعری اُردو ادب کی پہلی تنقیدی تصنیف قرار پاتی ہے۔ ڈاکٹر عابد حسین لکھتے ہیں:

''۱۸۹۳ء میں حالی نے اپنی قدیم اور جدید غزلوں کا مجموعہ ایک

مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ جس میں شعر و شاعری کی حقیقت پر نہایت دلچسپ اور نتیجہ خیز بحث کی ہے۔ اسی سے اردو زبان میں علمی تنقید کی بنیاد پڑی۔ ورنہ اس سے پہلے تنقید صرف اس کا نام تھا کہ شعر عروض کے کانٹے میں تولا جائے اور ہر لفظ اور ہر محاورے کی سند استادوں کے کلام سے طلب کی جائے۔ حالی نے اس مقدمہ میں فن شعر خصوصاً اُردو شاعری کا وہ دستور العمل مرتب کر دیا ہے جو شعر کہنے والوں کے لیے ہمیشہ شمع ہدایت کا کام دے گا۔''

کلیم الدین کا کہنا ہے:

''اُردو میں نئی تنقید کی ابتدا حالی سے ہوئی ہے۔ اردو تنقید کی دنیا محذوف و مقصود کے جھگڑوں، زبان و محاورات کی صحت، اسناد کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی۔ حالی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کر کے بنیادی اصول پر غور وفکر کی۔ شعر و شاعری کی ماہیئت پر کچھ روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے استفادہ کیا۔ اپنے زمانے اپنے ماحول اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ لائق ستائش ہے۔ حالی صرف اردو تنقید کے بانی ہی نہیں اس وقت تک اردو کے بہترین نقاد بھی ہیں۔''

عبدالسلام ندوی 'شعرالہند' میں لکھتے ہیں:

''دورجدید میں جب الفاظ و محاورات کو چھوڑ کر مارے شعرا کی توجہ تمام تر معانی و مطالب کی طرف مبذول ہوگئی اور اُردو شاعری پر معنوی حیثیت سے اعتراضات کیے جانے لگے وہ جدید

شاعر کے ساتھ فن تنقید کا بھی ایک نیا دور شروع ہوا اور سب سے پہلے مولانا حالی نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں اُردو کے تمام متداول اصنافِ شاعر پر اصول فن کے مطابق بحث کی اور آج معنوی حیثیت سے اردو لٹریچر میں بھی مقدمہ فن تنقید کا بہترین نمونہ خیال کیا جاتا ہے۔''

اختر انصاری کا خیال صحیح ہے کہ

''اگر حالی کی تنقید اور اُس کی ذہنی سطح کو نظر میں رکھ کر دیکھیے تو اس دور کی بقیہ تنقید بازیچۂ اطفال معلوم ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر تو ہماری تنقید حالی کے زمانے کی تنقید سے بہت آگے ہے۔ مگر حالی کی تنقیدی کارگزاری اپنے وزن اور گراں مایگی کے لحاظ سے آج تک منفرد اور بے مثال ہے۔ مقدمہ شعر و شاعری اردو تنقید کی خشت اول ہونے کے باوجود بعد کے تمام تنقیدی کارناموں پر فائق ہے۔ وہ تنقید کے میدان میں ایک منارۂ نور ہے، بلند، عظیم اور برگزیدہ بھی اور ضوریز وضیا پاش بھی۔''

حالی کے دو تاریخی اور علمی کارنامے ہیں۔ ایک مقدمہ شعر و شاعری اور دوسرا مسدس مدو جزر اسلام مقدمہ شعر و شاعری اُردو تنقید کی تاریخ میں نظریاتی تنقید کا پہلا مکمل نمونہ ہے۔ جس میں شاعری کی ضرورت شاعری کی ماہیئت اور حقیقت، شاعری اور شاعر کے لیے ضروری شرایط، وزن ردیف اور قافیہ کی بحث اور اس کے بعد اُردو شاعری کی مختلف اصناف غزل مثنوی قصیدہ مرثیہ وغیرہ سے بحث کی ہے حالی کی سب سے سخت تنقید غزل پر ہے۔

کس کس نے حالؔی کی مخالفت کی؟

یہ سچ ہے کہ اس مختصر گفتگو میں حالی کے سارے مخالفین کا ذکر ممکن نہیں۔ حالی کے دوست بے شمار تھے لیکن دشمنوں اور مخالفوں کی کمی بھی نہ تھی۔ ان کے مخالفین میں مذہبی و غیر مذہبی اور دوست نما دشمن شامل تھے۔ حالی کی مخالفت کی ایک خاص وجہ ان کی سرسید سے دوستی، علی گڑھ تحریک سے وابستگی اور سرسید کی سوانح، حیات جاوید کی تصنیف تھی۔ ہماری اس تحریر میں چند پردہ نشین مردوں کے نام بھی آئیں گے جو ظاہراً دوستی کا دم بھرتے تھے لیکن ان کے دل حالی سے صاف نہ تھے۔ بقول میر انیس:

''میں نے تو ایک دل بھی نہ دیکھا جو صاف ہو۔''

حالی کی علمی مخالفت ادیبوں اور شاعروں کا مرغوب مشغلہ تھا۔ اگرچہ سرسید، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ محمد اقبال کی طرح حالی پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا گیا مگر حالی کی شخصیت اور فن کو مسلسل نشانہ بنایا گیا۔ حالی کے دور کے سیاہ اوراق آج بھی موجود ہیں۔ مذہبی لوگ حالی کو سرسید کی بانسری اور نیچری کہتے تھے۔ حالی نے جو

اُردو شاعری کی پاکیزگی کی مہم کو اپنا شعار بنایا تھا وہ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو کھلتا تھا کیوں کہ وہ حالی کو اہل دلی اور لکھنو نہیں مانتے تھے وہ حالی کو پانی پت کا ایک معمولی شاعر جانتے تھے۔

دلّی دلّی کیسی دلی
پانی پت کی بھیگی بلی

حالی کی مخالفت ان کی موضوعاتی نظموں سے شروع ہو چکی تھی۔ مسدس حالی کی عوام میں پذیرائی ان کے مخالفین کے لیے خطرے کی گھنٹی محسوس ہو رہی تھی جو فن برائے فن وہ بھی بطور تفنن کے قایل تھے۔ حالی ایسی شاعری کو عفونت میں سنڈاس سے بدتر بتا رہے تھے اور ایسے شاعروں کی موجودگی یا غیر موجودگی سے متاثر نہ تھے جیسا کہ انہوں نے مسدس میں علانیہ کہا تھا۔

یہ ہجرت جو کر جائیں شاعر ہمارے
کہیں مِل کے خس کم جہاں پاک سارے

مقدمہ شعر و شاعری میں چوما چاٹی کی شاعری پر شدید ردعمل نے لکھنو اور دلی کے رومانی شعرا کو حالی کے مقابل کر دیا۔ درجنوں حالی کو دشنام اور نازیبا خطوط ملنے لگے۔ مختلف روزنامے اور رسالے مستقل طور پر حالی کے خلاف صف آرا ہو گئے جن میں حسرت موہانی کا اُردو مُعلّٰی اور سجاد حسین لکھنوی کا اودھ پنچ پیش پیش تھے۔ حالی کے خلاف سوقیانہ ہجو لکھی جانے لگیں۔ اودھ پنچ کے سرورق پر کئی سال تک یہ شعر چھپتا رہا۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

حالی کو خالی، جعلی، مالی، خیالی، اور ڈفالی جیسے ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔ لکھنو اور دلّی کے اہل زبان کہتے تھے:

''یہ پانی پتی شخص کس جرأت سے اہل زبان کے ہم زبان ہی نہیں بلکہ مسیحائے زبان ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔''

حالی ان تمام حملات کا خاموشی سے جواب دے رہے تھے اور ہمہ تن دن رات چمنستان شعر کی پاکیزگی میں مصروف تھے۔

اُردو دنیا اور دنیائے ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معاصرین پر تخریبی تنقید نظر آتی ہے۔ جیسے والٹیر کا حملہ شکسپیئر پر، گوئٹے کا حملہ ڈانٹے پر، رشید وطواط کا حملہ خاقانی پر، فرضی کا حملہ فردوسی پر، احراری کا حملہ سعدی پر، سودا کا حملہ میر پر، شیفتہ کا حملہ نظیر پر، رجب علی بیگ کا حملہ میر امن پر وغیرہ۔

چناں چہ ہر ادب اور ہر دور میں تخریبی تنقید نظر آتی ہے۔ یہاں ہم حالؔی کے چند معاصرین کی معاندانہ تنقید کو مستند حوالوں سے درج کرتے ہیں۔ حسرت موہانی اُردوئے معلّی میں حالی پر سخت اعتراضات کرتے تھے۔ ایک اسی قسم کا واقعہ تذکرہ حالی میں شیخ اسماعیل پانی پتی نے یوں لکھا ہے:

> ''علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک کے اصرار پر مولانا حالؔی بھی اس میں شرکت کے لیے تشریف لائے اور حسبِ معمول سیّد زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ اک صبح حسرتؔ موہانی دو دوستوں کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ اتنے میں سیّد صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے میں سے حسرتؔ کو دیکھا۔ اُن میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانے میں گئے اور اردوئے معلیٰ کے دو تین پرچے اُٹھالائے۔ حسرتؔ اور اُن کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں

اور اُٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے
دیتے تھے۔خود پاس بیٹھ گئے۔ایک پرچے کے ورق الٹنا شروع
کیے اور مولانا حالؔی کو مخاطب کر کے حسرتؔ اور اردوئے معلیٰ کی
تعریفوں کے پُل باندھ دیے................کسی کسی مضمون کی دو
چار سطریں پڑھتے اور واہ خوب لکھا ہے کہہ کر داد دیتے............
حالؔی بھی، ہوں ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے...........
اتنے میں سیّد صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے
بولے:

''ارے مولانا یہ دیکھیے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے''

اور کچھ اس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کیے۔ سچ تو یہ ہے کہ حالؔی
سے بڑھ کر مخربِ زبان کوئی نہیں ہوسکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم
کو اردو کی خدمت سے روک لیں۔ اُتنا ہی اچھا ہے۔فرشتہ منش
حالؔی زرا مکدر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ نکتہ چینی اصلاحِ
زبان کا بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔''

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرتؔ سے پوچھا:

''اب بھی حالؔی کے خلاف کچھ لکھو گے؟''

جواب دیا:

''جو کچھ لکھ چکا اُسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔''

حالؔی کا یہ ضبط، وقار اور عالی ظرفی بڑے بڑے مخالفوں کو شرمندہ
اور نکتہ چینوں کو پشیمان کر دیتی تھی۔''

جب حالی کی شاہکار کتاب ''حیات جاوید'' شائع ہوئی تو شبلی نعمانی نے اس کی

سخت مخالفت کی۔ مولوی عبدالحق ''چند ہم عصر'' میں لکھتے ہیں:

''جب میں نے حیات جاوید کا ایک نسخہ ان کو دیا تو دیکھتے ہی فرمایا: ''یہ کذب وافترا کا آئینہ ہے۔''

یہ جملہ سن کر عبدالحق دم بخود رہ گئے کیوں کہ پڑھنے سے پہلے ایسی سخت رائے کیا معنی رکھتی تھی۔

شبلی حبیب الرحمان خان شیروانی کے خط میں حیات جاوید کو کتاب المناقب لکھتے ہیں۔ ایک اور خط میں شیروانی کو لکھتے ہیں:

''وہ محض دعوے کرتے ہیں واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے بہر حال میں حیات جاوید کو مدلل مداحی سمجھتا ہوں۔''

شبلی اپنے شاگرد عبدالسمیع کو حیات جاوید پر منفی ریویو کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''میں کچھ مزید نہیں کہنا چاہتا تم مقلد نہیں مجتہد ہو پھر تقلید کیوں؟''

اب آئینہ کا دوسرا رُخ حالؔی کا کریکٹر دیکھیے جسے عبدالحق نے اپنی کتاب ''چند ہم عصر'' میں دکھایا ہے۔

''ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا حالی سے ملنے آئے اس زمانے میں وہ ''دکن ریویو'' نکالتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اِس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔ مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرایے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کیے چپ چاپ سُنا کیے۔ مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا، تنقید بہت

اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہو گی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اُڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔''

وحیدالدین سلیم پانی پتی جنہیں حالؔی نے دنیائے اُردو میں معروف کیا وہ بھی حیات جاوید کے بارے میں صدر یار جنگ حبیب الرحمان خاں شیروانی کو لکھتے ہیں:

''حالؔی نے دیباچہ میں جس امر کا وعدہ کیا ہے اس کو وہ ایک شمّہ بھی پورا نہیں کر سکے۔ جہاں انہوں نے سرسید کی تفسیر کی بحث کی ہے یہ کہتے ہوئے کہ بحث طولانی ہو جائے گی ادھورا چھوڑ دیا ہے۔''

بقول رشید حسن خان کہ

''حالؔی کو غالب کے بہت سے واقعات کا علم تھا وہ اگر اپنے طور پر ان کو لکھتے تو بعض ایسی باتیں ضرور بیان میں آ جاتیں جو ان کے نزدیک وضاحت طلب نہیں تھیں۔ اس الجھن اور اس کشمکش سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہ طریقہ انہوں نے اختیار کیا کہ بعض اہم واقعات کے بیان میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے خود مرزا صاحب کے بیانات کو نقل کر دیا اس طور سے سوانح نگار کی حیثیت سے ان کے کسی بیان کا جائزہ نہیں لیا اس طریقۂ کار نے کئی واقعات کی واقعی شکل وصورت کو سامنے آنے نہیں دیا۔''

سچ تو یہ ہے کہ

''لعن وطعن، گالی، دشنام، طنز واعتراضات کے طوفان کو حالؔی نے ایک نرالے طریقے سے زیر کیا

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا اُنہوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن جیسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے، مخالفت کا یہ طوفان جو خس و خاشاک کی کائنات تھا، جلد ہی دب گیا اور حالیؔ کی عظمت اور شان اپنی جگہ قائم رہی۔

غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

اُردو تنقید پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ اس کے ناقدین عموماً سکّے کے دو رخ پیش نہیں کرتے یا تو سراسر مدح ہوگی یا پھر ہر لفظ میں ذم و قدح کا پہلو ہوگا۔ حالیؔ کی حیات جاوید پر اعتراض کرتے ہوئے شبلی نعمانی نے کہا تھا یہ کتاب المناقب ہے مدلل مداحی ہے جب کہ خود شبلی نے جب موازنہ انیس و دبیر لکھا تو انیس کی مداحی اور دبیر کی قداحی لکھی۔ حالیؔ نے اپنی تینوں سوانح عمریوں میں یعنی حیات سعدیؔ، یادگار غالب اور حیات جاوید ان تینوں بزرگوں کی مدحت آرائی کی ہے اور خود اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ ابھی برصغیر میں کریٹکل بیوگرافی کا وقت نہیں آیا ہے۔ ہم کہتے ہیں حالی سے تسامح ہوا ہے اگر وہ تذکرے دیکھ لیں تو معلوم ہوگا کہ تذکرہ نویس نے کس طرح تخلیق کار کی شخصیت اور تخلیق کا ناحق خون کیا ہے۔

کیا حالیؔ کے استاد مصطفی خان شیفتہؔ نے نظیرؔ اکبر آبادی کے ساتھ ظلم نہیں کیا؟ کیا گلشن بے خار خارداری کی وجہ سے گلشن بے کار نہیں ہوا؟ اصلی تخلیق کار ایک پہاڑ ہوتا ہے اگر ناقد اس سے سر ٹکرائیں تو سر پھوٹتا ہے پہاڑ نہیں ٹوٹتا۔ ہم نے حالیؔ کی شاعری اور ان کے نثری کلام پر ناقدین کے دونوں رخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن نقادوں نے رسمی طور پر ایک دو جملے تعریف کے لکھ کر منفی بافی کا دفتر کھولا ہے جس میں انصاف سے کام لینے کے بجائے ذاتی فکر و تجربہ سے اخذ کردہ تنقیص اور ذم کا پہلو

دکھایا گیا ہے۔

جو علمی عقلی اور منطقی حوالوں سے ثابت نہیں ہوسکتا ہے۔ ان ناقدین میں احسن فاروقی وحید قریشی اور کلیم الدین احمد سرفہرست ہیں۔ ان ناقدوں نے نوک خار سے گل تخلیق کو تار تار کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

حالؔی کے منظوم اور نثری کلام پر کئی تبصرہ نگاروں نے کلیم الدین احمد کے تند و تیز جملے نقل کیے جنہیں بعض مقامات پر توڑ موڑ کر کچھ جوڑ کر اور کچھ چھوڑ کر اسی طرح بیان کیا کہ مسائل پر پوری روشنی نہیں پڑھ سکی۔ اس لیے ہم کلیم الدین احمد کے ایک طویل مضمون حالؔی سے جوان کی کتاب ''اُردو پر تنقید پر ایک نظر'' میں شامل ہے اقتباسات بغیر کسی متن کی تحریف کے یہاں لکھ کر حالؔی کے مقدمہ اور شعر و شاعری کے بارے میں ان کا نظریہ پیش کر رہے ہیں جہاں وہ حالؔی کی معمولی سی مغربی شاعری اور تنقید کی سہل انگاریوں یا ان سے واقفیت کو جرم سنگین بتا کر ان کی شخصیت اور تصنیف کا بہیمانہ قتل کرتے ہیں۔ ان کی تنقید دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ انہوں نے حالؔی کے تمام تر کلام کا مطالعہ کیا ہے۔

کلیم الدین احمد حالؔی کو اُردو تنقید کے بانی، اُردو کے بہترین نقاد جن کی نثر بلند پایہ ہے بتاتے ہیں:

> ''اُردو تنقید کی ابتدا حالؔی سے ہوتی ہے ''پرانی تنقید'' محذوف و مقصور کے جھگڑوں، زبان و محاورات کی صحت اسناد کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی۔ حالؔی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کی اور بنیادی اصول پر غور و فکر کیا۔ شعر و شاعری کی ماہیت پر کچھ روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے استفادہ کیا۔ اپنے زمانہ، اپنے ماحول اپنے حدود میں حالؔی نے جو کچھ کیا وہ بہت تعریف کی بات

ہے۔ وہ اُردو ''تنقید'' کے بانی بھی ہیں اور اُردو کے بہترین نقاد بھی ہیں یہاں جو کچھ لکھا جائے گا اس سے حالی کی تحقیر مقصود نہیں۔ ان کی تاریخی اہمیت اظہر من الشّمس ہے۔ ان کی نثر بلند پایہ ہے، ان کا خلوص زبردست ہے۔''

پھر لکھتے ہیں:

''شعروشاعری کی اہمیت کا صحیح اندازہ حالؔی کے بس کی بات نہیں وہ کہتے ہیں:

''شعر کی مدح و ذم میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور جس قدر اس کی مذمت کی گئی ہے وہ بہ نسبت مدح کے زیادہ قرین قیاس ہے۔''

وہ افلاطون کے ہم خیال ہیں اور شاعری کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ یوں کہتے ہیں کہ شاعری کا ملکہ بے کار نہیں ہے لیکن ان کے خیال میں شاعری محض تفریح طبع کا ذریعہ ہے۔ شاعری کوئی دلچسپ کھیل نہیں، وہ تو انسان کی بہترین دماغی تحریکات کا آئینہ ہے۔ اس سے کامل سکون، ایک ابدی سرور ملتا ہے جو اور کسی چیز سے نہیں ملتا اور نہ مل سکتا ہے۔ یہ بہترین فن ہے جس کی برابری کوئی دوسرا فن نہیں کر سکتا ہے۔ اس کا مقام سائنس اور فلسفہ سے بھی بلند ہے بعض نقاد تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مستقبل میں مذہب کی جگہ لے لے گی۔ افسوس ہے تو یہی کہ آج بھی کہنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ شاعری تفنن طبع کا ذریعہ نہیں۔ اس کے آئینہ میں مادری اور روحانی دنیا اور اس دنیا کے بنیادی اور پایدار قوانین کا صاف، مکمل اور پرسکون عکس ملتا ہے حقیقت اور اس کی پراسرار کارفرمائیاں اسی

آئینہ میں اپنی جھلک دکھاتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی حالی کو خبر نہ تھی
وہ شعر و شاعری کی اہمیت اور قدر و قیمت سے واقف نہ تھے اسی
لیے دوسروں کو ان چیزوں سے آگاہ کرنا ان کے بس کی بات نہ
تھی۔''

جس شخص نے بھی حالؔی کا مقدمہ پڑھا ہے ان کے مسدس کا مطالعہ کیا ہے۔ان کی نظموں کا تاثیری اثر جذب کیا ہے کیا وہ ان گول مٹول جملوں سے مرعوب ہو سکتا ہے۔

''حالؔی نے مغرب سے استفادہ کیا۔ اس استفادے کا نتیجہ جو ہوا
ظاہر ہے شاعرانہ فطرت کی خصوصیات اور شاعری کی اہم صفات
پر حالؔی کی پوری بحث پر مجموعی نظر ڈالتے ہوئے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا
پڑتا ہے کہ جتنی زیادہ یہ بحث اہم ہے حالؔی اتنے ہی زیادہ اس
پرطبع آزمائی کے لیے نااہل ہیں۔ جن علوم کی قابلیت اور جن فطری
صلاحیتوں کی اس سلسلہ میں ضرورت تھی وہ ان میں نہ تھیں۔ وہ
ایک بحر بیکراں میں بے خطر کود پڑے ہیں اور ہاتھ پاؤں مار رہے
ہیں مگر ان کا کود پڑنا اور ہاتھ پاؤں مارتے رہنا ہی اہم ہے ان کی
تمام بحث کی یہ نوعیت ہے جیسے کہ کسی بڑی، مکمل اور مربوط تصنیف
میں سے کوئی طالب علم کوئی ادھر کی اور کوئی ادھر کی بات نوٹ
کرے اور یہ سمجھے کہ وہ پوری کتاب پر حاوی ہو گیا۔''

افسوس یہ ہے کہ یہ حالی ہی تھے جنھوں نے اُردو ادب کو مغربی قدروں اور لٹریچر سے روشناس کروایا۔ اگر آزادؔ و حالؔی نہ ہوتے تو کلیم الدین احمد کا وجود نہ ہوتا جنھیں یہ غصہ ہے کہ حالی اس مغربی دریا میں کیوں اُترے اور اگر اترے تھے تو کیوں

نہ پورا دریا تیرا کی کی۔ حالیؔ نے کہیں یہ بات بالواسطہ یا بلاواسطہ نہیں کہی کہ انہوں نے مغربی لٹریچر پر عبور حاصل کیا وہ تو صرف مغربی قدروں کی نشان دہی اور مختصر تعارف کر کے چلے گئے۔ کلیم الدین احمد کہتے ہیں:

''حالیؔ فینسی اور امیجینیشن میں امتیاز نہیں کر سکتے لیکن جو تعریف انہوں نے لکھی ہے وہ بھی نامکمل اور ادھوری ہے۔''

وہ لکھتے ہیں:

''اگر مقدمے کو خضر راہ سمجھیں تو ترقی ممکن نہیں۔''

''افسوس کی بات ہے کہ آج جب لکھنے والوں کا مطمع نظر حالیؔ کی طرح محدود نہیں جب وہ بہترین مغربی ادب، تنقیدی ادب سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود کسی نے بھی ''مقدمہ شعر و شاعری'' سے بہتر تنقیدی کارنامہ پیش نہیں کیا۔ یہ خیال ہے کہ ''مقدمہ شعر و شاعری'' اُردو میں بہترین تنقیدی کارنامہ ہے نہایت حوصلہ شکن ہے۔''

حالیؔ کے کلام کے تابوت پر کلیم الدین احمد نے آخری کیل یوں ماری۔

خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی غور و فکر ناکافی تمیز ادنیٰ دماغ و شخصیت اوسط یہ تھی حالی کی کائنات۔

ہم صرف یہی کہیں گے کہ تنقید نگار کو جذباتی نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس کی ناقدانہ رائے قبول نہیں ہوتی۔ کلیم الدین احمد کی رائے کو اکثر اس لیے پیش کرتے ہیں کہ ان تمام عیوب کے باوجود حالیؔ عمدہ ترین تنقید نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں اور مقدمہ شعر و شاعری علمی تنقید کی پہلی معتبر کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اگر مرغ یہ سمجھیں کہ اس کے ککڑکوں نہ کرنے سے سورج طلوع نہ ہوگا تو مرغ کی خوش فہمی ہے۔ اُردو تنقید کا کاروان اپنی ارتقائی منازل پر گامزن ہے۔

شعر کی تاثیر کو ثابت کرنے کے لیے جو مثالیں حالیؔ نے دیں کیا وہ آج بھی ضرب المثل نہیں ہیں۔ یہاں کون ناسمجھ ہے ذیل کی عبارت پڑھ کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

''شعر کی تاثیر کو ثابت کرنے کے لیے وہ بہت سی مثالیں بھی دیتے ہیں۔ چھے مثالوں سے ان کی ناسمجھی ظاہر ہوتی ہے لیکن اس ناسمجھی سے قطع نظر یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ جس تاثیر کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ اہم نہیں۔ شعر کا مقصد جذبات کو بھڑکانا نہیں ہے۔ شاعری جذبات کی تعلیم و تربیت کرتی ہے۔ انہیں برانگیختہ نہیں کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ شاعری کا اثر ہنگامی نہیں پائیدار ہوتا ہے۔ اس سے ہماری روحانی، جذباتی اور جسمانی زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے۔ اچھے شعر جذبات کو بھڑکاتے نہیں ہیں اور جو شعر جذبات کو بھڑکاتے ہیں وہ اچھے نہیں ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ حالی کا معیار مادی ہے۔ وہ شعر کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے ہیں۔ اس غلط فہمی کا سبب یہی مادی معیار ہے وہ شعر کی تاثیر اور اس کے فائدہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس خوش فہمی کا سبب بھی یہی مادی معیار ہے۔''

''شعر کی ماہیت سے بھی وہی بے خبری ہے جو شعر کی اہمیت سے تھی۔ حالیؔ صرف میکولے کا قول نقل کرتے ہیں۔ میکولے کی نقاد کی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں۔ اس کے قول کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں میکولے کے خیال میں (اور یہ خیال بھی ماخوذ ہے) شاعری ایک قسم کی نقالی ہے۔'' یہ نقالی فن مصوری یا نقاشی کے مقابلہ میں نامکمل ہے لیکن اس کی دنیا وسیع ہے، ''خصوصاً انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی قلم رو ہے۔''

''میکولے کا یہ قول بھی صحیح نہیں کہ ''نقالی فن مصوری یا نقاشی کے مقابلہ میں نامکمل ہے۔'' اگر آنکھوں کی تسکین کو معیار سمجھا جائے تو اس قول میں صحت ہوسکتی ہے لیکن آنکھوں اور کانوں کی تسکین کو کامل تسکین نہیں سمجھ سکتے ہیں یہ تسکین ادھوری سی ہوتی ہے۔ اس میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہماری دماغی اور روحانی زندگی، ہمارے جذبات اور احساسات کو جو تسکین شاعری میں ملتی ہے، وہ کسی دوسرے فن لطیف میں نہیں ملتی اور نہ مل سکتی ہے۔ میکولے کو اس حقیقت کا احساس نہ تھا اور حالؔی میں بھی اس احساس کی کمی نظر آتی ہے، شاعری کے لیے جو شرطیں حالؔی ضروری سمجھتے ہیں وہ بھی سطحی اور کورانہ طور پر اخذ کی گئی ہیں۔ یہ شرطیں تین ہیں، تخیل کائنات کا مطالعہ، تفحص الفاظ۔''

کلیم الدین احمد کولرج کے مقلد ہیں۔ وہ میکولے کے قائل نہیں اس لیے تمام غصہ بے چارے حالؔی پر نکالتے ہیں۔ مغربی نقادوں کے نظریات میں مشرقی نقاد کی طرح اختلاف رائے موجود ہے۔

تنقید کا کھیل دو اور دو چار نہیں ہوتا۔ اگر تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ سطحی شرطیں ہیں تو پھر اصلی شرطیں کلیم الدین احمد کیوں بیان نہیں کرتے۔

وارث علوی ''حالی مقدمہ اور ہم'' میں لکھتے ہیں:

''نقاد جب حوالداروں کی طرح بات کرنا شروع کرتا ہے تو اس کا طرز گفتگو بھی کتنا غیر شریفانہ بن جاتا ہے۔ جوش تنقید میں انہیں یہ تک خیال نہیں رہتا کہ حالؔی جیسے نقاد پر قلم اٹھاتے وقت ہمیں آداب گفتگو کی پاس داری کرنی پڑتی ہے۔ حوالداری سے میرا کیا

مطلب ہے اسے سمجھنے کے لیے محمد احسن فاروقی کے یہ جملے دیکھیے
جو ان کی مقدمہ پر تنقید سے جستہ جستہ انتخاب کیے گئے ہیں:
''ایسی باتیں پڑھ کر تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ایسا شخص کسی طرح
شاعری کرنے اور شاعری پر رائے دینے کا اہل ہی نہیں ہوسکتا۔''
''اس اخلاق کی وکالت میں انہوں نے بڑے دھوکے کھائے ہیں
اور تنقید نگاری کی بہت ہی غلط مثالیں قائم کی ہیں۔ اس کی بدترین
مثال مقدمہ کا وہ حصہ ہے جس میں مراثی کی اخلاقی نوعیت کو واضح
کیا گیا ہے۔''
''یہاں وہ تنقید نگاری کے نقطۂ نظر سے ایسا جرم کر رہے ہیں جس
کی تلافی نہیں ہوسکتی۔''
''یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم علم کس قدر پرخطر ہوسکتا ہے۔''
''جتنی زیادہ یہ بحث اہم ہے، حالی اتنے ہی زیادہ اس پر طبع
آزمائی کے لیے نااہل ہیں۔''
اگر احسن فاروقی مقدمہ کو ذرا غور سے پڑھتے تو حالؔی کا اسلوب
نگارش انہیں آداب تنقید بھی سکھاتا۔''

اس طرح کا طرز بیان صرف فاروقی تک محدود نہیں بلکہ کلیم الدین احمد کہیں مقدمے کی تعریف کرتے ہوئے حالؔی کی نثر کے بارے میں اُسے انفرادی خصوصیتیں عطا کرتے ہیں کہ

''حالؔی نے صاف اور سادہ طرز ایجاد کی لیکن اس طرز میں بے رنگی
نہیں پھسپھسا پن نہیں اس میں ایک لطافت ہے ایک جاذبیت
ہے ایک رنگینی ہے اور یہ تنقیدی مسئلوں پر بحث کرنے کے لیے

موزوں بھی ہے۔‘‘

پھر حالی کی تنقید کے ہر جملے کو مغربی ترازو پر تولتے ہیں، اور اس میں جو کچھ کم و کسر ہے اُسی کو سب کچھ بتا کر فتوے صادر کرتے ہیں۔ وحید قریشی لکھتے ہیں:

’’ادبی مسائل میں جہاں کہیں بھی دو بزرگوں میں اختلاف کا موقع آیا، حالی اپنے اعتدال کا ترازو لے کر آ گئے ۔حالی کی دوکان داری کا یہ انداز ان کی صلح جو طبیعت کا ترجمان اور ان کی شخصیت پرستی کا آئینہ دار ہے۔لیکن ان ہی دو راہوں پر ان کا تنقیدی نظام متزلزل نظر آتا ہے۔شاعری شائستگی کے زمانے میں ترقی پاتی ہے یا ناشائستگی کے زمانہ میں اس پر انھوں نے مقدمے میں طویل بحث کی ہے۔مشکل یہ تھی کہ ہر دو آرا مغرب سے آئی تھیں۔جس کی پیروی کی انھوں نے قسم کھا رکھی تھی۔ مرحلہ نازک تھا لیکن فیصلہ قطعی، اس لیے دونوں کو خوش کرنے کے خیال سے اور احترام کی خاطر انھوں نے درمیان کی راہ نکالی کہ پہلی بات بھی کسی قدر صحیح ہے اور دوسری بھی۔‘‘

حالؔی سے منسوب فرضی عربی رسالہ کی حقیقت

حالؔی کے سوانح نگاروں نے ایک عربی رسالہ کا ذکر کیا ہے جو انہوں نے اٹھارہ برس کی عمر میں دہلی میں لکھا جو ان کی پہلی تصنیف تھی۔ خواجہ غلام الثقلین نے اپنے ایک مضمون میں اس کا یوں ذکر کیا ہے:

> ’’غدر سے دو تین سال پہلے مولانا دہلی میں زیر تعلیم تھے۔ اس زمانے میں ایک عربی رسالہ آپ نے تصنیف کیا۔ جس میں ایک منطقی مسئلہ مولوی صدیق حسن خان بہادر کی تائید میں تھا۔ جسے اُن کے استاد نے پڑھ کر نہایت ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہاں تک کہ اُسے چاک کر دیا۔ مولانا کو قدرتی طور پر رنج ہوا لیکن استاد نے جو مشہور حنفی عالم تھے اور حسین بخش مدرسے میں پڑھاتے تھے کہا کہ رسالہ اگرچہ نہایت لیاقت سے لکھا گیا تھا مگر چوں کہ ایک وہابی مولوی کی تائید میں تھا، اس لیے چاک کر دیا گیا۔‘‘

ہماری نظر میں مختلف حوالوں اور شواہد کی موجودگی میں اس عربی رسالہ کا وجود مشکوک معلوم ہوتا ہے اگرچہ اس کی تائید صالحہ عابد حسین اور مالک رام نے بھی خواجہ غلام الثقلین کے مضمون ہی سے کی ہے۔ یہ مسئلہ اس لیے تحقیق طلب ہے کہ

الف۔ عربی رسالہ کا نام اور اس کی ضخامت اور متن کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔

ب۔ حالؔی جب پہلی بار دلی آئے تو ڈیڑھ سال رہ کر پانی پت واپس ہو گئے۔

ج۔ حالؔی کی عمر جب سترہ اٹھارہ برس تھی تب ان کی عربی ادبی استطاعت ایسی نہ تھی کہ کوئی رسالہ تصنیف کر سکیں کیوں کہ وہ خود اپنی کہانی میں لکھتے ہیں:

> ''کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم و ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے۔''

اس وقت حالؔی کی عمر چوبیس سال تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں بغیر کسی مدد کے ایک دقیق اور ادق مسئلہ پر رسالہ تصنیف کریں اور وہ بھی عمدہ عربی میں جس کی داد استاد نے دی لیکن چوں کہ متن سے اختلاف تھا تو چاک کر دیا۔

د۔ حالؔی نے خود کسی تصنیف، تحریر، تقریر میں ایسی کتاب کا ذکر نہیں کیا۔

مالک رام نے اس قصے کو مزید رنگ دے کر یہ بھی لکھا کہ

> ''کتابچہ لکھنے کی یہ پہلی کوشش تھی لیکن استاد کی ناراضگی سے ان کے دل و دماغ پر کیا اثر ہوا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اس واقعہ کا ان پر ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے دس سال تک کچھ نہیں لکھا اور وہ بالکل خاموش رہے۔ اس کے بعد بھی انہوں نے کوئی ایسی کتاب نہ لکھی جس سے کسی دوسرے فرقے کی دل آزاری ہو۔''

ھ۔ حالؔی نے عربی نثر و نظم لکھنے کی ابتدا ۱۸۶۳ء کے بعد جہانگیر آباد میں کی جہاں وہ شیفتہ کے مصاحب اور ان کے بیٹوں کے اتالیق تھے۔ حالؔی نے ضمیمۂ کلیات حالی اپنی زندگی کے آخری دور میں یعنی ۱۹۱۲ء کے اواخر میں ترتیب دیا جس

میں ان کا پراگندہ فارسی اور عربی نثری اور منظوم کلام شامل ہے۔ حالی اس ضمیمہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''انہیں دنوں میں تنہائی اور قلت مشاغل کے سبب عربی ادب کی ہوس دل میں چٹکیاں لینے لگی، اگرچہ علمِ ادب کسی استاد سے باقاعدہ پڑھنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا اور نہ کسی ادیب سے اصلاح لینے کا موقع ملا تھا مگر چوں کہ لٹریچر سے فی الجملہ مناسبت تھی کبھی کبھی ڈکشنریوں کی مدد سے ادب کی آسان آسان کتابیں دیکھنے لگا۔ شدہ شدہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ عربی نظم و نثر پر خود رو مبتدیوں کی طرح ہاتھ ڈالنے کی جرأت ہوئی۔''

یہ ضمیمہ مقدمے کے ساتھ اگست ۱۹۱۴ء میں مولانا یعقوب مجددی پانی پتی کی سفارش سے حافظ عبدالستار بیگ نے اپنے مطبع تحفہ ہند پریس دہلی میں شائع کیا۔ اس اشاعت کے تقریباً چار مہینے بعد ۱۳ صفر ۱۳۳۳ ہجری مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو حالیؔ کا انتقال ہوا۔ حالیؔ کی اس تحریر کے بعد اس بات کی مزید گنجایش باقی نہیں رہتی کہ انہوں نے سترہ برس کی عمر میں ایک منطقی رسالہ عربی میں تصنیف کیا تھا جب کہ چوبیس برس کی عمر میں انہوں نے عربی سیکھنی شروع کی۔

و۔ محمد مشتاق تجاوری بھی ایسے کسی عربی رسالے کی تصنیف کو صحیح نہیں مانتے وہ لکھتے ہیں: ''نواب صدیق حسن خان اور احناف کے درمیان اختلافات فقہی نوعیت کے تھے منطقی نہیں بلکہ نہ نواب صدیق حسن خان منطقی تھے اور نہ مولانا حالی اس لیے مولانا کا ان کی حمایت میں منطق کا کوئی رسالہ لکھنا عقلاً متبادر نہیں ہوتا۔''

اے بسا آرزو کہ خاک شد

ایک کامیاب شخص آرزوؤں اور جستجوؤں کا پتلا ہے۔ غالبؔ نے کہا تھا:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں مگر پھر بھی کم نکلے

حالیؔ نے اپنی (۷۷) سالہ زندگی میں بہت سے مثبت کام کیے اور بہت سے کام گردشِ دوراں سے نہ ہو سکے۔ اس تحریر میں ہم ان خوابوں کو جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوئے بیان کریں گے۔

☆ حالیؔ چاہتے تھے دہلی میں ایک بڑا مطبع جاری کریں جس میں عمدہ مصنفوں کی کتابوں کو شائع کیا جائے، قدما کی عربی اور فارسی تصنیفات جو شائع نہیں ہوئیں نہایت حسنِ اہتمام کے ساتھ چھپوایا جائے اور ایک ماہانہ رسالہ بھی اجرا کریں جس میں ہندوستانیوں کو یورپ کی ترقیات کی طرف مائل کریں۔ یہ آرزو پوری نہ ہو سکی کیوں کہ کہ اس عمدہ کام کے لیے سرمایے کی ضرورت تھی جو حالیؔ کے پاس نہ تھا۔

☆ اُردو زبان کی تذکیر و تانیث کے اصول مرتب کر کے ایک کتاب لکھنے کا خیال پورا نہ ہو سکا۔

☆ عمدہ ناول اور شاہکار ڈرامے جو دوسری زبانوں میں ہیں، ان کو اُردو میں ترجمہ کرنا اور کروانا چاہتے تھے جو نہ کر سکے۔

☆ مولانا حالی نے ایک آل نامہ لکھنا شروع کیا تھا جو مزاح کا ایک عجیب و غریب اور دلچسپ نمونہ تھا۔ اس میں ہر مذہب اور فرقے کے تعصب، تنگ نظری، حماقت، جہالت، خودغرضی وغیرہ پر چوٹ کی گئی ہے۔ مکتوباتِ حالی میں ہمیں اس کے چند لفظ ملے ہیں جو یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

لفظ	معنیٰ
المذہب	اعلانِ جنگ
الدین	تقلید آباؤ اجداد
العلم	قسمے از جہلِ مرکب
الامتحان	آزمایشِ لیاقتِ ممتحنان
الیونیورسٹی	کارخانۂ کلرک سازی
المسلمانانِ ہند	چوں مارگزیدہ از ریسماں ترسندگان
الرئیس	آں کہ از ریاست بے خبر باشد
الامیر	آں کہ تہیدست و قرضدار باشد
المولوی	آں کہ مسلماناں را از دائرہ اسلام خارج می کردہ باشد
الواعظ	آں کہ درتفریق بین المسلمین خطا نہ کند
الشکار	بہانۂ آدم کشی

افسوس ہے کہ مکمل نہ ہوسکا ورنہ اپنے طرز کی لاجواب طنزیہ چیز ہوتا۔

☆ حالی عورتوں کی تعلیم و تربیت پر بڑی توجہ دیتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے پانی پت میں اپنے خاندان اور ہمسائے کی لڑکیوں کے لیے ایک مکتب کھولا

لیکن بہت جلد استادنی کے نہ ہونے کی وجہ یہ مکتب بند ہو گیا۔

☆ حالؔی باقاعدہ طور پر ایک ہائی اسکول کھولنا چاہتے تھے۔ چناں چہ ۱۹۰۱ء میں جب ملکہ وکٹوریا کا انتقال ہوا تو ان کی یاد بود میں ایک ادارہ قائم کیا گیا جس میں حالؔی نے ایک اسکول قائم کرنے کی تجویز کو منظور کروا کر چندہ جمع کرنے کا کام شروع کیا لیکن بدقسمتی سے تین ہزار روپے جمع کر سکے۔ چناں چہ یہ رقم ایک ہائی اسکول کے لیے بہت کم تھی اس لیے اس رقم سے حالؔی نے ملکہ وکٹوریا لائبریری قائم کی جو 1947ء کے فسادات میں ختم ہو گئی۔ حالی اسکول کا خواب حالی کے چھوٹے بیٹے سجاد حسین نے پورا کیا اور حالی اسکول قائم ہوا اور اس اسکول نے ترقی بھی کی لیکن افسوس کہ یہ اسکول بھی ۱۹۴۷ء کے بلوے میں ختم ہو گیا۔

☆ حالؔی کی بڑی خواہش تھی کہ اُردو زبان میں اعلا درجے کے ناول خصوصاً ڈرامے لکھے جائیں۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ خود کوئی ڈرامہ لکھیں لیکن اسٹیج سے واقف نہ ہونے اور کوئی عمدہ نمونہ سامنے نہ ہونے کی وجہ سے مجبور تھے۔

حالی اور اقبال کے تاثرات

علامہ محمد اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور جس کا قیام ۱۸۸۴ء میں عمل میں آیا تھا۔ اُس کے ۱۹۰۴ء کے اجلاس میں اپنی نظم ''تصوردرد'' پڑھی۔ اس موقع پر دیگر شخصیات کے علاوہ حالی، ارشد گورگانی، محمد شفیع، سر عبدالقادر، سر فضل حسین، ابوالکلام آزاد اور خواجہ حسن نظامی موجود تھے۔ نظم ترنم سے پڑھی گئی۔ ایک شعر سے متاثر ہو کر حالی نے بے اختیار دس روپے کا نوٹ پیش کیا جو انجمن کے چندہ میں جمع ہوا۔ نظم کے اختتام پر خواجہ حسن نظامی نے اپنا عمامہ اُتار کر اقبال کے سر پر رکھ دیا۔ اس اجلاس کے دوسرے روز کی نشست میں حالی اپنی نظم پڑھنے کے لیے اٹھے لیکن پیرانہ سالی کے سبب ان کی نحیف آواز حاضرین تک پہنچ نہ سکی۔ تبرک کے طور پر حالی نے کچھ پڑھا اور تھوڑی دیر بعد علامہ محمد اقبال اسٹیج پر آئے اور حالی کی نظم ''مادر پنجاب انجمن'' سُنانے سے پہلے یہ فی البدیہہ رباعی سنائی:

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی
معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے میرے لب پہ کلامِ حالی

☆ سرعبدالقادر خدنگ نظر لکھنؤ میں ۱۹۰۲ء میں لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی ہی نے اقبال کے متعلق کہا تھا جب محمد حسین آزاد اور حالی کی کرسیاں خالی ہوں گی تو لوگ اقبال کو ڈھونڈیں گے۔''

☆ جسٹس جاوید اقبال زندہ رود میں لکھتے ہیں:

''جاوید منزل'' میں علی بخش کے علاوہ رحماں اور دیوان علی بھی گھر کا کام کاج کرتے تھے۔ دیوان علی اچھا خاصا گا لیتا تھا۔کبھی کبھار اقبال کو ہارمونیم پر خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ، سلطان باہو رحمۃ اللہ علیہ، بلھے شاہ رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر شعرا کا کلام سنایا کرتا۔بعض اوقات راجہ حسن اختر اپنے ساتھ سجاد سرور نیازی کو لاتے اور وہ اقبال کو غالب، حالی یا ان کا کلام ہارمونیم کے ساتھ گا کر سناتے۔''

ایک مرتبہ اقبال نے جاوید کو مسدس حالی پڑھنے کے لیے کہا اور خاص طور پر وہ بند...... جسے میاں محمد شفیع نے دہرایا:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

تو سنتے ہی اقبال آبدیدہ ہو گئے۔

علامہ محمد اقبال حالی کی تعریف میں لکھتے ہیں:

آں لالۂ صحرا کہ خزاں دید و بی افسرد
سید دیگری او را نمی از اشکِ سحر داد
حالؔی ز نواہای جگر سوز نیا سود
تا لالہ شبنم زدہ را داغ جگر داد

''یعنی وہ صحرا میں اگنے والا لالہ جو افسردگی اور خزاں کا شکار تھا۔ سرسید نے اس کو اپنے آنسوؤں سے سینچا حالؔی اپنے درد بھرے

نغموں سے اس وقت تک خاموش نہ ہوا جب تک کہ لالہ بے حرارت کو داغِ جگر دے دے۔''

اقبالؔ نے حالیؔ کی سوسالہ سالگرہ کے موقع پر حالیؔ کو خراج عقیدت ان چار شعروں میں پیش کیا۔

مزاجِ ناقہ را مانندِ عرفیؔ نیک می بینم
چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم

''عرفیؔ شیرازی کی طرح اونٹ کے مزاج کو خوب جانتا ہوں اور جب محمل کو سنگین دیکھتا ہوں تو حُدی نغمے کو بلند آواز پڑھتا ہوں۔''

حمیداللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو
ز الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم

''حمیداللہ خان کی وجہ سے ملک اور ملت کو بلندی نصیب ہوئی ان کے لطف وکرم سے میری راہ میں گل اور لالہ کی نشوونما ہو رہی ہے۔''

طوافِ مرقدِ حالیؔ سزد ارباب معنی را
نوائے او بجانھا فگند شوری کہ می دانم

''حالی کی قبر کا طواف اہل فہم کو جچتا ہے کیوں کہ ان کے کلام کی آواز لوگوں کی زندگی میں انقلاب بپا کر دیتی ہے جس میں سے میں واقف ہوں۔''

بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازم
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگِ گل افشانم

”آ کے فقر اور شاہی کو حالی کے حضور میں مل کر پیش کریں، تو ان کی قبر پر جواہر نچھاور کر اور میں پھولوں کو بکھیر دوں۔“

بھوپال کے نواب حمید اللہ خان نے اس سالگرہ کے جشن میں حالیؔ کو سراہتے ہوئے ان کے فیض کے تاثرات میں علامہ محمد اقبال کے مقام و کلام کے وجود کا اعتراف کیا۔ اقبال نے بانگِ درا کی نظم ”شبلی و حالی“ میں لکھا۔

خاموش ہو گئے چمنستاں کے راز دار
سرمایہ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستان
حالیؔ بھی ہو گیا سوے فردوس رہ نورد

حالؔی کی جھڑپ شیخ واعظ اور مفتی کے ساتھ

شاید ہی اُردو کا کوئی ممتاز شاعر ہو جس نے شیخ واعظ اور مفتی کی ریا کاری پر طنز نہ کیا ہو۔ حالی کے کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس موضوع کو خاص طنز کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ حالی کے کلام میں درجنوں اشعار ان نام نہاد تفرقہ انداز دین و مذہب کے ظاہری اجارہ داروں کے قول اور عمل پر ملتے ہیں۔ حالی جس ماحول میں زندگی بسر کر رہے تھے جہاں مسلمان ذہنی، تعلیمی، اخلاقی، سماجی سیاسی اور اقتصادی طور پر پسماندگی سے دو چار تھے اور جو افراد قوم کو سدھارنے، جگانے اور بنانے میں اپنے دن رات صرف کر رہے تھے ان پر شیخ، زاہد، واعظ اور مفتی کے جارہانہ حملے ہو رہے تھے تا کہ عوام کی نظر میں ان رفارمروں کی شخصیت کو مسخ اور خراب کر کے پیش کیا جائے جس کا علمی ثبوت مختلف اخباروں پرچوں رسالوں اور خطبوں میں ان قومی افراد کے خلاف تحریروں اور تقریروں کا ایک مسلسل محاذ قائم کیا گیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ ان افراد کو اسلام سے باہر کرنے کی کوششیں بھی جاری تھیں۔

چناں چہ سرسید، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور آگے چل کر علامہ اقبال پر بھی کفر

کے فتوے دیے گئے۔ حالی ان حالات سے بہت رنجیدہ تھے۔ حالؔی نے کئی شعر اپنی غزلوں قطعوں نظموں اور رباعیوں میں اپنے خاص تعارف اور حق بیانی پر کہے ہیں۔ کیوں کہ ان تمام اشعار کی تشریح اور تفسیر کے لیے ایک پورا دفتر چاہیے۔ اس لیے اس مختصر اور محدود تحریر میں ہم اشعار کو گلستان شعر سے گلچین کر کے گلدستہ کی شکل میں پیش کرتے ہیں جس سے حالی کی گلشنِ فکر کے رنگ و بو کا احساس ہوسکتا ہے۔ پہلے یہاں ہم حالی کا تعارف اور ان کا رجحان جس کا تعلق ہمارے اس موضوع سے بلواسطہ یا بلاواسطہ ہے پیش کر رہے ہیں پھر اس کے بعد مختصر مگر جامع طور پر ان شعروں کو درج کیا جائے گا جو باآواز بلند نعرہ لگا رہے ہیں کہ

برہنہ حرف بگفتن ہنر گویائیت

گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا نہ تھا

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے
کچھ رنگ یہاں حالی ہے سب سے جدا تیرا

جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تم کو حالی
کچھ کر کے بھی دکھائے زور قلم تمہارا

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

متاع بے بہا ہے شعر حالی
مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

تم نے حالی کھول کر ناحق زباں
کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

جھگڑوں میں اہل دیں کے نہ حالی پڑیں بس آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

نہ ہم رہیں گے نہ حالی یہ دل خراشی جہاں
رہے گی حالی دل گیر کی صدا اک ایک

حالی نے مقصدی شاعری کی ہے۔ وہ اتحاد اور اتفاق کے علم بردار ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں:

امت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر　　　اسلام ہے فقیہو ممنوں بہت تمہارا

اسی موضوع پر دو طنزیہ رباعیاں دیکھیے:

رباعی

جب تک کہ نہ ہو دشمنِ اخواں پکا　　　ہوتا نہیں مومن کا اب ایمان پکا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے　　　سنتے ہیں کسی کو جب مسلماں پکا

رباعی

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دین　　　سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقین

مومن سے ضرور ہو گا یہ مرقد میں سوال　　　تکفیر بھی کی فقہا نے کہ نہیں
کرتے ہیں اک اک کی تکفیر آپ کیوں　　　اس پہ بھی کچھ غور فرماتے ہیں آپ

ایک قطعہ کے آخری شعر میں حالیؔ کے سوختہ دل کی آواز سنیے:

اہل حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر　　　سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

کبھی جو اسلام کا نام بدنام کر رہے ہیں اُن سے یوں مخاطب ہیں:

منہ سے دھواں سا اٹھا لیتے ہی نام اسلام　　　بارود بجھ رہی تھی گویا لب و دہن میں
ادبار بھی دیکھو گے جہاں پاؤ گے اسلام　　　اسلام کا ادبار بھی اک نام ہے گویا

حالی کے کلام میں جا بجا خود نما مذہبی رہنماؤں کے اخلاق و اطوار اور ان کے کردار اور رفتار پر تلخ اور سچے اشعار ملتے ہیں۔ حالیؔ کے پاس پوری پوری غزلیں اے شیخ! اے واعظ! اور زاہد کے نام ہیں۔

کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد　　　تیرا قبلہ ہے جدا میرا جدا اے زاہد
میں تو سو بار ملوں دل نہیں ملتا تم سے　　　تو ہی کہہ اس میں ہے کیا مری خطا اے زاہد
عیب حالیؔ کے بہت آج کیے تو نے بیاں　　　ذکر کچھ اور کر اب اس کے سوا اے زاہد
ریا کو صدق سے ہے جامِ مئے بدل دیتا　　　تمہیں بھی ہے کوئی یاد ایسی کیمیا اے شیخ
غرور فقر غرور غنا میں فرق ہے کیا　　　تجھی پہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ
کمالِ حُسن عقیدت سے آیا تھا حالیؔ　　　پہ خانقاہ سے افسردہ دل گیا اے شیخ

حالی نے مشکل اور ادق ردیف اور قوافی میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ چند شعروں میں زاہد اور واعظ پر نکتہ چینی کی ہے۔ جیسے اس غزل میں قوافی آڑ، لتاڑ اور بگاڑ وغیرہ۔

کھیلنا آتا ہے ہم کو بھی شکار　　　پر نہیں زاہد کوئی ٹٹی کی آڑ
بات واعظ کی کوئی پکڑی گئی　　　ان دنوں کم تر ہے کچھ ہم پر لتاڑ

یہ ہیں واعظ سب پہ منہ آتے ہیں آپ
ناصح قوم اس پہ کہلاتے ہیں آپ

واعظو! دین کا خدا حافظ
انبیا کے ہو تم اگر وارث

شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاک باز
سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث

اک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہے
اے زاہدو! تمہارا ہے اس میں کیا اجارا

عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم
ہم پہ منہ آئے گا منہ کی کھائے گا

مان لیجیے شیخ جو دعویٰ کرے
اک بزرگ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

جو کریں گے بھریں گے خود واعظ
تم کو میری خطا سے کیا مطلب

شیخ اللہ رے تیری عیاری
کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

اک پتے کی جو ہم نے کہہ دی بات
رنگ واعظ کا کر گیا پرواز

تو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ
ہم کریں پینے میں کیوں پھر احتیاط

زاہدو! ہم تو تھے ہی آلودہ
تم کو بھی ہم نے کچھ نہ پایا صاف

کیوں قہقہوں سے رک گئے حالیؔ
بھید تم نے نہ کچھ بتایا صاف

صحبتیں اہل ورع کی سب گئیں نظروں سے گر
بزم رنداں میں یونہی اک روز جا بیٹھے تھے ہم

شیخ دنیا کی حقیقت رہ کے دنیا میں کھلی
ورنہ دھوکہ دور سے دیکھ اس کو کھا بیٹھے تھے ہم

ہم نہ تھے آگاہ زاہد زشت خوی سے تری
آدمی تجھ کو سمجھ کر پاس آ بیٹھے تھے ہم

ہیں فصاحت میں مثل واعظ و حالی دونو
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

اڑے گی خاک تقدس کی اب سر بازار
فقیہہ و شیخ میں جوتی اچھلتی جاتی ہے

رہا کھل کے زاہد کا زہد ریائی
بنائی بہت بات پر بن نہ آئی

برائی ہے رندوں میں بھی شیخ لیکن
کہاں یہ بُرائی کہاں وہ بُرائی

شیخ جب دل ہی دیر میں نہ لگا
آ کے مسجد میں کیا لیا تو نے

حالیؔ نے بعض غزلوں میں نامانوس خارجی ادق قافیے مصرف کیے ہیں اور

صرف اعراض، اغماض، مقراض، مرتاض پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بعض مقامات پر پورا ایک مصرعہ یا پورا ایک شعر عربی زبان کا داخل غزل کر دیا۔

وعظ میں گل کرتے ہیں واعظ
منہ میں ان کے زباں ہے یا مقراض

ہے ریاضت پہ ناز کیا زاہد
خارکش تجھ سے ہے سوا مرتاض

ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع
ھل لنا فی نزا عنا من قاض

لَا اُبَالِیُ بان یحاتیے
کُلّ ناسِ و اَنْت عَنی راض

یعنی ہم میں اور فقہا میں جھگڑا ہے کیا ہمارے لیے اس جھگڑے کا کوئی فیصلہ کرنے والا ہے۔ میں اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ ہر شخص مجھ سے ناراض ہے میں تو اس بات پر خوش ہوں کہ تو مجھ سے راضی ہے۔

حالی حق کی بات سادے لفظوں میں سنا دیتے ہیں:

کیجیے کیا حالی نہ کیجیے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

ہمیں اور بھی تجھ سے کرتے ہیں بدظن
یہ جُبہ یہ ریش اور یہ دستار واعظ

سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں پر
نہ ستار ہے تو نہ غفار واعظ

کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں

رہا کھل کے زاہد کا زُہد ریائی
بنائی بہت بات پر بن نہ آئی

زینۂ منبر ہے لغزش کی جگہ
جانیو واعظ اسے راہِ صراط

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ
اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا حالی
کہتے پہلے سے تو دے لے کے ہٹایا جاتا

جن کے معبود حور و غلماں ہیں
ان کو زاہد خدا سے کیا مطلب

حالؔی مشاہیر کی نگاہ میں

علامہ محمد اقبالؔ

اقبالؔ کی زبان میں حالؔی میر کارواں ہیں کیوں کہ ان کی ذات میں وہ تینوں اوصاف موجود ہیں۔ جو موصوف نے اپنے اس شعر میں لازم قرار دیے ہیں۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

نواب ضیاالدین خان نیّر

در تبصرہٗ کہ گفتہ حالی حالی — بنوشت زِ خوب و زشت حالی حالی
پُر سند اگر کہ کیست غمخوارۂ قوم؟ — نیّر حالی بگو کہ حالی حالی

رشید احمد صدیقی

حالی مسلمان نہ بھی ہوتے تو بھی وہ مسلمانوں کی فلاکت و ہلاکت پر انسانی ہمدردی اور اس قوت ایمانی کے ساتھ آنسو روتے اور ان کی مسکنت ان تمام طوفان

زائیوں پر فوق تھی جن سے ان کو ساتھ تھا۔ پیغمبر اور فاتح میں یہی فرق ہے۔

خواجہ غلام الثقلین

مولانا حالی یونانی خیالات کی رو سے ایک معتدل اور متوسط کامل انسان تھے اور صوفیانہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔

عبدالقیوم

حالؔی وہ کولمبس ہیں جنھوں نے ہمارے لیے ایک ادبی جزیرہ تلاش کیا۔ وہ جزیرہ جو مرزا غالب کہلاتا ہے۔ حالؔی کا مقدمہ اُردو تنقید کا عہد نامۂ جدید ہے۔ حالی نے اُردو میں سوانح نگاری کو ایک مستقل صنف ادب بنا دیا۔

کسی نقاد کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اُس نے اپنے دور اور آنے والی نسل کو کس حد تک متاثر کیا۔ حالی کی سب سے بڑی عظمت یہی ہے کہ انھوں نے اُردو شعر و ادب کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا اور اس کی ترقی کے امکانات زیادہ روشن کر دیے۔

عبدالحق

عبدالحق مقدمات میں کہتے ہیں:

''اس بگڑے ہوئے گھر کو پھر بنانا اور اس خرابے کو از سر نو تعمیر کرنا ہے۔''

حالی نے زبان کو وسعت نہیں دی ایک نئی زبان پیدا کی۔ لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے عبارت میں جان پڑ جائے اور لفظ بول اٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے ادب کا بڑا کمال ہے اور یہ کوئی حالی سے سیکھے۔ عبدالحق نے گاندھی جی سے کہا تھا:

''اگر ہندوستان کی کوئی ایک زبان ہو جسے سب سمجھ سکیں تو وہ حالی کی نظم ''مناجات بیوہ'' کی زبان ہوگی۔''

پنڈت چکبست

اُردو زبان پر مولانا حالؔی کا احسان ہے۔ ان کی یاد دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ مولانا حالؔی غالباً پہلے شخص تھے جنہوں نے یہ آواز بلند کی تھی کہ

''زمانے کے ساتھ اردو شاعری کو بھی نیا لباس بدلنا چاہیے اور یہ معمولی بات نہ تھی۔ مگر اپنے انگریزی داں احباب کی مدد سے انگریزی شاعری کا جو معیار مولانا موصوف نے قائم کیا اور جس کے سانچے میں اردو شاعری کو ڈھالنا چاہا وہ اس عیب سے خالی نہ تھا، جس کا بھی ذکر ہو چکا ہے۔ اس عیب کا اثر مولانا کے نئے رنگ کے کلام میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ مولانا کی ایک رباعی اس وقت تمثیلاً یاد آگئی۔

کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی | دھونے کی ہے اے رفارمر! جاباقی
دھبا رہے کپڑے پہ، نہ کپڑا باقی | دھو شوق سے کپڑے کو، پر اتنا نہ رگڑ

جو خیال ان دو شعروں میں نظم کیا گیا ہے، وہ نہایت اعلیٰ درجے کا اصولِ اصلاح یہ ظاہر کرتا ہے مگر اظہارِ خیال کا طریقہ شاعرانہ نہیں ہے۔ اگر پاکیزہ و سلیس نثر میں یہ خیال ادا کیا جائے، تو اس نظم سے زیادہ دلکش ثابت ہوگا۔ ہمیں افسوس سے لکھنا پڑتا ہے کہ مولانا حالی نے اُردو شاعری کی اصلاح میں اپنے اصول اصلاح کو مدنظر نہیں رکھا۔ اردو شاعری کے دامن پر جو داغ اور دھبے تھے۔

انہیں اس طرح صاف کرنے کی کوشش کی کہ نہ داغ دھبے باقی
رہے نہ دامن کا ایک تار باقی رہا۔“

قدیم اُردو شعرا کے کلام میں بہتیرے ایسے خیالات ملیں گے، جنہیں موجودہ زمانے کا مذاق قبول نہیں کر سکتا یا جو موجودہ معیار کے مطابق پایۂ تہذیب سے گرے ہوئے ہیں۔ مگر محض خیالات کی پستی سے تنگ آ کر ہمیں ان کے شاعرانہ جوہر کو نہ بھول جانا چاہیے اور یہ نہ خیال کرنا چاہیے کہ محض پندونصائح نظم کرنے کا نام شاعری ہے۔ قدیم اُردو شاعروں کے خیالات بلند نہ ہوں، مگر ان کا انداز سخن شاعرانہ ہے۔ ان کی زبان شاعرانہ تاثیر کا ذخیرہ ہے۔ جو مضامین وہ نظم کرتے ہیں ان میں ان کے دلی جذبات کا پرتو نظر آتا ہے یہی شاعری ہے۔ اگر آتش و انیس و غالب کی شاعرانہ وقت کا صحیح اندازہ ہم سے نہ ہو سکا، تو اُن کی شاعری کا قصور نہ تھا بلکہ اپنی قومی بے خبری کے عالم میں جہاں ہم نے زندگی کے بہت سے معاملات میں مغربی تہذیب کے اکثر اصولوں کی غلط تعبیر کی، وہاں انگریزی شاعری کے غیر صحیح اندازے سے ہم نے اپنا مذاق سخن بھی الٹا سیدھا قائم کر لیا۔ زبان و شاعری کی آیندہ اصلاح و ترقی کے لیے قدیم شعرا کے اندازِ سخن اور رنگِ بیان کا صحیح اندازہ کرنا ہمارے لیے نہایت ضروری ہے کیوں کہ جس غیر صحیح مذاقِ سخن کی بنیاد پر ہم قدیم رنگ سخن کی قدر نہ کر سکے، اس کی مدد سے ہم زبان و شاعری میں نئے جوہر نہیں پیدا کر سکتے۔

گریہم بیلی

حالی کی طرز نگارش اور اسلوب بیان مصنوعی آرایش اور تصنع سے مبرا ہے۔ وہ کسی قدر پھیکا اور ناہموار ضرور ہے لیکن زور اور صحت سے معمور ہوتا ہے خصوصاً اس وقت جب وہ سائنٹفک موضوعات پر قلم فرسائی کرتے ہیں۔

مہدی افادی

سرسید کے بعد اگر ان کے رنگ میں کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے تو وہ بوڑھے حالی ہیں۔ ایک ہی وقت میں جہاں فطری شاعر ہیں۔ اعلیٰ درجے کے نثار بھی ہیں۔ لایف نگاری کے ساتھ نکتہ سنجی اور سخن آفرینی کا ایک خاص سلیقہ ہے۔

عابد حسین

حالی کی نثر بھی اپنے رنگ میں ان کی نظم سے کم نہیں۔ اس میں پختگی اور سادگی کی وہی شان پائی جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سلاست اور روانی میں نثر کبھی نظم کا مقابلہ نہیں کرسکتی خصوصاً وہ نثر جس میں علمی مضامین ادا کیے جائیں۔ پھر بھی ان کا اسلوب بیان اتنا سلجھا ہوا ہے کہ مشکل مسائل کو پانی کر دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ متانت اور وقار کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ حالی کی طبیعت بالقوہ انفرادیت اور داخلیت سے کوسوں دور تھی۔

آل احمد سرور

حالی کے جتنے رفیق اور ہم عصر تھے سب صاحب طرز تھے لیکن زندگی صرف حالی کے طرز کو نصیب ہوئی باقی یا تو ختم ہو گئے یا ان کی کارفرمائی محدود ہوگئی۔ آزاد کی صناعی، نذیر احمد کا زور بیان، سرسید کی سادگی، شبلی کی رنگینی سب اپنی اپنی جگہ خوب ہیں لیکن آج نثر کا کیا رجحان ہے حقیقت یہی ہے کہ حالی کا طرز ہی زندہ و پایندہ طرز تھا۔ جسے اُردو کے ادیب اپنا سکتے تھے اور ایسے ہی طرز کو حیات جاوید نصیب ہوتی ہے۔

صالحہ عابد حسین

حالی کی نثر میں فصاحت متانت استدلال اعتدال اورتوازن سموئے ہوئے ملتے ہیں۔ ان کے یہاں سلاست اور روانی بھی پائی جاتی ہے لیکن اس کی شان دوسری ہے۔ وہ روانی نہیں جو زبان تک محدود رہتی ہے یعنی پڑھتے ہوئے زبان کہیں نہ اٹکے بلکہ چٹخارے لیتی ہوئی چلی جائے بلکہ ان کے پاس وہ معنوی روانی ہے۔ جس میں دماغ کہیں نہیں بھٹکتا۔ ذہن ٹھوکر نہیں کھاتا۔ علمی مسائل ذہن میں صاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جسٹس سید محمود

اگر خداوند مجھے بندوں میں کسی کی پرستش کرنے کے لیے کہتا تو میں بلاشبہ حالی کی پرستش کرتا۔

سید اعجاز حسین

حالی کے مجموعہ کلام کو ایک ضخیم اور طولانی وعظ کہہ کر ٹالا نہیں جا سکتا۔ ان کے یہاں درس عمل اور واقعیت وجدانی کیفیات سے ہرگز محروم نہیں ہیں۔

صفی لکھنوی

صفی لکھنوی نے حالی کی شخصیت اور فن پر مسدس کی شکل میں پندرہ بند کا مرثیہ لکھا یہاں کچھ اشعار پر مشتمل اقتباس پیش کیا جا رہا ہے:

سعدی و عطار اس صدی کا طینت میں اثر نہ تھا بدی کا
دل آئینہ عشق سرمدی کا پتلا خلق محمدی کا

تھا حسن عمل سے جس کو رشتہ　　قالب میں بشر کے ایک فرشتہ
وہ خضر ادب، ادیب مشتاق　　فرخندہ سیر، طبیب اخلاق
یکتائے زباں، وحید آفاق　　گر نظم میں فرد،نثر میں طاق
پاکیزہ خیال، پاک طینت　　جس بزم میں ہو وہاں کی زینت
تھی قوم سے الفت انتہا کی　　قومی نظموں کی ابتدا کی
آرائش نقش مدعا کی　　رحمت مرحوم پر خدا کی
دل میں حالیؔ، زباں پہ حالیؔ　　حالیؔ کی جگہ مگر ہے خالی
سید کے جو نو رتن ہیں مشہور　　جن میں اک فرد ذات مغفور
ہر چند کہ سبھی نامور تھے　　رفتارِ جہاں سے باخبر تھے
آزاد روی کے راہبر تھے　　گویا چراغ رہگذر تھے
خواجہ لیکن سبھی میں گل تھا　　پانی تھا مزاج، صلح کل تھا

خوشی محمد ناظر

حالیؔ کے مرثیے سے چند شعر یہ ہیں:

اپنے گلشن میں رہی نالہ بلبل کی صدا　　خندۂ گل کا کوئی روز تماشا ہو کر
ہائے حالیؔ سے ہوئی بزم عزیزاں خالی　　چھا گیا قوم میں شب یلدا ہو کر
لغو و ہذیاں سے مبرّا تھا کلام حالیؔ　　دور اسفل میں رہا ارفع و اعلیٰ ہو کر

بشیر احمد ایڈیٹر ہمایوں لاہور

حالیؔ سرسید کی بانسری تھے جو پیام سرسید نے اپنی زبان سے نثر میں سنایا اسے شاعری کی زبان اور نغمے کی لَے حالی نے عطا کی۔

حالؔی کا مذہبی شعور اور عقیدہ

کلام وعمل کی روشنی میں

حالؔی مذہبی شخصیت کے مالک تھے لیکن اُن میں کسی اور مذہب سے بغض یا تعصب نہ تھا۔ برصغیر کے ماحول میں کسی شخص کے مذہب یا عقیدہ پر بحث کرنا پسندیدہ عمل نہیں لیکن یہ ہماری مجبوری ہے کہ موجودہ تحقیق اور تنقید اُن تمام زاویوں پر روشنی ڈالنے کی تاکید کرتی ہے جس سے فن کار کی فکر وخیال کی وادیوں میں سیر کی جا سکے اسی وجہ سے حالی کی شخصیت پر شاید ہی کوئی ایسا مضمون ہو جس میں ان کے مذہبی شعور اور عقیدہ پر جلی یا خفی طور پر گفتگو نہ ہو۔ ذیل کے حوالے ہماری بات کی تائید کریں گے۔ ہم نے بعض تکراری مطالب کو نظر انداز کر کے صرف کلیدی بیانات کو یہاں پیش کیا ہے۔

☆ حالؔی کی پڑنواسی عابدہ صالحہ حسین یادگار حالؔی میں لکھتی ہیں:

''حالؔی سُنّی تھے اور بیوی شیعہ اور اس خاندان میں انتہائی رواداری تھی اور اس قسم کی شادیاں بلا تامل ہوتی تھیں۔''

☆ حالؔی کے نواسے خواجہ غلام الثقلین اپنے اخبار عصر جدید میں لکھتے ہیں:

''حالؔی صوفیہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔''

☆ مولوی عبدالحق اپنی تصنیف ''چند ہم عصر'' کے مضمون خواجہ غلام الثقلین مرحوم میں لکھتے ہیں:

''خواجہ غلام الثقلین بے تعصب مسلمان مگر پکے شیعہ تھے اور لکھنؤ کے قیام میں تشیع کا میلان کسی قدر شدید ہو گیا تھا۔ جن دنوں مولانا حالی کا قیام حیدرآباد دکن میں تھا میں ایک روز حسب معمول ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھتے ہی فرمانے لگے:

''آیئے! آج آپ کے دوست یعنی (خواجہ غلام الثقلین) کا ہدایت نامہ وصول ہوا ہے۔''

میں نے کہا:

''خیر ہے کیا لکھا ہے؟''

فرمانے لگے:

''لکھا کیا ہے تلقین فرمائی ہے کہ تم بہت بڑھے ہو گئے ہو، گور کے کنارے پہنچ گئے ہو، اب تو راہِ راست پر آ جاؤ، مطلب یہ تھا کہ اپنے عقاید سے توبہ کرو اور مذہب حق پر ایمان لے آؤ۔''

☆ معین احسن جذبی ''حالی کا سیاسی شعور'' میں لکھتے ہیں:

''حالی کو مذہب سے کافی لگاؤ تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کا ایک طبقہ وہابی عقاید سے بہت متاثر تھا۔ حالی بھی غالباً ان عقاید کو تسلیم کرتے تھے۔ حالی نے وہابی تحریک کا اثر قبول کیا ہو جس کی بنیاد انگریزی حکومت کی تخریب اور اسلامی حکومت کے قیام پر تھی۔''

شیفتہ کے علم و تقدس اور مذہبی انہماک کا بھی ان پر ایک عرصے

تک سایہ رہا۔ اس ضمن میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شیفتہ کو ''مثنوی جہادیہ'' کے مصنف حکیم مومن خان مومن سے تلمذ تھا جو مولانا اسماعیل شہید کے خاندان سے روحانی ارادت اور قلبی محبت رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ حالی نے خود اپنے مضامین میں جس طرح شاہ ولی اللہ کے اقتباسات سے اپنی دلیلوں کو تقویت پہنچائی ہے، اس سے بھی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ جہاں شاہ صاحب کے مذہبی افکار کے قائل تھے وہاں ان کے انقلاب آفریں سیاسی تصورات سے بھی ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔''

راقم کا خیال ہے کہ سرسید کے افکار کا اثر بھی حالؔی پر رہا ہو گا۔ سرسید کی تحریروں سے ان کے عقاید کا پتا چلتا ہے۔ معین الدین جذبی نے انہیں کریلا نیم چڑھا وہابی لکھا ہے۔ اس موقع پر ہم حالؔی کے چند اشعار پیش کرتے ہیں جو ان کے حنفی عقائد، وہابی رجحانات اور عشق محمد و آل محمد ﷺ پر ہیں:

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم
نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم
کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی
کہ بندہ بھی ہوں اُس کا اور ایلچی بھی
نبی کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دُعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے
الٰہی بحق رسول تہامی ﷺ
ہر ایک فرد انساں کا تھا جو کہ حامی
طفیل اس کا اور اس کی عترت کا یاربّ!
پکڑ ہاتھ جلد اس کی اُمت کا یاربّ!
ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبت تری عترت کی ولا ہے

حالؔی کے قطعات کا اجمالی تجزیہ

حالؔی نے مختلف موضوعات پر (٦٧) قطعات لکھے ہیں۔ یہ قطعات سارے مختلف عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں۔ قطعات کے مجموعی اشعار کی تعداد (٤٧٠) ہے۔ سب سے طولانی قطعہ میں (٢١) شعر اور سب سے چھوٹے قطعے میں (٢) شعر ہیں۔

قطعات کی تقسیم بندی اور ترتیب و تدوین میں ہم نے بھی افتخار صدیقی کی طرح بعض نظموں کو صرف اس وجہ سے قطعات میں شامل نہیں کیا کہ ان کی ہیت یا ظاہری شکل قطعہ نما ہے اس کے علاوہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے مرتب کردہ دیوان میں چوں کہ قطعات کی کوئی ترتیب نہ تھی اس لیے افتخار صدیقی کے دیوان کی پیروی کرتے ہوئے موضوعات کے تحت قطعات کو تنقیدی قطعات، سیاسی قطعات، معاشرتی اور اصلاحی قطعات، طنزیہ و مزاحیہ قطعات اور حکایات و مطائبات کے زیرعنوان پیش کیا ہے۔

حالؔی کا ایک عمدہ پندرہ شعر کا قطعہ ’’شعر کی طرف خطاب‘‘ کے زیرعنوان نظر آتا ہے۔ اس قطعہ میں حالؔی نے جدید شعر کا منشور نظم کیا ہے جو مقدمہ شعر و شاعری میں

نثر کی صورت میں نظر آتا ہے۔ چوں کہ جدید شعر سے عوام اور خواص واقف نہ تھے اور ہر محفل میں اس کی پذیرائی ممکن نہ تھی اس لیے حالؔی نے اس قطعہ میں شعر کو ڈھارس دی ہے اور دلاسا دیا ہے کہ تو بہت صحیح اور سچ ہے تجھے ظاہری اور جھوٹے نقش و رنگ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ حالؔی نے شعر کو مخاطب کر کے ایک عمدہ شعر کی خصوصیات کو بیان کیا ہے جو اجمالی طور پر یہ ہیں:

الف۔ شعر میں دل فریبی یا رنگینی نہ ہو تو افسوس نہیں مگر شعر بے کار بلکہ افسوس کا حامل ہوگا اگر اس میں دل میں اثر کرنے کی قوت اور خوبی نہ ہو۔

ب۔ اگر چہ شاعری کی دنیا ضایع لفظی ضایع معنوی اور دوسرے صنعتوں کے گورکھ دھندوں کو پسند کرتی ہے مگر شعر کی اصلی خوبی اس کی سادگی ہے اس لیے کبھی سادگی کو ان بے قیمت قدروں پر قربان نہ کر۔

ج۔ شعر کا ذاتی جوہر اس کا سچا خیال اور بیان ہے چناں چہ اس کو دوسروں کی جھوٹی تعریف کی ضرورت نہیں رہتی۔

د۔ اس دور میں اگر سچائی اور سادگی کے حُسن کے پرستار نہ ملیں تو کوئی بات نہیں تو خود کو دیکھ کر فخر کر کیونکہ تو نے سچائی کے سمندر میں طوفان پیدا کیا ہے جو جھوٹے جہازوں کو ڈبو دے گا۔

ھ۔ شعر کو جھوٹ اور مبالغہ سے پاک ہونا چاہیے۔ وہ قدیم روایات تھیں جب کہ مبالغہ شعر کی جان اور شاعری کا ایمان تھا اب اگر اساتذہ بھی مبالغہ سے کام لیں تو ان کی پیروی اور تقلید نہ ہو۔

و۔ اچھا شعر جس میں یہ سب خصوصیات ہوں خاموشی کے ساتھ دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کو تبلیغات اور ظاہری تعریف کی ضرورت نہیں رہتی۔ اچھا شعر داد و تحسین کے نشیب و فراز سے گزر کر جاوداں ہو جاتا ہے۔

ز۔ شاعری جو وطن اور عوام کے لیے کی جائے اس میں عزت اور سلطانی ہے۔

ح۔ جدید شعر کی قدر ابھی پوری طرح سے نہیں کی جاتی مگر یقیناً وہ وقت دور نہیں کہ اس کو سب اپنا اُسلوب بنائیں گے۔

ط۔ جدید اشعار سے محفل آراستہ ہونی چاہیے۔ حالیؔ نے جدید شعر کو اعتبار بخشا اور اسی سے اعتبار پایا۔

اوپر بیان کیے گئے شعری محاسن اور مطالب حالیؔ نے کچھ مغربی شعریات سے لیے اور کچھ اپنی فکر و دانست سے مہیا کیے جس کی تربیت اور نشوونما شیفتہؔ کی صحبتوں سے حاصل ہوئی تھی۔

حالیؔ اب آؤ پیروی مغربی کریں بس اقتدائے مصحفیؔ و میرؔ ہو چکی

حالیؔ سخن میں شیفتہؔ سے مستفید ہے غالبؔ کا معتقد ہے مقلد ہے میرؔ کا

خود حالیؔ نے کہا تھا:

دل پر درد سے کچھ کام لوں گا اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

حالیؔ اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ انہیں نسبتاً طوالانی عمر (۷۷) سال ملی اور آخری ایام تک ذہنی فتوحات جاری رہے۔ انہیں سرسید جیسا مرشد، آزاد، شبلی، نذیر احمد جیسے مصاحب، غالب جیسا استاد شیفتہ اور آسمان جاہ جیسے سرپرست، اقبال عبدالحق زین العابدین، اسماعیل پانی پتی، جیسے پرستار، سجاد حسین، غلام سیدین غلام ثقلین، عابد حسین، صالحہ عابد اور سیّدہ سیدین جیسے خاندانی سپوت ملے جنہوں نے حُسن یوسف کو بازار مصر میں پیش کیا۔

حالیؔ نے قطعات میں تنقیدی اور شعر کی تعمیری گفتگو بھی کی ہے جو حالی سے پہلے خال خال تھی۔ حالی نے نثر اور نظم میں جدید اور زندہ شعر کے علائم اور اثرات ظاہر کیے ہیں۔

مثنوی کی طرح نظم اور قطعہ میں ایک مضمون یا مطلب کو تسلسل کے ساتھ پوری طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ حالی نے اپنے استاد غالب کی طرح قطعوں میں وہ مطالب نظم کیے ہیں جو مختصر اور مسلسل موضوعات رکھتے ہیں۔

جابر علی سید نے اپنے ایک دل چسپ مضمون گولڈسمتھ حالی اور گریرسن میں، حالؔی کے اس قطعہ ''شعر کی طرف خطاب'' سے اٹھارویں صدی کے انگلش شاعر گولڈسمتھ کی نظم ''اے میری پیاری نظم'' تقابل کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ حالی کے قطعہ کے کئی شعر گولڈسمتھ کی نظم سے ماخوذ ہیں۔ ہم یہاں گولڈسمتھ کے اشعار کا ترجمہ اور حالی کے قطعہ کے اشعار جابر علی سید کے مضمون سے بطور اقتباس بغیر کسی تشریح اور تبصرے کے درج کرتے ہیں۔

۱۔ گولڈسمتھ

اے میری پیاری نظم تو اُن موقعوں سے پہلی بھاگنے والی نظم ہے جہاں نفسانی خواہشات کی طیغانی ہوتی ہے۔

حالی:

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں　　　پر حیف تجھ پہ ہے جو نہ ہو دل گداز تو

۲۔ گولڈسمتھ

تو اس بے قدری کے زمانے میں بجائے اس کے کہ دلوں کو اپنی طرف مائل اور پاک شہرت حاصل کرے ہر جگہ ملامت کی جاتی ہے۔

حالی:

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام　　　ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

۳۔ گولڈسمتھ

تو کمال کے طالبوں کی رہنما ہے اور نیکی کی دایہ۔ پس خدا ہی تیرا نگہبان ہوگا۔

حالی:

گر چاہتا ہے خضر کی عمر دراز تو	چپ چاپ اپنے سچ سے کیے جا دلوں میں گھر

۴۔ گولڈسمتھ

تیری بہ دولت عام جلسوں میں مجھے شرمندہ ہونا پڑتا ہے لیکن جب تنہا ہوتا ہوں تو تجھ پر فخر کرتا ہوں۔

حالی:

حالؔی کو تجھ پہ ناز ہے کر اس پہ ناز تو	جو قدرداں ہو اپنا اسے مغتنم سمجھ

اگرچہ گولڈسمتھ کی نظم کے باقی شعروں کے متن کا حالی کے قطعہ سے کوئی موضوعی تعلق نہیں رہا لیکن ان چند شعروں سے یہ پتا چلتا ہے کہ حالی مغربی شاعروں کا مطالعہ ترجموں کی صورت میں کر رہے تھے اور اس سے استفادہ بھی حسب ضرورت ہو رہا تھا اور اسی کو چراغ سے چراغ روشن کرنا کہتے ہیں۔

حالی نے اچھے شعر کی بابت یہ بھی لکھا ہے کہ شعر میں شاعر ان ہی موضوعات پر قلم اٹھائے جو اُس نے خود کیے ہیں اور اس کا ذاتی تجربہ رکھتا ہو یعنی شراب رندی میخانے کا مست و رنگین ذکر وہی کرے جو اس کا اہل ہے۔ عشق و عاشقی ہجر و وصال کے مضامین وہی باندھے جو عاشق رہا ہو اور عاشقی کا مزا اور درد چکھا ہوا ہو۔ حالی کا خیال

ہے ایک تو فرضی عاشق یا شرابی بننا نِرا نقالی اور نقلی عمل ہے دوسرے اس میں سچائی اور صداقت کا فقدان ہے جس سے شعریت مجروح ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں ریاض خیر آبادی نے تمام شاعری شراب اور میخانے کی نذر کر دی مگر شراب کے ساغر کو بھی ہاتھ نہ لگایا اسی طرح درجنوں شاعروں نے فرضی معشوقاؤں کی محبت اور ہجر و وصل میں دفتر سیاہ کر دیے۔

حالی نے ایک قطعہ میں جس کا عنوان ہے ''مشاعرے کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر'' یہ دکھایا ہے کہ انہوں نے عشقیہ شاعری کی جب تک ان کا دل اور اس کی امنگیں جوان تھیں وہ زمانہ تھا جبکہ

طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی

لیکن اب وہ جوانی نہ رہی چناں چہ اب یا دوسروں کی نقالی کریں اور مضمون فرضی باندھیں۔

گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زبان ٹکسالی — آپ بیتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لطف
کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر — لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی

مگر ایسا کرنے سے ہم اُس بوڑھی بدکار عورت کے مانند ہو جائیں گے جس کا کام صرف دلالی ہو جاتا ہے۔

قحبہ چون پیر شود پیشہ کند دلالی — پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل

حالی نے خود نظم اور نثر پر نکتہ چینی کی اور ان کی اصلاح کے لیے اپنا نظریہ بھی پیش کیا۔ حالی کا ایک طنزیہ قطعہ نکتہ چینی ہے جس میں باپ بیٹے کو نصیحت کر رہا ہے کہ اپنا خون و پسینہ ایک کر کے نظم و نثر میں معنی آفرینی کی تصانیف کر کے نام کمائے اگر وہ شاعر

یا نثار بننے کی لیاقت نہ رکھے تو

شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجیے

اس مطلب کو کئی شاعروں نے پیش کیا ہے کہ بہت سے ناکام شاعر کامیاب ناقد بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

حالی نے قطعہ ''چھوٹوں کا بڑا بن جانا'' میں عربی مصرعہ پر قطعہ کی عمارت کھڑی کی۔

کَبّرنَامَوتُ الکُبَراً۔

یعنی بڑے لوگوں کی موت نے ہمیں بڑا بنا دیا۔ اس قطعہ کی تمہید کو حالی نے ایک دانشور کی حکایت سے جوڑ کر جو کئی چھوٹے بڑے خطوط سے ایک ایک خط کو مٹا کر سب سے چھوٹے خط کو محفوظ کیا جو دراصل سب سے بڑا خط نظر آنے لگا۔ حالی نے اس حکایت کو برصغیر کے قحط الرجال سے جوڑ کر اپنی عجز وکسر نفسی سے تکمیل کیا۔

قوم میں جیسا حال ہے اب	آدمیوں کا کال نہ تھا
شعر میں تھے استاد اکثر	سحر بیاں اور نکتہ سرا
اہل ہنر کا نام و نشاں	قوم میں جب باقی نہ رہا
حالی و زید و عمرو بنے	صاحب دیوان نام خدا
ہم ہیں وہی ناچیز مگر	کبّرنا موت الکبرا

حالی کے مسدس میں شعرا کی جو گت بنائی گئی تھی اس کے بعد حالی کی مختلف نظموں اور مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے جو تنقید اُردو شاعری اور شعرا پر کی تھی اُس کی وجہ سے حالی کے خلاف کئی اخبار اور رسالے مسلسل نثر اور نظم میں مطالب لکھ رہے تھے جن میں حسرت موہانی کا اُردوئے معلّٰی اور سجاد حسین کا اودھ پنچ پیش پیش تھا۔ کوئی کہتا تھا:

دلی دلی کیسی دلی پانی پت کی بھیگی بلی

کوئی حالی کو خالی، ڈفالی لکھتا تھا۔ اودھ پنچ کے صفحہ اول پر کئی سال تک یہ شعر شائع ہوتا رہا۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

اُردوئے معلیٰ کے شاعر و ادیب حالی کو دلی کا نہیں بلکہ پانی پت کا باشندہ مانتے تھے جب کہ حالی کی زندگی کا ایک بڑا حصہ دلی میں گزرا اور پانی پت دلی سے پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بہرحال ''دلی کی شاعری کا تنزل'' کے تحت حالی نے ان سوالوں کا جواب بھی دیا اور کسی حد تک اپنے دل کا بخار بھی کم کیا۔ اُردوئے معلیٰ کے شعرا صرف دلی اور لکھنو کو ہی ٹکسال قرار دیتے تھے۔ ہم یہاں اس تیرہ (۱۳) اشعار کے قطعہ کے کچھ مصرعوں اور شعروں کو درج کر کے بغیر مزید تشریح کے حالی کا جواب پیش کرتے ہیں۔

اک دوست نے حالی کے کہا از رہ انصاف شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہل زباں سے

معلوم ہے حالی کا جو ہے مولد و منشا اردو سے بھلا واسطہ حضرت کے وطن کو

اردو کے دھنی وہ ہیں جو دلی کے ہیں روڑے پنجاب کو مس اس سے نہ یورپ نہ دکن کو

حالی کی زباں گر بہ مثل نہر لبن ہو خالص نہ ہو تو کیجیے کیا لے کے لبن کو

پھر اس دوست نے چند شعر سنائے جو اُردو شاعری کے لیے ننگ تھے۔ حالی نے اس قطعہ کو یوں تمام کیا۔

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

قطعات میں حالی کے فن کا یہ کمال ہے کہ وہ مصرعوں میں پورا مطلب ظاہر کر دیتے ہیں ''پولیٹکل اپچیں'' جو سیاسی لیڈروں کی ہوتی ہیں کیا اس کے سوا ان میں کچھ ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ جادو ہے بیاں میں ترے لیکن دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات
کھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیاں میں اک مرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

حالی کے سیاسی قطعات آزادی، ہندوستان کی غلامی اور کالے اور گورے کے نسلی فرق کو ظاہر کرتے ہیں۔ کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان میں کہتے ہیں۔

دو ملازم ایک کالا اور گورا دوسرا
راہ میں دونوں کے باہم ہو گئی کچھ ہشت مشت
کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار
ڈاکٹر نے آ کے دونوں کی سُنی جب سرگزشت
دی سند گورے کو لکھ تھی جس میں تصدیق مرض
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اس کی بیماری کا کیوں کر اعتبار

یہ سچ ہے کہ اکثر حالی کے قطعات معمولی مضامین اور سطحی شاعری سے بنے ہیں۔ بعض قطعات حالی کے ایک مصرعہ یا ایک لفظ کے اردگرد تخلیق ہوئے معلوم ہوتے ہیں جیسے اس قطعہ ''قانون'' کے پانچ شعر لفظ ''لا'' کے اطراف ہیں جس کے معنی عربی میں ہیچ اور انگریزی میں (Law) قانون کے ہیں۔

حالی اس قطعہ میں یہ بتاتے ہیں کہ اگرچہ قانون سب کے لیے ہے لیکن اس کی پابندی اور عمل داری صرف کمزوروں کے لیے ہے۔ امیروں، حکمرانوں اور زورمندوں کے لیے وہ مکڑی کے جالے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

حق میں کمزوروں کے ہے قانوں وہ اور نظر میں زور مندوں کی ہے ''لا''

یہاں حالی نے انگریز حکمرانوں کے لیے زور مندوں اور ''لا'' بمعنی ہیچ استعمال کیے ہیں۔ حالی نے بعض انگریزی ضرب الامثال کو بھی قطعات میں عمدہ اور سلیس طریقے سے پیش کیا ہے۔ Divide and rule فاتح قوموں کا شعار اور طریقۂ کار حکومت رہا ہے۔ حالی کے قطعے ''تدبیر قیام سلطنت'' کا شعر سنیے۔

تدبیر یہ کہتی ہے کہ جو ملک ہو مفتوح وارں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو

ایک اور انگریزی ضرب المثل کا ترجمہ اس قطعہ میں دیکھیے۔

ٹھوٹ کاریگر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہے کام
اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہے سدا

حافظ کہتا ہے کہ

''میرا دشمن صحیح معنی میں میرا دوست ہے جس کی وجہ سے میں راہ راست پر ہوں۔''

کئی فلسفیوں اور دانشوروں نے بھی ایسی باتیں کی ہیں۔ حالی کے قطعے سے دو شعر دیکھیے:

قول اک حکیم کا ہے کہ گر غور کیجیے ہے حق میں سب کے دوست سے دشمن مفید تر
دشمن سے بڑھ کے کوئی نہیں آدمی کا دوست منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر

حالی بعض دوشعری قطعات عمدہ نکات کی ترجمانی انوکھے انداز میں کرتے ہیں جو ان کی فن پر قدرت اور معنی آفرینی کا ثبوت ہے۔ مغرور کی پہچان کے ذیل کہتے ہیں:

غرورِ زید کی کرتا ہے گر شکایت عمرو تو سمجھو کرتا ہے اپنے غرور کا اظہار
جنہوں نے آپ کو سب سے سمجھ لیا بڑا بڑائی دیکھ نہیں سکتے غیر کی زنہار

ایک اور قطعہ ''کام اچھا کرنا چاہیے نہ جلد'' میں کہتے ہیں:

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے　　اُس نے کی تاخیر اس میں جس قدر اچھا کیا
کب کیا کیوں کر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں　　بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

''سچ کہاں ہے'' عمدہ قطعہ ہے۔ تاریخ اور دیگر تحریریں جھوٹی ہیں:

دیکھنے ہوں تمہیں گر جھوٹ کے انبار لگے
دیکھ لو جا کے خزانوں میں کتب خانوں کے
سچ کو تحریروں میں پاؤ گے نہ تقریروں میں
سچ کہیں ہے تو وہ سینوں میں ہے انسانوں کے

حالی ایک نسبتاً طویل قطعہ ''خودستائی'' میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ خودستائی کا مادہ ہر شخص میں ہے لیکن ہر ایک کا طریقہ اظہار جداگانہ ہے۔

جو زیور خرد سے مصرا ہیں سادہ لوح　　کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا
جو ان سے تیز ہوش ہیں سو سو طرح سے وہ　　پردوں میں کرتے ہیں اسی مضمون کو ادا
چپ چاپ سن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں　　یعنی کہ یہ بیان ہے سب راست اور بجا
کہتا ہے اس پہ کوئی کہ سب حسن ظن ہے یہ　　اک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا
اور چاہتا ہے یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا
القصہ جس کو دیکھیے جاہل ہو یا حکیم　　آزار میں خودی کے ہے بے چارہ مبتلا

حالی نے عورتوں اور لڑکیوں کے مسائل پر صرف مناجات بیوہ اور چپ کی داد ہی نہیں لکھی بلکہ کئی دوسری نظموں اور نثری تحریروں میں ان کی تعلیم اور حقوق کی پاس داری بھی کی ہے۔ حالؔی نے عملی طور پر بھی پانی پت میں لڑکیوں کے لیے مکتب جاری کیا تھا۔ جہاں تک قطعات کا تعلق ہے حالی کا ایک چودہ شعر کا قطعہ ''بیٹیوں کی نسبت'' ایک پراثر نظم ہے۔ حالی اس قطعہ میں یہ بتاتے ہیں کہ ہم بڑی آب و تاب سے بیان کرتے ہیں کہ قدیم دور میں عرب اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے لیکن یہ نہیں سوچتے کہ

یہی عمل بیٹیوں کے لیے ہمارے معاشرے میں دوسری شکل سے جاری ہے یعنی جب لڑکی کی شادی کرتے ہیں تو اس کے شوہر کے صفات و اخلاق دیکھنے کے بجائے خاندان کے نام ونشان ثروت اور جاگیر پر توجہ کرتے ہیں۔

چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو ۔۔۔ پر نہیں دیکھا یہ کوئی کہ کیسا ہو بَر
بدمزاجی ہو جہالت ہو کہ ہو بدچلنی ۔۔۔ کچھ بُرائی نہیں ڈھونڈتا ہو داماد اگر
جاہلیت میں تو تھی اک یہی آفت کہ وہاں ۔۔۔ گاڑ دی جاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر
ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی ۔۔۔ زندہ درگور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر

علامہ محمد اقبال کا ایک شاہکار ہے جس کے معنی ہیں کہ

''ایک کافر دل کی بیداری (یقین دل) کے ساتھ اپنے بت کے سامنے اُس مسلمان سے بہتر ہے جو کعبے میں غیر یقینی کے عالم میں ہے۔''

کافری بیدار دل پیش صنم ۔۔۔ بہ بہ دینداری کہ خفت اندر حرم

شاید اقبالؔ نے یہ مطلب حالی سے اخذ کیا ہو۔ حالی قطعہ ''یقین'' میں کہتے ہیں:

آتی نہیں ہے شرم تجھے اے خدا پرست ۔۔۔ دل میں کہیں نشاں نہیں تیرے یقین کا
تجھ سے ہزار مرتبہ بہتر ہے بت پرست ۔۔۔ جس کا یقیں ہے تیرے یقیں سے کہیں سوا
وہ مانگتا بتوں سے مرادیں ہے عمر بھر ۔۔۔ آتا نہیں یقین میں اس کے کبھی قصوا
تو بندۂ غرض ہے وہ راضی رضا پہ ہے ۔۔۔ وہ ہے کہ یہ ہے بندگی؟ اے بندۂ خدا

حالی نے سرسید احمد خان پر نثر میں شاہکار سوانح حیات جاوید لکھی جو تقریباً ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ نظم میں بھی حالی نے سرسید پر سب سے زیادہ اشعار لکھے۔ وہ کہیں مرثیے کی صورت، کہیں علی گڑھ تحریک کے جلسوں اور قصیدوں میں اور کہیں قطعات اور نظموں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ دیباچوں، مقالات اور خطوں میں بھی سرسید کا ذکر اور

ان کی فکر کی مدح سرائی نظر آتی ہے۔ ہم یہاں تحریر کی نوعیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے صرف تین طنزیہ قطعات پر روشنی ڈالیں گے۔ ان قطعات میں حالی نے سرسید کی مخالفت اور ان کی تکفیر پر طنز کیا ہے۔ اُردو شاعری میں ہماری نظر میں حالی کے سوا کوئی دوسرا شاعر نظر نہیں آتا جس نے کھل کر بڑی تعداد میں تکفیر کے خلاف شعر کہے ہوں۔

''سید احمد خان کی تکفیر'' کے قطعہ سے چند شعر بغیر تشریح اور تبصرے کے یہاں درج کیے جا رہے ہیں:

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعریف میں
بعض کے نزدیک توحید اس کی حد تام ہے
بعض کہتے ہیں کہ شر سے تیرے سب ایمن رہیں
پس مسلمانی و دیں داری اسی کا نام ہے
بعض کہتے ہیں شعار اسلامیوں کا ہے لباس
جو لباس غیر پہنے خارج از اسلام ہے
اہل حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر
سید احمد خان کو کافر جاننا اسلام ہے

حالی نے اپنے ایک قطعہ میں ''سید احمد خاں کی مخالفت کی وجہ'' بتائی ہے جو صرف سرسید کے سماجی، سیاسی اور مذہبی خیالات یا ان کی تصانیف اور عملیات کے باعث نہیں بلکہ یہ زیادہ تر حسد اور سرسید کی فتوحات کی بنا پر تھی۔

سید احمد خاں کے اک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ
کس لیے سید سے صاف اے حضرت والا نہیں
کافر و ملحد ہمیشہ اس کو ٹھہراتے ہیں آپ
آپ بھی نام خدا ہیں تارک صوم و صلوٰۃ

پھر یہ سید پر تبرا آپ کو زیبا نہیں
سن کے فرمایا اگر ہو پوچھتے انصاف سے
رنج کچھ اس کا نہیں مجھ کو کہ وہ ایسا ہے کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں

حالی کا ایک طنزیہ قطعہ ''سید احمد خان کی تصانیف کی تردید میں'' ہے۔ یہ قطعہ درحقیقت............ایک واقعہ کا منظوم نقشہ ہے جو خود سرسید نے بھی لکھا تھا۔ اُس دور میں سرسید کی ہر تصنیف اور تالیف ہی نہیں بلکہ ہر تحریر اور تقریر کو بھی مذہبی لوگ اور چند حاسد مولوی اپنے اپنے رسالوں اور کتابوں میں موردِ اعتراض اور طعن ولعن کرتے تھے۔ اس قطعہ کا لب لباب یہ ہے کہ

''ایک مولوی جو معاش سے پریشان تھا اور روزی کمانے کے چکر میں سرگرداں تھا اُس کو ایک شخص نے مشورہ دیا کہ سرسید کی تازہ تصنیف بازار میں آئی ہے اُس پر تنقید کر کے تو ثروت مند ہو سکتا ہے۔''

حالی کی زبانی کچھ مصرعوں کو سنیے۔

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے — برسوں رہا تلاش میں وجہ معاش کی
راہ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت — اک خضر بے خجستہ نے کی آ کے رہبری
جھک کر کہا یہ کان میں اس کے کہ آج کل — سنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیف احمدی
جا اور لفظ لفظ کو اس کے چتھیڑ کر — تردید اس کی چھاپ دے جو ہو بری بھلی
پھر دیکھنا کہ راس و چپ و گرد و پیش سے — لگتی ہے کیسے آ کے زر و سیم کی جھڑی

ہم اس تحریر کو حالی کے دو چھوٹے قطعات پر تمام کرتے ہیں۔

سخن سازی

ہے مرد سخن ساز بھی دنیا میں عجب چیز
پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اس کو
موجود سخن گو ہوں جہاں واں ہیں طبیب آپ
اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخن گو
دونوں میں سے کوئی نہ ہوتو آپ ہیں سب کچھ
پر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونوں

ناصح مخلص اور اہل غرض میں تمیز

منصور نے یہ جعفر صادق سے عرض کی
محتاج ہے ہمیشہ سے ناصح کا بشر
کرتے رہیں گر آپ کرم مجھ پہ گاہ گاہ
ہوتا رہوں گا پند سے حضرت کی بہرہ ور
فرمایا ہوتے ہیں تری صحبت میں جو شریک
لائیں گے وہ نہ حرف نصیحت زبان پر
اور جن سے ہے امید نصیحت وہ بالیقیں
صحبت میں بیٹھنے سے کریں گے تری عذر

حالؔی کی غزلوں کا مختصر تعارف

جہاں تک حالی کی غزل گوئی کا تعلق ہے اس کی ابتدا کا تعین مشکل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی نے اپنے ابتدائی دور کی غزلیں تلف کر دیں چناں چہ ان کی غزلیات کا پہلا دور جو حالی شناسوں نے 1863ء سے 1874ء متعین کیا ہے وہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے مصاحب ہونے سے شروع ہوتا ہے۔ اسی زمانے میں غالب کے ساتھ ملاقاتیں اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور تہذیب الاخلاق کے مضامین کے ذریعے سر سید کے خیالات سے واقفیت بھی ہو رہی تھی۔

حالی کے کلام میں دَورِ اوّل یا قدیم دور کی تیس (۳۰) غزلیں شامل ہیں جن کے مجموعی اشعار کی تعداد (۳۰۸) ہے۔ حالی نے دور دوم یا جدید غزلیات کو 1874ء اور 1893ء کے درمیان لکھا۔ یہ وہ غزلیات ہیں جن کے اشعار نساخ کے تذکرہ سخن مطبوعہ 1874ء میں شامل نہیں بلکہ تمام غزلیات دیوان حالی مطبوعہ 1893ء میں موجود ہیں۔ جنکی مجموعی تعداد چھیاسی غزلیں اور (۸۶۳) اشعار ہے۔ دور دوم کی طرح حالی کی غزل گوئی کا آخری دور بھی بیس سال پر مشتمل تھا لیکن حالی نے صرف سات غزلیں کہیں۔ اس طرح حالی کی کل غزلیں (۱۲۳) اور ان کے مجموعی اشعار کی تعداد

(۱۲۶۱) ہوتی ہے۔یعنی حالی کے کلام کا تقریباً پندرہ فیصد حصہ غزلوں کی شکلوں میں ہے۔حالی کی قدیم اور جدید غزلوں میں عموماً اشعار سات سے بارہ شعر ہوتے ہیں لیکن تیس (۳۰) شعر کی غزل، دلی سے متعلق غزل مسلسل ہے اور سب سے کم پانچ شعروں کی غزل بھی ہے۔حالی کی غزلوں میں نعتیہ غزلیں بھی شامل ہیں۔عموماً حالی کی غزلیں مردف ہوتی ہیں لیکن غیر مردف بھی موجود ہیں۔حالی کئی غزلوں میں مقطعے کے شعر کو اپنی ذات سے منسوب کر کے تعلی کم اور بیشتر عجز وانکساری کا پیام دیتے ہیں۔

غزلیات قدیم (۱۸۶۳ء۔ ۱۸۷۴ء)	۳۰ عدد...... ۳۰۸ شعر	
غزلیات جدید (۱۸۷۴ء۔ ۱۸۹۳ء)	۸۶ عدد...... ۸۶۳ شعر	
غزلیات دور آخر (۱۸۹۳ء۔ ۱۹۱۴ء)	۷ عدد...... ۹۰ شعر	
کل غزلیں	۱۲۳ عدد...... ۱۲۶۱ شعر	

یہ سچ ہے کہ حالی کی بلند شاعرانہ حیثیت کی وجہ ان کا مسدس اور ان کی قومی ملی سماجی نظمیں تھیں۔لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ حالی کی غزلیں بہ خصوص پہلے دور کی قدیم غزلیں ان کے شعری شعور اور فن کی نقیب تھیں جن میں تخیل کی روایتی چاشنی نے دوآتشہ کر دیا تھا۔حالی سعدی، میر، غالب، انیس اور شیفتہ سے متاثر تھے جس کی جھلک ان کی غزلوں میں عیاں اور نہاں ہے۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے　　غالبؔ کا معتقد ہے مقلد ہے میرؔ کا

ڈاکٹر اعجاز حسین نے حالی کی غزلوں کے بارے میں سچ کہا ہے کہ

”ان میں میرؔ کا درد غالبؔ کا انداز بیان اور شیفتہ کی سادگی اور سچائی کو یک جا کر دیا ہے۔“

حالی کی قدیم غزلوں کا مطالعہ بھی یہ بتاتا ہے کہ وہ روایتی موضوعات یعنی معاملہ بندی، خمریات، تصوف اور فلسفہ وغیرہ سے دلچسپی رکھتے نہ تھے کیونکہ ایسے اشعار

ان کے مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے یہ اور بات ہے کہ اگر حالی نے انہیں نکال دیا ہو کیونکہ اس طرح کے مضامین تمام تر اساتذہ شعرا تک باندھتے تھے جن سے حالی مستفید تھے۔ حالی یقینا میر کی طرح حساس تھے لیکن میر کی طرح اسیر غم نہ تھے بلکہ وہ سحر کے منتظر تھے۔

دل پُر درد سے کچھ کام لوں گا　　　اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

درحقیقت حالی کی غزل گوئی کا یہ سفر غم جاناں سے غم دوراں بنتا گیا۔ حالی نے انسانی حقوق اور قدروں کو پائمال ہوتا دیکھا ان کے قلب و دماغ میں شعور اور احساس کی جدید فضا پیدا ہوئی چناں چہ اپنی خداداد فنی قدرت کو برصغیر کے سماجی، اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی حالات پر متمرکز کر کے شاعری کے دفتر کو رفارمر کا صحیفہ بنا دیا۔ اس طرح عشقیہ روداد کو درد و گداز کے ہمراہ عزم و استقلال کی کیفیت میں پیش کر کے جدید غزل کا ڈول ڈالا۔

اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں　　　جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی

حالی نے نہ صرف قطرے میں دجلہ دیکھا بلکہ دوسروں کو دکھایا چناں چہ مقدمہ شعر و شاعری میں شاعروں کو اس طرف متوجہ بھی کیا۔ حالی نے قدیم و جدید غزلوں کی تشبیہات استعارات اور اشارات کے قدیم ساغروں میں نئی شراب بھری، زبان اور اُسلوب کو نئے دور کے تقاضوں سے آشنا کروایا جو بعض شاعروں اور ادیبوں کی سخت مخالفت کے باوجود بھی مورد تقلید قرار دی گئی۔

ناجانے کیوں اُردو شاعری پر بچپن سے آج تک غزل کی حکمرانی ہے۔ غزل کی زباں پر ٹکسال کی سند ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ فارسی کا اثر بھی ہو کیوں کہ دودھ کا اثر بہرحال رہتا ہے۔ اُردو نے اگرچہ ماں کا دودھ نہیں پیا مگر فارسی دایہ کا دودھ تو ضرور پیا تھا جس کا اثر آج تک باقی ہے۔

بیسویں صدی میں نظمیں غزل سے عمدہ لکھی گئیں۔ نظم کے شاعروں میں حالی اقبال، جوش، فیض اپنے اپنے دور میں مفید شعر کے تاجدار مانے گئے۔ حالؔی کی بیانیہ شاعری کا مسدس تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا لیکن ان کی زیادہ تر نظمیں سوائے مناجات بیوہ، چپ کی داد اور شکوہ ہند کے سوا گمنامی کا شکار رہیں۔

حالی میرؔ کے مقلد ہیں۔ ان کی شریعت شاعری میں عام آدمی کی زندگی کے مسائل اور جذبات کو نغمگی کے ساتھ پیش کرنا شاعری ہے۔ میرؔ کے کلام کا مطالعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ میر صاحب نے دونوں قدروں سے استفادہ کیا ہے اور ایک کو دوسرے کے لیے قربان نہیں کیا۔ اور حالی نے نظیرا کبرآبادی کی طرح اس مسلک کی پیروی کی ہے مگر یہاں حالی اور نظیرؔ کے درمیان ایک واضح فرق یہ بھی ہے کہ نظیرؔ نے زندگی کے نشاط پرور مسائل پر مستانہ اور رندانہ کیف کے ہمراہ سب کچھ قربان کر دیا جب کہ حالی نے نشاط سے زیادہ غم کو ملحوظ رکھا جس کی بنا پر کہیں ان کے مسدس کو قوم کا مرثیہ کہیں ان کی شاعری کو رونے اور بسورنے کا دفتر کہا گیا۔ حقیقت یہی ہے کہ حالی نے زندگی کے حقیقی مسائل اور مظاہر کو غم و نشاط کے ساغروں میں پیش کیا ہے جو واقعات تجربات اور مشاہدات کی دقیق دیدہ وری سے پیدا ہوئے۔ الفاظ میں نغمگی تو ان میں پوشیدہ ذاتی غنائت یا Organic rhythem سے ہوسکتی ہے لیکن الفاظ میں درد اور تاثیر اُس وقت تک پیدا نہیں ہوسکتی جب تک اُسے دل کے الاؤ میں پکایا نہ جائے۔

حالؔی کی رباعیات کا مختصر جائزہ

حالی نے اُردو میں (۱۶۰) اور فارسی میں (۲۰) رباعیات لکھی ہیں جن کا دور تصنیف ۱۸۶۳ء سے ۱۹۱۴ء تک پھیلا ہوا ہے۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے حالی کی اُردو رباعیات کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔

الف۔ رباعیات قدیم وہ رباعیات جو ۱۸۶۳ء اور ۱۸۷۴ء کے درمیان تصنیف ہوئیں جن کی تعداد صرف سات (۷) عدد ہے۔

ب۔ رباعیات جدیدہ وہ رباعیات جو ۱۸۷۴ء اور ۱۸۹۳ء کے درمیان تخلیق ہوئیں جن کی تعداد ایک سو (۱۰۰) عدد ہے۔

ج۔ رباعیات دور آخر ۱۸۹۳ء سے ۱۹۱۴ء تک کی رباعیات کی تعداد اکیاون (۵۱) عدد ہے۔

حالی نے موضوعات کے لحاظ سے مذہبی، سماجی، اخلاقی، فلسفیانہ اور ذاتی رباعیات کہی ہیں:

مذہبی رباعیات میں حمدیہ، نعتیہ، منقبتی اور رثائی رباعیات شامل ہیں۔ سماجی رباعیات میں افراد اور ان کا ماحول پیش نظر رکھ کر رباعیات تخلیق کی گئی ہیں۔

حالی کی رباعیات کا بڑا حصہ اخلاقی رباعیات اور انسانی قدروں پر مشتمل ہے۔ ان کے پاس فلسفیانہ اور ذاتی رباعیات نسبتاً کم ہیں۔ اس مقام پر ہم رباعیات کا

نمونہ پیش کرتے ہیں۔ حالی کی رباعیات پر میر انیسؔ کا اثر گہرا ہے۔ فارسی رباعیات کی ترکیب بھی اُردو رباعیات کی طرح ہے ان رباعیات کا ذکر ہم نے حالی کی ضمیمہ فارسی میں کیا ہے۔ حالی رباعی کے ہنر سے واقف تھے۔ چناں چہ انہوں نے رباعی کے مضمون کو پہلے دومصرعوں میں تیار کر کے تیسرے مصرعہ میں پوری طرح تراش خراش کر کے چوتھے مصرعے میں یوں پیش کیا ہے کہ اس کا اثر آتشہ ہو جاتا ہے یہ ان کی فن پر مہارت اور قادرالکلامی کی سند ہے۔توحیدی اور حمدیہ رباعیات میں حالی کی ندرت بیانی ہے۔

اے عقل کی فہم کی رسائی سے دور　　ادراک سے اوجھل تو نظر سے مستور
یہ حسرت دید دل میں قائم رکھیو　　بس یاس کی ظلمت میں یہی ہے اک نور

مختلف مذاہب اور عقاید کے لوگ بھی کسی طرح سے معبود کے قائل ہیں۔

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا　　آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے　　انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

اگرچہ حالی عشق محمد ﷺ و آل محمد ﷺ میں سرشار رہتے ہیں جس کی جھلک ان کے کلام میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ حالی نے کئی نعتیں لکھی ہیں۔کئی رباعیات حالی نے نعتیہ کہی ہیں۔ حالی کی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ معمولی اور محلی الفاظ سے شعر کو دل سے جوڑ دیتے ہیں۔

بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا　　اور اُمیوں کو خیر امم تو نے کیا
اسلام نے ایک کر دیا روم و تتار　　بچھڑے ہوئے گلے کو بہم تو نے کیا

حضور نبی کریم ﷺ کی نسبت سے شہروں اسلافوں اور اولادوں کو شرف ملا جس کا خوب صورت مضمون اس رباعی میں ہے:

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف　　یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر　　آبا کو بھی ہے تیری ابوت سے شرف

حالی نے اگرچہ کوئی کربلائی مرثیہ یا سلام نہیں لکھا لیکن اُن کے کلام میں منقبتی اور رثائی اشعار درجنوں بکھرے پڑے ہیں۔ حالی نے مقدمہ شعروشاعری میں مرثیے کو ادب کی اخلاقی درس گاہ بتایا ہے۔ رباعی کی معروف بحر میں خوب صورت رباعی پڑھیے:

کیا پاس تھا قول حق کا اللہ اللہ — تنہا تھے پر اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
میں اور اطاعت یزیدِ گمراہ — لاحول و لا قوۃ الا باللہ

کربلا کا جانباز حُر ابن ریاحی کی زبانی کلمات سے بنائی گئی رباعی ہے۔

حُر کہتا تھا اے دل شہ ذی جاہ سے مل — گمرہ نہ ہو رہبر حق آگاہ سے مل
سرگشتگیٔ کوئے ضلالت کب تک — اللہ سے ملنا ہے تو چل شاہ سے مل

بالکل نیا مضمون ہے۔ یہ رباعی حالی کے دور اوّل کی رباعیات میں شامل ہے۔

گر کفر میں فرعون کا ثانی نکلا — اک شام میں بے داد کا بانی نکلا
سمجھا تھا نہ تھاہ بحر غفلت کی یزید — واں نیل سے بھی زیادہ پانی نکلا

حالی نئی شاعری کے بانی تھے۔ انہوں نے پہلے ماحول کے مطابق پرانی ڈھب کی شاعری کی پھر اعلان کیا۔

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی — بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا — ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

حالی شاعری کو مقصد اور سماجی اخلاقی قدروں کو ابھارنے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ وہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے پاس دار تھے اور انگریزوں کی پھیلائی ہوئی نفرتوں سے نبرد آزما تھے۔

ہندو سے لڑیں گے نہ گبر سے بیر کریں — شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا — وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

کان پور کی مسجد کے افسوس ناک واقعہ پر حالی کی یہ دو رباعیاں دیکھیے:

یاران وطن نے قوم کا ساتھ دیا — دی قوم نے دادِ قوم بے رو و ریا
ہر سو بھڑک اٹھی آگ ہمدردی کی — ہنگامۂ کان پور نے کام کیا

....

تائید میں حق کے جو بلا آتی ہے — ساتھ اپنے بہت سی برکتیں لاتی ہے
بچھڑے ہوئے دوستوں کو ملاتی ہے — روٹھے ہوئے بھائیوں کو منواتی ہے

حالی کا مسدس مسلمانوں کے عروج و زوال کا مرقع ہے۔ اس کا آغاز ہی اس رباعی سے ہوتا ہے جو مضمون کی تمہید باندھتا ہے۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اس زوال کے کئی اسباب ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ عیش و طرب و غفلت ہے۔

اے عیش و طرب تو نے جہاں راج کیا — سلطاں کو گدا غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تو نے نینوا اور بابل — بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

مسلمانوں کے اخلاق کی پستی مذہبی جنون تکفیر کے فتاویٰ سب حالی کی نظر میں زوال کے باعث تھے وہ ان کو اسلام کے دامن پر دھبہ محسوس کرتے تھے۔

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ — کافر کہا واعظ نے انہیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت — لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

اسلام کے دو مکتب خیال پر حالیؔ نے مضمون متن سے ہی باندھا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دونوں گروہ انتہا پسند اور حقیقت سے دور ہیں۔

جبریہ و قدریہ کی بحث و تکرار — دیکھا تو نہ تھا کچھ اس کا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور — جو باہمت تھے ہو گئے وہ مختار

رباعی کٹر صنف سخن ہے یہ بحر ہزج کے چوبیس (۲۴) اوزان میں کہی جا سکتی ہے اسی لیے اس کے لیے کہنہ مشقی اور قادرالکلامی کی ضرورت ہے۔ یہ حالی کی مہارت ہے جو انھوں نے رباعی کے مصرعوں میں محاوروں کو ایسا جڑا ہے جیسے نگینہ انگوٹھی میں۔

مصروف جو یوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ　　خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ
بولیں کچھ منہ سے یا نہ بولیں حضرت　　معلوم ہے ہم کو جتنے پانی میں ہیں آپ

....

کہتا تھا کل اک منکر قرآن و خبر　　کیا لیں گے یہ اہل قبلہ باہم لڑ کر
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ورنہ　　کُتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

حالی نے صنف رباعی قطعوں کی طرح مشاہیر شعر و ادب، احباب اور ہم نشینوں کی قدر و منزلت کو اجگار کرنے کے لیے بھی استعمال کی۔ بعض رباعیاں اگرچہ سیدھی سادی ہلکی پھلکی اور حقیقت اور جذبات سے لبریز ہیں لیکن معروف ہیں۔ اجڑی دلی پر حالی کی یہ رباعی دلوں پر کندہ ہے۔

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیّر باقی　　وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزم یاراں سمجھو　　یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

محسن الملک مہدی علی کی موت پر حالی کے دل سے نکلی ہوئی آواز کو سینے:

ہیہات وہ تعلیم کا حامی مہدی　　سیّد کا وصی قوم کا ہادی مہدی
برسوں یہ صدا رہے گی کالج میں بلند　　مہدی مہدی دریغ مہدی مہدی
جو قوم کی دوستی کا دم بھرتے ہیں　　خدمت پہ وطن کی ناز جو کرتے ہیں
مہدی سے وہ سیکھ لیں کہ اس کوچے میں　　یوں رہتے ہیں یوں جیتے ہیں یوں مرتے ہیں

حالی میر انیسؔ سے بہت متاثر تھے۔ وہ میر صاحب کی زبان دانی اور تخیل کے

عاشق تھے۔ حالی کے کلام میں میر انیس کے کلام کی سادگی، مکالموں کی نشست کا عمل محسوس کیا جا سکتا ہے۔ یہ حالی کی خوش نصیبی تھی کہ ان کی زندگی میں ان کو چار اُردو کے عظیم شاعروں یعنی میر تقی میر، میر انیسؔ مرزا غالب اور محمد اقبال میں سے تین شاعروں کی ملاقات اور معاصرانہ ربط رہا۔ انیسؔ پر تین رباعیات یہاں پیش کی جاتی ہیں چوں کہ عیاں را چہ بیاں اس لیے مزید تشریح یا تبصرہ کے عظمت انیسؔ کو رباعیات میں دیکھ سکتے ہیں۔

رباعی ۱

اُردو کو انیسؔ نے گراں قدر کیا
پائیں سے اٹھا کر لایق صدر کیا
قوت جو نہاں تھی اس میں دی سب کو دکھا
دانے کو شجر، ہلال کو بدر کیا

میر انیسؔ نے کہا تھا:

مری قدر کر اے زمین سخن
تجھے بات میں آسماں کردیا
سبک ہو رہا تھا ترازوے شعر
مگر پلّہ ہم نے گراں کر دیا

رباعی ۲

اُردو گو راج چار سو تیرا ہے
شہروں میں رواج کو بہ کو تیرا ہے
منسوب ہے لکھنؤ سے جب تک کہ انیسؔ
تو لکھنؤ کی ہے لکھنؤ تیرا ہے

رباعی ۳

دلی کی زبان کا سہارا تھا انیسؔ
اور لکھنؤ کا انجمن آرا تھا انیسؔ
دلی تھی جڑ اس کی لکھنؤ اس کی بہار
دونوں کا ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیسؔ

حالؔی کے کلام میں سرسید

حالی نے سرسید کی سوانح عمری شخصیت اور خدمات کا مفصل ذکر ''حیات جاوید'' میں لکھا جس کو شبلی نے کتاب المناقب اور مدلل مداحی کہا۔ حیات جاوید میں حالی نے سرسیّد کے بارے میں تمام معلومات جمع کر دی ہیں لیکن حالی جو سرسید کی صحبت میں حالی بنے تمام عمر سرسید کے مدح خوان اور سچے دوست اور ساتھی رہے۔ یہاں ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حیات جاوید کی نثری دستاویز کے علاوہ حالی نے اپنے منظوم کلام میں سرسید کے بارے میں کچھ قطعات رباعیات قصیدہ اور مرثیہ لکھا۔ حالی کا فارسی میں سرسید کا مرثیہ شاہکار تخلیق مانا جاتا ہے۔ جو ترکیب بند میں ہے یہ مرثیہ سات بندوں میں مشتمل ہے اور ہر بند میں دس شعر ہیں۔ ہم نے اس مرثیے کی تشریح اور ترجمانی شخصی مرثیوں کے ذیل میں کی ہے جس کی تکرار یہاں بے سود ہے۔ حالی کا وہ کلام جو سرسید سے مربوط ہے اس کی تفصیل یوں ہے:

الف۔	قطعہ سید احمد خان کی تکفیر۔	(۱۰) شعر
ب۔	قطعہ سید احمد خان کی مخالفت کی وجہ۔	(۷) شعر
ج۔	قطعہ سید احمد خان کی تصانیف کی تردید۔	(۹) شعر

د۔ قصیدہ ناتمام در مدح سید احمد خان تصنیف ۱۸۷۴ء۔ کل(۱۴) شعر

ہ۔ مرثیہ فارسی سید احمد خان تصنیف ۱۸۹۸ء۔ کل(۷۰) شعر

حالی نے قطعات، قصیدہ اور مرثیہ میں سر سید احمد خان کی قومی علمی سماجی اور اخلاقی خدمات کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان پر مسلمانوں کی جانب سے ہونے والے حملوں کا منہ توڑ جواب بھی دیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں سر سید کو معطون کر کے کفر کا فتویٰ دیا گیا انہیں بے دین اور نیچری کہا گیا۔ حالی نے اس تکفیری دھندے کے خلاف آواز اُٹھائی۔ حالی اُردو ادب کا وہ پہلا شاعر اور نثار ہے جس نے اس مہلک رویہ کی مخالفت کی تھی اور اسے اسلام کے لیے بہت نقصان دہ بتایا تھا چناں چہ حالی کی فکر کی ویژن آج ہم اکیسویں صدی میں دیکھ رہے ہیں۔

حالی اپنی رباعی آزادگانِ راست باز کی تکفیر میں کہتے ہیں:

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیب و گناہ کافر کہا واعظ نے انہیں اور گمراہ
جھوٹے کو نہیں ملتی شہادت جس وقت لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

سر سید کے ناتمام قصیدے میں جو ۱۸۷۴ء کی تصنیف ہے اور جس میں صرف چودہ اشعار ہیں اس میں بھی پہلے سر سید کی خدمات اور قوم کی فلاح و بہبود کا ذکر کر کے یہ سوال کیا ہے۔

بعد از قرون اولیٰ کس نے کیا بتاؤ سید نے کام آ کر جو قوم میں کیا ہے

اور اس مصلح قوم قاید قوم غم خوار و خدام قوم کے ساتھ قوم کا برتاؤ ایسا رہا۔

اس دور آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم اک ہاشمی تمہارا مصلح کھڑا کیا ہے
سرسبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں فتووں سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے
وار اُس پہ قوم کے ہیں وہ قوم کی سپر ہے قوم اس سے بدگماں ہے وہ قوم پر فدا ہے
تعلیم کی تمہاری بنیاد اس نے ڈالی ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے

حالی نے احساس کرلیا تھا کہ تکفیر کرنا فیشن ہو گیا ہے اور یہ مولویوں اور فقہیو ں کا حربہ ہے چناں چہ غزلوں میں قطعوں میں اور مسدس میں بھی اس طرف اشارے کرتے ہیں۔

امت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کے — اسلام ہے فقہیو ممنوں بہت تمہارا
اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا حالی — کہتے پہلے سے تو دے لے کے ہٹایا جاتا
کرتے ہیں ایک اک کی تکفیر آپ کیوں — اس پہ بھی کچھ غور فرماتے ہیں آپ
تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے وقت کی — چھوڑے گا وقت انہیں نہ مسلماں کیے بغیر

حالی رباعی میں لکھتے ہیں۔

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دیں — سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہو گا مرقد میں سوال — تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں

حالی نے اپنے دیوان میں ایک قطعہ کی سرخی سیداحمد خان کی تکفیر رکھ کر دس اشعار لکھے۔ اس قطعے میں حالی نے طنزیہ لہجہ میں مختلف اسلامی ذہنیتوں کے مسموم خیالات کو پیش کیا ہے کہ اسلام صرف بعض گروہ کے لیے رحمت اور باقی سب کے لیے زحمت ہے وہ صرف بعض خاص گروہ کے امن وایمن ہے اگر اُمتی کا لباس اسلامی عبا قبا نہ ہوتو مسلمان باقی نہیں رہ سکتا۔

جو لباس غیر پہنے خارج از اسلام ہے

تمام یہ افراد ایک بات پر متفق اور متحد ہیں کہ سرسید کافر ہیں۔

اہل حل وعقد ہیں اب متفق اس رائے پر — سید احمد خان کا کافر جاننا اسلام ہے

حالی سرسید کی مخالفت کی وجہ سرسید کی شخصیت کی دل پذیری اوران کی عزت و شہرت بتاتے ہیں۔ سرسید سے حسد قوم کے مذہبی لیڈروں کو اس لیے بھی تھا کہ وہ جدید تفاسیر اور تاویلات سے زندگی بسر کرنے کی ترغیب دیتے۔ سرسید کی مخالفت کرنا ایک

عوام اور خواص کا پسندیدہ مشغلہ بھی تھا چناں چہ سرسید کی تحریروں کے جواب میں جو کتابیں چھپتی تھیں وہ ساری فروخت ہو جاتی تھیں۔

حالی نے ایک دوسرے قطعہ میں اسی مضمون کو نظم کیا ہے۔ اس نظم کے کچھ شعر یہ ہیں:

اک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے — برسوں رہا تلاش میں وجہ معاش کی
راہ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت — اک خضر بے خجستہ نے آکے کی رہبری
جھک کر کہا کہ کان میں اس کے کہ آج کل — سنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیف احمدی
جا اور لفظ لفظ کو اس کے چتھیڑ کر — تردید اس کی چھاپ دے جو ہو بری بھلی
پھر دیکھنا کہ راس و چپ و گرد و پیش سے — لگتی ہے کیسے آ کے زر و سیم کی جھڑی

حالؔی پنجاب میں

۱۸۶۹ء کے منحوس سال حالی کے دو بڑے محسن مرزا غالب اور مصطفیٰ خان شیفتہ انتقال کر گئے۔ حالی روزگار کے چکر میں لاہور گئے۔ جہاں گورنمنٹ پنجاب بک ڈپو میں بحیثیت پروف ریڈر ان کا تقرر ہو گیا۔ ان کا کام جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے ان کی اُردو عبارت درست کرنا تھا۔ حالی نے لاہور میں چار سال قیام کیا اور بقول خود:

> ''اس کی وجہ سے مجھے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔''

یہ سچ ہے قدرت نے اپنی کرشمہ سازی سے حالی جو انگریزی زبان و ادب سے آشنا نہ تھے۔ ترجموں کے ذریعے ان پر مسلط کر دیا۔ حالی اُردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے انگریزی قدروں کو اُردو شعر و ادب کے لیے فارسی سے زیادہ سودمند اور عصری تقاضوں کو پورا کرنے میں موثر قرار دیا۔

لاہور اُس زمانے میں اُردو علم و ادب کا اہم مرکز بھی تھا۔ یہاں کرنل ہال رائڈ

کی اسکیم سے متاثر ہوکر محمد حسین آزاد نے موضوعی مشاعرے کی بنیاد ڈالی تھی۔ جہاں مصرعہ طرح کے بجائے نظم کا موضوع دیا جاتا تھا اور شعرا اُسے کسی بھی شعری فارم یا ہیت میں پیش کر سکتے تھے۔ یہ مغربی طرز کے مشاعرے عوام کی توجہ کا باعث ہوئے۔ حالی نے ان مشاعروں میں محمد حسین آزاد کے ساتھ پورا تعاون کیا کیوں کہ وہ بھی قدیم فرسودہ کنگھی چوٹی، چوماچاٹی کے بے جان شاعری سے تھک چکے تھے چناں چہ انہوں نے ان محافل شعری میں چار نظمیں مختلف اوقات میں سنائیں جو ''برکھارت''، ''نشاط امید''، ''مناظرہ رحم و انصاف'' اور ''حب وطن'' کے عنوانات سے مثنوی کی شکل میں آج بھی عمدہ نظمیں مانی جاتی ہیں۔

جس طرح دلی میں حالی وہاں کے نابغۂ روزگار ہستیوں کے ساتھ رہتے تھے اُسی طرح لاہور میں غربت کے باوجود وہ محمد حسین آزاد جو گورنمنٹ کالج لاہور کے عربی کے پروفیسر تھے ان کے ساتھ ہمکاری کرتے جو انجمن پنجاب کے سیکرٹری اور ماہنامہ اتالیق پنجاب کے ایڈیٹر بھی تھے۔ حالی آزاد کو دلی سے جانتے تھے جب کہ وہ قدیم دلی کالج میں ذکاالله اور ڈپٹی نظیر احمد کے ساتھ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ لاہور میں اُردو شعر و ادب کی شمع کو جلائے رکھنے میں آزاد کے ساتھ ڈاکٹر لٹز جو گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے۔ ماسٹر پیارے لال اور کرنل ہال رایڈ کی محبتیں بھی شامل تھیں۔

حالی محمد حسین آزاد کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جب آب حیات پر اعتراضات ہوئے تو حالی نے کُھل کر آزاد کی حمایت کی اور اپنے کام کو جاری رکھنے کی خواہش بھی کی۔ حالی اتالیق پنجاب کے سب ایڈیٹر اور بعد میں پنجاب میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔

محمد حسین آزاد اپنی آخری عمر کے حصے میں ALZAHMER سے دو چار ہو کر ذہنی توازن کھو بیٹھے تھے۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ حالی کی شہرت اور عزت کا ڈنکا

چاروں طرف بج رہا تھا۔ جہاں تک لاہور کے مشاعروں کا تعلق ہے آزاد ہمیشہ حالی کی حمایت کرتے تھے۔ چناں چہ مولوی عبدالحق نے جو ریمارک حالی اور آزاد کے بارے میں ''چند ہم عصر'' میں بیان کیے ہیں۔ وہ افسوس ناک اور حقیقت اور صحت سے عاری ہیں۔ لکھتے ہیں:

''ان بزرگوں میں سے کسی نے کسی کتاب کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ آزاد مرحوم تو اُن کا نام تک سُننے کے روادار نہ تھے۔ اِس معاملے میں ان کی طبیعت کا رنگ بعینہٖ ایسا تھا جیسے کسی سوت کا ہوتا ہے۔ لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی زیر ہدایت جو جدید رنگ کے مشاعرے ہوئے، ان میں دونوں نے طبع آزمائی کی۔ برکھارُت، حبِ وطن، نشاطِ امید اُسی زمانے کی نظمیں ہیں۔ مولانا کی ان نظموں کی جو تعریف ہوئی تو یہ امر حضرت آزاد کی طبعِ نازک پر گراں گزرا۔ اُس وقت سے اُن کا رُخ ایسا پھرا کہ آخر دَم تک یہ پھانس نہ نکلی۔ آزاد اپنے رنگ کے بے مثل نثار ہیں مگر شعر کے کوچہ میں اُن کا قدم نہیں اٹھتا۔ لیکن مولانا کی انصاف پسندی ملاحظہ کیجیے، کیسے صاف لفظوں میں اس نئی تحریک کا سہرا آزاد کے سر باندھتے ہیں۔

۱۸۷۴ء میں جب کہ راقم پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو سے متعلق اور لاہور میں مقیم تھا۔ مولوی محمد حسین آزاد کی تحریک اور کرنل ہال رائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کی تائید سے انجمن پنجاب نے ایک مشاعرہ قائم کیا تھا جو ہر مہینے ایک بار انجمن کے مکان میں منعقد ہوتا تھا۔''

لاہور کے چار سال قیام کے دوران حالی نے نثری کتابیں بھی لکھیں جس میں سب سے عمدہ کتاب ''مجالس النسا'' تھی جس میں عورتوں کی تعلیم و تربیت اور بچوں کی پرورش کے طریقوں کو ایک قصے کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس گراں تصنیف کو حکومت پنجاب کی جانب سے چار سو روپے کا انعام بھی دیا گیا۔ اس کتاب کی زبان سادہ اور سلیس ہے۔ کرنل ہال رایڈ نے سفارش کی واسرائے نارتھ بروک نے 1875ء میں دلی میں تعلیمی دربار میں اس گراں قدر انعام کو حالی کو پیش کیا یہ دربار ایڈورڈ ہفتم کی دلی میں آمد پر منعقد کیا گیا تھا۔

لاہور کے قیام کے دوران حالی نے ڈاکٹر لٹنر کی کتاب جو طبقات الارض کے موضوع پر تھی اُسے عربی سے اُردو میں ترجمہ کر کے ۱۸۸۳ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے شائع کیا جو یونی ورسٹی کے نصاب میں شامل رہی۔

حالؔی اور تذکرہ آبِ حیات

اُردو کی کوئی تنقیدی تحریر محمد حسین آزاد کے تذکرے ''آب حیات'' کے ذکر کے بغیر پوری نہیں ہوتی کیوں کہ اس میں افسانوی اور تاثیراتی گفتگو کو آب حیات پلا کر جاودانہ زندگی بخشی ہے۔ اس کتاب کی بنیاد اُردو کے قدیم تذکروں پر رکھی گئی ہے جس میں عموماً مدح یا قدح کی جاتی ہے اور ان دو انتہاؤں کے علاوہ درمیانی راستے کی گنجایش نہیں ہوتی۔ قدیم تذکروں میں غزلوں کے دیوان کی طرح شاعروں کے نام باعتبار حروف تہجی ترتیب دیے جاتے ہیں۔ شاعروں کے نام کے ساتھ حالات کبھی کبھار مختصر لکھ کر نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے۔

تذکرہ نویس اگر کچھ تبصرہ یا تحریر لکھے تو عموماً وہ علوم قواعد، زبان، بدیع اور عروض کے دائروں سے باہر نہیں ہوتا۔ شاعروں کے ریویو پڑھ کر تذکرہ نویس کے علم و فضل کا احساس تو کسی حد تک ہو جاتا ہے لیکن شاعر کے مقام کا تعین اور اس کے کلام کو پرکھنے میں دشواریاں ہوتی ہیں اور تذکرہ کا اصلی مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ بعض قدیم اُردو تذکروں میں شعری نمونوں کے علاوہ تمام تر تحریر فارسی میں نظر آتی ہے جو اپنی طلسماتی پیکر اور رنگین طبع سے اُردو قارئین کے لیے ایک ایسا مرقع تراشتی ہے جو نظروں کو چکا چوند

کر دیتا ہے اور جس کا سمجھنا تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے۔

محمد حسین آزاد کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ قدیم تذکرے نئے تعلیم یافتہ دماغوں کو مطمئن نہیں کر سکتے جن میں شاعروں کی زندگی شخصیت اور عادات و اطوار کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ ان کے کلام کی خوبی و زشتی صحت اور سقم کی کیفیت کا پتا نہیں چلتا۔ شاعر کا اُسلوب، طرز بیان اور انفرادیت کی بابت حرف گوئی نہیں ہوتی اور حد یہ ہے کہ معمولی اور ضروری اطلاعات جیسے پیدایش اور موت کی تاریخوں کا بھی درج نہیں ہوتا۔ چناں چہ آبِ حیات کی وجہ تصنیف میں لکھتے ہیں:

> ''غرض خیالات مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں انہیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں اور انہیں حیات جاوداں حاصل ہو۔''

سچ یہ ہے کہ آزاد کی آرزو پوری ہوئی شخصیت کے روپ تو سامنے آئے لیکن کلام کے تقاضے پورے نہ ہوئے اس تذکرے میں اُردو زبان کی تاریخ، شعر و اُردو شاعری کی تعریف و تاریخ انہوں نے اپنی فکر و علمیت سے لکھ کر پیش کی جو علم تنقید سے زیادہ تاریخ لسانیات کے باب میں آتی ہے۔ یہاں شاعر کی شخصیت سامنے آ جاتی ہے جس میں ان کے شاعرانہ انداز سے دل نشین تصویریں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ شگفتہ طرز میں واقعات میں طنز و مزاح کی چاشنی کے ساتھ کہیں کہیں عبرت اور تاسف سے تحریر مرقع بن جاتی ہے اور تحریر کی دلکشی کم نہیں ہوتی شاید اسی نثری نغمگی اور ترنم میں ڈوبی ہوئی قدرتی رنگینی کو پیش نظر رکھ کر آزاد کو نثر کا میر انیس کہا گیا۔

آب حیات میں آزاد نے ولی دکنی سے انیس لکھنوی کے پونے دو سو سال

کے عرصے کو پانچ ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور میں تمہیدی بیان اور اُس دور میں شامل چند شعرا پر اظہار خیال کیا جو بڑا انوکھا کام تھا کیوں کہ برصغیر اس دور میں تقریباً ایک ہی ادبی سیاسی علمی ثقافتی اور اقتصادی حالات سے دو چار تھا۔ جہاں تک اُردو زبان کا تعلق تھا لسانی تبدیلیاں متروک الفاظ کی فہرستوں کے علاوہ کوئی خاص انقلاب کا سراغ نہیں ملتا۔جس کی مثال یورپ کے لٹریچر میں موجود ہے۔احسن فاروقی لکھتے ہیں:

''لطف یہ ہے کہ یہ ادوار اس قدر زیادہ مقبول ہوئے کہ جو بھی اُردو شاعری کی تاریخ لکھتا ہے ان ہی ادوار کو اٹل مان کر لکھتا ہے۔ آزاد تو خیر ناواقف تھے وہ لوگ بھی جو دوسرے ادبوں کی تاریخ سے واقف ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں گوارا کرتے کہ آیا آزاد کے قائم کیے ہوئے یہ ادوار صحیح بھی ہیں یا نہیں۔آج آزاد کی طرح بے سوچے سمجھے ادوار قائم کرنے کا عمل بیماری کی طرح پھیل گیا ہے۔ کچھ جماعتوں کا یہ پیشہ ہو گیا ہے کہ ہر سال چند شاعروں کو سامنے کر کے اعلان شائع کر دیتی ہیں کہ یہ ایک نیا دور قائم کرتے ہیں۔''

ہم اس موقع پر حالی کے مضمون سے کچھ اقتباسات پیش کریں گے جو انہوں نے مفصل طور پر آب حیات پر لکھے ہیں۔ اس مضمون سے آبِ حیات کی اہمیت اور محمد حسین آزاد سے حالی کی عقیدت اور ان کے علم و فضل اور انشا پردازی کی قدرت سے بڑی حد تک آشنائی ہو سکتی ہے۔

''ہم کو اس بے مثل کتاب کے مطالعہ سے مستفید ہونے کا موقع اس وقت ملا جب کہ بہت سے اُردو اخباروں میں اس پر ریویو لکھے جا چکے تھے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس کو اپنے ہم وطنوں پر بھی

ظاہر کریں۔ اس تذکرہ کو میں نے اوّل سے آخر تک دیکھا۔ حق یہ ہے کہ یہ اُردو زبان کا پہلا تذکرہ ہے جس میں تذکرہ نویسی کے فرائض ادا کیے گئے ہیں۔ ہمارے تذکرہ نگاروں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ شعرا کے نہایت ضروری حالات کے تجسس میں بھی کبھی کوشش نہیں کی گئی، یہاں تک کہ تاریخ ولادت، تاریخ وفات، مولد، مسکن، قوم، خاندان، تعلیم، مشورۂ سخن وغیرہ کا بھی بہت کم ذکر کیا گیا ہے بلکہ تمام ہمت اس بات میں صرف کی گئی ہے کہ اُن کا کلام جس قدر اپنے مذاق کے موافق پایا انتخاب کر کے لکھ دیا اور اُن کی بے معنی اور لغو ستائش میں جس سے کلام اور صاحبِ کلام کی اصل حقیقت پر اور پردے پڑ جائیں، ورق کے ورق سیاہ کر دیے۔ مصنف نے شعرا کے ضروری حالات لکھنے ہی پر قناعت نہیں کی بلکہ چند شخصیتوں کے سوا جن کے نشان قدم اگلے تذکرہ نویسوں کی بے پروائی سے کسی قدر محو ہو گئے ہیں، ہر شاعر کے سوانح عمری جہاں تک ممکن تھا نہایت تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس نے ان کی تعریف میں وہ شاعرانہ مبالغے بھی نہیں کیے جن کا کچھ ثبوت نہ ہو۔ بلکہ خود ان کے وقائع ایسے لکھے ہیں جن سے اُن کی سیرت اور اخلاق پر استدلال ہو سکے۔ اُس نے ان کے کلام اور شاعری پر نکتہ چینی بھی کی اور جابجا اپنی رائے بھی ظاہر کی ہے مگر ادب اور تہذیب کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور نہایت خوبی کے ساتھ اس دشوار گزار مرحلہ کو طے کیا ہے، وہ تاریخ اُردو کے مضمون میں پارسیوں، ہندوؤں اور بودھ مت والوں کا نام

ایسے ادب سے لیتا ہے کہ ہمارے بھائی مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کا نام بھی ایسے ادب سے نہیں لے سکتے۔

مصنف نے اس تذکرہ کے اوّل میں دو مضمون زبان اُردو اور نظم اُردو کی تاریخ پر لکھے ہیں۔ پہلا جو زبان اُردو سے متعلق ہے، اس نے انگریزی مؤرخوں کی کتابوں سے نہایت کوشش کے ساتھ چھان بین کر کے مدد لی ہے اور پچھلا بڑا حصہ جو کہ اُردو، بھاشا، عربی اور فارسی زبانوں سے متعلق ہے وہ خاص مصنف کی اس طرز کی شاعری ابھی ایسی حالت میں ہے کہ اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ دوسرے جس چیز کی ہدایت خود مصنف سے ہوئی ہے۔ اس کا جتانا مصنف کے معاصرین کا حق ہے نہ کہ خود مصنف کا۔ اس مضمون کے اخیر میں مصنف نے میر انیس اور مرزا دبیر کو خاتمہ شعرائے اُردو لکھا ہے، یہ اس نے ایک نہایت انصاف کی بات لکھی ہے بلکہ میر انیس کا رتبہ ہمارے نزدیک اس سے بہت بڑھ کر ہے۔ ہماری رائے میں اُردو شاعری کا پورا پورا اطلاق اگر ہو سکتا ہے تو میر انیس ہی پر ہو سکتا ہے۔ میر انیس پر نہ صرف اہل لکھنؤ بلکہ ان سے زیادہ اہل دہلی کو فخر کرنا چاہیے کیونکہ ان کے بزرگ اسی معدن کے جواہر تھے۔ یہ مثل کہ

''بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویّا مرثیہ خواں''

شاید اس زمانے میں مشہور ہوئی ہو گی جب کہ مرثیہ گوئی کا آغاز تھا اور غزل اور مثنوی معراج کمال کو پہنچ چکی تھیں جیسے ہماری قوم میں اب سے بیس برس پہلے علومِ قدیمہ کے سامنے علومِ جدیدہ ہیچ

د پوچ سمجھے جاتے تھے لیکن اب روز بروز خیالات دگرگوں ہوتے
جاتے ہیں۔ نظم اُردو میں نیچرل شاعری کا پتا اگر ملتا ہے تو میر انیس
ہی کی شاعری میں ملتا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے ولی سے لے
کر غالب تک شعرائے اُردو کے پانچ طبقے کیے ہیں اور ہر ایک
طبقہ کے نامور اور مستند شاعر (جو کہ اس کے نزدیک مستند تھے)
انتخاب کر لیے ہیں، اگرچہ بعض طبقات میں ایک آدھ ایسے شاعر کا
حال قلم انداز کیا گیا ہے جو اپنے طبقہ میں مستند سمجھا جاتا تھا جیسے
طبقۂ پنجم میں مومن خاں مومنؔ کی بے انتہا اور بے بہا کوشش کا
نتیجہ ہے۔ یہ تمام مضمون نہایت مفید اور بصیرت افزا اور زبان کی
حقیقت کا آئینہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مصنف سے اس باب میں
کوئی ضروری بات فروگذاشت ہوگئی ہو تو اس پر کچھ اعتراض نہیں
ہوسکتا، کیونکہ جو شخص سب سے اوّل کوئی تاریخی مضمون لکھتا ہے
اس کو ہزاروں پریشان باتیں فراہم کرنی پڑتی ہیں اور ممکن نہیں کہ
کوئی ضروری چیز فروگذاشت نہ ہو جائے۔ لیکن ہم افسوس کے طور
پر لکھتے ہیں کہ اُردو زبان کی ترقی کے بیان میں پرچۂ تہذیب
الاخلاق کا کچھ ذکر نہیں کیا گیا۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو
اس پرچہ نے اُردو زبان کو چند روز میں اس درجہ تک پہنچا دیا ہے
جو کم سے کم پچاس برس کے بعد اس کو حاصل ہوتا۔ اُردو لٹریچر پر
اس پرچہ کا بہت بڑا احسان ہے۔ مذہب، اخلاق، معاشرت اور
تمدن پر جو اعلا درجہ کے مضامین اس پرچہ میں لکھے گئے ہیں
انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اُردو زبان کسی مطلب کے ادا

کرنے سے قاصر نہیں ہے۔ بلند خیالات کو سیدھے سادے لفظوں میں موثر طور پر بیان کرنا اسی پرچہ نے لوگوں کو سکھایا ہے اور اس فخر کا وہ ہمیشہ مستحق سمجھا جائے گا۔ نظم اُردو کی تاریخ کا مضمون بھی جس کو پہلے مضمون کا ضمیمہ کہنا چاہیے نہایت عمدہ ہے۔ اس کی نسبت بھی کہا گیا ہے کہ اس میں نیچرل شاعری کا ذکر جس کی بنیاد خود مصنف نے انجمن پنجاب میں ڈالی تھی قلم انداز کیا گیا ہے لیکن اس باب میں مصنف کی طرف سے یہ عذر ہوسکتا ہے یا میر نظام الدین خاں ممنون لیکن اس کا یہ عذر ہوسکتا ہے کہ مصنف نے کہیں یہ دعویٰ نہیں کیا کہ کسی دور کا کوئی مستند شاعر فروگذاشت نہیں کیا جائے گا بلکہ اس نے ہر دَور میں سے چند شاعر بطور نمونہ کے انتخاب کر لیے ہیں اور ان سے ان تغیرات کا دکھانا منظور ہے جو ہر ایک دور میں زبانِ اُردو پر واقع ہوئے ہیں۔ البتہ اگر مصنف تمام شعرائے اُردو کا حال بالاستیعاب لکھتا تو چند نامی شاعروں کا ذکر نہ کرنا محل اعتراض تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک عام خیالات ظاہر کرنے کے ساتھ (جیسا کہ مصنف نے کیا ہے) یہ بھی ضرور ہے کہ ہر ایک شاعر کے اعلیٰ درجہ کے خیالات اور اچھوتے مضامین بھی دکھائے جائیں تا کہ اس کا مبلغ فکر اور رسائی طبیعت کا منتہا معلوم ہو اور اس کے پُرکُن اور پست خیالات بھی بطور نمونہ کے ظاہر کیے جائیں تا کہ اس کی طبیعت کے اتار چڑھاؤ کا حال اچھی طرح خاطر نشیں ہو جائے۔ بظاہر اس تمام تذکرہ میں ۲۳ شاعروں کا حال قلم بند اور ان کا کلام نقل کیا گیا ہے لیکن تراجم

شعرا کے ضمن میں جابجا ان کے معاصرین اور ان کے ہم صحبتوں کا ذکر بھی کیا ہے اور ہر موقع پر بہت دلچسپ نقلیں اور لطیفے ایزاد کیے ہیں اور تمام حالات کے فراہم کرنے میں جو محنت اور جانکاہی مصنف نے کی ہے اس کا اندازہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ابتدائے سنِ تمیز سے ایک ایسی جامع کتاب لکھنے کا ارادہ کیا ہوگا اور وقتاً فوقتاً جہاں جو سرمایہ ملا اس کو احتیاط کے ساتھ ضبط کیا ہوگا ورنہ ایسے تفصیلی حالات جو کتابوں میں درج نہ ہوئے ہوں اور صرف افواہِ خلائق پر جاری ہوں، کسی طرح اس ترتیب کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ اب ہم مصنف کی شکر گزاری پر اس ہذیان سرائی کو ختم کرتے ہیں جس نے اپنے بیش قیمت اوقات کا ایک بہت بڑا حصہ صرف کر کے اہل وطن کے لیے ایک ایسی کتاب تیار کی ہے جو زبان کے محققوں کے لیے ہادی اور رہنما ہے، سیر و اخبار کے شائقین کے واسطے ایک داستان عبرت انگیز ہے، ظرافت پسندوں اور نوجوانوں کے لیے سامان خندہ و نشاط ہے اور اصحابِ رائے کے لیے ایک مفصّل روئیداد ہے، جس میں اُردو شاعری کے فیصلہ کے لیے کافی شہادتیں موجود ہیں۔ اگرچہ وہ وقت ابھی نہیں آیا کہ شائستہ ملکوں کی طرح ہر نئی تصنیف و تالیف پر ہمارے ہم وطن بھی اس طرح گریں جیسے پیاسا ٹھنڈے پانی پر گرتا ہے لیکن عمدہ اور مفید تصانیف کا حق ہے کہ اہل وطن دل و جان سے ان پر متوجہ ہوں اور ان کی قدر کریں اور مصنفوں کے شکر گزار ہوں۔“

حالؔی اور شبلؔی

حالؔی نے شبلؔی سے بیس (۲۰) سال زیادہ زندگی گزاری اگرچہ دونوں کا سالِ رحلت ۱۹۱۴ء ہے۔ حالی اور شبلؔی سرسید کے مصاحبین میں شامل تھے۔ حالی اور شبلی کی ملاقات بھی علی گڑھ میں ہوئی تھی۔ سرسید کی خواہش تھی کہ شبلی ان کی سوانح عمری لکھیں لیکن یہ کام بعنوان حیات جاوید حالی نے سرسید کے انتقال کے دو تین سال بعد تکمیل کیا۔

حالی پانی پتی اور شبلی اعظم گڑھی تھے۔ دونوں اُردو فارسی اور عربی کے شاعر تھے۔ دونوں کا تعلق سرسید کی تحریک سے تھا اگرچہ بعد میں شبلی نے کچھ دوری اختیار کر لی تھی اور وہ الندوہ مشن کے روح رواں بن گئے تھے۔ شبلی جذباتی تھے حالی خاموش طبیعت کے، اسی لیے ان دونوں کے دوست اور بزرگ عماد الملک سید حسین بلگرامی نے حالی کے بارے میں لکھا تھا کہ

”سرسید کے گروہ میں حالی جیسا نیک اور فرشتہ صفت دوسرا شخص نہیں یہاں تک کہ سرسید بھی اس جہت سے حالی کے پیچھے ہیں۔“

حالی اور شبلی دونوں شمس العلما خطاب یافتہ تھے۔ دونوں کی تصانیف کی

شہرت تھی دونوں انگریز حکومت کے طرف داروں میں شامل تھے۔ دونوں محمد حسین آزاد کا احترام کرتے اور ان کی تصانیف کی مدح سرائی کرتے تھے۔ حالی نے محمد حسین آزاد کے ساتھ دلی اور لاہور میں وقت گزارا۔ شبلی نے اگرچہ ان کو صرف ایک بار ان کی بیماری کے عالم میں دیکھا لیکن ہر وقت ان کو خدائے سخن کہہ کر یاد کرتے تھے۔ شبلی کی تحریروں میں جو ذوق سخن تھا حالی اُس سے محروم تھے۔ حالی کی نظموں میں جو گہرائی تھی شبلی اُس سے دور تھے۔ دونوں نے انگریزوں کی مدح سرائی کی۔ حالی کے اشعار جو قطعات قصیدوں اور شخصی مرثیوں میں ہیں اس بات کا ثبوت ہیں۔ شبلی کے بہت سے قصیدوں اور قطعوں کو ان کے باوفا شاگرد سید سلیمان ندوی نے شبلی کی کلیات میں اس لیے جگہ نہ دی کہ شبلی حکمرانوں کی مدح کو پسند نہیں کرتے تھے۔ یعنی وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اشعار شبلی نے لکھے نہیں بلکہ لکھائے گئے ہیں۔ بہرحال

چھپ نہیں سکتا ہے شاعر شعر کے چھپنے کے بعد

زمانے کی رسم اور دنیا کا رواج ہے کہ ہم عصروں میں چشمک ہوتی ہے۔ اُردو شعر و ادب ان معرکوں سے پانی پت کا میدان بنا ہوا ہے۔ اگرچہ حریفان قوی ہوں اور دونوں کی طبیعتوں میں آتش فشانی ہو تو حاشیہ بردار اس سے فائدہ اٹھا کر جنگل کی آگ کر دیتے ہیں چوں کہ حالی بہت منکسر المزاج اور نرم طبیعت کے صلح جو تھے اس لیے یہ مسئلہ بڑھ نہ سکا اگرچہ دونوں طرف کے احباب مسلسل سرگرم رہے۔

مولانا سیّد سلیمان ندوی ''حیات شبلی'' میں لکھتے ہیں:

''شبلی کو اپنے معاصرین میں مولانا حالی کے ساتھ سب سے زیادہ عقیدت، محبت اور الفت تھی اور اُن کی دقتِ نظر اور اُن کی سخن فہمی کے ہمیشہ مداح رہے، فرماتے تھے کہ

''وہ جو ہر کو خوب سمجھتے تھے اور بڑی نازک تنقید کرتے تھے،

فرماتے تھے کہ جاحظ کی کتاب البیان والتبیین جب نئی نئی چھپ کر آئی تو مجھے وہ بے ترتیب اور پراگندہ معلوم ہوئی، رات کو مولانا حالی آئے اور وہ کتاب مانگ کر لے گئے، صبح کو واپس کی تو فرمایا کہ یہ نثر کا حماسہ ہے۔''

مولانا کہتے ہیں کہ

''اُن کے اس ایک فقرہ نے کتاب کے موضوع کو میرے سامنے آئینہ کر دیا، اور اُس کی ترتیب کا وہ پہلو میرے سامنے آ گیا جو پہلے سامنے نہ تھا۔''

فرماتے تھے:

''میں دریا ہوں اور حالی کنواں ہیں۔ میرا علم دریا کی طرح وسیع ہے اور حالی کے پاس معلومات اگرچہ کم ہیں لیکن وہ گہرے ہیں، جب تک کافی مواد وتحریر موجود نہ ہو میں ایک قدم بھی چل نہیں سکتا، مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں، اُن کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے، جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا، اور یہ کمالِ اجتہاد کی دلیل ہے، مولانا حالی کی تصنیفات میں حیاتِ سعدی کو نہایت پسند فرماتے تھے، شعرالعجم حصہ دوم میں سعدی کے حالات لکھنے میں اس لیے پس و پیش کرتے تھے کہ حالی کے بعد اُس میں کیا اضافہ کیا جا سکتا ہے، لیکن مجبوراً سعدی کے حالات لکھے تو اُس کے ساتھ یہ حاشیہ لکھا:

''مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے حیات سعدی میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا ہے، اس کے بعد کچھ لکھنا

بے فائدہ ہے لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ
اصرار کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا۔''

'حیاتِ سعدی' شائع ہوئی تو اُس پر ریویو لکھا، مولانا کا عام قاعدہ تھا کہ جس چیز کو خود پسند کرتے تھے، اپنے اعزّہ تلامذہ اور احباب کو بھی اس کی ترغیب دیتے تھے، حیاتِ سعدی بھی اسی قسم کی پسندیدہ چیزوں میں تھی، چناں چہ ایک عزیز کو لکھتے ہیں:

''ایک کتاب حال میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفۃً بھیجی ہے، یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ، محققانہ سوانح عمری ہے، میں نے بے اختیار اس کو تمہارے لیے پسند کیا اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں، دیکھو کہیں واپس نہ جائے، قیمت ایک روپیہ چار آنہ ہے، واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا نہایت ضروری ہے، اس کتاب کے اور خریدار پیدا کرنے چاہئیں۔''

اس کے برخلاف شبلی کا دوسرا رخ دیکھیے، جب حالی کی ''حیات جاوید'' چھپ کر آئی تو مولوی عبدالحق ''چند ہم عصر'' میں لکھتے ہیں:

''جب میں نے حیات جاوید کا ایک نسخہ ان کو دیا تو دیکھتے ہی فرمایا ''یہ کذب و افترا کا آئینہ ہے۔''

یہ جملہ سُن کر عبدالحق دم بخود رہ گئے کیوں کہ پڑھنے سے پہلے ایسی سخت رائے کیا معنی رکھتی تھی۔

شبلی حبیب الرحمان خان شیروانی کے خط میں حیات جاوید کو کتاب المناقب لکھتے ہیں۔ ایک دوسرے خط میں شیروانی کو لکھتے ہیں:

''وہ محض دعوے کرتے ہیں واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے
بہرحال حیات جاوید کو میں مدلل مداحی سمجھتا ہوں۔''

سیّد سلیمان ندوی نے حیات جاوید کے ریویو کو بغیر تمام تمہید کے صرف ''کتاب المناقب'' اور ''مدلل مداحی'' لکھا۔

شبلی اپنے شاگرد عبدالسمیع کو حیات جاوید پر منفی ریویو کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''میں کچھ مزید نہیں کہنا چاہتا تم مقلد نہیں مجتہد ہو پھر تقلید کیوں؟''

حالی نے کئی مقامات پر تکفیر یعنی دوسرے مسلمان کو کافر قرار دینا شدت سے احتجاج کیا ہے۔ حالی کے ہم عصروں میں سرسید، ڈپٹی نذیر احمد اور شبلی نعمانی کو کافر قرار دیا جا چکا تھا۔ حالی اس سے سخت نالاں تھے۔ چناں چہ اُردو شعریات میں اس موضوع پر سب سے زیادہ اشعار حالی نے لکھے ہیں۔ حالی شبلی کی علمی قدرت کے قدرداں تھے انہوں نے شبلی کی تصانیف اور ان کے شعری کلام کی تعریف بھی کی ہے۔ حالی نے شبلی کے قائم کردہ دارالعلوم کو ایک مثبت قدم قرار دیا چناں چہ جب 1904ء میں الندوہ کا اجرا ہوا اور اس میں علم حدیث پر سید سلیمان ندوی کا مضمون چھپا، حالی نے شبلی کو لکھا:

''سب سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہے۔

فبارک اللہ فیھا و فی طلبتھا و فیتعلمھا۔

مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کامل تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت ہماری قوم میں ایسے لایق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی نہیں پیدا کرسکتی۔''

۱۷ مئی ۱۹۰۷ء کو ان کی بہو کی غلطی سے بندوق کی گولی شبلی نعمانی کے پاؤں پر چل گئی جس کی وجہ سے پاؤں کا حادثہ پیش آیا اور ان کی سرجری ہوئی اور نصف پنڈلی کاٹ دی گئی۔ دوست احباب نے اس بڑے حادثے سے نجات پر اشعار لکھے۔ حالی نے بھی ایک رباعی فارسی میں اس حادثے سے متاثر ہو کر کہی۔ یہ رباعی حیات شبلی میں بھی موجود ہے جو الندوہ ستمبر اکتوبر ۱۹۰۷ء کو شائع ہوئی۔

شبلی کہ گزند پاش پُر دل شکن است　　با خستگیش خجستگی مقترن است
چندان کہ بکاہند فزایند اینجا　　کاراستن چمن ز پیراستن است

حالی قدیم فارسی عنصری کے مصرعہ پر تضمین کر کے کہتے ہیں۔ اگرچہ شبلی کے پاؤں کی جراحت دل شکن ہے۔ جس میں غم اور خوشی کا سامان ہے یہ سچ ہے کہ اس کو بڑھائیں یا گھٹائیں۔ بقول عنصری چمن کی خوبصورتی اس کی تراش خراش سے باقی ہے۔

حالی نے شبلی کی صحت یابی کی خوشی میں ایک سات شعر کا فارسی قطعہ بھی لکھا جو دراصل ماہ ستمبر ۱۸۹۹ء میں شبلی نعمانی کے ''قصیدہ کشمیریہ'' کا جواب تھا جو شبلی نے اپنے دوستوں کو بیماری سے شفایاب ہونے پر بھیجا تھا۔ اس قصیدے کا مطلع ہے:

دوستاں ای کہ رہ و رسم وفا کیش شماست　　ہیچ دانند کہ شبلی بچہ حال ست و کجاست

''یعنی اے دوستو! جو وفادار ہونے کا دعویٰ کرتے ہو کچھ معلوم ہے کہ شبلی کا کیا حال ہے اور وہ کہاں ہے؟''

حالی کہتے ہیں:

لِللّٰہُ الحمد پس از ناخوشی و رنج دراز　　شبلی ما بہ مراد از سر بالیں برخاست
آں کہ نامش بہ کمالات سمر در گیتی ست　　آں کہ مشہور در آفاق بہ شمس العلما ست
آں کہ گر سر کند افسانۂ فضل و ہنرش　　خاصہ مشکل کہ بہ پایاں بردش بے کم و کاست

آں کہ خوانندش اگر فخر زمانِ خود و بس — کردہ باشند عدول اہلِ سخن از رہِ راست
بود در علت او علت قومے مضمر — لاجرم صحتِ او بہر ہمہ قوم شفا ست
بسکہ او روح دمیدہ است بہ تاریخِ سلف — بر قدر فخر پہ ذاتش بکند قوم رواست
زندہ تا دیر بماناد کہ برقد کسے — بعد ازو خلعت تحقیق نمی آید راست

خدا کا شکر ہے کہ بیماری اور رنج و درد کے بعد ہمارا شبلی بستر علالت سے اٹھا جس کا نام دنیا کے عظیم باکمال تخلیق کاروں میں ہوتا ہے اور جو آسمانوں میں بھی شمس العلما کے نام سے مشہور ہے۔ اگر اس کے فضل اور ہنر کے افسانہ کو پڑھیں تو بڑی مشکل سے تمام ہو سکے گا اگر اُسے صرف فخر زماں کہا جائے تو یقیناً سخنوروں نے اس کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ کیوں کہ اس کا وجود قوم کا وجود ہے اس لیے بے شک اس کی صحت یابی قوم کی شفا ہے اُس نے تاریخ اسلاف میں جو روح پھونکی ہے اس کی شخصیت پر قوم جتنا بھی فخر کرے بجا ہے۔ وہ طولانی عمر پائے کیونکہ تحقیق کی خلعت (لباس فاخرہ) کسی اور بدن پر موزوں نہیں جچتی۔

سیّد سلیمان ندوی حیات شبلی میں لکھتے ہیں:

> ''ڈپٹی سیّد زین العابدین کا بیان ہے کہ سرسید نے ان ہی سے انگریزی میں ایک چٹھی لکھوا کر گورنمنٹ میں بھیجی کہ مولانا شبلی جیسے فاضل کی قدردانی ترکی گورنمنٹ تو اتنی کرے کہ تمغہ مجیدی عطا فرمائے اور انگریزی گورنمنٹ بڑے افسوس کی بات ہے اس فرض سے غافل رہے۔ اس کے بعد جو ہوا وہ یہ ہے کہ گورنمنٹ نے جنوری ۱۸۹۴ء کو مولانا کو شمس العلما کا خطاب دینے کا اعلان کیا۔''

چناں چہ اسی تقریب میں حالی نے شبلی کی مدح میں عربی قصیدہ پیش کیا۔ ہم پورا قصیدہ سلیمان ندوی کے ترجمے کے ساتھ پیش کر رہے ہیں:

قصیدہ من الحبیب الی الحبیب

(ایک حبیب کی طرف سے دوسرے حبیب کو ہدیہ)

یا وحید امن الکرام فریدا و عزیزاً کمثل علقٍ نفیسٗ

''اے بڑے آدمیوں میں یکتا اور یگانہ، اور نادار الوجود مثل نفیس و نادر چیز کے۔''

انت اولی بان تلقَّبَ شمسًا بَل باَنْ یجعلوک شمسَ الشموس

''تو اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ تجھ کو آفتاب کا لقب دیا جائے، بلکہ اس بات کا کہ تجھ کو آفتابوں کا آفتاب قرار دیا جائے۔''

انت شمسُ الھُدی و لست لشمس یعتریھا الخنوس بعد خنوس

''تو ہدایت کا آفتاب ہے اور وہ آفتاب نہیں، جس کو غروب پر غروب لاحق ہوتا ہے۔''

انت طھَّرت ذیل دین مبین لوّثتہ اللئام بالتدلیس

''تو نے دینِ مبین کے دامن کو پاک کیا، جس کو کہ کمینوں نے فریب دہی سے آسودہ کر دیا تھا۔''

ثم دافعت عن امامٍ تقی کان بعد النّبی خیر رئیس

''پھر تو نے اس امام پاک کی طرف سے مدافعت کی، جو پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے بڑا سردار تھا۔''

و عن الحق قد کشفت غطاءً بعد ما اغلقوہ بالتلبیس

''اور تو نے حق سے پردہ اٹھایا، بعد اس کے کہ لوگوں نے اس کو دھوکہ سے پردہ میں چھپا دیا تھا۔''

سرتَ فی الارض برًّا و مجرًا للعالی ولا لامر خسیس

''تو نے دنیا کے بحر و بر کی سیر کی، اعلیٰ مقاصد کے لیے نہ کسی ذلیل غرض کے لیے۔''

قلّدوک التزاد مدرس قومٍ فیه یرجی لهم کمال النفوس

''تجھ کو قومی مدرسہ کی خدمت سپرد کی گئی، جس میں کہ نفوس کی تکمیل کی امید کی جاتی ہے۔''

مقلّدت والتزمت لزوماً خدمة المسلمین بالتدریس

''تو تو نے اس خدمت کو قبول کیا، اور درس و تدریس سے اُن کی خدمت کا فرض ادا کیا۔''

قمت بالدرس واللّٰه اته فیهم غارغًا عن ریاسة و رئیس

''تو تعلیم اور درس میں مشغول ہوا، ریاست اور رئیسوں سے بے پروا ہو کر۔''

و جعلت الکمال غایة همٍّ واتخذت الکتاب خیر جلیس

''اور تو نے کمال کو اپنا انتہائے مقصد قرار دیا، اور کتاب کو عمدہ ہم نشیں بنایا۔''

فعلی القوم لازماً لک حق کلّهم من وجوههم ورؤس

''پس قوم میں جس قدر اکابر و اعیان ہیں، سب پر تیرا لازمی حق ہے۔''

صانک اللّٰه عن مکاره حتی صرت کا لقلب اِمنا فی الخمیس

''خدا تجھ کو مکروہات سے بچائے، یہاں تک کہ تو اس طرح محفوظ رہے جس طرح فوج میں قلب کا حصہ۔''

حالؔی کی دلّی

حالی پانی پتی تھے مگر دلّی کے عاشق تھے۔ حالی کا نہ مولد دلّی تھا اور نہ ان کا مدفن دلّی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دلّی حالی کے دل میں بسی ہوئی تھی۔ حالی کی عمر کا تقریباً چوتھائی حصہ دلی میں کٹا دلی ہی میں وہ غالب کے شاگرد بنے۔ دلی ہی میں ان کی ملاقات مصطفیٰ خان شیفتہ اور سرسید احمد خان سے ہوئی جنہوں نے ان کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا اور وہ خالی سے حالی بنے۔ حالی نے دلی کے مشہور و معروف شاعروں کے ساتھ مشاعرے پڑھے۔ دلی ہی میں ان کی جوانی کی راتیں بھی گزریں۔ اکرام خان شیدا کا دیوان خانہ جہاں علم و ادب شعر و شاعری کا بازار گرم تھا۔ جہاں رقص اور سرور کی محافل بھی ہوا کرتی تھیں۔ حالی ان میں شرکت کرتے تھے۔ حالی کو فطرت نے کائناتی مشاہدہ کی وہبی دقیق نظر عطا کی تھی چناں چہ وہ ہر کائنات کے چھوٹے بڑے نظارہ کا تجزیہ اور تصویر کشی کر کے ذہن میں محفوظ کر لیتے۔ عربی، فارسی، اُردو کی ادبی اور مذہبی کتابوں کے مطالعے کر کے حافظے کے صندوق میں بند کر لیتے۔ مجلسی مطالعے میں کبھی غالب کبھی شیفتہ کبھی دہلی کے دوسرے نامور شعرا اور محافل شعر و سخن سے مستفید رہتے۔ یہ سچ ہے کہ دلی میں حالی صحیح اوقات میں صحیح افراد کے ساتھ رہے جس کی وجہ سے وہ صحیح مشوروں

اور صحیح راستوں پر گامزن ہوئے۔ حالی سے اختلاف کرنے والوں کے جلن کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حالی ایک معمولی مقام پانی پت کی پیداوار ہوکر اہل زبان دہلی اور لکھنو والوں کو درسی ادب وشاعری دے رہے تھے۔ کبھی کہتے:

دلی دلی کیسی دلی   پانی پت کی بھیگی بلی

کبھی کہتے:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے   میدان پانی پت کی طرح پائمال ہے

لیکن حالی کی زندگی کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں پتا چلتا ہے کہ وہ برصغیر میں کہیں بھی رہے مگر دلی ان کی حدیث دل تھی ایسا لگتا ہے کہ دلی ان کی محبوبہ تھی اور وہ دلی کے ہوکر رہ گئے تھے۔

حالی بس اب یقین ہے کہ دلی کے ہورہے   ہے ذرّہ ذرّہ مہرفزا اس دیار کا

دلی پر حالی نے جوتیس اشعار کی غزل مسلسل لکھی ہے وہ ان کے دل کی روداد ہے۔ اس غزل کی مشکل ردیف ہرگز میں حالی نے عمدہ اشعار نکالے ہیں۔ اس میں دلی کی تاریخ جغرافیہ ادبی اور سماجی محافل اور نامور شعرا کا بیان موجود ہے یہ ایک ایسا قصیدہ ہے جس میں مرثیہ بھی شامل ہے۔ اُردو شاعری میں شاید کوئی ایسی عمدہ دلی پر نظم ہواس کا مطلع ہے:

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز   دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

ہم یہاں آٹھ نو شعر انتخاب میں پیش کر کے غزل کو مقطع پر ختم کرتے ہیں:

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ   نہ سُنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہِ خاک   دفن ہو گا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلی   ہم کو بھولے ہوتو گھر بھول نہ جانا ہرگز

کوچ سب کر چکے دلی سے ترے قدر شناس   قدریاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہو گی یارو
یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانہ ہرگز

غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سُنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کہ رلانا ہرگز

....

حالی بس اب یقیں ہے کہ دلی کے ہو
ہے ذرّہ ذرّہ مہر فزا اس دیار کا

....

حالی اب اسی کو بزم یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

....

دلی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

جدول مسدس حالؔی

تصنیف رباعی	:	۱۸۷۹ء
تصنیف مسدس	:	۱۸۷۹ء
تصنیف ضمیمہ	:	۱۸۸۶ء
تصنیف عرض حال	:	۱۸۸۶ء
ہیّت مسدس وضمیمہ	:	مسدس
ہیئت عرض حال	:	قطعہ/قصیدہ نعتیہ

جدول اشعار

رباعی		۲ شعر
مسدس	(۲۹۴ بند)	۸۸۲ شعر
ضمیمہ	(۱۶۴ بند)	۴۹۲ شعر
عرض حال		۶۳ شعر
کل تعداد اشعار مسدس اور ضمیمہ:		۱۳۷۴ شعر

مسدس حالی کا اجمالی تجزیہ

تصنیف رباعی: 1879ء

تصنیف مسدس: 1879ء

تصنیف ضمیمہ: 1886ء

تصنیف عرض حال: 1886ء

ہیت مسدس وضمیمہ: مسدس

ہیت عرض حال: قطعہ/قصیدہ نعتیہ

جدول اشعار مسدس:

رباعی: --------------------------------2شعر

مسدس: ----------(294 بند)----------882شعر

ضمیمہ: -----------(164 بند)-----------492شعر

عرض حال: -----------------------------63شعر

کل تعداد اشعار: -------------------- مسدس اور ضمیمہ: (1374) اشعار

مسدس حالی کا تجزیہ اور اس کی ہیت (Form) پر گفتگو سے پہلے ہم اُردو زبان میں مسدس بہ حیثیت صنف سخن یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس صنف سخن کی بدولت اُردو ادب میں شاعری کے عمدہ ترین نمونے محفوظ ہو گئے۔ اُردو مسدس ایک خاص صورت حال ہے جو خود اُردو کا ذاتی کرشمہ ہے عربی اور فارسی مسدس اس کے سامنے بے قدر ہیں۔ اُردو مرثیہ مسدس جس کا مخصوص فارم ہے کئی جہتوں سے عربی اور فارسی مرثیوں سے آگے ہے یہ بلندی مرثیے کے عظیم شعرا کی وجہ سے ہے جن میں انیسؔ اور دبیرؔ سر فہرست ہیں اور جنھوں نے مسدس کی شکل میں مضامین عالیہ کا ذخیرہ اُردو کے دامن میں بھر دیا۔ شاید اسی وجہ سے ابوالکلام نے کہا تھا۔ اُردو ادب کی جانب سے میر انیسؔ کے مراثی اور غالب کی غزلیں دنیائے ادب کو تحفے میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ وہ مسدس جس میں پہلے صرف واسوخت کے سوقیانہ مضامین نظم ہوتے تھے مرثیے میں آ کر حزنیہ، رزمیہ، اخلاقی سماجی اور جذباتی قدروں کا گلدستہ معلوم ہونے لگا جس کے ہر پھول کی چھے چھے پنکھڑیاں اپنے رنگ و بو سے گلدستہ نظم کو سنوار رہی تھیں۔ مرثیوں کی کامیابی اور عوامی پذیرائی کے ساتھ ان کی تاثیر سے متاثر ہو کر کئی عمدہ یادگار مسدس اُردو میں لکھے گئے جن میں مسدس حالی کے علاوہ پنڈت چکبست کا مسدس رام چندر جی کا بنو باس اور علامہ اقبال کا شکوہ و جواب شکوہ شامل ہیں۔

یہاں ہم مسدس حالی کی ادبی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ اصلاحی نظم کی ہیت مسدس اس لیے رکھی گئی ہے کہ یہاں مختلف موضوعات کو مختلف شعری بندوں میں پیش کر کے زنجیر کے حلقوں کی طرح ایک دوسرے میں پیوست کیا جا سکے۔ مسدس مکالمہ نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جذبات نگاری کے لیے شعری ہئیتوں میں سب سے عمدہ ہیت یا فورم ہے۔ مسدس کی زبان سلیس، صاف، شگفتہ اور سادہ ہے۔ اس میں عامی سے عالم تک کے لیے سہولتیں موجود ہیں۔ تشبیہات،

استعارات اور محاسن زبان کا ہجوم یہاں نہیں ہے۔ صنائع اور بدائع کا گورکھ دھندہ بھی یہاں نہیں۔ یہاں رمزیت اور تخیل کی خاکہ نگاری کی جگہ اصلیت اور حقیقت کا اظہار ہے۔ اس نظم میں مغربی لٹریچر کی قدروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے اور عربی فارسی کی ادق تراکیب اور رنگین تقلید سے اجتناب کیا گیا ہے۔ نظم کے لہجے میں مبالغہ، جھوٹ، تصنع، بناوٹ، خوشامد اور چوما چاٹی کے مضامین کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہاں ادب برائے ہدف، شعر زندگی کی تفسیر اور شاعری کا مقصد حیات کی بالیدگی اور اخلاق کی بلندی کا ضامن ہے۔ بعض افراد جن کی زبانوں پر شاعری کے عشقیہ مضامین کا چٹخارہ ہے وہ اسے بے مزہ پھیکی نظم یا قومی مرثیہ سمجھتے ہیں لیکن دردمندوں، اصلاح طلب شاعروں، اور ترقی پسند ادیبوں نے اسے وقت کی راگنی سمجھا چناں چہ اپنے اپنے انداز میں اقبالؔ لاہوری، اکبر الٰہ آبادی، چکبستؔ لکھنوی، جوش ملیح آبادی، نجم آفندی، سردار جعفری، فیض احمد فیض اور درجنوں دوسرے شاعروں نے اِسے بہتی گنگا سمجھ کر اپنی اپنی زمینوں کو سیراب کیا۔

حالی کے مسدس کی جان ان کا فطری انداز بیان ہے جو سیدھا سادہ ہے مگر اس میں زور جوش اور روانی ہے۔ یہ سادہ، سلیس اور نرم الفاظ دل و دماغ میں اتر جاتے ہیں کیوں کہ ان میں صداقت اور حقیقت ہے۔ جوش اور نغمگی نے اس نظم کو دوآتشہ بنا دیا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اُن مقامات پر جہاں وہ تاریخی واقعات کو ایک مورخ کی طرح پیش کرتے ہیں وہاں ان کی شاعری سپاٹ اور بے رنگ وخشک ہو جاتی ہے لیکن اس کے باوجود اثر پذیر رہتی ہے۔ بعض زبان دانوں نے مسدس میں موجود ادق غیر مانوس عربی فارسی اور ہندی الفاظ کو مسدس کی فصاحت کے خلاف بتا کر اِسے پھیکے پکوان میں کنکر بتایا ہے۔

حالیؔ نے مسدس کے آغاز میں جو رباعی کہی ہے اُس کے دوسرے شعر میں

مسلمانوں کی زوال پذیر حالت کی عکاسی ہے۔ اس میں مسلسل پسماندگی اور پستی سے افسردگی کی کیفیت ہے

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

شاید اسی کیفیت کا اثر جو سارے مسدس پر چھایا ہوا تھا اُس کو زائل کرنے یعنی نا امیدی کو امید میں بدلنے کے لیے چھ سال بعد حالؔی نے مسدس میں ضمیمہ کا اضافہ کیا۔ مسدس کے شائع ہونے پر ملک بھر میں موافقت اور مخالفت کی آوازیں بلند ہوئیں۔ حالؔی کے خلاف طرح طرح کے مضامین اور نظمیں شائع ہوئیں۔ مسدس کی نقالی کی گئی اور مسدس حالؔی کے جواب میں ''مسدس خالی'' شائع ہوا۔ حالؔی کے خلاف اودھ پنچ لکھنو میں جو مضامین شائع ہوتے تھے ان کے عنوانات پر یہ شعر لکھا جاتا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدان پانی پت کی طرح پائے مال ہے

سچ تو یہ ہے کہ پانی پت کے تاریخی میدان کے سپوت حالؔی نے جو ادبی جنگ جیتی اُسے پانی پت کی چوتھی جنگ کہنا چاہیے جس نے ادبی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

مسدس کے آغاز میں حالؔی نے خودفریبی کو انسان کی سب سے بڑی لا علاج بیماری بتا کر کہا کہ اس کا علاج تو بقراط جیسے حکیم کے پاس بھی نہ تھا اگرچہ دنیا میں کوئی درد ایسا نہیں ''کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا''

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں
دوا اور پرہیز سے جی چرائیں
یوں ہی رفتہ رفتہ مرض کو بڑھائیں

پھر مضمون کو مسلمان قوم سے جوڑ کر ان کی غفلت سے پیدا شدہ صورتِ حال کا یوں جائزہ لیتے ہیں:

یہی حال دنیا میں اُس قوم کا ہے
بھنور میں جہاز آ کے جس کا گھرا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی
نہ افسوس انہیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ
نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ

غفلت اور پسماندگی اس حد تک ان کی فکر اور تہذیب کا حصہ بن چکی ہے کہ وہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنا ذلت و خواری کو اپنی تقدیر سمجھنا اور اسی پر مطمئن رہ کر ظاہری طور پر اسے دین داری سمجھتے ہیں:

لیا عقل و دیں سے نہ کچھ کام انہوں نے
کیا دین برحق کو بدنام انہوں نے

حالیؔ نے مسدس میں ایک موضوع سے دوسرے موضوع کو جوڑتے وقت انہی الفاظ کی قدرت سے کام لیا ہے۔ یہ گریز حالیؔ نے انیسؔ کے مرثیوں سے سیکھا ہے جسے آگے چل کر اقبالؔ نے بھی اپنے پر شکوہ مسدس میں برتا ہے۔

وہ دیں جس نے اعدا کو اخواں بنایا
وحوش اور بہائم کو انساں بنایا
درندوں کو غم خوار دوراں بنایا
گڈریوں کو عالم کا سلطاں بنایا
وہ خطہ جو تھا ایک ڈھوروں کا گلہ
گراں کر دیا اُس کا عالم سے پلہ

ان مصرعوں میں وحوش، بہائم، درندوں، گڈریوں، ڈھوروں، گلہ صنعت مراعات النظیر کی عکاسی ہے اسلام سے قبل جزیرہ عرب کی جاہلیت کو حالؔی نے بڑی سچائی سے پیش کیا ہے۔ وہاں کی جغرافیائی حالت، قبیلوں کی کسمپرسی اور بری عادتیں جن کی وجہ سے ان میں اور جانوروں میں فرق کرنا مشکل تھا۔ قدیم رسومات، تحقیر انسان، بت پرستی اور درجنوں برائیوں کو اسلام نے ایک مثبت انقلاب کی طرح پیش کیا جس میں آزادی، حریت، حقوق انسان کی پاسداری وغیرہ شامل ہیں۔ حالی نے نہ صرف ان مطالب کو صاف، سلیس، شگفتہ عام فہم الفاظ میں ادا کیا بلکہ محاسن زبان اور بیان سے بھی آراستہ کیا۔ اس موضوع کو حالؔی نے تقریباً چالیس اشعار میں نظم کیا جو آپ اپنی مثال ہے۔ چند اشعار یہ ہیں:

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا — جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
تمدن کا اُس پر پڑا تھا نہ سایہ — ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا
زمیں سنگلاخ اور ہوا آتش افشاں — کھجوروں کے جھنڈ اور خار مغیلاں
نہ سبزہ تھا صحرا میں پیدا نہ پانی — فقط آب باراں پہ تھی زندگانی
نہ کھیتوں میں غلہ نہ جنگل میں کھیتی — عرب اور کل کائنات اُس کی یہ تھی
نہ واں مصر کی روشنی جلوہ گر تھی — نہ یونان کے علم و فن کی خبر تھی
کہیں آگ پجتی تھی واں بے محابا — کہیں تھا کواکب پرستی کا چرچا
وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا — خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا
وہ تیرتھ تھا اک بت پرستوں کا گویا — جہاں نام حق کا نہ تھا کوئی جویا
قبیلے قبیلے کا ایک بت جدا تھا — کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عزا پہ وہ نائلے پہ فدا تھا — اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا
چلن ان کے جتنے تھے سب وحشیانہ — فسادوں میں کٹتا تھا اُن کا زمانہ

جو دو شخص آپس میں لڑ بیٹھتے تھے　　تو صدہا قبیلے بگڑ بیٹھتے تھے
جوا ان کی دن رات کی دل لگی تھی　　شراب ان کی گھٹی میں گویا پڑی تھی
جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر　　تو خوفِ شماتت سے بے رحم مادر
کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اُس کو جا کر

حالی کے ان شعروں میں حقائق اور صحیح واقعات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ جو پڑھنے والے کے دل میں اُتر جاتے ہیں۔ حالی اسلام کی آمد کی تمہید باندھ رہے ہیں۔ یہ اشعار مکمل شعریت کی تفسیر ہیں چوں کہ اس میں صداقت ہے، سادگی اور سلاست کے ساتھ ساتھ جوش اور تاثیر بھی ہے۔ شاعر نے پڑھنے اور سننے والے کے ذہن کو اپنے مدعا کی پیش کش کے لیے آمادہ کرلیا ہے جو اس پر آشوب، زمان و مکان میں رحمۃ للعالمین ﷺ کی آمد آمد ہے۔ حالی نے تقریباً سو اشعار میں حضور نبی کریم ﷺ کی ولادت مبارک، سیرت اور تعلیمات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ بعض اشعار میں تلمیحات سے بعض میں اشارات، تشبیہات اور استعارات سے معنی اخذ کیے گئے ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کے القاب، فضائل، شمائل خصائل اور اسلام سے مربوط مسائل پر اس سے عمدہ اجمالی شاعری ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ اس مسدس کے حصے میں حالی کی شاعری آسمان سخن پر تارے ٹنکاتی معلوم ہوتی ہے۔ ہم یہاں کچھ مصرعوں کو جوڑ کر مضمون کا نچوڑ پیش کرتے ہیں:

یکایک ہوئی غیرت حق کو حرکت　　ادا خاکِ بطحا نے کی وہ ودیعت
ہوئی پہلو آمنہ رضی اللہ عنہا سے ہویدا　　دُعائے خلیل اور نوید مسیحا
ہوئے محو عالم سے آثار ظلمت　　کہ طالع ہوا ماہِ برج سعادت
یہ چالیسویں سال لطف خدا سے　　کیا چاند نے کھیت غار حرا سے
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا　　اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

وہ نبیوں علیہم السلام میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ یتیموں کا والی غلاموں کو مولیٰ
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
سبق پھر شریعت کا ان کو پڑھایا
اچھوتا تھا توحید کا جام اب تک خم معرفت کا تھا منہ خام اب تک
سکھائے معیشت کے آداب ان کو پڑھائے تمدن کے سب باب ان کو
سکھائی انہیں نوع انساں پہ شفقت کہا ''ہے یہ اسلامیوں کی علامت''
کرو مہربانی تم اہل زمیں پر خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر
کہیں فقط صحت کے آئیں سکھائے سفر کے کہیں شوق ان کو دلائے
نشاں راہ و منزل کا ایک اک دکھایا بنی نوع کا اُن کو رہبر بنایا
جب امت کو سب مل چکی حق کی نعمت ادا کر چکی فرض اپنا رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
تو اسلام کی وارث اک قوم چھوڑی کہ دنیا میں جس کی مثالیں ہیں تھوڑی

جیسا کہ ہم سب پر واضح ہے مسدس کی زبان، شعری نکات، موضوع اور مطالب پر اعتراضات کیے گئے۔ مسدس کے جواب میں مسدس خالی، ڈفالی، نقالی، جعلی وغیرہ کئی نظمیں لکھی گئیں۔ مختلف مضامین میں جو حالؔی کے دوستوں اور طرف داروں نے لکھے؛ اعتراضات کیے گئے۔ حبیب الرحمان شیروانی مسدس پر تقریظ لکھتے ہوئے اس کی بعض کمزوریوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جیسے وہ سرسید کے وقتی خیالات کا اثر کہتے ہیں۔

بنانا نہ تربت کو میری صنم تم نہ کرنا مری قبر پر سر کو خم تم
نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم کہ بے چارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی کہ بندہ بھی ہوں اُس کا اور ایلچی بھی

حالی کے جس شعر پر اعتراضات ہوئے وہ یہ تھا کہ اللہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کو ہمارے ہی طرح کا ایک بندہ بنایا ہے اور صرف وہ ایک پیغام بر، نامہ بر، ایلچی یا سفیر بھی ہیں۔ یہ عقیدہ اُن لوگوں کے لیے باعث اختلاف تھا جو حضور نبی کریم ﷺ کو اللہ کا خاص بندہ ''عبدہٗ'' سمجھتے ہیں اور جس کی تشریح قرآن کی آیات سے کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ذات مقدس وہ ہے جس پر اللہ اور اس کے فرشتے درود وسلام بھیجتے ہیں۔ وہ ذات رحمت للعالمین ہے۔ وہ ذات ایسی مقدس ہے جس کے ذکر کو اللہ نے بلند کرنے کا وعدہ کیا ہے وہ ایسی مقدس ہستی ہے جس کے اخلاق عظیم ہیں۔ وہ اللہ کا حبیب ہے اور اللہ ہی کی طرح مومنین کا ولی ہے۔ بندۂ خاکی اور بندۂ نوری میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

حالی کے خاندان کے بعض افراد جن میں غلام الثقلین، غلام السیدین اور صالحہ عابد حسین شامل ہیں۔ اس کے تذکرے سے اجتناب کرتے ہیں۔ حالی حضور نبی کریم ﷺ کے اقوال متبرکہ سے ان اشعار کو جوڑتے ہیں۔

مری حد سے رتبہ نہ میرا بڑھانا بڑھا کر بہت تم نہ مجھ کو گھٹانا
سب انساں ہیں واں جس طرح سرفگندہ اسی طرح ہوں میں بھی ایک اس کا بندہ

علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ جو حالی کے معتقد اور بعض موارد میں مقلد بھی ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس کو عام انسان سے برگزیدہ بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں:

''ہم عبد ہیں اور حضور نبی کریم ﷺ عبدہٗ۔''

اور اس عبد اور عبدہٗ کے فرق کو جاوید نامہ میں ابن حلاج کی زبان میں یوں بیان کرتے ہیں:

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است خویش را خود عبدہٗ فرمودہ ست
عبدہٗ از فہم تو بالا تر است زانکہ او ہم آدم وہم جوہر است

جوہر او نے عرب نے اعجم است — آدم است وہم ز آدم اقدم است
عبدہٗ صورت گر تقدیر ہا — اندرو ویرانہ ہا تعمیر ہا
عبدہٗ ہم جانفزا ہم جانستاں — عبدہٗ ہم شیشہ ہم سنگ گراں
عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر — ما سراپا انتظار او منتظر
عبدہٗ دہر است و دہر از عبدہٗ است — ما ہمہ رنگیم و ادبے رنگ و بوست
عبدہٗ یا ابتدا بے انتہاست — عبدہٗ را صبح و شام ما کجاست؟
کس ز رمز عبدہٗ آگاہ نیست — عبدہٗ جز سر الا اللہ نیست
لا الہ تیغ دو دمِ او عبدہٗ — فاش تر خواہی ، بگو ''ہوٗ'' عبدہٗ
عبدہٗ چند و چگونِ کائنات — عبدہٗ رازِ درونِ کائنات

ترجمہ: ''آپ کے سامنے ایک جہاں جبیں گستر رہا (مگر) خود انھوں نے اپنے آپ کو عبدہٗ (اللہ کا بندہ) ہی کہا۔

عبدہٗ تیری سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ وہ آدم بھی ہے اور جوہر بھی۔

ان کا جوہر عربی یا عجمی نہیں۔ وہ جوہر آدم ہے اور آدم سے قدیم تر بھی ہے۔

عبدہٗ سے تقدیروں کی صورت گری ہوئی۔ اس وجود میں ویرانیاں اور تعمیریں ہیں۔

عبدہٗ نے جان فزائی کی اور جان ستانی بھی۔ عبدہٗ شیشہ بھی ہے اور بھاری پتھر بھی۔

عبد اور ہے اور عبدہٗ اور۔ ہم (عام عبد) سراپا انتظار ہوتے ہیں اور عبدہٗ منتظر ہوتا ہے۔

عبدہٗ زمانہ ہے اور زمانہ عبدہٗ ہے۔ ہم رنگ ہیں اور عبدہٗ بے رنگ و بو ہے۔

عبدہٗ ابتدا والا ہے مگر بے انتہا۔ عبدہٗ کے لیے ہماری صبحیں اور شامیں کہاں ہیں۔

عبدہٗ کے راز سے کوئی آ گاہ نہیں۔ وہ لا الہ الا اللہ کے راز کے سوا ہے بھی کیا؟ لا الہ الا اللہ تلوار ہے اور عبدہٗ اس کی دھار۔ تجھے زیادہ وضاحت چاہیے تو ہو کو عبدہٗ کہو۔

عبدہٗ کائنات کی کیفیت اور اس کا رازِ باطن ہے۔''

حالیؔ کے مسدس کی مخالفت مختلف اسلامی گروہوں کی جانب سے ہوئی جنہوں نے ان اشعار کو غلط بتایا اور حالیؔ کو شبلیؔ اور سرسیدؔ کے خیالات کا پیرو قرار دیا مگر حالیؔ پر سرسیدؔ، شبلیؔ، ڈپٹی نذیرؔ احمد اور اقبالؔ کی طرح کفر کا فتویٰ صادر نہیں ہوا جب کہ اُردو ادب کا حالی وہ منفرد شاعر ہے جس نے سب سے زیادہ اور سب سے واضح تر اشعار تکفیر کے خلاف لکھے ہیں۔

موضوع کی وسعت اور تحریر کی قلت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم کسی تشریح اور تبصرے کے بغیر وہ چند بند بھی یہاں درج کرتے ہیں جو خود پڑھنے والا کہہ سکے گا کون سچ کہہ رہا ہے۔

کرے غیر گر بُت کی پوجا تو کافر
جو ٹھہرائے بیٹا خدا کا تو کافر
جھکے آگ پر بہر سجدا تو کافر
کواکب میں مانے کرشما تو کافر
مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں
پرستش کریں شوق سے جس کی چاہیں
نبی ﷺ کو جو چاہیں خدا کر دکھائیں
اماموں کا رتبہ نبی ﷺ سے بڑھائیں
مزاروں پہ دن رات نذریں چڑھائیں
شہیدوں سے جا جا کے مانگیں دعائیں
نہ توحید میں کچھ خلل اس سے آئے
نہ اسلام بگڑے نہ ایمان جائے
وہ دیں جس سے توحید پھیلی جہاں میں
ہوا جلوہ گر حق زمین و زماں میں
رہا شرک باقی نہ وہم و گماں میں
وہ بدلا گیا آ کے ہندوستاں میں
ہمیشہ سے اسلام تھا جس پہ نازاں
وہ دولت بھی کھو بیٹھے آخر مسلماں

حالیؔ نے مسدس میں جگہ جگہ نوع انسان سے محبت کرنا اسلامیوں کی شناخت بتایا ہے اور کئی احادیث مبارکہ ترجمہ کر کے پیش کیں ہیں:

سکھائی انہیں نوع انسان پہ شفقت کہا ''ہے یہ اسلامیوں کی علامت
کہ ہمسائے سے رکھتے ہیں وہ محبت شب و روز پہنچاتے ہیں اُس کو راحت
وہ جو حق سے اپنے لیے چاہتے ہیں
وہی ہر بشر کے لیے چاہتے ہیں
خدا رحم کرتا نہیں اُس بشر پر نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر
کسی کے گر آفت گزر جائے سر پر پڑے غم کا سایہ نہ اُس بے اثر پر
کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر''

حالی کے یہ اشعار آئین اسلام اور سیرت محمدی ﷺ کا درس دے رہے ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے خلق خدا سے محبت، ہمسایوں سے الفت، کمزوروں ضعیفوں کی مدد کو ہم پر فرض کیا ہے۔ اوپر کے اشعار صاف ستھری زبان میں اقوال پیغمبر ﷺ اور آیات قرآنی کا خلاصہ ہیں۔ حالیؔ نے مدو جزر اسلام مسدس میں تقریباً چونسٹھ بند یعنی دوسو اشعار میں مسلمانوں کی ترقی ان کی عظمت شان وشوکت، علم وحکمت، اخلاق وکردار، اسلامی اقدار، کشور کشائی اور دوسرے ادیان سے صلح وآشتی کے خوبصورت اشعار سے جو صحیفہ تشکیل دیا ہے وہ اس نظم کا قصیدہ معلوم ہوتا ہے جس میں مبالغے اور مدح سرائی نہیں بلکہ سچائی کی قدر دانی اور اعتراف شامل ہے۔ مسدس کے اس حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ صدر اسلام اور اگلے زمانے کے مسلمان خواہ عوام ہوں یا حکمران اخلاق انسانی اور قانون اسلامی کے پابند تھے۔ وہ سب اللہ اور رسول ﷺ کے وفادار، اسلام کے حکم بردار، مسلمانوں کے مددگار اور یتیموں کے غم خوار

تھے کیوں کہ وہ سب عشق الٰہی سے سرشار تھے۔ان کی زندگی سیدھی سادی تھی۔

امیر اور لشکر کی تھی ایک صورت　　فقیر اور غنی سب کی تھی ایک حالت
کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی　　زمانے میں ماجائی بہنیں ہوں جیسی

یہاں حالیؔ یہ بتاتے ہیں کہ جس زمانے میں مسلمانوں کے علم و ہنر کا ستارہ عروج پر تھا اُس زمانے میں کسی بھی زمین کے حصے یا قوم میں ایسی ترقی اور تمدن کا نشان بھی نہ تھا یہ سب موجودہ ترقیاں مسلمانوں کی دین ہیں جن سے خود آج کے مسلمان محروم ہیں یعنی خود ملت اسلام نے اپنے اسلاف کی میراث سے منہ موڑ لیا۔

ترقی کا جس دم خیال ان کو آیا
ہر اک قوم پر تھا تنزل کا سایا

پراگندہ دفتر تھا یونانیوں کا　　پریشاں تھا شیرازہ ساسانیوں کا
جہاز اہل روما کا تھا ڈگمگاتا　　چراغ اہل ایراں کا تھا ٹمٹماتا
ادھر ہند ہیں ہر طرف تھا اندھیرا　　اُدھر تھا عجم کو جہالت نے گھیرا
بنے آج جو گلہ باں ہیں ہمارے　　وہ تھے بھیڑیے آدمی خوار سارے
گھٹا ایک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی　　جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
کیا امیوں نے جہاں میں اجالا　　ہوا جس سے اسلام کا بول بالا
ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا　　ہر اک شہر و قریہ کو یوناں بنایا

مسلمان علم و حکمت کی تلاش میں ہر مقام پر پہنچے:

ہر اک میکدے سے بھرا جا کے ساغر　　ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر
گرے مثل پروانہ ہر روشنی پر　　گرہ میں لیا باندھ حکم پیغمبر ﷺ

کہ حکمت کو اک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو

مسلمان حکمرانوں نے شہر آباد کیے۔ فنونِ لطیفہ کو ترقی دی۔ عمارتیں، باغات، خیابانیں دنیا کے کونے کونے میں بنائی گئیں۔ آج یہ آثار ہمارے درمیان بکھرے ہوئے ہیں جو ہمیں ان کی یاد دلا رہے ہیں۔

ہر اک ملک میں ان کی پھیلی عمارت ہر اک قوم نے ان سے سیکھی تجارت
یہ ہموار سڑکیں یہ راہیں مصفا سر رہ کنوئیں اور سرائیں مہیا
وہ مرقد کے گنبد تھے جن کے طلائی جمی جن کے کھنڈروں پہ ہے آج کائی
ہمالہ کو ہیں واقعات ان کے ازبر نشاں ان کے باقی ہیں جبرالٹر پر

حالؔی اندلس کی تاریخ سے متاثر تھے۔ یہاں حالؔی نے بڑے جذباتی طور پر اس کی منظر کشی کی شاید علامہ اقبال کی نظم ہمالیہ، شکوہ جواب شکوہ اور قرطبہ پر حالی کے مسدس کا اثر رہا ہوگا اور شاید اسی لیے انہوں نے ان مقامات کا سفر کیا۔

کوئی قرطبے کے کھنڈر جا کے دیکھے مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
ہویدا ہے غرناطہ سے شوکت ان کی عیاں ہے بلنسیہ سے قدرت ان کی
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر یہ ہے بیت حمرا کی گویا زباں پر
نصیب ان کا اشبیلیہ میں ہے سوتا شب و روز ہے قرطبہ ان کو روتا

حالؔی بتاتے ہیں کہ یہ اسلامی دانش مند اور اسلامی علما تھے جنھوں نے ترجموں اور تشریحوں کے ذریعے یونان کے مردہ علم وفن وتہذیب میں جان ڈالی ورنہ یہ خزانے سب دفن ہو چکے تھے۔ یہ سچ ہے کہ ان تمام علوم وفنون کا پہلے عربی اور اسلامی زبانوں میں ترجمے اور تفاسیر لکھے گئے اور جب اندلس اسپین کی سات سو سالہ اسلامی حکومت تباہ وتاراج ہوئی تو ان دخائر کو یورپ کی زبانوں میں منتقل کیا گیا۔

وہ لقمان و سقراط کے درِّ مکنوں وہ اسرار بقراط و درس فلاطوں
ارسطو کی تعلیم سولن کے قانوں پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفوں
پڑی خاک ایتھنز میں جاں یہیں سے
ہوا زندہ پھر نام یونان یہیں سے
یہ تھا علم پر واں توجہ کا عالم کہ ہو جیسے مجروح جو پائے مرہم
حریم خلافت میں اونٹوں پہ لا کر چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر

یہ سچ ہے کہ خلفائے عباسیہ کے دور میں نہ صرف یونانی زبان کے تراجم ہوئے۔ مامون رشید نے قبرص سے بہت سی یونانی فلسفہ کی کتابیں منگوا کر ترجمہ اور تشریح کروایا۔عباسیوں کے دور میں رومی، پہلوی، فارسی، سنسکرت اور سریانی کتابوں کے بے شمار ترجمے عربی زبان میں کیے گئے۔ابوجعفر منصور نے ایلچی بھیج کر قیصر روم سے کئی عمدہ کتابوں کی نقلیں منگوا کر ترجمے کروائے۔لقمان حکیم جو حضرت عیسیٰu سے تقریباً چھے سو برس پہلے یونان میں رہتا تھا اور اس کی کہانیاں مشہور تھیں جن کو یونانی زبان سے عربی میں محفوظ کیا گیا تھا جو عربوں کے درمیان امثال لقمان کے نام سے مشہور ہیں۔ یورپ کی تہذیب اور وہاں کے تمدن پر ان کہانیوں کا گہرا اثر رہا چناں چہ بعض یورپ کے مورخوں نے اس بات کی تائید کی ہے کہ انہیں کہانیوں نے وحشی قوموں کو مہذب ستم کشوں کو رحم دل اور سرکشوں کو نیک اور فرمانبردار بنایا۔

جیسا کہ ہم نے کہا ہے حالؔی کا مسدس عامی اور عالم دونوں کو سیراب کرتا ہے۔ حالؔی نے مسدس میں کئی عمدہ معلومات فراہم کیے ہیں۔مسلمانوں کی علم و ہنر کی پذیرائی کو معتبر حوالوں سے پیش کیا ہے۔ان حوالوں میں اسلامی مدرسوں کا ذکر نظم کی ہیت میں حالی کے علم اور فن کا معترف ہے جسے آج کا محقق سنگ میل جان کر جادۂ تحقیق پر منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

عراقین[۱] وشامات[۲] وخوارزم[۳] وتوراں[۴] جہاں جنس تعلیم سنتے تھے ارزاں[۵]
وہیں پے سپر[۶] کر کے کوہ و بیاباں پہنچتے تھے طلاب[۷] افتاں و خیزاں[۸]
جہاں تک عمل دین اسلام کا تھا ہر اک راہ میں ان کا تانتا[۹] بندھا تھا
نظامیہ[۱۰] نوریہ[۱۱] مستنصریہ[۱۲] نفیسیّہ[۱۳] سِتّیہ[۱۴] اور صاحبیّہ[۱۵]
رواحیّہ[۱۶] عزّیّہ[۱۷] اور قاہریہ[۱۸] عزیزیہ[۱۹] زینبیّہ[۲۰] اور ناصریّہ[۲۱]
یہ کالج تھے مرکز سب آفاقیوں کے حجازی و کردی[۲۲] و قبچاقیوں[۲۳] کے

۱۔عراقین: عرب عراق اور عجم عراق جو ایران کا پہاڑی سلسلہ ہے۔
۲۔شام کے مختلف حصوں کو شامات کہتے ہیں۔
۳۔خوارزم: خراسان کے شمال میں بحیرہ خوارزم یعنی جھیل یورال کا حصہ جس پر کئی سلاطین نے حکومت کی اور چنگیز خان نے اس حکومت کا خاتمہ کیا۔ اب یہ علاقہ روس کے تحت ہے۔
۴۔توران: دریائے سندھ سے جھیل یورال تک کا علاقہ۔ اب یہ حصہ روس اور دوسری سلطنتوں میں شامل ہے۔
۵۔ستا یعنی ارزاں۔
۶۔پے سپر: طے کر کے۔
۷۔طلاب: مذہبی طالب علم
۸۔افتاں وخیزاں: گرتے پڑتے۔
۹۔تانتا: سلسلہ
۱۰۔نظامیہ: اسلامی مدرسے جس کو نظام الملک طوسی وزیر الپ ارسلان نے بنوائے۔ پانچ مدرسے ہرات، نیشاپور اصفہان بصرہ اور بغداد میں تھے۔
۱۱۔نوریہ: اسلامی مدرسہ موصل میں نورالدین ارسلان موصل نے بنوایا۔
۱۲۔مستنصریہ: مستنصر باللہ عباسی کا اسلامی مدرسہ بغداد میں۔
۱۳۔نفیسہ: اسلامی مدرسہ، بانی کا نام نامعلوم۔
۱۴۔ستیہ: دمشق میں صلاح الدین ایوب کی بیٹی خاتون کا بنوایا ہوا اسلامی مدرسہ۔
۱۵۔صاحبیہ: اسلامی مدرسہ قاہرہ میں صاحبیہ وزیر صفی الدین کا بنوایا ہوا۔
۱۶۔رواحیہ: اسلامی مدرسہ دمشق میں ابوالقاسم کا بنوایا ہوا۔
۱۷۔عزیہ: اسلامی مدرسہ بیت المقدس، بانی کا نام معلوم نہیں۔
۱۸۔قاہریہ: اسلامی مدرسہ موصل میں، بانی کا نام معلوم نہیں۔
۱۹۔عزیزیہ: اسلامی مدرسہ بغداد میں، بانی کا نام نامعلوم۔
۲۰۔زنبیہ: اسلامی مدرسہ دمشق میں بانی کا نام نامعلوم۔
۲۱۔ناصریہ: اسلامی مدرسہ ناصر الملک کا بنوایا ہوا قبرص میں۔
۲۲۔کردی: کردستاں کے باشندے جن کا ہیرو صلاح الدین ایوبی تھا جس نے بیت المقدس فتح کیا۔
۲۳۔قبچاقیوں: تاتاری قوم جو بحیرہ کاسپین کے شمال میں رہتے ہیں۔

دنیا کی سیاحت کی تاریخ میں عہد وسطیٰ کے مسلمان سیاحوں کا ذکر نظر آتا ہے۔ بعض مسلم سیاحوں کی کتابیں آج بھی تاریخ عالم میں شاہکار مانی جاتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اہل یورپ نے تمام تر تاریخی خزانے مسلمانوں سے ہی لوٹے اور یہ نادر کتابیں آج بھی یورپ اور امریکہ کے مختلف کتب خانوں میں دفن ہیں۔ یورپ کے قدیم مورخوں نے ان کتابوں کے مفید حوالے منتخب کر کے اپنی تصانیف میں شامل کر لی ہیں چناں چہ اب ابو راشد، حاجی خلیفہ طبری، مسعودی، ابن بطوطا، مخریطی، حمزہ اور اصفہانی کے کارنامے مغربی نہیں بلکہ مشرقی لٹریچر میں بھی مشکل سے نظر آتے ہیں۔ حالیؔ کہتے ہیں:

وہ بخارا کا اور کوفہ کا میداں — کرہ کی مساحت کے پھیلائے ساماں
اندھیرا تواریخ پہ چھا رہا تھا — ستارہ روایت کا گہنا رہا تھا
سرِرہ چراغ اک عرب نے جلایا — ہر اک قافلہ نے نشاں جس سے پایا
مورخ ہیں جو آج تحقیق والے — تفحص کے ہیں جن کے آئین نرالے
جنہوں نے ہیں عالم کے دفتر کھنگالے — زمیں کے طبق سر بسر چھان ڈالے

عرب ہی نے دل ان کے جا کر ابھارے
عرب ہی سے وہ بھرنے سیکھے طرارے

انیسویں صدی کا معروف جرمن مستشرق اشپرنگر جو دلی کالج کا پرنسپل تھا، دلی کی سائنٹفک سوسائٹی کا بانی بھی تھا۔ جس نے دلی اودھ اور کلکتہ کے کتب خانوں کی فہرستیں مرتب کیں؛ لکھتا ہے کہ برصغیر کے لوگوں کو اپنے اسلاف اور اجداد کی شاہکار کتابوں کو محفوظ کرنے اور مطالعہ کرنے کی توفیق نہیں۔ اشپرنگر نے لکھا ہے کہ اُس نے یورپ کے تمام سیاحوں میں سب سے زیادہ برصغیر کی کتابیں یورپ منتقل کی ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اشپرنگر نے فٹ پاتھ پر بکھری حویلیوں میں پڑی ہوئی کتابوں کو یورپ کی

لائبریریوں میں محفوظ کر کے اُردو ادب کی خدمت کی ہے۔ کربل کتھا جو فضل علی کی شاہکار تصنیف ہے اس کا واحد مخطوعہ راقم کو جرمنی کی یونیورسٹی کی لائبریری سے حاصل ہوا جسے اشپرنگر نے بھیجا تھا۔

حالیؔ نے مسدس کے چار بند میں علم رجال کا سہرا علمائے دین کے سر باندھا ہے۔ علم رجال میں احادیث کے معتبر اور ضعیف راویوں سے بحث کی جاتی ہے۔ علم رجال ہی سے استفادہ کر کے مورخوں نے تاریخی واقعات کو صحیح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اشپرنگر لکھتا ہے: ’’علم رجال پر مسلمان جتنا فخر کریں بجا ہے۔ نہ ایسی کوئی قوم گذری اور نہ اب ہے جس نے مسلمانوں کی طرح بارہ سو برس تک علماء کے حالات زندگی لکھے ہوں۔ ہم کو پانچ لاکھ عالموں کا تذکرہ ان کی کتابوں سے ملتا ہے۔‘‘ یہ سچ ہے کہ علم رجال کی وجہ سے ہی حدیث معتبر اور مشکوک قرار دی گئی۔ راویوں کی شخصیت اور ان کی تحریروں کو تنقیدی نظر سے دیکھا گیا اس طرح تنقید کا آغاز بھی اسلامی علماء نے کیا جس کی پیروی اور تقلید کئی صدیوں بعد یورپ نے کی۔ عالموں نے راویوں کے عیب ڈھانکنے اور بلا وجہ تعریف سے گریز کیا۔ انہیں جبہ و دستار یا ایمان و کفر حق گفتاری سے نہ روک سکا جس کا اعتراف حالی نے یوں کیا:

گروہ ایک جویا تھا علم نبی ﷺ کا لگایا پتہ جس نے ہر مفتری کا
نہ چھوڑا کوئی رخنہ کذب خفی کا کیا قافیہ تنگ ہر مدعی کا
کیے جرح و تعدیل کے وضع قانوں
نہ چلنے دیا کوئی باطل کا افسوں

سنا خازن علم دیں جس بشر کو لیا اُس سے جا کر خبر اور اثر کو
کیا فاش راوی میں جو عیب پایا مناقب کو چھانا مثالب کو تانا
طلسم ورع ہر مقدس کا توڑا نہ ملّا کو چھوڑا نہ صوفی کو چھوڑا

رجال اور اسانید کے ہیں جو دفتر　　گواہ ان کی آزادگی کے ہیں یکسر
نہ تھا ان کا احساں یہ اک اہل دیں پر　　وہ تھے اس میں ہر قوم و ملت کے رہبر

خبر اور اثر حدیث کی قسمیں ہیں۔ اسانید میں ایک راوی کے ذکر کے ساتھ تین احادیث بیان کی گئی ہیں۔ مسلمانوں کے علم رجال سے دنیائے ادب نے استفادہ کر کے کئی مورخوں، مصنفوں، راویوں، اخبار نویسوں کی تحریروں اور تقریروں کو صحت دی۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مغرب نے یہ عہدہ مال بھی بازار اسلام سے اٹھایا۔ شاید حالیؔ اُردو کے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اس حقیقت پر شعر لکھے ہیں۔ علوم فلکیات اور علوم نجوم عربوں اور اسلامیوں کی وجہ سے دور وسطیٰ کے عہد میں کافی ترقی پر تھے۔ مختلف شہروں میں رصد گاہیں قائم کی گئی تھیں۔ کئی کتابیں اسی دور میں تصنیف ہوئیں۔ رصد گاہ جہاں سے سائینسداں اور منجم ستاروں کی حرکات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مامون رشید اور دوسرے حکمرانوں نے اسلامی مملکت کے مختلف شہروں میں جیسے بغداد، مراغہ، قاسیوں، سمر قند اور اندلس وغیرہ میں رصد گاہیں تعمیر کروائیں اور کئی کتابوں کے ترجموں سے فائدہ اٹھا کر یورپ نے ٹیلی سکوپ اور لیبارٹریاں بنا کر آسمانوں پر کمند پھینکے۔

وہ تارے جو تھے شرق میں لمعہ افگن　　پہ تھا اُن کی کرنوں سے تا غرب روشن
نوشتوں سے ہیں جن کے اب تک مزین　　کتب خانہ پیرس و روم و لندن
بڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں
وہ سوتے ہیں بغداد کے مقربوں میں

سمر قند سے اندلس تک سراسر　　انہیں کی رصد گاہیں تھیں جلوہ گستر
سواد مراغہ میں اور قاسیوں پر　　زمیں سے صدا آ رہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وہ اسلامیوں کے منجم کہاں ہیں

مامون نے دمشق کے شمالی پہاڑ قاسیوں پر رصد گاہ بنوائی تھی۔ ہلاکو خان نے مراغہ آذر بائیجان کے پہاڑ پر خواجہ نصیر الدین طوسی کی زیر سرپرستی رصد گاہ تعمیر کروائی۔ یہاں یہ بات بھی خارج از محل نہیں کہ تقریباً ستر (70) سال قبل جب اندلس اسپین کے الحمرا پر نیو یارک ٹائمز کے کالم نگار نے انگریزی میں عمدہ کتاب لکھی اور اس میں مسلمانوں کی ترقی کی تمام روداد تفصیل سے لکھی اور نیو یارک میں اس کتاب کی رونمائی ہوئی۔ اس تقریب رونمائی میں کتاب کے مصنف سے یہ سوال کیا گیا کہ اگر اندلس کی حکومت کو تباہ و تاراج نہ کیا جاتا تو یورپ کی ترقی آج کس منزل پر ہوتی؟ جواب دیا کہ شاید چاند پر انسان آج سے دوسو سال پہلے قدم رکھ چکا ہوتا۔

دور جاہلیت میں بھی عرب شاعری اور خطابت میں منفرد تھے۔ وہ عربی ادب اور شاعری کے مقابل دوسری قوموں کو گونگا یا عجم کہتے تھے۔ اسلامی حکومت نے شعر و ادب کا نشہ دو آتشہ کر دیا۔ سبعہ معلقہ تو دور جاہلیت کی نشانی تھا لیکن عرب زبان نے ایسے عمدہ نابغہ روزگار شاعر ادیب اور خطیب پیدا کیے کہ ان کے نام آج بھی زندہ ہیں۔ عرب کا مقابلہ فصاحت و بلاغت میں مشکل سے کوئی دوسری زبان کر سکتی ہے۔ عربوں کی شاعری اور ان کی خطابت لڑائیوں میں تیرو سنان کا کام کرتی تھیں۔ جان ڈیوٹ پورٹ نے لکھا۔ عرب کے علم ادب نے روم اور یونان کے علم ادب میں دوبارہ جان ڈال دی۔ اورینٹل کمیٹی نے صحیح اعتراف کیا کہ ''فن ادب اور خصوصاً قصص اور حکایات میں کوئی عرب سے بڑھ کر نہیں ہوا۔'' یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ خطابت کا زور اور خاص انداز یورپ کو اندلس کے مسلمانوں سے ملا۔ حالؔی نے ان تمام نکات کو خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

اُدھر روم کی شمع انشا تھی مردہ ادھر آتش پارسی تھی فسردہ
فصاحت کے دفتر تھے سب گاو خوردہ بلاغت کے رستے تھے سب نا سپردہ

یکا یک جو برق آ کے چمکی عرب کی
کھلی کی کھلی رہ گئی آنکھ سب کی

وہ جادو کے جملے وہ فقرے فسوں کے — تو سمجھے کہ گویا ہم اب تک تھے گونگے
وہ اشعار کی دل میں ریشہ دوانی — وہ خطبوں میں مانند دریا روانی
سلیقہ کسی کو نہ تھا مدح و ذم کا — خزانہ تھا مدفوں زباں اور قلم کا
نواسنجیاں ان سے سیکھی ہیں سب نے — زباں کھول دی سب کی نُطقِ عرب نے

اس میں کسی کو شک نہیں کہ اسلامی طبیبوں نے طبابت میں نئ زندگی پھونکی۔ اٹلی کے شہر سلرنوں میں جو اسلامی طبی مدرسہ تھا وہاں ساری دنیا سے طالب علم آتے اور طب میں مہارت حاصل کرتے تھے۔ اسپین میں بھی کئ مشہور اطبا گزرے ہیں جنہوں نے جراحی کے کئ آلات کا اختراع بھی کیا تھا۔ بوعلی سینا کی طب کی مشہور کتاب شفا صدیوں تک یورپی طب کے مدرسوں میں پڑھائی جاتی رہی۔ یہی نہیں بلکہ یہ طبیب حکیم بھی تھے ان میں شاعر اور فلاسفر بھی گزرے ہیں۔ حالؔی نے صرف چند اشعار میں کئ اطبا اور دوسرے دانشوروں کو نظم کیا ہے جو ان کی وسعت علمی اور فن پر گرفت کی عمدہ مثال ہے:

زمانہ میں پھیلی طب ان کی بدولت — ہوئی بہرہ ور جس سے ہر قوم و ملت
ابوبکر رازی علی ابن عیسا — حکیم گرامی حسین ابن سینا

صرف طب ہی میں نہیں بلکہ الٰہیات، ریاضیات، طبیعیات، حکمت، ہندسہ، ہیت اور مختلف علوم وفنوں کے یہ لوگ رسیا تھے جن سے دنیا نے بہت استفادہ کیا۔

غرض فن ہیں جو مایہ دین و دولت — طبیعی الٰہی ریاضی و حکمت
طب اور کیمیا ہندہ اور ہیئت — سیاحت تجارت فلاحت عمارت
ہرا کر گیا سب کو باراں عرب کا — سپید و سیہ پر ہے احساں عرب کا

حالؔی نے مسدس میں لفاظی یا مبالغہ نہیں کیا بلکہ مستند حقائق کو حوالوں کے ساتھ پیش کیا جس سے حالؔی کی وسعت علمی، دیانت داری اور فن شاعری پر مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یورپ جنوبی یعنی اندلس اسپین اور اس کے اطراف و اکناف میں جو اسلامی حکومت سات سو برس تک رہی، جس نے یورپ کی پہلی یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جہاں ادب مذہب کے ساتھ ساتھ طبی، معاشی، سائنسی اداروں نے علم و ہنر کو ترقی دی اور فنون لطیفہ کی ایسی یادگاریں چھوڑیں جس کے نقوش آج بھی ذہنوں کو جھنجھوڑ دیتے ہیں کہ بارہ سو سال پہلے ایسے معماری شاہکار تعمیر کرنے والوں کی سائنٹفک اور تمدنی و علمی سطح کیا ہوگی۔ ایک مقام پر مسدس میں حالی نے یہ بھی سوال اٹھایا ہے کہ جمہوریت کی قدروں کو کس نے پروان چڑھایا۔ انسانوں کے حقوق کی پاسداری عملاً طور پر کب اور کہاں شروع ہوئی بے شک ان تمام سوالوں کے جوابات تاریخ کے دامن میں دفن ہیں اور کچھ نقش صفحہ ہستی پر باقی ہیں۔ حالؔی کہتے ہیں:

لبرٹی میں جو آج خالق ہیں سب سے
بتائیں کہ لبرل بنے ہیں وہ کب سے

فطرت کا تقاضا ہے کہ اشیا کی حیثیت اور قدر و قیمت ان کی تضاد سے کی جاتی ہے یعنی روشنی کی قدر اندھیرے سے، بہار کی قدر خزاں سے، تندرستی کی قدر بیماری سے، بلندی کی قدر پستی سے، علم کی قدر جہالت، آبادی کی قدر بربادی سے، امن کی قدر جنگ سے وغیرہ وغیرہ۔

حالؔی نے مسدس میں انسانی آفاقی اور اخلاقی قدروں کو حیوانی، سفلی اور جنگلی قوتوں سے مقابلہ کر کے انسانیت اور آدمیت کے پیکر کو سنوارا ہے جس کی وجہ سے مسدس کا اثر دو آتشہ بن گیا اور لوگوں نے صحیح لکھا کہ اِسے چشم نم اور عزم و استقلال کی نشوونما کے سوا پڑھا اور سنا نہیں جا سکتا۔

حالؔی نے یہ عمل بعض مقامات پر فوری بعد کیا اور بعض مقامات پر کچھ وقفے سے کیا لیکن وہ مطالب بھی دیر آید مگر درست آید کے مصداق بن کر پیش ہوئے۔ حالی اگر صرف مدِ اسلام یا ارتقائے اسلام کی بات کر کے نظم ختم کر دیتے تو وہ قومی قصیدہ یا سپا سنامہ بن جاتا اور ہمیں پدرم سلطان بود کی روایت سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ حالؔی نے پہلے بیماری کی تشخیص کی پھر اس کے درمان کی ترکیب پیش کی۔ لوگوں کو غیرت و شرم و حیا دلوائی۔ انہیں اپنی پسماندگی کا احساس دلا کر اس خواب گراں سے جاگنے کی تاکید کی۔ انہوں نے فرد اور معاشرے میں موجود خرابیوں کو دکھا کر انہیں اچھائیوں سے دور کرنے کا راستہ بھی دکھایا۔ یہی وجہ تھی کہ مسدس بہت ہی کم مدت میں تمام تر مملکت میں پھیل گیا، مدرسوں میں، مسجدوں کے خطبوں میں، مجالس اور محافل کی تقریروں میں، اخبارات اور رسالوں کی تحریروں میں، عامی اور عالم، مکتب و بازار ہر مقام پر مسدس کی آواز گونجنے لگی مصرعے دلوں میں اتر جاتے اور ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیتے مسدس کے اوائل میں جو مخالفت کی آندھیاں چلیں اُس کے زور سے وہی درخت اکھڑ گئے جو مخالف صف میں کھڑے تھے۔ بادِ سموم غنچہ نسیم بن کر شاعر کی روشن کی ہوئی شمع کی تعریف میں سر دُھننے لگی:

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے

حالؔی نے مسلمانوں کے تنزل کا سبب معرفت الٰہی اور عشقِ نبوی ﷺ سے دوری بتایا ہے۔ وہ سورۂ رعد کی آیت یعنی اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ آپ اپنی حالت نہیں بدلتی کو یوں نظم کیا ہے:

کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک
وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک

شاعر نے مسلمانوں کی کمزوریوں، کوتاہیوں، اخلاقی پسماندگیوں اور بری عادتوں پر تذکرہ اور تبصرہ کر کے اُسے اسلام کے باغ کی ویرانی اور تاراجی کا باعث قرار دیا۔ حالی کہتے ہیں اگر ہم ایک اونچے مقام سے دنیا کا نقشہ دیکھیں تو ہمیں ہر طرف تازہ سرسبز و شاداب باغات نظر آئیں گے جن کے درمیان ایک خشک باغ بھی دکھائی دے گا۔

گھٹا کھل گئی سارے عالم میں چھا کر	ہری کھیتیاں جل گئیں لہلہا کر
جہاں خاک اڑتی ہے ہر سو برابر	نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل	نہیں پھول و پھل جس میں آنے کے قابل
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے	یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے

شاعر نے مسلمانان برصغیر کو اپنے حملوں کا نشانہ بنایا ہے جن کے مسائل اور کرتوتوں سے وہ واقف ہے اور ان کے لیے وہ درد بھرا دل بھی رکھتا ہے جن کی پانچ سو سالہ حکومت کے چند سال بعد کسمپرسی کا یہ حال ہے:

مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا	وہ دین حجازی کا بے باک بیڑا
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آ کر	کیے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
لگا اُن سے عیب آج ہندوستاں کو	کہ کل فخر تھا جن سے اہل جہاں کو
اک اسلام کا رہ گیا نام باقی	رہا دین باقی نہ اسلام باقی

حالؔی کا لہجہ تند اور تیز ہو جاتا ہے جو عموماً ان کا طرز بیان نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس صورت حال سے کتنا رنج اور درد تھا۔ حالؔی نے ان اشعار میں خود کو بھی شامل رکھا اور کہیں پر واعظانہ گفتگو نہ کی۔

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے
کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے

مگر ہم تو اب تک جہاں تھے وہیں ہیں　　جمادات کی طرح بار زمیں ہیں
گڈریے کا وہ حکم بردار کتا　　کہ بھیڑوں کی ہر دم ہے رکھوالی کرتا
جو ریوڑ میں ہوتا ہے پتے کا کھڑکا　　تو وہ شیر کی طرح پھرتا ہے پھیرا
گر انصاف کیجئے تو ہے ہم سے بہتر
کہ غافل نہیں فرض سے اپنے دم بھر

اگر ہم علامہ اقبال کی بعض نظمیں جن میں شکوہ جواب شکوہ بھی شامل ہے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اقبال نے موضوع اور لہجہ کو بعض مقامات پر حالؔی سے لیا ہے۔ یہاں ہمارا مقصد تقابل نہیں بلکہ یہ بتانا ہے کہ شاعری میں چراغ سے چراغ جلایا جاتا ہے۔

اقبال نے کہا تھا کہ انسان بعض مقامات پر کتے سے بھی پست ہو جاتا ہے۔ ہم نے انساں کو انساں کے سامنے سر خم کرتے دیکھا لیکن کسی کتے کو دوسرے کتے کے سامنے سر جھکاتے نہیں دیکھا۔ حالؔی کہتے ہیں کہ برصغیر کی دوسری قومیں علم و ہنر صنعت و حرفت تعلیم و تربیت میں مسلمانوں سے بہت آگے نکل چکی ہیں۔ وہ سب موجودہ حالات سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور مسلمان مذہب کا بہانہ بنا کر روز بہ روز گرتے جا رہے ہیں انہیں اپنا رخ بدلنا ہو گا۔

سدا ایک ہی رخ نہیں ناو چلتی
چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

برصغیر کے مسلمانوں پر ایسی آفت آئی ہے کہ عوام تو ایک طرف خواص جن میں حکمرانوں کی اولادیں شاہوں کی نسلیں نان شبینہ کے لیے محتاج ہو گئی ہیں:

یہ اے قوم اسلام عبرت کی جا ہے　　کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہے
نہیں کوئی ان میں کمانے کے قابل　　اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل

بزرگوں کے نازاں ہیں جس نام پر وہ اسے بیچتے پھرتے ہیں در بدر وہ
بہت آپ کو کہہ کے مسجد کے بانی بہت بن کے خود سید خاندانی
بہت آستانوں کے خدام بن کر پڑے مانگتے کھاتے پھرتے ہیں در در

مسدس کا یہ حصہ طولانی ہے اور مسلسل مضامین کی تکرار بھی ہے۔ دنیائے اسلام کی عظیم تاریخ اور تاریخی فتوحات کے ساتھ ہندوستان کے ذلیل وخوار مسلمانوں کا تقابل ایک ایسا مرقع ہے جسے بیوہ کی فریاد کہا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ اسلامی حکومتوں کی ترقیاں اور فتوحات حالیؔ نے پڑھی اور سنی تھیں اور مسلمانان ہند کی نکبت بار زندگی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے اور دل و دماغ میں محسوس کر رہے تھے۔ حالیؔ نے مسدس کی ہیت کا سب سے زیادہ استعمال اسی حصے میں کیا ہے جہاں کسی واقعے، خصلت، مسئلہ کو لے کر پہلے اس کی تمہید پھر اس کے مضمون کی تکمیل اور آخر میں ٹیپ کے شعر میں نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔ چند بند ہمارے ادعا کا ثبوت ہیں:

مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں ہنر اور پیشے کو جو خوار سمجھیں
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں فرنگی کے پیسے کو مردار سمجھیں
تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

بہت لوگ پیروں کی اولاد بن کر نہیں ذات والا میں کچھ جن کو جوہر
بڑا فخر ہے جن کو لے دے کے اس پر کہ تھے اُن کے اسلاف مقبول داور
کرشمے ہیں جا جا کے جھوٹے دکھاتے
مریدوں کو ہیں لوٹتے اور کھاتے
یہی ہیں مراد اور یہی ہیں مرید اب
یہی ہیں جنید اور یہی ہیں بایزید اب

بڑھے جس سے نفرت وہ تحریر کرنی جگر جس سے ہو شق وہ تقریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی
یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ
یہ ٹھہرے ہیں اسلام کے رہنما اب
لقب ان کا ہے وارث انبیا اب
رہا کوئی امت کا ملجا نہ ماوا نہ قاضی نہ مفتی نہ صوفی نہ ملّا
وہ دیں جو کہ چشمہ تھا خلق نکو کا کیا قُلّتین اُس کو غسل و وضو کا
نہ سنی میں اور جعفری میں ہو الفت نہ نعمانی و شافعی میں ہو ملت
وہابی سے صوفی کی کم ہو نہ نفرت مقلد کرے نا مقلد پہ لعنت
رہے اہل قبلہ میں جنگ ایسی باہم
کہ دین خدا پر ہنسے سارا عالم
اگر بھولتے ہم نہ قول پیغمبر ﷺ کہ ہیں سب مسلماں باہم برادر
برادر ہے جب تک برادر کا یاور معین اس کا خود ہے خداوند داور
تو آتی نہ بیڑے پہ اپنے تباہی
فقیری میں بھی کرتے ہم بادشاہی

اس نظم کے سلسلے میں حالؔی نے تقریباً ہر اخلاقی، سماجی، مذہبی، ثقافتی اور ملی کمزوری پر شعر لکھے ہیں جن میں خود پسندی، غرور و تکبر، حسد اور فتنہ گری، تعصب اور غیبت وغیرہ جن کا تفصیل سے ذکر ممکن نہیں اس لیے چیدہ چیدہ اشعار یا مصرع لکھ کر ہم آگے بڑھتے ہیں۔

جہالت نہیں چھوڑتی ساتھ دم بھر　　تعصب نہیں بڑھنے دیتا قدم بھر
منھ اپنا ہو گو دین و دنیا میں کالا　　نہ ہو ایک بھائی کا پر بول بالا
مجالس میں غیبت کا زور اس قدر ہے　　نہ ملّا نہ صوفی کو اس سے حذر ہے
نشہ میں تکبر کے ہے چور کوئی　　حسد کے مرض میں ہے رنجور کوئی
نہیں دستیاب ایسے اب دو مسلماں　　کہ ہو ایک کو دیکھ کر ایک شاداں
شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے　　وہ لے جا کے سب اہل مغرب نے جوڑے
نہیں راس یاں چار پیسے کسی کو　　مبارک نہیں جیسے پر چیونٹی کو

حالیؔ نے مسدس میں فلسفہ اور حکمت کا دباؤ اور ظاہری دکھاوے کے ساتھ طبابت اور حکیموں کی نا اہلی اور شاعروں کی جھوٹی اور چوما چاٹی کی شاعری پر کھل کر اعتراضات کیے ہیں۔ حالیؔ کے مسدس کا یہی وہ حصہ ہے جو برصغیر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلا اور حالیؔ کو اعتراضات اور رکیک تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ شاعروں ادیبوں اور صحافیوں نے حالیؔ کے پیغام کو جام زہر سمجھ کر اس کو پاش پاش کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی۔ حسرت موہانی اُردوئے معلیٰ میں اور اودھ کے اخبار نے تو کئی سال تک سرخی کے طور پر یہ شعر اپنے اخبار کی پیشانی پر لکھا:

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائے مال ہے

کہیں پر مسدس خالی، کہیں پر نقالی، ڈفالی، نقلی اور جعلی وغیرہ عناوین کے تحت اعتراضات ہوتے رہے لیکن حالیؔ کا مسدس عوام اور خواص میں مشہور اور معروف ہوتا رہا۔ حالی نے یونان کے فلسفہ کو ایک بے کار مشق بتایا ہے جو صحیح نہیں۔ اسلامی فلسفہ اور یونانی فلسفہ میں مشترک قدریں موجود ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حالی فلاسفر نہیں تھے شاید انہیں فلسفہ کا ابتدائی قاعدہ بھی سمجھنے نہ آیا ہو۔ اسلامی فلسفیوں نے یونانی، ہندی اور دوسرے

قدیم فلسفوں سے استفادہ کیا ہے۔ اس مختصر تحریر میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ ہم یہاں بحث کا دفتر کھول دیں۔ حالیؔ کے مسدس کا یہ حصہ ہمیشہ بحث و مباحثہ کا محور رہے گا۔ حالیؔ نے ان اشعار میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور شاید بعض دعوے صحیح بھی نہیں۔

وہ حکمت کہ ہے ایک دھوکے کی ٹٹی　　وہ تقویم پارینہ یونانیوں کی
کوئی بات اس میں نہیں کم زیادہ　　اُسے وحی سے سمجھے ہیں ہم زیادہ
بالاجماع ہیں قابل نسخ و نسیاں　　زبور اور توریت و انجیل و قرآں
نہیں نسخ و تبدیل کا ان میں امکاں　　مگر لکھ گئے جو اصول اہل یوناں
شفا اور محیطی کے دم بھرنے والے　　اب اس فلسفہ پر جو ہیں مرنے والے
فلاطون کی اقتدا کرنے والے　　ارسطو کی چوکھٹ پہ سر دھرنے والے
وہ تیلی کے کچھ بیل سے کم نہیں ہیں
پھرے عمر بھر اور جہاں تھے وہیں ہیں

پھر اس کے بعد حالیؔ نے ایک معمولی مزاحیہ داستان بارہ اشعار میں نظم کی ہے جو بچکانی ہے اور فلسفہ و طبابت سے میل نہیں کھاتی۔ بندروں کو سردی ہو رہی تھی انہیں آگ جلانے کی ضرورت ہوئی کہیں آگ دکھائی نہ دی انہوں نے جگنو کو چنگاری سمجھ کر اُسے گھانس پھونس میں دبا دیا مگر جب صبح ہوئی تو دیکھا کہ اس کی روشنی ختم ہو چکی ہے وہ جگنو تھا جسے بندر آگ سمجھ بیٹھے تھے۔

جہاں تک طبابت اور حکیموں کے نسخوں کا تعلق ہے حالی حق بجانب ہیں۔ حکیموں نے محنت اور مشقت اور جدید نسخوں کی تیاری کی طرف کچھ توجہ نہ کی جس کا نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ لوگوں کو ان کی طبابت پر اعتبار نہ رہا۔

سمجھتے ہیں جس کو بیاض مسیحا　　وہ طب جس پہ غش ہیں ہمارے اطبا
چلے آئے ہیں جو کہ سینہ بہ سینہ　　فقط چند نسخوں کا ہے وہ سفینہ

نہ ان کو نباتات سے آگہی ہے — نہ علم طبیعی نہ کمیسٹری ہے
نہ پانی کا علم اور نہ علم ہوا ہے — مریضوں کا ان کے نگہباں خدا ہے
سلف لکھ گئے جو قیاس اور گماں سے — صحیفے ہیں اترے ہوئے آسماں سے

حالؔی نے کچھ اہم کتابوں اور مصنفوں کے حوالے بھی دیئے ہیں جیسے قانون، مخزن، نفیسی اور سدیدی وغیرہ۔

مسدس کا وہ حصہ جو طرفداری اور مخالفت کا باعث ہوا جہاں اصل میں پانی پت کی چوتھی لڑائی لڑی گئی وہ شاعروں سے متعلق تھا۔ یہاں حالؔی کا لہجہ سخت تھا اور اُس سے اہم بات یہ بھی تھی کہ حالؔی نے سکے کا ایک رخ جو خراب تھا بتا کر عمومی شاعری اور سارے شاعروں پر لعن وطعن کی تھی۔ حالؔی نے تمام تر شاعری کی قدروں کو اپنی پسند کے مطابق چنا تھا اُس زمانے میں عمدہ شاعروں کی کمی نہ تھی جنھوں نے صحت مند شاعروں میں زحمت کی تھی چنان چہ ایک ہی رنگ میں خوب و بد کو رنگنے سے مسئلہ اختلافی ہو گیا۔ ایک سالم ذہن کس طرح سے اچھی شاعری کو بری شاعری اور دفترِ معجز بیاں کو سنڈاس سے بدتر سمجھ سکتا ہے۔

وہ شعر اور قصاید کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا — وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

ہمیں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سارا علم دین کس طرح سے ہمارے علم ادب سے برباد ہو گیا۔ لوگ کہتے ہیں حالؔی کو مبالغہ اور غلط بیانی پسند نہ تھی۔

اب شاعروں کو جہنم میں جھونکا جا رہا ہے:

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے — عبث جھوٹ بکنا اگر نا روا ہے
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے — جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے

شاعروں کو سقّے، دھوبی، مہتر اور عوام سے بدتر اور ناکارہ بتانا ہنرمند کی بے

احترامی ہے۔عمدہ شاعری میں شاعر اپنے جذبات کے تحت قلم کونہیں بہاتا کیوں کہ اس کا اثر معکوس ہوسکتا ہے۔اگرچہ یہ اشعار زبان زدعام ہوئے کیونکہ لوگوں کے دل شاعروں کے معترف نہ تھے اور ہر شاعر اس الزام کو دوسرے کے سر دھر رہا تھا۔

ہو میلا جہاں گُم ہوں دھوبی اگر سب جو سقّے نہ ہوں جی سے جائیں گذر سب
جو ٹھُہڑ جائیں مہتر گندھے ہو گھر سب بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب
پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے ''خس کم جہاں پاک'' سارے

حالؔی کے دور میں اور ان کی معاشرتی تہذیب میں غزلوں کا بھانڈوں اور طوائفوں کا گانا کلام اور شاعر کی توہین سمجھا جاتا تھا جب کہ مغربی تہذیب کے اثر سے آج یہ بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔

گویّوں پہ بے حد ہیں احسان ان کے طوائف کو ازبر ہیں دیوان ان کے
تو بھانڈ ان کی غزلیں مجالس میں گائیں کہ جب شعر میں عمر ساری گنوائیں

حالؔی نے ایک اور نا انصافی یہ کی کہ برصغیر کی انیسویں صدی کی شاعری کو عرب کی ہزار سالہ شاعری سے مقابلہ کیا۔

مٹا دی عزیزوں نے ان کی نشانی عرب جو تھے دنیا میں اس فن کے بانی
رہے شاعری کو آخر ڈبو کر سب ان کے ہنر اور کمالات کھو کر

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر ملک کی شاعری ہر زبان کی شاعری ہر ماحول کی شاعری اور ہر دور کی شاعری میں معجز بیانی سے سوقیانہ شاعری نظر آتی ہے۔ ع

در ید بیضا ہمہ انگشت ہا یک دست نیست

اُردو ادب میں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں وہ شاعر بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اُردو شعر کا مرتبہ فارسی اور عربی شعروں کے ہم پلہ کر دیا۔کاش حالی اس کا

بھی ذکر کرتے؟

☆ حالؔی کا لہجہ اصلاحی نقطہ نظر سے عموماً میانہ رو اور متوازن ہے۔ بعض مقامات پر حالی جذبات کی رو میں بہہ کر اخلاق شاعری اور تہذیب شعر سے تجاوز کرتے نظر آتے ہیں البتہ ایسے اشعار شریعت شعری میں مکروہ سہی مگر عوام میں انہی اشعار کو جاودانہ زندگی میسر ہوئی جیسے مسدس کا یہ شعر:

وہ شعر و قصاید کے ناپاک دفتر

عفونت میں سنڈاس سے ہیں جو بدتر

مسدس میں انگریز حکومت کا اچھے انداز میں ذکر ان کے عمل کردہ اور ترقی پذیر صنعتوں کی پذیرائی اور سرزمین ہند پر مقبوضہ قوم کی برکتوں کا خیر مقدم حالؔی کی شاعری کا کمزور رخ تھا وہ ہوا کے رخ پر چلنا ہی صحیح راستہ سمجھ رہے تھے۔ حالؔی کا قصیدہ جوبلی خود قصاید ناپاک کے دفتر کا حصہ تھا لیکن ان تمام مسائل کو ہمیں اُس زمانے کے محبوس شکست خوردہ ماحول کے پس منظر میں دیکھنا پڑے گا جہاں برصغیر میں صرف مسلمان قوم انگریزوں سے دور ہوتی جا رہی تھی اور ہر ترقی کے راستے کو گمراہی اور غیر مذہبی سازش سمجھ کر افلاس اور جہالت کے دلدل میں پھنستی جا رہی تھی۔ حق گفتاری اور آزاد بیانی کا حشر لوگ فضل حق خبر آبادی، منیر شکوہ آبادی اور محمد باقر کے ساتھ انگریزوں کے سلوک میں دیکھ چکے تھے۔ حالؔی نے ملک کی ترقی صنعت وحرفت تعلیم و تربیت کے ساتھ اخلاق سازی اور عزم و استقلال زندگی کے معیار کو بلند کرنے کے لیے بیان کر کے سکہ کا دوسرا روشن رخ دکھانے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر اعجاز حسین نے مسدس کی بابت ٹھیک بیان دیا ہے کہ اسے صرف طولانی واعظ کہہ کر ٹالنا نہیں چاہیے بلکہ یہ اشعار درس عمل اور واقعیت وجدانی کیفیات سے محروم نہیں۔

حالؔی نے بیان کی اصلیت کے ساتھ زبان کی سادگی شگفتگی اور تازگی پر کام کر کے اُسے جدید چہرہ دیا ہے۔ شاید حالؔی ان پہلے شعرا میں سب سے ممتاز شاعر ہوں جنھوں نے عام فہم اور بول چال کی زبان نظم کرنے میں نرم اور آسان اُردو الفاظ کے ساتھ ایسے ہندی الفاظ نظم میں داخل کیے جس سے شعرا کا حلقہ واقف نہ تھا یا ان الفاظ کو استعمال کرنے کی ضرورت اور جرأت نہیں رکھتا تھا۔ اس عمل سے حالؔی نے اُردو شاعری کو برصغیر کی زمین سے جوڑ دیا۔ اس جدت کے ساتھ ساتھ انہوں نے فارسی اور عربی تراکیب تلمیحات، اصطلاحات، فقرے اور تمثیلیں بھی بکثرت استفادہ کیں۔

حالؔی نے یہاں سے مسدس کو امیروں جاگیرداروں کی بدچلنی اور عیش پرستی کی طرف موڑا جنہیں اس کا احساس ہی نہیں تھا کہ ان کی کچھ خاندانی، سماجی دینی اور اخلاقی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ حالؔی تقریباً اُن سے مایوس ہو گئے تھے اور ان کی نظر محنت کش تعلیم و تربیت یافتہ افراد پر جمی تھی۔

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے   تباہ ان کی حالت بُری ان کی گت ہے
کسی کو کبوتر اڑانے کی لت ہے   کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اور چنڈو کا رسیّا ہے کوئی

نشہ میں مئے عشق کے چور ہیں وہ   صفِ موجِ مژگاں میں محصور ہیں وہ
اگر شش جہت میں کوئی دلربا ہے   تو دل ان کا نادیدہ اُس پر فدا ہے
بھری سب کی وحشت سے روداد ہے یاں
جسے دیکھیے قیس و فرہاد ہے یاں
قلی یا نفر ہو تو کچھ کام آئے
مگر ان کو کس مد میں کوئی کھپائے

حالیؔ کے مسدس کا سرمایہ یہی نوجواں تعلیم یافتہ محنت کش تھے جنہیں وہ قوم کی آیندہ زندگی سمجھ رہے تھے:

یہی جان ڈالے گی باغ کہن میں
اسی سے بہار آئے گی اس چمن میں
یہی شمعِ اسلام روشن کریں گی
بڑوں کا یہی نام روشن کریں گی

حالی نسلِ جدید کو ترغیب دیتے ہیں کہ انگریزوں نے جو ملک میں سہولتیں دی ہیں خواہ وہ تعلیم حاصل کرنے کی ہوں یا تجارت صنعت و حرفت کی اُس سے مکمل فائدہ اٹھاؤ پھر خود بنو اور دوسروں کو بناؤ۔ بعض لوگوں نے اس کو انگریزوں اور انگریز سرکار کی مدح کہہ کر حالیؔ پر انگریز پرستی کا الزام لگایا۔ حالی کہہ رہے تھے گنگا بہہ رہی ہے دوسری قومیں اس سے فائدہ حاصل کر رہی ہیں تو تم بھی کچھ کر لو۔

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں نہیں بند صنعت کی حرفت کی راہیں
سفر جو کبھی تھا نمونہ سقر کا وسیلہ ہے اب وہ سراسر ظفر کا
کرو قدر اس امن و آزادی کی کہ ہے صاف ہر سمت راہِ ترقی
بہت قافلے دیر سے جا رہے ہیں بہت بوجھ بار اپنے لدوا رہے ہیں
بہت چل چلاؤ میں گھبرا رہے ہیں بہت سے نہ چلنے سے پچھتا رہے ہیں
مگر ایک تم ہو کہ سوتے ہو غافل
مبادا کہ غفلت میں کھوئی ہو منزل

اس میں کوئی شک نہیں کہ انگریز غاصب تھے جن کا مقصد استحصال تھا چناں چہ ان کے لیے یہ مصرعے حالیؔ کے ٹھیک نہیں۔

کہ راجا سے پر جا تلک سب سکھی ہیں
لٹیرے نہ ٹھہراؤ تم رہبروں کو

حالیؔ کا یہ بند بھی نشانہ اعتراض ہوسکتا ہے۔ اقبالؔ نے تو کھلے لفظوں میں یہ کہا ہے:

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

حالیؔ کہتے ہیں:

نہ بد خواہ ہے دین و ایماں کا کوئی نہ دشمن حدیث اور قرآں کا کوئی
نہ ناقص ہے ملت کے ارکاں کا کوئی نہ مانع شریعت کے فرماں کا کوئی
نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں
اذانیں دھڑلے سے دو مسجدوں میں
وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے
سوا اُس کے انجام سب کا فنا ہے

یہ جو اعتراض حالیؔ پر کیا جاتا ہے کہ وہ انگریز پرست تھے اور اس کی تائید میں ان کے کلام سے چھانٹ چھانٹ کر کچھ اشعار اور مصرعے پیش کیے جاتے ہیں اُس میں تھوڑی بہت حقیقت ضرور ہے کہ حالیؔ نے ایک غاصب قوم کو جو تبییض نژاد، رنگ، قوم اور زبان میں مشہور تھی ایک ہمدرد اور قابل تقلید قوم بتایا جس کے اشارے انھوں نے کئی قصیدوں، قطعوں، مسدس اور ملکہ وکٹوریا کے مرثیے میں بھی کیے۔ اس مسئلہ پر انصاف کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمیں اُس ماحول اور اُس زمانے کی سیاسی دنیا کو بھی دیکھنا چاہیے۔ برصغیر کی اکثریت مسلمان سلطنتوں کی نابودی کا جشن منا رہی تھی چناں چہ غدر کے فوری بعد وہ سب انگریزوں کے ساتھ ہوگئے اور ان کی سماجی ادبی رفاہی، علمی،

تعلیمی، تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے یہ اور بات ہے کہ بعد میں اکثریت کا ایک خاص گروہ جس کی سرکردگی گاندھی جی اور ان کے رفقا نے کی انگریزوں کی مخالفت کی اور اُس وقت انگریزوں کو یہ محسوس ہوا کہ برصغیر جاگ رہا ہے اور ع

جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ایسے پر آشوب دور میں سرسید کی حکمت عملی نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ انگریزوں سے مخالفت کرنے کے بجائے اکثریت کی طرح ان کے سماجی، رفاہی اور تعلیمی کاموں سے فائدہ اٹھایا جائے تاکہ عزت نفس کی زندگی بسر کر جائیں۔ انگریزوں میں سب جفاکش، ظالم، غاصب اور قاتل نہ تھے بلکہ کئی شریف انسان برٹش ظلم کے کم از کم زبان سے قائل ضرور تھے۔ برصغیر میں امن و امان کی برقراری ضروری تھی کیوں کہ یہ بھی دنیا کا اصول ہے کہ جب اچھے لوگ منہ موڑ لیتے ہیں تو برے لوگ اپنا کام کر جاتے ہیں۔

کسی بھی حکمران کی کرسی کبھی خالی نہیں رہتی اگر شریف لوگ اُس کرسی کو پسند نہ کریں تو رذیل اور بدمعاش اُس پر بیٹھ جاتے ہیں۔ حالؔی دوسرے ادیبوں اور شاعروں کی طرح اس کوچہ سے بغیر صدا و شور گزر سکتے تھے اور اس سے اپنے شخصی فائدے بڑھا سکتے تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ صرف اچھے کام کرنے کا انعام نہیں بلکہ اُن کاموں کے بارے میں بھی سوال کیا جائے گا جس کو نہیں کیا گیا اور جس کے کرنے میں قوم کا فائدہ تھا۔

اسی لیے حالؔی نے یہ بڑا پتھر تن تنہا اٹھا کر محراب انسانیت میں سجا دیا جس کی وجہ سے حالؔی ہر دور کے حالی ہوئے۔ برصغیر کی بے روزگاری، بے کاری، غربت اور افلاس کی ایک بڑی وجہ ترقی یافتہ قوموں کی استعمار گیری تھی۔ یورپ کے کارخانوں سے

بنا ہوا مال برصغیر میں استعمال ہوتا یہاں صرف مصرف کنندہ ہوتے تھے اور تولید دھندے سب امیر یورپ کے تاجر تھے۔ اُردو ادب کا پہلا شاعر جس نے اس طرف عوام کی توجہ مبذول کی؛ حالؔی ہیں۔

ذیل میں مسدس کے کچھ بند ترتیب دیے گئے ہیں جو موضوع کو روشن کرنے کے لیے کافی ہیں:

ہنر اور فن واں ہیں سب گھٹتے جاتے ہنر مند ہیں روز و شب گھٹتے جاتے
ادیبوں کے فضل و ادب گھٹتے جاتے طبیب اور ان کے مطب گھٹتے جاتے
ہوئے پست سب فلسفی اور مناظر نہ ناظم ہیں سر سبز اُن کے نہ ناثر

....

اگر وہ پہننے کو ٹوپی بنائیں تو کپڑا وہ اک اور دنیا سے لائیں
جو سینے کو وہ ایک سوئی منگائیں تو مشرق سے مغرب میں لینے کو جائیں
ہر اک شے میں غیروں کے محتاج ہیں وہ مکینکس کی رَو میں تاراج ہیں وہ

....

نہ پاس ان کے چادر نہ بستر ہے گھر کا نہ برتن ہیں گھر کے نہ زیور ہے گھر کا
نہ چاقو نہ قینچی نہ نشتر ہے گھر کا صراحی ہے گھر کی نہ ساغر ہے گھر کا
کنول مجلسوں میں قلم دفتروں میں اثاثہ ہے سب عاریت کا گھروں میں

....

جو مغرب سے آئے نہ مالِ تجارت تو مر جائیں بھوکے وہاں اہل حرفت
ہو تجّار پر بند راہ معیشت دکانوں میں ڈھونڈھی نہ پائیں بضاعت
پرائے سہارے ہیں بیوپار واں سب طفیلی ہیں سیٹھ اور تجار واں سب

....

یہ ہیں ترکِ تعلیم کی سب سزائیں
وہ کاش اب بھی غفلت سے باز اپنی آئیں
مبادا رہِ عافیت پھر نہ پائیں
کہ ہیں بے پناہ آنے والی بلائیں
ہوا بڑھتی جاتی سرِ رہ گذر ہے
چراغوں کو فانوس بن اب خطر ہے

....

بس اب علم و فن کے وہ پھیلاؤ ساماں
کہ نسلیں تمہاری بنیں جن سے انساں
غریبوں کو راہِ ترقی ہو آساں
امیروں میں ہو نورِ تعلیم تاباں
کوئی ان میں دنیا کی عزت کو تھامے
کوئی کشتی دین و ملت کو تھامے

....

بنے قوم کھانے کمانے کے قابل
زمانہ میں ہو منھ دکھانے کے قابل
تمدن کی مجلس میں آنے کے قابل
خطاب آدمیت کا پانے کے قابل
سمجھنے لگیں اپنے سب نیک و بد وہ
لگیں کرنے آپ اپنی اپنی بد وہ

....

کرو قدر اُن کی ہنر جن میں پاؤ
ترقی کی اور اُن کو رغبت دلاؤ
دل اور حوصلے اُن کے مل کر بڑھاؤ
ستوں اس کھنڈر گھر کے ایسے بناؤ
کوئی قوم کی جن سے خدمت بن آئے
بٹھائیں انہیں سر پہ اپنے پرائے

....

یہی سلطنت کی ہے کافی اعانت
کہ ہو ملک میں امن اُس کی بدولت
نفوس اور اموال کی ہو حفاظت
حکومت میں ہو اعتدال اور عدالت
نہ تورا رعیت پہ بیجا ہو کوئی
نہ قانون چھچٹ کار فرما ہو کوئی

حالیؔ کا مسدس دل کی آواز تھا اس لیے ہر پڑھنے اور سننے والے کے دل و دماغ میں اتر جاتا اور متاثر کرتا۔ عہد رفتہ کی تعریف اور عہد حاضر کی تذلیل سے ایک

خاص قسم کی بے چینی اور کنفوژن پیدا ہوتا تھا۔ مسدس کے آخری بندوں کے اشعار میں مایوسی اور افسردگی تھی چناں چہ اکثر لوگ ان پر آنسو بہاتے تھے جو حالؔی کی نظم کا مقصد نہ تھا:

مگر اک تمہیں ہو کہ سوتے ہو غافل
مبادا کہ غفلت میں کھوئی ہو منزل

......

یہ بوسیدہ گھر اب گرا کا گرا ہے
ستوں مرکز ثقل سے ہٹ چکا ہے

......

نہیں گرچہ کچھ قوم میں حال باقی
ابھی اور ہونا ہے پامال باقی

......

بہت یاں ہوئے خشک چشمے ابل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر

حالؔی کے الفاظ ہیں ''نظم بالکل غیر مانوس تھی اور مضمون اکثر طعن و ملامت پر مشتمل تھے قوم کی خرابیاں چن چن کر ظاہر کی گئی تھیں اور زبان سے تیغ وسناں کا کام لیا گیا تھا۔ مگر یہ اسلوب جس قدر غیرت دلانے والا تھا اُسی قدر مایوس کرنے والا بھی تھا۔ مصنف کے دل کی آگ بھڑک بھڑک کر بجھ گئی تھی اور اس کی افسردگی الفاظ میں سرایت کر گئی تھی نظم کا خاتمہ ایسے دل شکن اشعار پر ہوا جن سے تمام امیدیں منقطع ہو گئیں اور تمام کوشش رایگاں نظر آنے لگیں شاید اس خرابی کا تدارک کچھ نہ ہو سکتا اگر قوم کی توجہ مصنف کے دل میں ایک نئی تحریک پیدا نہ کرتی۔ بعض احباب کی تحریک نے ان خیالات کی تائید کی اور ایک ضمیمہ مقتضائے حال کے موافق اصل مسدس کے آخر میں لاحق کیا گیا۔'' (دیباچہ ضمیمہ:۱۸۸۶ء)

حالیؔ نے مسدس کے چھے سال بعد ضمیمہ اور عرض حال بجناب سرور کائنات ﷺ تصنیف کیا۔ضمیمہ میں (۱۶۴) بند یعنی (۴۹۲) اشعار ہیں چناں چہ کل مسدس کے اشعار کی تعداد ضمیمہ کے شامل کرنے کے بعد (۱۳۸۰) ہو جاتی ہے۔نعتیہ نظم میں صرف تریسٹھ اشعار ہیں شاید یہ تعداد حضور نبی کریم ﷺ کی طبعی عمر کو ملحوظ کر کے انتخاب کی گئی ہو۔

ضمیمہ کا اصلی مقصد مسدس میں بیماری کی تشخیص کے بعد اس کا علاج کا تذکرہ ہے۔حالیؔ جانتے تھے کہ اسلام میں نا امیدی کفر اور گناہ تصور کی جاتی ہے اسی لیے اس کا آغاز یوں کیا گیا:

بس اے نا امیدی نہ یوں دل بجھا تو
جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو

پھر مسلسل دس بندوں میں یعنی تیس اشعار میں امید پر تمام جمال و جلال و کمال کے ساتھ روشنی ڈالی۔تاریخی واقعات، مذہبی روایات، دنیاوی تجربات اور کامیابی اور کامرانی کی حکایت پیش کر کے افسردہ اور رنجیدہ دلوں کو گرمایا کہ یہ امید ہی تھی جس نے ذات اور کائنات میں انقلاب برپا کیا اور انسان و انسانیت ترقی کر سکی۔محاوروں اور تاریخی حوالوں کے اشارے دیکھیے:

ترے دم سے مردوں میں جانیں پڑی ہیں
جلی کھیتیاں تو نے سر سبز کی ہیں

......

سکندر کو دارا پہ ہے تو چڑھاتی
فریدوں کو ضحاک سے ہے تو لڑاتی

......

سکندر کو شانِ کئی تونے بخشی
کلمبس کو دنیا نئی تونے بخشی

تلمیحات کے پیکروں میں قرآنی اور اسلامی واقعات کی طرز بیانی بتاتی ہے کہ حالؔی ایک عظیم ناظم تھے انہیں مصرعوں کی ترتیب، نغمگی اور تاثیر پر پوری قدرت حاصل تھی۔

سفینہ پۓ نوح طوفاں میں تو تھی سکوں بخش یعقوب کنعاں میں تو تھی
زلیخا کی غم خوار ہجراں میں تو تھی دل آرام یوسف کی زنداں میں تو تھی

مصائب نے جب آن کر ان کو گھیرا
سہارا وہاں سب کو تھا ایک تیرا

امید اور نا امید کی تضادی کیفیت کو ان رواں مصرعوں میں دیکھیں کہ حالؔی کے یہاں صنعتِ تضاد لاشعوری طور پر کیا کیا مضمون باندھواتی ہے:

بہت ڈوبتوں کو ترایا ہے تونے (ڈوبنا ۔ تیرنا)
بگڑتوں کو اکثر بنایا ہے تونے (بگڑنا ۔ بنانا)
اکھڑتے دلوں کو جمایا ہے تونے (اکھڑنا ۔ جمانا)
اجڑتے گھروں کو بسایا ہے تونے (اجڑنا ۔ بسانا)
بہت تونے پستوں کو بالا کیا ہے (پست ۔ بالا)
اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے (اندھیرا ۔ اجالا)
قوی تجھ سے ہمت ہے پیر وجواں کی (پیر ۔ جوان)
بندھی تجھ سے ڈھارس ہے خورد و کلاں کی (خورد ۔ کلاں)

حالی نظم کے تسلسل میں موضوع کو ترقی دے کر پُر تاثیر بناتے ہیں اور پھر ایک ایسا عمدہ شعر جڑ دیتے ہیں جس سے نظم کا آیندہ مضمون جڑ جاتا ہے۔ یہی کیفیت

قصیدوں میں گریز کا شعر پیدا کرتا ہے میر انیسؔ نے مسدس مرثیہ میں مختلف اجزا کو جوڑنے کے لیے یہی عمل کیا جو بہت کامیاب ثابت ہوا:

جہالت میں وہی قوم کی رہنموں ہے
تعصب کی گردن پہ ملت کا خوں ہے

مصرعِ ثانی لا جواب ہے۔ کس نے کہا حالیؔ کی شاعری پھیکی اور بد حالی سے دو چار ہے۔ پھر حالیؔ کہتے ہیں کہ اس قوم میں نہ جان باقی ہے نہ آن بان اور شان باقی ہے مگر کیونکہ غیرت ابھی باقی ہے اس لیے امکان ہے کہ ترقی کریں گے اور جو کچھ کھویا ہے اس میں کچھ پائیں گے:

نہیں قوم میں گرچہ کچھ جان باقی
نہ وہ جاہ و حشمت کے سامان باقی
......
بگڑنے کا گو ان کے وقت آ گیا ہے
مگر اس بگڑنے میں بھی اک ادا ہے
......
بہت ہیں ابھی جن میں غیرت ہے باقی
دلیری نہیں پر حمیت ہے باقی
......
سمجھتے ہیں عزت کو دولت سے بہتر
فقیری کو ذلت کی شہرت سے بہتر
......
گلیم قناعت کو ثروت سے بہتر
انہیں موت ہے بار منت سے بہتر
......

سر ان کا نہیں در بدر جھکنے والا
وہ خود پست ہیں پر نگاہیں ہیں بالا

حالی نے قوم کی حالت اُس بیمار کے مانند بتائی ہے جو بدنی کیفیت سے بہت کمزور مگر حواس اور ہمت سے قوی ہے اس لیے امکان شفا ہے اور ایسا بھی نہیں کہ ساری قوم بیمار اور نکمی ہے بلکہ

چھپے سنگ ریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ
ملے ریت میں ریزہ زر بھی ہیں کچھ

......

نکموں میں کچھ کام والے بھی ہیں یاں
جو چاہیں پلٹ دیں یہی سب کی کایا

......

یوں ہی کام دنیا کا چلتا رہا ہے
دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے

شبلی نے اچھے شعر کی شناخت یہ بھی بتائی ہے کہ وہ روزمرہ میں ہو جس کے ترجمے اور تشریح کی ضرورت پیش نہ آئے اس لیے ہم رواں، سلیس، شگفتہ سیدھے سادے مصرعوں کو بغیر کسی تشریح کے پیش کر رہے ہیں۔ حالی نے مسدس کو عوامی بنانے کے لیے اس کی زبان بھی عوام کی بول چال کی صاف ستھری زبان رکھی جس میں آلائش بناوٹ، شاعرانہ ایہام وابہام نہ ہو تا کہ عامی اور عالم دونوں اپنی ذہنی اور فکری استطاعت کے مطابق مستفید ہو سکیں۔

حالی بتاتے ہیں کہ برصغیر کا قومی جمود ختم ہو رہا ہے جو نیک شگون ہے اگرچہ ابھی ترقی اور شائستگی سے دور ہیں لیکن امید ہے کہ جلد صحیح راستے پر چلیں گے۔ خوبصورت اور عام فہم استعاروں میں گفتگو کو آگے بڑھاتے ہیں جس سے مطلب روز

روشن کی طرح ظاہر ہے۔ ہم کچھ مصرعوں کو جوڑ کر پیش کرتے ہیں:

بہت دن سے دریا کا پانی کھڑا تھا
کہ مکروہ تھی بو تو کڑوا مزا تھا

......

پر اب اس میں رو کچھ کچھ آنے لگی ہے
عفونت وہ پانی سے جانے لگی ہے

......

وہ غفلت کی راتیں گذرنے کو ہیں اب
نشے جو چڑھے تھے اترنے کو ہیں اب

......

کہ نا اتفاقی نے کھویا ہے ہم کو
اسی جزر و مد نے ڈبویا ہے ہم کو

انسان کی بیداری اس کی ترقی کی ضامن ہے۔ خود فریبی جگ فریبی سے مہلک تر ہے۔

اگر با خبر ہیں حقیقت سے اپنی
گذشتہ اور آیندہ حالت سے اپنی

......

تو سمجھو کہ ہے پار کھیوا ہمارا
نہیں دور منجدھار سے کچھ کنارا

حالی نے الپ ارسلان اور طغرل بیگ کی نصیحت آموز گفتگو کے بعد لقمان کی مشہور کہانی خرگوش اور کچھوے کی دوڑ کو نظم کر کے:

یوں ہی وقت سو سو کے ہیں جو گنواتے
وہ خرگوش کچھوؤں سے ہیں زک اٹھاتے

تمام تر توجہ محنت اور کوشش پر مبذول کی ہے۔ حالؔی دیکھ رہے تھے کہ قوم تقدیر کا بہانہ بنا کر محنت سے فرار اختیار کر رہی تھی۔

وہ تدبیر اور کوشش سے کام نہیں لیتے تھے:

نہیں لیتے کام تدبیر سے وہ
سدا لڑتے رہتے ہیں تقدیر سے وہ

......

ہلانے سے ڈوری کے گر ڈور ہلتی
تو روٹی نکموں کو ہرگز نہ ملتی

اصل برکت محنت ہے۔ یہی ترقی بشر کا راز ہے۔ یہی کوشش ہے جس سے قوموں کی آبرو اور حیثیت قائم ہے۔ کسانوں کی محنت سے روٹی ملتی ہے۔ اگلوں کے کاموں سے پچھلے فایدہ مند ہیں۔ دین اور دنیا دونوں کوشش سے حاصل ہوتے ہیں:

یہ برکت ہے دنیا میں محنت کی ساری
اسی پر ہے موقوف عزت تمہاری

......

ہلاتے نہ اگلے اگر دست و بازو
جہاں عطرِ حکمت سے ہوتا نہ خوشبو

......

نہیں ملتی کوشش سے دنیا ہی تنہا
کہ ارکانِ دیں بھی اسی پر ہیں برپا

......

وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

......

حلال آدمی کو ہے کھانا نہ پینا
نہ ہو ایک جب تک لہو اور پسینا

حالیؔ نے ضمیمہ میں جہاں جاہلوں کاہلوں کی مذمت کی ہے ان پر طنز وطعن کیا ہے وہیں عالموں، کاملوں، محنت کشوں اور نیک لوگوں کی تعریف بھی کی ہے۔ یہاں سکہ کے دونوں رخ دکھائے ہیں۔ضمیمہ مسدس کا یہ حصہ طویل ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسدس کے کچھ موضوعات میں کلی تکرار بھی موجود ہے

سب ایسے تن آساں و بے کار و کاہل
تمدن کے حق میں ہیں زہر ہلاہِل
......
بچو ایسے شوموں کی پرچھائیوں سے
ڈرو ایسے چپ چاپ یغمائیوں سے
......
مگر اک فریق اور ان کے سوا ہے
شرف جس سے نوع بشر کو ملا ہے
......
ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر
بنے ہیں زمانے کی خدمت کی خاطر
......
گھلاتے ہیں محنت میں جسم و رواں کو
وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو
......
دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی
انہیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی
......

انہیں سے ہے رتبہ یہ آدم نے پایا
کہ سر ان سے روحانیوں نے جھکایا

پھر حالی بزرگان قوم و دین حکمران اور فلاسفر و ادیبوں کا ذکر کر کے علم کا نورانی دریچہ کھولتے ہیں۔ حالؔی نے مسدس میں کچھ موضوعات کو چھوٹے بڑے قصوں اور تاریخی واقعات سے موثر بنانے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کاہل لوگوں کو سوئے ہوئے خرگوش سے نسبت دے کر کچھوے سے شکست دیتے ہیں:

یوں ہی وقت سو سو کے ہیں جو گنواتے
وہ خرگوش کچھوؤں سے ہیں زک اٹھاتے

کہیں الپ ارسلان اور طغرل کی گفتگو سے نصیحت کرتے ہیں:

کہا ملک و دولت ہو ہاتھ ان کے جب تک
جہاں ہو کمر بستہ ساتھ ان کے جب تک

......

حوادث کے بن گذارا نہیں یاں
بلندی و پستی سے چارا نہیں یاں

......

بہت یکہ تازوں کو یاں گرتے دیکھا
سدا شہسواروں کو یاں گرتے دیکھا

ایک مقام پر عقل مند انسان کی بات چیت کو مکالمے کی صورت میں کہتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بڑی نعمت کیا ہے؟ سب سے بڑی نعمت عقل ہے اس کے بعد علم و ہنر اور مال و دولت کا مقام ہے۔ اگر یہ نعمتیں نہ ہوں تو انسان ترقی نہیں کر سکتا:

کہ نعمت ہے دنیا میں سب سے بڑی کیا؟
کہا عقل جس سے ملے دین و دنیا

کہا پھر اہم سب سے علم و ہنر ہے
کہا مال و دولت ہے پھر سب سے بڑھ کر

کبھی بندر اور جگنو کی داستان بیان کرتے ہیں اور کبھی چیونٹی کی اپنی قوم پر خدمت کو ظاہر کر کے انسانوں کو عبرت کا سبق دیتے ہیں کہ ہم اتنے خودغرض ہیں کہ اس حقیر سے کیڑے سے بھی گئے گزرے ہیں۔

ذخیرہ ہے جب چونٹا کوئی پاتا
فتوح اپنی ایک ایک کو ہے دکھاتا
کمائی سے ایک اک کی لاکھوں ہیں پلتے
جب اک چونٹا جس میں نہ دانش نہ حکمت
کرے ان پہ وقف اپنی ساری غنیمت
تو اس سے زیادہ ہے بے عزتی کیا
کہ ہو آدمی کو نہ پاس آدمی کا

حالؔی مسدس میں مسلمانوں کی سماجی اقتصادی اور فکری قدروں میں تبدیلی لانے کی کوشش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ معمولی پیشہ بھی اگر اچھے طریقے اور ایمان داری سے کیا جائے تو وہ قابل عزت اور قابل قدر ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ کبھی اپنی ترقی سے مایوس نہ ہو۔ مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ بڑے بڑے لوگ ادنیٰ اور معمولی پیشوں سے منسلک تھے۔ کوئی صفار یعنی تانبے کے برتن بنانے والا تھا، کوئی دھوبی، کوئی بڑھئی کوئی زین گر اور کوئی روئی دُھننے والا تھا۔

حکومت ملی اُن کو صفار تھے جو امامت کو پہنچے وہ قصار تھے جو
وہ قطب زماں ٹھہرے عطار تھے جو بنے مرجع خلق نجار تھے جو
ابوالفضل یاں اٹھے سراج کتنے
ابوالوقت ہو گذرے حلاج کتنے

حالیؔ مسلمانوں کے ذہنوں سے جھوٹی شان اور جاگیرداری آن بان دور کرنے کی کوشش میں تھے۔ ان کا سراسر کلام اس کا گواہ ہے۔ بچوں کی نظموں میں ایک مثالی نظم ہے جس میں بچہ ماں سے کہتا ہے کہ میں کسان بنوں گا، دھوبی بنوں گا، کوئی کہتا ہے بڑھئی، ڈاکیہ، موچی وغیرہ بنوں گا۔ رزق حلال کماؤں گا۔ جاگیرداری فکر میں ان کاموں کی طرف رخ کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا وہ چوری بد معاشی اور بھیک مانگنے کو ان کاموں پر ترجیح دیتے تھے۔

حالیؔ نے مسدس میں اس گروہ اور جماعت کی نشان دہی کی ہے جن کی بدولت کچھ زندگی اور روشنی باقی ہے۔

حالیؔ کی تمام امیدیں اور حسرتیں ان سے ہیں جن کے بارے میں کہتے ہیں:

مگر اک فریق اور ان کے سوا ہے — شرف جس سے نوع بشر کو ملا ہے
ہوئے جو کہ پیدا ہیں محنت کی خاطر — بنے ہیں زمانے کی خدمت کی خاطر
وہ تھکتے ہیں اور چین پاتی ہے دنیا — کماتے ہیں وہ اور کھاتی ہے دنیا
یہ چلتی ہے گاڑی انہیں کے سہارے — جو وہ کل سے بیٹھیں تو بے کل ہوں سارے
گھلاتے ہیں محنت میں جسم و رواں کو — وہ مر مر کے رکھتے ہیں زندہ جہاں کو
بس اس طرح جینا عبادت ہے ان کی — اور اس دھن میں مرنا شہادت ہے ان کی
کسی پر چلے تیر آماج یہ ہیں — لٹے کوئی رہ گیر تاراج یہ ہیں
بھروسے پہ اپنے دل و دست و پا کے — سمجھتے ہیں ساتھ اپنے لشکر خدا کے
انہیں پر ہے کچھ فخر ہے گر کسی کو — انہیں سے ہے گر شرف آدمی کو
دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی — انہیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی

مسدس پر اکابرین کے تاثرات

سرسید احمد خان:

’’یہ کہنا بالکل مناسب ہوگا کہ اس کتاب نے ہماری صنف نظم میں ایک دور پیدا کر دیا اس عبارت کی خوبی اور صفائی اور روانی کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ امر کچھ کم تعجب خیز نہیں کہ اتنا مہتم بالشان مضمون اس قدر واقعیت کی پابندی کے ساتھ اور بلا اغراق و مبالغہ اور تمثیل و استعارہ کے جو کہ ہماری شاعری کی جان اور شاعروں کا ایمان ہے اور پھر اس قدر موثر اور سلیس اور فصیح طریقہ سے بیان کیا جائے۔ اس کے بہت سے بند تو ایسے ہیں کہ ان کو پڑھ کر سخت سے سخت دل کے لوگ بھی بغیر آنسو بہائے نہیں رہ سکتے۔ کیوں نہ ہو جو چیز دل سے نکلتی ہے وہ ضرور دل میں گھر کرتی ہے۔‘‘

سرسید علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں لکھتے ہیں: ’’حالؔی سے ہم نے کہا: اے میرے مخدوم خدا نے تم کو زبان دی ہے۔ معجز بیان دی ہے۔ لِلّٰہ اپنی قوم کے حال پر روؤ۔ قوم کی جو تباہ حالت ہے اُس پر مثل قرطبہ کے مرثیہ لکھ دو۔‘‘

سچ تو یہ ہے کہ مسدس میں حالی مسلمانوں کی حالت پر خود بھی روئے اور

دوسروں کو بھی رلایا۔ سرسید مسدس کی اسٹیج کیفیت کے بارے میں اپنے سفر نامے پنجاب مورخہ 1886ء میں لکھتے ہیں: ''امرتسر کے مسلمانوں نے ایک تھیٹر کا منظر پیش کیا جس کا پردہ اٹھنے پر ایک کشتی جس کے لوگ سو رہے تھے طوفان میں جکڑ چکے تھے اور وہ ڈوب رہے تھے۔ وہاں حالؔی کے مسدس کے بند کوئی پڑھ رہا تھا اور لوگ رو رہے تھے۔''

سرسید حالؔی کو خط لکھتے ہیں۔ جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہوگا...... متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ بے شک میں اس کا محرک ہوں اور اس کو میں ان اعمال حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالؔی سے مسدس لکھوا لایا ہوں اور کچھ نہیں۔

شیخ محمد اکرام:

مسدس میں حالؔی کے آنسو خالص آبِ حیات کے چھینٹے تھے دل سے نکلے ہوئے۔

علامہ اقبالؔ:

آں لالہ صحرا کہ خزاں دید و بیفرد
سید دیگری او رانمی از اشک سحر داد
حالؔی ز نواہاے جگر سوز نیا سود
تا لالہ شبنم زدہ را داغ جگر داد

یعنی وہ دشت کا لالۂ جو خزاں زدہ اور پژ مردہ تھا۔ ایک سید (احمد خان) نے اشکِ سحر گاہی سے اس کو تازہ کیا۔ حالیؔ (الطاف حسین) نے اپنے جگر جلانے والے نغموں کو مسلسل اُس وقت تک جاری رکھا جب تک کہ اس لالۂ تر پر داغ کا نشان بن جائے۔

اقبالؔ کی زبان میں حالیؔ ''میر کارواں'' ہے کیونکہ اس کی ذات میں وہ تینوں اوصاف موجود ہیں جو موصوف نے اپنے اس شعر میں لازم قرار دیئے ہیں

نگہ بلند ، سخن دل نواز جاں پر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

سید سلیمان ندوی:

ہماری زبان کی نظم و نثر میں جو کتابیں لکھی گئیں اُن میں قبول عام اور حیات دوام اگر کسی کو نصیب ہوئی تو وہ مولانا حالی کا مسدس ہے۔ قبول عام کا حال یہ ہے کہ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک اور جاہلوں سے لے کر عالموں اور واعظوں تک اس کے بند کے بند پڑھے ہوئے ہیں۔

مسدس کی اس قبولیت پر تعجب اس لیے آتا ہے کہ شاعر کی طرف سے جیسا کہ خود اُس نے کہا ہے مذہبی حلقوں میں کافی بدگمانی تھی۔ مسدس میں بے عمل اور جامد علما کی دھجیاں بکھیری گئی تھیں، جُھوٹے پیروں اور مشائخوں کی برائیاں بتائی گئی تھیں، عیش پرست اور نکمے امیروں کا خاکہ اُڑایا گیا تھا، جھوٹے خوشامدی شاعروں کی ہجو کی گئی تھی، عام مسلمانوں کے مشرکوں جیسے خیالات کو برا کہہ کر اُن کے دل دُکھائے گئے تھے۔ غرض قوم کا وہ کون سا طبقہ تھا، جس کے لیے حالی کے یہ دل دوز طعنے دل پسند ہو سکتے تھے، چنانچہ اس مسدس کا نکلنا تھا کہ مذہبی شاعروں نے اس کا جواب لکھا، ادبی شاعروں

نے اس کی زبان اور شاعری پر لے دے کی، کافرگروں نے اس کے بعض مضامین کی بنا پر فتوے مرتب کیے، عام مسلمانوں نے اس کے چبھتے ہوئے نشتروں پر شور وغل کیا، مگر بادِمخالف کے یہ جھونکے سچائی کے اس پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکے۔ سچی بات دل میں اترتی چلی گئی، اور اُس کی تاثیر رگ رگ میں پھیلتی گئی۔ کل جو نفریں کرتے تھے وہ تحسین کرنے لگے، جو اسلام کے لیے اس کو کبھی زہر قاتل کہتے تھے، وہ آبِ حیات کہنے لگے۔ غور کے قابل یہ بات ہے کہ مسدس کی اس مقبولیت اور پسندیدگی کا راز کیا ہے۔

مسدس میں شاعر نے اس عظیم الشان قوم کے حادثہ موت کے اسباب اس تفصیل سے بیان کیے تھے جن کو سن کر اُن بے خبروں کو دفعتاً 1857ء کے حادثہ خونیں کے وقت ہی سب سے پہلے اس موت کا حال معلوم ہوا، اس حسرت ناک انجام پر سخت حیرت تھی۔ شاعر نے موت کے طبعی اسباب سنا کر اُن کی حیرت کو دُور کیا، اور بتایا کہ ان اسباب کے موجود ہوتے ہوئے موت نہیں زندگی تعجب انگیز تھی۔

مسدس میں قوم کی غیرتی رگ کو حرکت میں لانے کے لیے اسلام اور مسلمانوں کی قومی تاریخ کے پُرفخر کارناموں کو شاید سب سے پہلی دفعہ اس طرز و اسلوب سے اس ملک میں بیان کیا گیا تھا، رونے کی تسکین کے ساتھ اس کتاب میں مسلمانوں کے فخر وغرور کا سامان بھی تھا۔ اس نشہ نے بھی لوگوں کو اس مسدس کے پڑھنے کا چسکا لگایا۔ عرب کی حالت، رحمت عالم کی بعثت، قرآن کی تاثیر، اسلام کا شکوہ، فتوحات کی وسعت، علوم وفنون کی ترقی، علما اور حکما کا کمال، تعمیر بلاد، سیر و سیاحت، اور بغداد و اندلس کے قابل فخر آثار، اس خوبصورتی اور خوبی کے ساتھ اس میں نظم کیے گئے تھے کہ مسلمانوں کو فقیری میں بادشاہی کا مزہ آ گیا، اُن کے جھکے ہوئے سر غرور سے اونچے ہونے لگے، اور گذشتہ دورِ عظمت کی کہانی اس پستی اور تنزل میں اُن کو تسکین و تسلی کا سرمایہ معلوم ہونے لگی۔

''عرب، ہند، مصر، اندلس، شام و دیلم'' ہر جگہ کی کہانی مسدس کی زبانی مسلمانوں نے سنی، اور اس سینما میں اُن کو بغداد کا حریم خلافت اندلس کا بیت حمرا، غرناطہ کی شوکت، بلنسیّہ کی عظمت، اشبیلیہ کے محراب و در، اور قرطبہ کے ٹوٹے پھوٹے کھنڈر، سنجار اور کوفے کے میدان اور سمرقند، مراغہ اور قاسیون کے رصد خانے سب نظر آنے لگے، پڑھنے والے پر عجب کیفیت طاری ہوتی، کبھی روتا اور کبھی ہنستا، اور ان دونوں کیفیتوں سے ہر گھڑی دل میں نئی لذت پاتا۔

غم اور فخر کے سرمایہ کے ساتھ اس عجیب و غریب کتاب میں موجودہ حالت کا احساس پیدا کر کے آیندہ کی فکر کا سامان بھی تھا۔ مسلمانوں کے ہر طبقہ کے عیوب اور کمزوریوں کا راز فاش کر کے اس کے سامنے اپنی حالت کے سدھارنے کا خاکہ بھی کھینچا گیا تھا، احساس کے نشتر سے زخم کے فاسد مادوں کے نکالنے کے بعد اُن کی مرہم پٹی بھی کی گئی تھی، اس لیے مسلمانوں میں اس کے ذریعہ جس کو تنزل کا احساس ہوا ترقی کی فکر بھی پیدا ہوئی۔

غرض مسدس قوم کی تیرہ سو برس کی حالت و کیفیت کا ایک آئینہ تھا، جس میں اُس کے چہرہ کا ایک ایک خط و خال نمایاں تھا۔ اُس کی پیدائش، اُس کا نمو، اُس کی جوانی، اُس کا بڑھاپا، اُس کی بیماری، اُس کے عوارض، اُس کی کمزوری ہر چیز اس میں نظر آ رہی تھی، اس لیے ہر مسلمان کو جس میں ذرا بھی حسّ تھی، اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھنے کا شوق تھا۔

اُس شاعری میں جو صرف تفریح طبع کا سامان رہ گئی تھی، اور جس میں گل و بلبل کی حکایت، حسن و عشق کی روایت اور رقیب سیہ رو اور فلک پیر کی شکایت کے سوا کچھ اور نہ تھا، شاعر نے اپنی مسیحا نفسی سے ایک عظیم الشان قومی انقلاب کی تاثیر کی روح پھونک دی۔ لفظ سیدھے سادے، ترکیبیں بے تکلف، معنی مبالغہ سے خالی، مصرع تشبیہ و

استعارہ سے پاک، مگر ہر شعر جوشِ بیان سے لبریز، وفورِ احساس سے معمور، اور درد وغم سے بھرا ہوا۔

اس نظم کے لیے نکتہ شناس شاعر نے مسدس کا رنگ اختیار کیا۔ مسدس اُس زمانہ میں واسوخت کے لیے پھر اہل بیت کرام کے دل دوز مصائب اور شہید کربلا کے دل فگار سوانح کے بیان کے لیے یک گونہ مخصوص ہوکر غم والم کی داستاں سرائی کے لیے خاص ہو چکا تھا۔ اس لیے شاعر کو جب اپنی قوم کے زہرہ گداز ماتم کا خیال آیا، تو اس مسدس سے زیادہ موزوں اور بہتر نظم کی کوئی صنف نظر نہیں آئی، جس کا وزن ہی گویا درد وغم اور نالہ و ماتم کی لے بن چکا تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ اس نظم کے پر اثر ہونے کے لیے ضرورت تھی کہ اس کے ہر ٹکڑے میں قابل بیان واقعہ ادا ہو جائے، مثنوی اس کے لیے موزوں نہ تھی، کہ اوّل تو وہ رزم وبزم کی حکایت کے لیے خاص ہو چکی تھی، اور پھر اُس میں اتنی سمائی نہیں ہوسکتی تھی، کہ اُس کے ایک ایک شعر میں تاریخ وسیر کا ایک ایک واقعہ ادا ہو جاتا۔ مسدس کی یہ صورت ہے کہ اس کا ایک ایک بند گویا کتاب کا ایک ایک مختصر باب یا تحریر کا ایک ایک پیرا گراف ہوتا ہے جس میں ایک ایک واقعہ الگ الگ ادا ہوتا جاتا ہے نظم کی رفتار پہلے مصرع میں تمہید، دوسرے تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں واقعہ کی تفصیل اور پانچویں اور چھٹے میں نتیجہ کی تاثیر بنتی جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کہاں سے چیز شروع ہوئی، کہاں تک اوپر چڑھی اور پھر کہاں سے نیچے اُتری۔ ہر نئے بند کے شروع اور خاتمہ پر سامع کا نفس تبدیل ذائقہ اور تجدید احساس کے لیے مستعد اور تیار رہتا ہے۔

اس سادگی اور بے تکلفی کے باوجود مسدس کی نظم میں ایسی سلاست، روانی اور برجستگی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی صاف وشفاف نہر کسی ہموار اترائی میں آہستگی سے

بہتی چلی جا رہی ہے نہ کہیں رُکاوٹ ہے، نہ لفظ میں گرانی ہے نہ قافیہ کی تنگی ہے۔ زبان میں گھلاوٹ، بیان میں حلاوت، لفظوں میں فصاحت اور ترکیبوں میں لطافت ہے، ہماری زبان میں سہل ممتنع کی یہ بہترین مثال ہے۔

شاعر کی طبیعت نہایت گداز تھی، وہ ازل سے درد مند دل لے کر آیا تھا، اُس کا مزاج سدا کا اُداس تھا، وہ عالم کی نیرنگی، زمانہ کی ناسازگاری اور پھر اپنی قوم کی پستی کے منظر دیکھ کر خود بھی اکثر روتا تھا اور دوسروں کو بھی رُلاتا تھا، وہ جب روتا تھا، اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا تھا، کہ دیکھنے والے دیکھنے کی اور سننے والے سننے کی تاب نہیں لا سکتے تھے، مصنف کے سارے مرثیے خواہ وہ شخصی حیثیت سے لکھے گئے ہوں، یا قومی، اسی قدر پر اثر اور کیف غم سے لبریز ہیں، اس انداز کا شاعر جب ملت مرحومہ کے گذشتہ اقبال اور برباد شدہ جاہ و جلال کا سوگ منائے گا تو ظاہر ہے کہ اُس کے قلم کی ہر بوند آنسو کا ایک قطرہ، اور اُس کے لب کی ہر صدا فریاد کی ایک لے کیونکر نہ بن جائے گی۔

شاعر کو اپنی اس طبیعت کا کافی احساس تھا، دیباچہ اور ضمیمہ دونوں میں بار بار اُس کا یہ اقرار چھلکا پڑتا ہے، اس لیے مسدس کا اصلی حصہ جو 1296ء میں لکھا گیا تھا ایسے اشعار پر ختم ہوا تھا، جو سر تا پا یاس اور نا امیدی سے بھرے تھے۔

ضمیمہ:

شاعر کو خود بھی خیال ہوا، اور دوسرے اصحاب نظر کے کہنے سے بھی معلوم ہوا کہ کسی ایسی کتاب کا جو قوم کو غیرت دلانے اور اُس کے احساسِ عمل کو جگانے کے لیے لکھی گئی ہو، ایسے دل شکن اور حوصلہ فرسا اشعار پر ختم کرنا ہمیشہ کے لیے اُس کی امیدوں کو منقطع اور اُس کے حوصلوں کو پست کر دینا ہے۔ چنانچہ چھے برس کے بعد 1303ھ میں شاعر نے اُس کا ضمیمہ لکھا اور چاہا کہ اپنی اُداس طبیعت کو اُبھار کر نوحہ

خوانی کے بجائے کچھ رجز خوانی کا فرض انجام دے۔ مگر انداز طبیعت اور دلی یقین کے خلاف کوئی بات بنانا مشکل ہے، اس لیے اس ضمیمہ کی صورت بالکل ایسی ہے جیسے کوئی غموں کا مارا ماتم گسار اپنے دوسرے غم زدہ عزیزوں کو تسکین دینے بیٹھے۔ وہ بار بار اپنے آنسوؤں کو پیتا ہے اپنے چہرہ کو مطمئن بناتا ہے اور دوسروں کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو اپنے بھیگے رومال سے پونچھتا اور صبر کی تلقین کرتا ہے اور پھر منھ پھیر کر اُن عزیزوں کی آنکھوں کو بچا کر اُسی رومال سے اپنے آنسوؤں کے قطروں کو بھی پونچھ لیتا ہے۔

اس ضمیمہ کی روانی اور فصاحت کا بھی وہی عالم ہے مگر ہر بند پر صاف نظر آتا ہے کہ مصنف وقت کی مصلحت اور طبیعت کے اقتضا کی کشمکش میں مبتلا ہے اور اسی کشمکش میں اُس سے جہاں تک بن پڑتا ہے وہ اپنی قوم کے دل اُبھارنے، ہمت بڑھانے، اور ترقی کے گُر بتانے میں نئے نئے اسلوب پیدا کرتا ہے اور طرح طرح سے سمجھاتا ہے۔

مسلمانوں کے علوم وفنون کی تاریخ اور ترقیوں کا یہ پہلا نقشہ تھا، جس کو مولانا حالی نے اپنے موے قلم سے تیار کیا تھا، بڑے بڑے تاریخی واقعات اور قابل فخر کارناموں کو جس طرح چند مصرعوں میں کھپا کر انہوں نے بیان کر دیا، وہ آج بھی بے نظیر ہے۔

نظم کے ساتھ مقدمہ اور دیباچہ کی نثر بھی اپنی سلاست اور فصاحت کے لحاظ سے ہماری زبان کے ادب کا اتنا بلند نمونہ ہے، جس کی پیروی آج تک نہ ہوسکی۔

عبدالماجد دریابادی:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے ہے جو بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر ملک جس سے شرماتے ہیں آسمان پر

اکبر واقبال کے دور سے قبل، اپنے شعر وتغزل کے وصف، آپ نے شاعر ہی کی

زبان سے سن لیے؟ اپنی دو قرن قبل والی شاعری کا عکس آپ نے خود شاعر ہی کے آئینہ میں دیکھ لیا؟...... کیا اب اس کی بھی حاجت ہے کہ اُس ناپاک دفتر، کے کچھ اوراق، بطور نمونہ، آپ کی خدمت میں پیش کیے جائیں؟ گویا دن دوپہر کی کڑی دھوپ کے وقت اس کی بھی حاجت ہوتی ہے کہ پہلے صغریٰ و کبریٰ، قائم ہولیں اور انتاج مقدمات کی باضابطہ شکل مرتب ہولے، جب جا کر آفتاب کے روشن ہونے کا یقین آئے؟

اصل سوال یہ ہے کہ اس آن کا، اور اس شان کا اس جمال کا اور اس کمال کا، اُردو میں کوئی اور مسدس ہے بھی؟ جب اپنے 'آج' کی پستیاں دکھانے پر آتا ہے تو دیکھیے، کیسے کیسے پردے کھول کر رکھ دیتا ہے:

کسی کو کبوتر اُڑانے کی لت ہے — کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی — مدک اور چانڈو کا رسیا ہے کوئی
نہ گالی سے دشنام سے جی چرائیں — نہ جوتی سے پیزار سے ہچکچائیں
جو میلوں میں جائیں تو لچپن دکھائیں — جو محفل میں بیٹھیں تو فتنے اُٹھائیں
لرزتے ہیں اوباش اُن کی ہنسی سے — گریزاں ہیں رند اُن کی ہمسائیگی سے

اور جب اپنے گزرے ہوئے 'کل' کی بلندیوں کی تاریخ سنانے لگتا ہے تو اک دم ناصح ملامت گر سے شاعر رجز خواں بن جاتا ہے

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحیٰ کے اُٹھی — پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دُور دُور اُس کی پہنچی — جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اُس سے محروم آبی نہ خاکی — ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی
کیا جا کے آباد ہر ملک ویراں — مہیا کیے سب کی راحت کے ساماں
خطرناک تھے جو پہاڑ اور بیاباں — اُنہیں کر دیا رشک صحنِ گلستاں
بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے — یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

خامیوں سے کون سی بشری تالیف آج تک بچ سکی ہے؟ کون سی آیندہ بچ سکے گی؟ نکتہ چینی پر کوئی آجائے تو عیب کہاں نہیں نکل سکتا؟ تو اس معیار کو تو خیر جانے ہی دیجیے حق وانصاف کی طرف آیئے تو خدا لگتی بات یہ ہے کہ مسدس اپنا کام مدت ہوئی؛ کر چکا۔ احساس کی بیداری جو اُس کا مقصد تھا، اُس میں وہ مدتیں گزریں، کامیاب ہو چکا، اکبر اور پھر اقبال جیسے سعید جانشین پیدا کر چکا۔ اس کے بعد مٹ گیا ہوتا۔ دُنیا اُسے بھول گئی ہوتی، جب بھی یہ اُس کی منفعت نہ تھی، عین فطرت کا تقاضا ہوتا۔

ضرورتِ دعوت پوری ہو چکنے کے بعد داعی کو باقی رکھنا، سنت الٰہیہ میں داخل ہی کہاں ہے؟......لیکن جب کوئی اپنی بخششوں کو بغیر حساب اور بغیر شمار لٹانے والا، محض فضل اور محض انعام پر آجائے تو کیا کوئی اس کا ہاتھ پکڑ سکتا ہے؟ جس کو جتنی چاہے دولتِ حیات سے سرفراز کر دے۔

عبدالرحمن خان شیروانی:

ہندوستان میں مسلمانوں کا دورِ جدید جن اسباب انقلاب کا منت پذیر ہے ان میں مسدس حالی بھی ہے مجھ کو وہ وقت خوب یاد ہے جب یہ مشہور مسدس پہلی بار شائع ہو اتھا مدح و ذم کا ایک طوفان اُٹھا۔ مداحین میں مرحوم سرسید بھی تھے۔ اُنہوں نے مدح اس بلند آہنگی سے کی۔ قیامت میں جب خدا تعالیٰ مجھ سے پوچھے گا کہ ہمارے واسطے کیا لایا تو میں کہوں گا مسدس حالی۔ مخالف دو گروہ تھے۔ ایک قدامت کے شیدائی جن میں مذہبی خیال والے بھی شامل تھے۔ دوسرے لکیر کے فقیر شعرا۔ مسدس میں جن بے با کی سے ہم عصر مذہبی و معاشرتی طبقات پر جرح کی گئی تھی اس نے احساس مخالفت کو مشتعل کر دیا تھا خصوصاً مذہبی احساس کو۔ شعرا کو شکوہ تھا کہ مسدس کے قوافی وغیرہ میں ناموس شاعری کی اہانت کی گئی ہے۔ مخالفت کے لیے جب نثر کا میدان تنگ ہو گیا تو نظم

کی باری آئی۔ مسدس کے جواب میں متعدد مسدس لکھے گئے جن میں ایک میں ''مسدس خالی'' بھی تھا۔ جہاں یہ سب کچھ ہوتا رہا وہاں حالی کا اخلاص بھی اپنا کام کرتا رہا بہت سے بند دلوں پر نقش ہو گئے، زبانوں پر چڑھ گئے، لوگ ان بندوں کو پڑھتے تھے اور سر دھنتے تھے، خصوصاً عروج و زوال مسلم کے بند یا وہ بند جن میں اندلس کا نوحہ ہے۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ اندلس سے یہاں کے مسلمان اسی جادو اثر کلام کی بدولت واقف ہوئے۔ ایک ''جنٹلمین'' جو شاید ہی کبھی شعر پڑھتے ہوں مسدس کے یہ بند ترنّم سے پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے

کچھ ہی زمانہ گزرا کہ مخالفت کی آندھی چھٹ گئی۔ اہل نظر نے دیکھا کہ مسدس اپنی جگہ پر ہے۔ ہوا صاف ہونے پر اُس کی مقبولیت بڑھی ان دلوں پر حاوی ہوئی جو حالی کا تصور بھی شاید داخل معصیت سمجھتے ہوں۔ ذکر مبارک کی مجلسوں میں مشائخ وعلما کو نعتیہ بندوں پر وجد کرتے دیکھا

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

اُردو میں ایسا دلوں کو گرمانے والا نعتیہ کلام زیادہ نہیں ملے گا۔

خوبیوں کے ساتھ مسدس میں کمزوریاں بھی ہیں، خصوصاً جہاں سرسید کے وقتی خیالات کا اثر گہرا ہے۔

مولوی عبدالحق:

پچاس برس سے زیادہ ہوتے ہیں۔ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا۔ میرے ایک ماموں فیروز پور (پنجاب) میں ملازم تھے اور فیروز پور سے قریب ایک گاؤں میں بس گئے تھے۔ یہ گاؤں انہیں کا تھا اور وہاں کے سب سے بڑے آدمی یہی تھے۔ انہوں

نے اپنے بیٹے کے ختنے کیے اور اس رسم میں اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کو مدعو کیا۔ یہ جشن بڑی دھوم دھام سے دو تین روز تک رہا۔ دوسرے دن کا ذکر ہے صبح کا وقت تھا، میدان میں بہت بڑا شامیانہ تنا ہوا تھا، اور اُس میں لوگ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے بلکہ مجمع شامیانے سے باہر دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں زیادہ تر اُس گاؤں اور آس پاس کے گاؤں کے کسان اور مزدور تھے۔ اتنے میں ایک طوائف اٹھی۔ یہ لاہور سے بلائی گئی تھی۔ نام میں اس وقت بھول گیا ہوں۔ یہ اچھی پڑھی لکھی عورت تھی، شعر بھی کہتی تھی اور اُس کی غزلیں لاہور کے اخباروں میں چھپا کرتی تھیں، اُس نے کھڑے ہو کر مجمع پر ایک نظر ڈالی اور یک بارگی مسدس (حالی) گانا شروع کیا

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا
مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا

جب تک وہ گاتی رہی، سناٹے کا عالم رہا۔ کچھ لوگ جھوم رہے تھے اور کچھ آبدیدہ تھے۔ وہ سماں اب تک میری نظروں کے سامنے ہے اور وہ گانا اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔

اب بھی جب کبھی میں مسدس حالی پڑھتا ہوں تو یہ سماں میری آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اِن اَن پڑھ اُجڈ گنواروں پر اس قدر اثر کیا کہ وہ آبدیدہ ہو گئے؟

ہندوستان میں ہر چیز آ کر ذات بن جاتی ہے۔ ہماری شاعری کی بھی خاص ذات تھی۔ وہ مخصوص طبقے اور خاص لوگوں کے خیالات کے اظہار کا ذریعہ تھی اور وہی اُس کے نکات سمجھ سکتے اور اُس کا لطف اُٹھا سکتے تھے۔ جو ذات سے باہر تھے وہ اکثر اس سے محروم رہتے تھے۔ حالی نے ذات پات کا یہ جھگڑا بالکل اُٹھا دیا اور اُس نے اپنا دردِ دل اُس زبان میں سنایا جسے اکثر لوگ بولتے اور سمجھتے ہیں۔ اسی لیے وہ برادری سے

خارج کر دیا گیا۔ شعر یا موسیقی ہے کیا؟ یہی نہ کہ ہم الفاظ یا آواز کے ذریعہ سے اپنے جذبات کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں اور لوگ اُسے پڑھ کر یا سن کر محظوظ ہوتے ہیں۔ دُکھ سے دکھی اور سکھ سے سکھی ہوتے ہیں۔ کیا کسانوں اور گنواروں کے دل نہیں ہوتا؟ کیا اُن میں عشق ومحبت کا مادہ نہیں؟ کیا وہ دُکھ درد کا احساس نہیں رکھتے؟ کیا اُن میں ہمدردی اور ایثار نہیں ہوتا؟ رستم کی داستان یا حاتم طائی کا قصہ پڑھ کر سنایئے اور پھر اُن کے جوش اور ہمدردی کو دیکھیے لیلیٰ مجنوں کا ڈراما کیجیے اور پھر دیکھیے کہ اُن کے دلوں پر کیا گزرتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی اُن کے گیت سنے ہیں؟ کیا چیز ہے جو اُن میں نہیں ہے۔ شجاعت، عشق ومحبت، ہمدردی، عصمت وعفت، غیرت، ظرافت سبھی کچھ ہے۔ پھر کیا وجہ کہ آپ یہی چیزیں بیان کریں اور وہ نہ سمجھیں شرط یہ ہے کہ آپ کی زبان تکلفات لا یعنی سے پاک ہو۔ اعلیٰ شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ لوگ لطف حاصل کر سکیں۔

مسدس اس کسوٹی پر پورا اُترا، ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ بار بار چھپا اور اتنی بار چھپا کہ شاید ہی کوئی دوسری کتاب چھپی ہو اور ہر طبقے میں مقبول ہوا۔

اس کی روانی حیرت انگیز ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دریا اُمڈا چلا آ رہا ہے۔ شروع سے آخر تک ایک عجیب تسلسل ہے جس کا تار کہیں نہیں ٹوٹتا اور پڑھنے والے کو ایک لمحہ کے لیے بھی کہیں رُکنے کی نوبت نہیں آتی۔ جوش کی وہ فراوانی ہے گویا ایک چشمہ اُبل رہا ہے۔ باوجود ادبی خوبیوں کے سادگی کا یہ عالم ہے کہ اُس پر ہزار صنائع بدائع ظاہر سے قطع نظر کر کے باطن کو دیکھیے تو ایسی پُر جوش، ایسی عبرت انگیز اور سبق آموز اور دلوں کو اُبھارنے اور غیرت دلانے والی نظم ہماری کسی زبان میں نہیں مدو جزر اس کا بہت ہی صحیح نام ہے۔ شعر کی نسبت جو یہ کہا گیا ہے کہ اُسے حقیقت یعنی زندگی اور واقعات زندگی سے وابستہ ہونا چاہیے وہ اس پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ یہ مسدس

ہماری قومی زندگی کا کامل مرقع ہے جس میں ہمارے خط و خال صاف صاف نظر آتے ہیں۔ پھر حُسنِ بیان نے اُسے معراجِ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ جہاں آئیں اُخوت، ہمدردی، اتفاق، خودداری، حب وطن، جفاکشی، بے تعصبی وغیرہ سبق دیتے ہیں وہاں تیز نشتر بھی ہیں جو جگر کے پار ہو جاتے ہیں۔لیکن یہ نشتر غم گسار سرجن کے ہیں نہ کہ بے درد و بد اندیش کے۔

مسدس حالی زندہ جاوید کتابوں میں سے ہے اس کی درد بھری آواز ہمیشہ دلوں کو تڑپاتی رہے گی اور اس کے دردمندانہ اقوال دلوں میں گھر کیے بغیر نہ رہیں گے۔ ادب کے رسیا اس سے ادبیت کے گر سیکھیں گے اور اخلاق کے بندے اس میں وہ بے بہا جواہر پائیں گے جن سے دوسری کانیں خالی ہیں۔ ہزاروں خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ اُس کی بنیاد صداقت پر ہے۔ ادب میں حسن و خوبی کا آخری معیار صداقت یا حقیقت ہے۔

سید سر راس مسعود:

خواجہ الطاف حسین حالؔی اُن چند بزرگوں میں سے ہیں جن کا اثر میرے قلب و دماغ کے ہر رگ و ریشے نے قبول کیا ہے۔ جب کبھی اُن کا خیال آتا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے دو تصویریں پھر جاتی ہیں جن کا تعلق میرے بچپن کے زمانے سے ہے۔

ایک تصویر جو دکھائی دیتی ہے یہ ہے کہ علی گڑھ میں جون کا مہینہ ہے اور ہمارے غریب خانے میں خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی ہیں اور اس نیم تاریکی میں جہاں خس کی خوشبو کے ساتھ تمباکو کی خوشبو بھی ملی ہوئی ہے؛ مولانا مرحوم اور میرے والد ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں اور شعر و شاعری پر گھنٹوں سے گفتگو ہو رہی ہے۔ مولانا شرافت کی مجسم تصویر

بنے ہوئے ہیں۔ ہر ادا سے بلند خیالی اور میرے والد کے ساتھ سچی محبت ٹپکتی ہے۔ دونوں گفتگو میں اس قدر غرق ہیں گویا اس دنیا کو چھوڑ کر کسی اور دنیا میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

دوسری تصویر جو میری آنکھوں کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ رات کا وقت ہے کھانے کی میز لگی ہوئی ہے۔ ایک سرے پر میرے دادا مرحوم بیٹھے ہوئے ہیں اور اُن کی داہنی جانب مولانا الطاف حسین مرحوم اور بائیں طرف میرے والد، قومی معاملات پر پُر جوش گفتگو ہو رہی ہے۔ چند لمحوں کے لیے باتیں بند ہوتی ہیں اور میرے والد کے منھ سے یہ فقرہ نکلتا ہے۔ ’’ابا جانی! اگر خدا مجھ سے کبھی یہ سوال کرے کہ میرے جتنے بندوں سے تو ملا ہے اُن میں سے کون ایسا ہے جس کی پرستش کرنے کے لیے تیرا دل تیار ہو جائے تو میرے پاس جواب حاضر ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ شخص الطاف حسین حالیؔ ہے۔‘‘ میں دور کھڑا ہوا اس فقرے کو سنتا ہوں اور مجھ کو اکیلا کھڑا ہوا دیکھ کر میرے والد اشارہ کرتے ہیں کہ اُن کے قریب آؤں اور پھر حکم دیتے ہیں کہ ’’جا الطاف حسین صاحب کے پاس کھڑا ہو جا!‘‘ میں اس حکم کو بجا لاتا ہوں الطاف حسین صاحب کمال شفقت سے مجھے سینے سے لگاتے اور پیار کرتے ہیں اس وقت میری عمر سات سال کی ہے۔ اس کے بعد میں زنانے میں اپنی والدہ کے پاس جاتا ہوں اور اُن سے پوچھتا ہوں کہ ’’یہ کون صاحب ہیں جن کی پرستش کرنے کے لیے میرے والد صاحب تیار ہیں اور جنھوں نے مجھے پیار کیا ہے۔‘‘ اس سوال کا جو مجھے جواب ملتا ہے اُس سے پہلی دفعہ مولانا مرحوم کی عظمت کا بیج میرے دل میں بویا جاتا ہے اور جب کبھی میں اُن کو دیکھتا ہوں تو اپنے دل میں کہتا ہوں کہ یہ انسان نہیں فرشتہ ہیں، باوجود اس کے کہ اب میری عمر تقریباً پچاس سال کی ہو گئی ہے میرے دل میں وہی عظمت ان کی ہے اور وہی محبت ان سے قائم ہے جو بچپن میں تھی۔

میرا عقیدہ ہے کہ اگر مولانا حالی مرحوم وہ بیش بہا ادبی خدمت اردو کی نہ کرتے جو انہوں نے کی، تو جہاں تک ہماری شاعری کا تعلق ہے وہ ختم ہو جاتی اور ہمارے پاس کوئی ایسی چیز موجود نہ ہوتی جس کو اپنے ہاتھ میں لے کر ہم یورپ کی شاعری کا مقابلہ کر سکتے۔ مسدس ہی میں چند بند ایسے ہیں جن سے بہتر یورپ کی کسی قوم کے ادب میں آج تک کوئی چیز نہیں لکھی گئی۔ میرا اشارہ اُس حصے کی طرف ہے جہاں بغداد کے عروج کو بیان کر کے اُس کا زوال دکھایا گیا ہے۔ جب تک کہ اس دنیا میں ہماری مادری زبان رائج ہے، الطاف حسین حالی کا نام مٹ نہیں سکتا اور نہ اُس اثر میں کمی واقع ہوسکتی ہے جو اُن کے ذریعہ سے ہمارے ادب پر پڑا ہے۔ مولانا مرحوم کی نثر بھی لا جواب ہے اور نظم بھی؛ دونوں میں وہ سادگی پائی جاتی ہے جو ہمیشہ سچے جذبات کی بہترین نشانی ہے۔

خواجہ غلام السیدین:

چیست انسانی تپیدن از تپ ہمسایگاں　　از سمومِ نجد درباغِ عدن پژماں شدن

اچھا شاعر ہونے کے لیے یہ 'انسانیت' ضروری ہے اور نجد وعدن کا امتیاز مٹانا لازم۔ حالی کو حساس اور درد آشنا دل ملا تھا اور حق پسندی اور حق گوئی کا جوہر عطا ہوا تھا۔ تربیت نے دین داری کو ان کی طبیعت میں راسخ کر دیا تھا۔ جب انہوں نے ہوش سنبھالا اور اپنے ماحول پر نظر ڈالی تو ایک عبرت خیز اور دردناک نقشہ نظر آیا۔ انہوں نے خود اس منظر کو ان الفاظ میں دکھایا ہے۔

''قوم کی حالت تباہ ہے عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصّب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی

ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ اُمرا جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، غافل اور بے پروا ہیں۔ علماء جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔''

یہی نقشہ تھا جس کو حالی کے خوں چکاں قلم نے مسدس میں اس طرح کھینچا ہے۔

پھر اک باغ دیکھے گا اُجڑا سرا سر جہاں خاک اُڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر
نہیں پُھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں زہر کا کام کرتا تھا باراں جہاں آ کے دیتا تھا رو ابرِ نسیاں
تردد سے جو اور ہوتا تھا ویراں نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں
یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

کیا حالی کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ ملت اسلامیہ کے اس اجڑے باغ کا نظارہ دیکھنے کے بعد گل وبلبل کی شاعری میں نازک خیالیاں دکھاتے؟ بے شک ایسے شعرائے کرام بھی اس زمانے میں گذرے جن کے پاس آنکھیں تھیں، لیکن انہوں نے دیکھا نہیں، کان تھے لیکن سنا نہیں، دل تھا لیکن کچھ محسوس نہیں کیا۔ قوم کا گھر جلتا رہا اور وہ رومہ کے شہنشاہ نیرو کی طرح بیٹھے بانسری بجایا کیے۔ لیکن حالی کے دل و دماغ پر اس آگ کا دھواں چھا گیا اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑا۔ حالی کی شاعری چوٹ کھائے ہوئے دل کی فریاد ہے مگر کس کے دل کی؟ وہ ایک فرد واحد الطاف حسین حالی کا دل نہیں، بلکہ ایک قوم وملت ایک تہذیب وتمدن کا دل ہے، جو اپنی وسعت میں ایک جہانِ درد وآرزو کو لیے ہوئے ہے۔ حالی کی شاعری میں سب سے بڑی خصوصیت

یہ ہے کہ وہ محض اُن کے جذبات و کیفیات کا آئینہ نہیں بلکہ ایک پوری قوم کی داستان عروج و زوال ہے۔

دوسری خصوصیت شاعر کی نظر کی رسائی اور رائے کی اصابت ہے۔ اس نے قوم کی نبض پر ہاتھ ہی نہیں رکھا بلکہ مرض کی صحیح تشخیص کر کے مناسب دوا بھی تجویز کی۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ بڑے بڑوں کی عقلیں یہاں جواب دے چکی تھیں۔ لوگ افراط و تفریط میں گرفتار تھے۔ بعض قدامت پرستی کے بندے، ماضی کے نشے میں سرشار یہ چاہتے تھے کہ جدید علوم اور تمدن کو بالکل مسترد کر دیں، بعض تہذیب مغرب سے مسحور ہو کر اپنی قومی روایات اور خصوصیات کو اُس پر قربان کرنے کو تیار تھے۔ اس نازک موقع پر حالی کی عقلِ سلیم نے شمع ہدایت کا کام دیا۔ انہوں نے ایک طرف مسدس میں مسلمانوں کو اُن کے عروج کی داستان سنائی اور اُن کی خود داری اور عزت نفس کو اُبھارا انہیں اسلام کے بھولے ہوئے اُصول یاد دلائے دوسری طرف مغربی تہذیب و تمدن کا جائزہ لے کر اُس کی اُن خصوصیات کی طرف توجہ دلائی جو مغربی اقوام کی ترقی اور فروغ کا باعث ہوئی ہیں ان کی حق پسندی نے اپنے تمدن کی برائیوں پر پردہ ڈالنا گوارا نہیں کیا اور نہ دوسروں کی خوبیوں کے اعتراف میں کوتاہی کی انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک ہم اپنے آپ کو جدید ذہنی ہتھیاروں سے مسلح نہیں کریں گے کارزارِ حیات میں قدم رکھنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کا سارا کلام خصوصاً مسدس جہاں دل درد آشنا کے لیے ایک مرثیہ کا حکم رکھتا ہے وہاں عقلِ سلیم کے لیے دعوتِ فکر اور سر چشمہ ہدایت ہے۔ اصلاحی نقطہ نظر سے سب سے اہم مسدس کا وہ حصہ ہے جس میں شاعر نے قوم کے ہر گروہ اور ہر طبقے کی حالت کو اپنی بے پناہ اور درد ناک تنقید کے ذریعے بے نقاب کیا ہے جس کے ہر شعر میں سوسائٹی کی کسی دُکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا ہے۔ سرور کائنات کی بارگاہ میں عرض حال کرتے ہوئے چند

اشعار میں وہ حقائق بیان کر دیے گئے ہیں جن پر مورخین معلمین اخلاق اور مصلحین معاشرت مدتوں سر دھنیں گے۔ اس درد بھری، دل دوز نظم میں سے کوئی کیا سنائے اور کیا چھوڑے۔ مثال کے طور پر چند شعر سن لیجیے۔

اے خاصۂ خاصانِ رُسل ﷺ وقت دُعا ہے | اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے | اُس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آ کے ملائے | اُس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جُدا ہے
جو دین کہ ہمدرد بنی نوع بشر تھا | اب جنگ و جدل چار طرف اُس میں بپا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی | اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے
عالم ہے سو بے عقل ہے جاہل ہے سو وحشی | منعم ہے سو مغرور ہے مفلس سو گدا ہے
چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں | پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے
دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے | ایک دین ہی باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

صرف اسی نظم کی تنگ زمین میں حالی نے اُن مقامات کو بیان کر دیا ہے جہاں مذہب و فلسفہ کے بڑے بڑے مدعی نہیں پہنچ سکے۔ اسلام کی تعلیم کے رخ روشن پر، زمانہ کے تعصب، مخالفوں کی غلط بیانی اور خود مسلمانوں کی بے راہ روی کی وجہ سے پردہ پڑ گیا تھا۔ حالی نے اس پردے کو اُٹھا کر دکھا دیا کہ اسلام ایک مذہب امن ہے جو دنیا میں سلوک اور محبت کی حکومت قائم کرنے آیا تھا۔ اسلام کا مقصد قوموں اور جماعتوں کے اختلاف اور تعصب کو مٹانا اور ان میں ایک عالم گیر اخوت قائم کرنا تھا۔ اس نے فقر میں خود داری اور جدو جہد اور ثروت میں فیاضی، خدا ترسی اور حق شناسی سکھائی تھی۔ اس نے علم و حکمت کو مومن کی کھوئی پونجی سے تعبیر کیا تھا۔ اسی کی برکت سے مسلمانوں نے دنیائے فکر و عمل کو مسخر کر لیا تھا۔ لیکن اب خود ملت اسلامیہ میں پھوٹ پڑ گئی ہے اور افراد اور جماعتوں کے تعلقات میں حسن مراعات کا نام تک باقی نہیں رہا۔

عمل کی سرگرمی کی جگہ جمود اور بے حسی کا دور دورہ ہے۔ منعم اپنی دولت میں مست ہیں اور مفلس خود داری کو چھوڑ کر ہر ایک کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ نہ اُن میں قوت عمل باقی رہی ہے نہ اِن میں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں سے محروم ہو گئے ہیں، خدا کے ہاں انصاف ہے پاس داری نہیں، جو قوم اس کے احکام اور قوانین کی پیروی نہیں کرے گی وہ اس کا خمیازہ اُٹھائے گی۔ اس میں تقدیر کا گلہ کرنا، اپنے نفس کو فریب دینا اور حقیقت کی تلخی سے گریز کرنا ہے۔

شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلہ ہے جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت

تمدن و معاشرت کے تمام مختلف فیہ مسائل میں حالی ہمیشہ اُدھر ہوتے ہیں جو عدل، انسانیت اور انصاف کا رستہ ہے۔ وہ حق پرستی، انصاف پسندی، خود داری، جرأت، بلند حوصلگی اور روا داری کے حامی ہیں اور وقت کی قدر کرنا، محنت کی عزت کرنا، ابنائے جنس کے حقوق کی پاس داری کرنا اور مفاد ملی کے لیے ذاتی اغراض کو قربان کرنا سکھاتے ہیں۔ ان کی تعلیم میں ایک انقلاب عظیم کا امکان پوشیدہ ہے جس کو اُن لوگوں نے بھی پوری طرح نہیں سمجھا جو ان کے کلام پر سر دُھنتے ہیں اور ان کا قومی مرثیہ پڑھ کر آنسو بہاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں نہ صرف قوم کا دل دھڑکتا ہے بلکہ اس کے بلند ترین جذبات اور اعلیٰ ترین مقاصد کی ترجمانی موجود ہے۔ اقبال نے شیکسپیر کی شان میں جو شعر لکھا ہے اُس کا اطلاق بدرجہ کمال حالی پر ہوتا ہے۔

حسن آئینہ حق اور دل آئینہ حسن دل انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ

حالی کی مصلحانہ حیثیت کی سچی قدر شناسی کے لیے ان کی بلند اور پاکیزہ سیرت کو سمجھنا ضروری ہے۔ دنیا میں بہت سے بڑے آدمی گذرے ہیں جن کا نام لوگوں کی اور تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے، لیکن باوجود ان کے بڑے بڑے کارناموں کے ان میں کم ایسے ہوئے ہیں جن کا ظاہر و باطن، قول و فعل، اُصول اور عمل، زندگی اور تعلیم

بالکل ایک ہوں۔ حالیؔ کی کامیابی اور اثر آفرینی کی ایک بڑی وجہ ان کا خلوص ہے۔ ان کی شاعری میں بھی وہی خالص سونا دمکتا ہے جس سے ان کی فطرت کا خمیر تیار ہوا تھا ان میں تصنع اور تکلف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر لفظ جو دل سے نکلتا ہے بجلی بن کر دل پر گرتا ہے۔ سید کے حلقہ احباب اور رفقا میں جو بڑے بڑے مشاہیر اور قابل احترام لوگوں پر مشتمل تھا حالی کی سیرت سب سے برتر اور بلند تھی، جس پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے عصر جدید میں لکھا تھا ''بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا یونانی خیال کی رو سے ایک معتدل اور متوسط انسان، اور صوفیانہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے۔

ان ذاتی اوصاف اور باطنی کمالات کا تذکرہ غیر متعلق یا خارج از بحث نہیں، کیونکہ حالی کی ذات اب انفرادیت کی حدود توڑ کر ہماری تہذیب وتمدن اور ہماری تاریخ و ادب کے سرمایہ عزیز میں سما گئی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری کی قدر شناسی کے لیے ان نفسی خصوصیات اور محرکات عمل کو پہچاننا ضروری ہے جنھوں نے حالی کو حالی بنایا حقیقت یہ ہے کہ اصلاح کا جذبہ اور خدمت خلق کا شوق اُن کی زندگی اور عمل کے ہر پہلو پر محیط تھا۔

اس نے ان کو غم عشق اور غم روزگار دونوں سے آزاد کر کے قوم کے غم اور قوم کے عشق میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہی جذبہ اصلاح تھا جس نے ان کی زندگی کی ابتدا سے رہنمائی کی اسی کی بدولت انھیں مسدس کے مضامین کا الہام ہوا۔

آج جو لوگ قومی خدمت کی راہ میں گامزن ہیں، حالی کی سیرت اور شاعری ہر قدم پر ان کی رہنمائی کرتی ہے اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے۔

نگہ بلند ، سخن دل نواز ، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

عابد حسین:

حالیؔ کا نخلِ طبع دورِ تنزل کی بنجر زمین میں اُگا مگر اُس کی آبیاری میرؔ و دردؔ کے رشحاتِ فیض نے اور اُس کی پرداخت غالب و شیفتہ کے دستِ شفقت نے کی۔ حالی کی ابتدائی عمر کی غزلوں میں زمانے کا رنگ نظر آتا ہے مگر وہ ستھرا رنگ جو اربابِ صفا کے ایک چھوٹے سے حلقے میں محدود تھا۔ ان کی صحتِ ذوق اور صلاحیتِ مزاج کا اندازہ اُن نظموں سے ہوتا ہے جو انہوں نے لاہور کے جدید طرز کے مشاعرے کے لیے لکھیں۔ ''برکھا رُت''، ''نشاطِ اُمید''، ''مناظرہ رحم و انصاف''، اور ''حبِ وطن'' جیسی نظموں کا ایک ایسے شاعر کے قلم سے نکلنا جو ابتدا سے غزل کہنے کا عادی تھا، صاف ظاہر کرتا ہے کہ اس کی طبیعت کی اپج خود ہی رسمی شاعری کی کال کوٹھری سے اُکتا گئی تھی اور اپنے لیے ایک وسیع تر اور روشن تر جولاں گاہ ڈھونڈتی تھی۔

پھر بھی جب تک جوانی کی شوریدہ سری باقی رہی انفرادیت اور داخلیت کی قید سے رہائی نہیں ہوئی کیونکہ جوانی نام ہی اس کا ہے کہ انسان دل کے کونوں کو ٹٹولتا، نفس کی بھول بھلیاں میں بھٹکتا پھرے۔ اس چکر سے نکلنے کے بعد ردِّ عمل کا دور آیا۔ چالیس برس کی عمر میں حالیؔ کی طبیعت پر افسردگی اور مایوسی کے بادل چھا گئے۔ ممکن ہے اس میں دنیاوی افکار و آلام کو بھی دخل ہو مگر اصل وجہ یہ ہے کہ حالیؔ کی نظر جسے ''خوب سے خوب تر'' کی جستجو رہا کرتی تھی اس جگہ پہنچ کر ٹھہری جہاں سے انہیں اپنی گذری ہوئی شاعری نکمی اور بیتی ہوئی عمر اکارت دکھائی دینے لگی۔ اس پر طرہ یہ کہ تلافی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ دل سوز وطن سے آشنا ہو چکا تھا مگر وطن اور اہلِ وطن کی حالت اور بھی زیادہ مایوس کن اور دل شکن تھی۔ جو نا اُمیدی کے بوجھ سے دبا ہو رجز خوانی تو ایک طرف نوحہ خوانی بھی نہیں کر سکتا۔

یکا یک اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں امید کی روشنی چمکی۔ سرسید احمد خاں نے جو انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کے سب سے بڑے مدبر تھے، 57ء کے ہنگامے کے بعد تمدن کے بکھرے ہوئے اجزا کو ''قومیت'' یا ''ملیت'' کی تحریک میں سمیٹنے کی کوشش شروع کی۔ سرسید کی ذات میں حالی کو وہ رہنما مل گیا، قوم کے تصور میں وہ منزل مقصود اور قومی تعلیم کی تحریک میں وہ راہِ عمل نظر آ گئی جس کی انہیں تلاش تھی۔ اب کیا تھا ان کے رندھے ہوئے دل میں نئے ولولے اُٹھنے لگے، بجھی ہوئی طبیعت میں نئی آگ بھڑک اُٹھی۔ انہیں ایک مقصدِ حیات ہاتھ آ گیا اور وہ یہ تھا کہ ادب وشعر میں وہی انقلاب پیدا کر دیں جو اُن کے مرشد نے تمدن ومعاشرت میں برپا کیا تھا۔

اس عزم کا پہلا نتیجہ مسدس مدو جزر اسلام تھا جو سرسید کی فرمائش سے 1879ء میں لکھا گیا۔ اس میں شعر حالی کے دوسرے دور کی کل خصوصیات موجود ہیں۔ افرادیت کا توڑ تو اُس کا موضوع اور مقصد ہی ہے۔ داخلیت سے بچنے کا اس قدر اہتمام ہے کہ بجز ودیباچے کے شاعر نے اپنی ذات کو کہیں جھلکنے نہیں دیا۔ تخیل ہر قدم پر مشاہدے کا پابند ہے۔ نظم کا تار پود صحیح تاریخی حالات اور نفس امری واقعات سے تیار ہوا ہے۔ اسلام کی گذشتہ عظمت کے دکھانے میں جہاں عقیدت تخیل کو ایڑ لگاتی ہے وہاں دیانت اُس کی باگیں کھینچے ہوئے ہے جذبات کی شدت کو ضبط نے قابو میں رکھا ہے۔ البتہ مسلمانوں کی موجودہ پستی کے بیان میں تلخ نوائی سے چارہ نہ تھا۔ یہاں دل کھول کر نشتر ملامت کے کچوکے دیے ہیں خصوصاً شاعروں کی ہجو میں بڑی سختی سے کام لیا ہے شاید اس وجہ سے کہ یہاں ملامت غیر نہیں بلکہ ملامت نفس مقصود تھی۔ اس کے باوجود الفاظ کی سختی سے قطع نظر کر لیجئے تو واقعات کے بیان میں یہاں بھی اصلیت سے انحراف نہ پایئے گا۔ مبالغہ جو دوسرے شاعروں کی دال روٹی ہے حالی کے یہاں اتنا

ہے جتنا کھانے میں نمک اور اسی قدر لطف دیتا ہے۔ شاید آپ کو حکومت وقت کی برکات کے بیان میں بے جا مبالغہ نظر آئے لیکن ان آنکھوں سے دیکھئے جنہوں نے مدتوں کے فتنہ و فساد کے بعد پہلے پہل امن کی صورت دیکھی تو آپ کو بھی وہی دھوکا ہو گا جو حالی کو ہوا۔

بیان کی سادگی اور صفا کی زبان کی سلاست و نرمی اور گھلاوٹ، حالی کا حصہ ہے اُردو زبان کے پودے کو علمیت بگھارنے والے اس ڈھب پر لا رہے تھے کہ اپنی زمین چھوڑ کر عربی فارسی کے تناور درختوں کا طفیلی بن جائے۔ حالی کا یہ احسان بھی کچھ کم نہیں کہ انہوں نے اسے جڑ سے مضبوط کر کے اپنے بل پر پنپنے اور بڑھنے کے قابل کر دیا۔ ہندی کے سہل اور نرم الفاظ جو اُردو میں کھپ سکتے تھے، گھریلو محاورے جو بول چال میں رائج تھے مگر تحریر میں نہیں آتے تھے، حالی کے ٹھپے سے نظم و نثر میں چلنے لگے۔ اس زبان کے اختیار کرنے میں ادبی مصلحتوں کے علاوہ جمہوریت اور مساوات کے جذبے کو بھی دخل ہے۔ حالی کا خطاب کسی ایک طبقے سے نہیں بلکہ ساری قوم سے ہے اور قوم کا مفہوم اُن کے ذہن میں اس سے کہیں زیادہ وسیع تھا جو ان کے ہم عصروں کے ذہن میں تھا۔ حالی کی قوم میں صرف ''شرفا'' نہیں بلکہ غریب، امیر، چھوٹے بڑے، عالم جاہل، سب داخل ہیں اس لیے انہوں نے اپنے خیالات سیدھے سادے طریقے سے سلیس اور عام فہم زبان میں ادا کیے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

مگر اسے شاعری کا کمال کہیے یا سچائی کا جادو کہ اسی کھرّی اور کڑوی نظم میں وہ زور وہ لطف وہ اثر پیدا ہو گیا جو انسان کے کلام میں بہت کم ہوتا ہے۔ حالی سمجھتے تھے کہ یہ ''اُبالی کھچڑی اور بے مرچ سالن''، ''جس میں نہ مبالغے کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی'' خوش خوراکوں کے حلق سے نہیں اُترے گا اور انہیں تعجب ہوا کہ ''تھوڑی سی مدت

میں یہ نظم ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی...... لوگ اس کو پڑھ کر بے اختیار روتے ہیں اور آنسو بہاتے۔

رام بابو سکسینہ:

''مسدس حالی'' کو ڈاکٹر رام بابو سکسینہ ایک الہامی کتاب قرار دیتے ہیں۔ وہ اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

''مولانا حالی کی یہ سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ مشہور تصنیف ہے۔ یہ ایک نیا دور پیدا کرنے والی کتاب ہے۔ اس کی مقبولیت اب بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ یہ ایک الہامی کتاب ہے اور اس کو تاریخ ارتقائے ادب اردو میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیے۔ یہ ایک نیا تارا ہے جو اردو کے افق شاعری پر طلوع ہوا۔ اس سے ہندوستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی اور اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ایسی پر اثر اور پر درد نظموں کے واسطے مسدس نہایت موزوں چیز ہے۔ اس کے بہت سے نقال پیدا ہوئے مگر کوئی شخص اب تک بہ لحاظ جوش اور زور تخیل اور طرز ادا کے مولانا تک نہیں پہنچا۔ اس میں اسلام کی گذشتہ عظمت مسلمانان سابق کے کارنامے ان کے بلند خیالات اور اولوالعزمیاں اور برخلاف اس کے زمانہ موجودہ میں ان کی پستی و زوال اور سستی و کاہلی کا ذکر ہے۔ آخر میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی ہے کہ تاریخ عالم میں جو اُن کا مرتبہ پہلے تھا اب پھر اس کو حاصل کرنے کے لیے کمر ہمت باندھیں۔

''زمانہ حالی کی کوئی اردو کتاب مقبولیت میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا مسلمان اس سے آشنا ہے اور کچھ عرصہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کو تو یہ حفظ تھی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام قومی اچھائیوں اور برائیوں کا ایک ساتھ جائزہ لیتی ہے۔ یعنی اچھائیاں زمانہ گذشتہ کی اور برائیں زمانہ موجودہ کی۔

رشید احمد صدیقی:

اُردو کے بلند پایہ نقاد اور صاحب قلم انشا پرداز پروفیسر رشید احمد صدیقی رقمطراز ہیں: ''حالی اپنی شاعری میں اسلاف اور ان کے کارناموں ہی کا واسطہ نہیں دیتے بلکہ ہندوستان اور اس میں رہنے بسنے والے جس بستی اور غفلت کے شکار نیز بدلے ہوئے حالات میں زندگی اور زمانے کے جن مصائب و مطالبات سے دو چار یا غافل تھے، ان سے بھی عہدہ برآ ہونے کا راستہ دکھاتے اور حوصلہ دلاتے ہیں حالی نے مسلمانوں کو ''مسدس حالی'' اور ''شکوۂ ہند'' میں ان کا ماضی یاد دلانے کے علاوہ اپنی دوسری نظموں، تحریروں اور تقریروں میں حال کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی جس دل سوزی اور دلیری سے تلقین کی ہے، ان کے عہد کے کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی۔''

صالحہ عابد حسین:

مسدس کی اس درجہ قبولیت کی ایک بڑی وجہ تو اس کی حقیقت نگاری، صداقت، خلوص اور وہ درد و سوز ہے جو اس کے ہر ہر شعر میں جاری و ساری ہے۔ دوسری وجہ زبان و بیان کی سادگی، روانی، شیرینی اور وسعت ہے۔ حالی کا پیام قوم کے کسی ایک طبقے یا فرقے کے نام نہ تھا اس لیے وہ اُسے کسی خاص اصطلاحی اور مشکل زبان میں ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کو تو پوری قوم کو اپنا پیام پہنچانا تھا خواہ وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس لیے انہوں نے وہ زبان استعمال کی جسے ہر کس و ناکس آسانی سے سمجھ سکے۔ ''بیان کی سادگی اور صفائی، زبان کی سلاست اور نرمی اور گھلاوٹ حالی کا حصہ ہے۔'' انہوں نے وہ الفاظ اور محاورے جو ادب میں متروک اور گھٹیا سمجھے جاتے تھے لیکن روزمرہ کی زبان میں انہیں قبولیت حاصل تھی بے تکلف استعمال کیے اور

اس خوبی سے کہ جو لفظ جہاں بٹھا دیا گیا وہاں نگینے کی طرح جڑ گیا ہے۔ بقول مولوی عبدالحق کے ''زبان کی حقیقی فصاحت دیکھنی ہو تو مسدس حالؔی صرف اخلاقی اور اصلاحی نقطہ نظر ہی سے ایک بالکل جدید طرز کی چیز نہ تھی بلکہ حقیقت میں یہ ترقی پسند ادب اور نئی شاعری کا سنگ بنیاد تھی۔ جس تحریک کو ہم ترقی پسند تحریک کہتے ہیں، دراصل آج سے ستر سال پہلے حالؔی نے اس کی ابتدا کی تھی۔ اگر آج ترقی پسند تحریک اشتراکیت کے رنگ میں لگی ہوئی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ پون صدی پہلے بھی اس صورت میں یہ تحریک اٹھائی جا سکتی تھی۔ حالؔی نے صرف ترقی کا راستہ نہیں دکھایا بلکہ دراصل ایک انقلاب کی بنا ڈالی۔ انہوں نے صرف شعر کی دنیا میں انقلاب پیدا نہیں کیا بلکہ شعر کے ذریعے انسانوں کے دماغوں اور ذہنوں میں بھی انقلاب کا بیج بویا۔ ہاں حالؔی تخریب کے ساتھ ساتھ تعمیر کا کام بھی کرنا چاہتے تھے۔ وہ فرسودہ عمارت کے پرانے مسالے سے ایک نئی اور پائدار عمارت بنانا چاہتے تھے۔ ہمارے بعض نقاد بڑی بے تکلفی اور ''بے غوری'' سے آج کے معیاروں پر انیسویں صدی کے شعر و ادب کو پرکھتے ہیں اور جب پرانی اصلاحی اور انقلابی چیزیں اُن کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتیں تو بے تکلف اُن کو کھوٹا سونا قرار دے دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ سانچے، یہ معیار بہت بعد کے بنے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سماجی اور سیاسی ماحول کی پیداوار ہیں۔ حالؔی دراصل اپنے زمانے کے انقلابی، اور ترقی پسند تحریک کے بانی تھے۔ ہاں اُن کا معیار جدا تھا۔ چنانچہ ایک جگہ حالؔی کہتے ہیں: ''جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آ جاتا ہے مگر پہیہ اور دُھرا بدستور باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیے تھے مگر اسلوبِ بیان میں مطلق فرق نہ آیا۔ جو تشبیہیں اور استعارے پہلے مدح، ہجو، غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے وہی اب توحید، مناجات، اخلاق اور موعظت میں

استعمال ہونے لگے۔ خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ متاخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات سے دست بردار ہو جائیں مگر اُن کے طریقہ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے ...... نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرزِ بیان میں قدما کے طرز بیان سے بہت دور نہ جا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انہیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں۔......'' اس لیے حالیؔ نے معنی کی نئی شراب کو بھی پرانی بوتلوں یا اُن سے ملتے جلتے پیمانوں میں پیش کیا اور اس طرح قبولیت کی راہ میں غیر ضروری اُلجھنیں نہیں پیدا کیں۔

مسدس میں بعض مقامات اپنی جگہ اتنے پُر اثر، دلکش اور فنی اعتبار سے لا جواب ہیں کہ وہ اردو ادب کے لیے ہمیشہ سرمایہ افتخار رہیں گے۔ پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ a کی نعت میں شاعروں نے گزشتہ چودہ صدیوں میں کیا کچھ نہیں کہا لیکن مسدس میں جو چند نعتیہ بند ہیں وہ ایک طرف عقیدت اور ارادت کی اور دوسری طرف حقیقت اور صداقت کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتے ہیں۔

یہ آخری ریمارک غور کے قابل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حالیؔ کے پیش نظر مسلمانوں کی حالت زار تھی اور اُن کی اصلاح ان کا مقصد اوّل تھا۔ لیکن وہ اُن کے عروج و زوال کی جو داستان پیش کرتے ہیں وہ تاریخ عالم کا ایک روشن اور عبرت انگیز حصہ ہے اور اس کا مطالعہ انسان کی تہذیبی میراث کا جز ہے، جو صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہیں بلکہ سب قوموں کے لیے مفید ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ قومی عروج و زوال کے جو اصول اور اسباب اس میں سمجھائے گئے ہیں ان کا اطلاق عام ہے۔ اس کے علاوہ جن قدروں کو انہوں نے پیش کیا ہے اور جس انداز سے پیش کیا ہے وہ بھی زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہیں۔ محنت، اکل حلال، دیانت داری، اخوت، انصاف، سماجی برابری، علم کا احترام، دولت اور نام و نسب کی بے جا پاس داری کے خطرے۔ یہ تمام چیزیں ایسی

ہیں جن کا سمجھنا ہر قوم کے لیے ضروری ہے۔ اگر ان کو کسی خاص قوم یا مذہب کی اصطلاحوں میں بیان کیا جائے (اور برخلاف اقبال کے حالی کے ہاں تو اصطلاحیں بھی بہت کم ہیں اور ان کی شاعری کی زبان ایک عالمگیر زبان ہے) تو اس سے ان کی قدریں کم نہیں ہو جاتیں۔

سیّدہ سیدین حمید:

Syeda Saiyidain Hameed:

Musaddas-e-Hali is not an account of the rise and decline of Muslim empires---a process which spanned over seven hundred years. The poem is first an account of Jahilliat and then of the revolutionary change the Prophet brought about in the character of the Arabian tribes. Hali is not talking about politics or empires but about the individual Muslim of his daily life, toils and troubles. It is an account of how he has deviated from the essential teaching of his religion. In the poem when he describes the grandeur and beauty of monuments if Islam, such as the mosque Qartaba (Cordova) and the palace Alhamra, both in Spain, it should be taken as praising architectural and aesthetic achievements:

Let someone explore the relics of Cordova
The arches and portals of mosque lying in ruins
Hejazi palaces which sparkled like Nova
The rise and the fall of Khilaafat's strongholds
In debris thus shine their visages, I am told
As in dust there glitters fine silver and gold.

He does not applaud the political power or conquests of the Muslims nor urges them to rise as great military people. His concern is about their character as indivduals and as a community. It is their scholarship, their arts and sciences, their poetry and literature, in short, their civilizin influence over the world, which he extols. What Hali lauds is not the glory of Islam's temporal empire but its spiritual dominion in transforming the Arabs into people of high moral character. By accepting the Islamic faith Hali believes that pagans and beasts were turned into true human beings:

The Din which transformed enemies into brothers
The savage who swore by the sword learnt to love
Even predators it taught to care for the others
To shepherds which gave the control of the world
The land which was grazeland for cattle and bare
Was turned gold and treen so the world it colud dare.

After describing the spread of Islam through the Islamists who went far and wide to found new civilizations, the poet goes on to the next phase. This is the story of decline and fall, which starts one-third way into the poem, with the famous line-Pa gadla hua jab ke chashma safa ka (When muddy became the crystal waters).

In this part the poet describes Islam as a 'ruined

garden' and states how the Muslims themselves are to be held responisible for their condition. He holds up a mirror for the Quom to see, recognize and wince at its state. No words are spared to show the Quom what it was once and to what depths it has sunk. It touches upon all aspects of life, work and human relationships. The reduced circumstances and poor condition of Indian Muslims is described. Never having bothered to acquire English education, their marginalized status during the colonial regime at the end of the nineteenth century is described in verse after verse.

Here one may digress to explain what Hali means by Quom, the word which occurs most often in the poem and which has been left as is in the translation because it has no equivalent in the English language. Originally Hali had used the word for the people of Arabia, whom the Prophet had addressed when he emerged from the Cave of Hira and declared his Prophethood. Later he uses the word for the Muslims among whom he lived. Hali did not use the word Quom in the sense of a people living in a specific territory and professing allegiance to the land, as a modern nationalist would do for his Nation-stae. He did not use it in the sense Jinaah and Gandhi used it. Teli, tanboli, mughal, patahn, syed, gujjar, jat, Hindus, Muslim, Sikhs, scores and scores of them were called Quom in India.

Hali's dirge is only for the Muslims of India who, by the end of the nineteenth and beginning of the twentieth

century, had become a confused, rudderless Quom. His reformist Zeal did not extend to other religions; perhaps because he was a deeply religious man who did not want to pass judgment over the people of other…… religions and declare whether or not they were conforming to the tenets of their own faiths. Perhaps also because he wanted others to learn the best from their own faiths. It is interesting to juxtapose Hali's use of literature as a vehicle of reform with the other great literary (and political) gaint of the period, another man whose name bears the prefix Maulana. He was Maulana Abul Kalam Azad whose early writings coincide with the last decade of Hali's life. In his earliest journal, Lisan-us-Sidq (Voice of Truth), begun in 1903, he voices the same sentiment and lament for the Muslims. Like all Muslim youth, Musaddas was part of his upbringing as well.

In a manner reminiscent of Jonathan Swift, the great satirist of the seventeenth century whose work Hali may have read, Hali spares no one for the condition of his Quom, least of all the Muslims themselves. He chastises the religious leaders who have abdicated the responsibility of their calling. He condemns dogmatism, obscurantism and bigotry, which have become the hallmark of those who profess to be Islam's custodians. He attributes the decline of Muslims to the stifling of dissent, curbing of questions and allowing of religious ritulas to take precedenc over the spirit of the religion.

The poet has no hesitation in upbraiding members of his very own tribe for their mediocrity and profligacy in misleading the Quom through their writings. He hauls up the inferior poets who preen themselves before the muse. He is unsparing towards those who excel in convoluting and complicating religion so that it goes out of reach of the common person. The Prophet himself had declared, Al Din Yusrun, meaning 'Din is easy', but the 'learned' have so negated his words that people begin to feel that Din is nothing but a burden. The poem concludes with a warning to Muslims to repair their ship before the storm wrecks it to peices.

The whiplash of Hali's verses struck deep at the Quom. Later in this Introduction, I have described the Public reaction to Hali's poem, from intensely emotional to laudatory to condemnatory. It shook its readers and made them look within to identify the malasie. Today, 150 years later, we Muslims need the same introspection; first to be reminded, then to be chided and finally to be shown the Siratul Mustaqeem (Straight Path). This was the crux of Musaddas. And this became for me the overwhelming reason for undertaking this work.

مالک رام:

یہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اردو شاعری ابتدا ہی سے اپنے محدود دائرے سے آگے نہیں بڑھ سکی اور خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکی۔ حالؔی عرصے دراز تک اس

سے مطمئن نہیں رہے۔ ان کے ذہن میں اردو شاعری میں اصلاح کے بہت سے طریقے تھے تا کہ اس کو زیادہ سے زیادہ مفید اور کار آمد بنایا جا سکے۔ لاہور کے قیام کے زمانے میں محمد حسین آزاد نے جو مشاعرہ منعقد کیا تھا اس میں حالی بھی شریک تھے۔ اس مشاعرے سے پرانی شاعری کی اصلاح کے کئی طریقے سامنے آئے مگر کوئی صحیح راستہ نظر نہ آتا تھا۔ حالیؔ نے اپنی بے چینی، کرب اور ذہنی کشمکش کا اظہار تفصیل سے مسدس حالیؔ کے دیباچے میں کیا ہے۔ خوش قسمتی سے دلّی آنے کے بعد حالیؔ کی ملاقات ایک مرد دانا سید احمد خاں سے ہوئی جس کے دل میں قوم کا درد تھا اور جو مسلمانوں کا سچا ہمدرد تھا یہ وہ مرد بزرگ دانا ہے جس نے مسلمانوں کی ڈوبتی کشتی کو پار لگایا تھا۔ حالیؔ ان کی سیرت اور بلند خیالات سے بہت متاثر ہوئے اور دل و جان سے سرسید کے ساتھ ہو گئے۔ سرسید کے دل میں مسلم قوم کا درد بہت تھا اور وہ قوم کی خواہشوں اور آرزوؤں کو پورا کرنے میں لگے رہتے تھے، قوم کو پستی سے نکالنے کا واحد ذریعہ تعلیم تھا اور اسی کے ذریعہ قومی جذبے کو بیدار کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ راستہ تھا جو قوم کو ترقی کی طرف لے جا سکتا تھا۔ سرسید آخر میں اس نتیجے پر پہنچے کہ مختلف سوسائٹیاں اور ادارے صرف اسی مقصد کے لیے قائم کیے جائیں اور اس کو با مقصد بنانے کے لیے اخبارات و رسائل نکالے جائیں تا کہ مسلمانوں کو تعلیم کی طرف رغبت دلائی جا سکے اور وہ پستی سے باہر نکل سکیں۔ چنانچہ سرسید نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے 1875ء میں علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جو بعد میں ترقی کر کے یونیورسٹی ہو گیا۔

سرسید کے تعلقات اس زمانے کی بڑی بڑی عظیم شخصیتوں سے تھے ان میں بیشتر ان کی پالیسیوں کے ہم نوا تھے لیکن بعض ایسے بھی تھے جو ان کے بلند حوصلوں کو آگے بڑھنے سے روکتے تھے البتہ ایک حالیؔ کی شخصیت ایسی تھی جس نے سرسید کے دکھ کو سمجھا اور ان کے بلند حوصلوں پر مرہم رکھا اور انہوں نے مسلم قوم کو پستی سے باہر

نکالنے کا ذریعہ تلاش کر لیا۔ سرسید نے حالیؔ سے قوم کو بیدار کرنے کے لیے ایک نظم لکھنے کی خواہش کی۔ چنانچہ حالیؔ نے قومی جذبے سے سرشار ہو کر قوم کو بیدار کرنے کے لیے ''مدو جزر اسلام'' (اسلام کا عروج و زوال) کے نام سے ایک طویل نظم لکھی۔ یہ نظم بعد میں ''مسدس حالی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ نظم سب سے پہلے جون 1879ء کے شروع میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی اشاعت سے مسلم قوم میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ نظم میں حالیؔ نے سب سے پہلے اسلام کے عروج و زوال پر روشنی ڈالی ہے اس کے بعد مسلم قوم کی جہالت اور تعلیم کی کمی پر اظہار خیال کیا ہے۔ ایک سچے اور مخلص شاعر کے دل کی آواز کو درد آشنا انسانوں نے سمجھا اور اس کی ہمت اور حوصلے کی داد دی۔ سرسید نے جب اس نظم کو پڑھا تو ان کے دل پر گہرا اثر ہوا اور انہوں نے بڑے دل کش انداز میں حالیؔ کے اس غیر فانی کارنامے کی داد دی۔ زبان سادہ سلیس اور دل نشیں ہے۔ روانی اس نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ نظم کے بہت سے بند ایسے ہیں جو بغیر چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ نقادوں نے بھی حالیؔ کی اس نظم کی بہت تعریف کی ہے یہ کتاب بہت مقبول ہوئی۔ اس کا تیسرا اڈیشن 1886ء میں جب شائع ہوا تو حالیؔ نے اس میں 162 تازہ بند نظم کے آخر میں اضافہ کیے اور سرسری ترمیم و اضافہ کیا۔ یہ اڈیشن بہت مقبول ہوا۔ اس کی مقبولیت کی بڑی وجہ اس کی حقیقت نگاری ہے۔

آل احمد سرور:

مسدس کے بارے میں تنقیدی اشارے میں کہتے ہیں: حالی کی سرسید سے ملاقات ہوئی اور وہ سرسید کی اصلاحی تحریک کے روح رواں بن گئے، مسدس سرسید کی فرمائش پر لکھی گئی اور سرسید اُسے اپنی نجات کا باعث سمجھتے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی پستی سے نجات ملی۔ یہ نظم اپنے طرز کی

انوکھی اور نئی ہے اور اس کی مقبولیت اس کی خوبی کی دلیل ہے۔ اس میں حالیؔ نے قوم کا مرثیہ لکھا ہے مگر مرثیہ میں تعمیری شان ہے۔ جہاں اس میں شرفا کی حالت، شعرا کی پستی، علم عمل کے فقدان پر ماتم ہے وہاں ماضی کی شان وشوکت کا وہ ولولہ انگیز تذکرہ ہے جسے پڑھ کر مایوس سے مایوس دل بھی گرما جاتا ہے۔ مسدس میں کئی مقامات ہیں جو دلوں پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں عرب کی جہالت اسلام سے پہلے، نبی برحق کا نزول، ان کی سیرت، ان کی تعلیم ان کے رفیقوں اور ساتھیوں کا خلوص اور جذبہ اسلامی، مسلمانوں کی علم دوستی اور علم پروری، قرطبہ اور بغداد کی عظمت، سب کا ذکر سادہ مگر بڑے پر اثر الفاظ میں ہوا ہے۔

حالیؔ خود روتے ہیں اور دوسروں کو رلاتے ہیں پھر ایسی باتیں کہتے ہیں کہ آنکھوں میں آنسو خشک ہو جاتے ہیں مگر دلوں میں عزم بیدار ہو جاتا ہے، وہ ماضی کے شاعر کہے جاتے ہیں، مگر ماضی کی یاد میں کھو جانا ان کا شیوہ نہیں۔ ماضی کی ہر تصویر عبرت کے لیے پیش کرتے ہیں نہ کہ عشرت کے لیے۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی:

مسدس کے بارے میں تجربے اور روایت میں لکھتے ہیں:

حالی کی مسدس اردو میں قومی شاعری کی پہلی بلند آواز ہے سیاسی شعور اس سے پہلے بھی شعرا کے کلام میں موجود ہیں۔ غزلوں ہجویات اور شہر آشوب میں اس کی جھلک موجود ہے نذیر کے یہاں تو یہ شعور نہایت واضح ہے لیکن حالی سے پہلے اس کا مقصد اتنا واضح اور متعین نہیں ہے سبب اس کا یہ ہے کہ حالی کا یہ مسدس سرسید کی تحریک کا ایک جزو ہے۔ سرسید کی تحریک بڑی ہمہ گیر اصلاحی تحریک تھی۔ مذہب معاشرت، تعلیم، شعر و ادب، انشا اور صحافت سب اس کے حلقے میں آتے تھے سرسید کا مقصد یہ تھا کہ

ہندوستان کے مسلمان نئے بدلے ہوئے حالات کا مقابلہ کر سکیں ان میں جدید تعلیم اور روشن خیالی پھیلائی جائے، پرانے رسم و رواج، بے ہودہ تقلید اور رواج پرستی کی بیخ کنی کی جائے۔ جھوٹ، خوشامد، تصنع اور تکلف کا خاتمہ کیا جائے، اخلاق سدھارا جائے قوم اور قومیت کا تصور پیدا کیا جائے اور قومی عزت اور عزت نفس کی تعلیم دی جائے، سر سید کی اس ہمہ گیر تحریک میں ان کے بہت سے شریک کار اور رفیق تھے انہیں میں ایک حالی بھی تھے، مسدس ایک اصلاحی نظم ہے جس کا مقصد مسلمانوں کو ان کے ماضی اور حال کی داستان سنا کر ترقی کے راستے پر چلنے کے لیے آمادہ کرنا تھا، اس نظم میں بڑی حقیقت پسندی اور واقعہ نگاری کا ثبوت دیا گیا ہے اس میں مروجہ اسلوب سے انحراف کر کے صفائی، سادگی اور سلاست پر زور دیا گیا تھا۔ اسی لیے لوگوں کو جو تشبیہوں، استعاروں اور کنایوں کے عادی تھے حالیؔ کا یہ نیا اسلوب بڑا روکھا پھیکا نظر آیا۔ بعض لوگوں کے نزدیک حالی کی شاعرانہ زندگی مسدس کہنے سے پہلے ختم ہو جاتی ہے اور وہ اس نظم کو محض ایک قومی مرثیہ اور پھیکی نظم کہتے ہیں لیکن حالی نے جو راستہ دکھایا تھا اسی پر اکبر، چکبست، اقبال اور جوش سے لے کر فیض احمد فیض تک گامزن ہوئے ہیں۔

جلیل قدوائی:

مسدس حالیؔ، مولانا کی بہترین مسلسل بیانیہ نظم ہے۔ اس میں حالیؔ کی شاعری کے تمام ظاہری اور باطنی اوصاف اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں، صاف، سادہ، رواں اور مبالغہ سے پاک یہ مسلمانوں کے کھوئے ہوئے جلال اور گزری ہوئی عظمت اور بیتی ہوئی زندگی کی نہ صرف خونچکاں تاریخ ہے بلکہ ان کے زوال کا مرثیہ بھی ہے۔ شاعر نے نہایت اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ اسلام کے عروج و زوال کی تصویر کھینچی ہے اور زندگی کے ہر شعبے اور دنیا کے ہر حصے میں مسلمانوں نے جو نمایاں

خدمات سر انجام دیں، علوم و فنون میں جو مستقل اضافے کیے، تمدن و سیاسیات میں جو غیر فانی نقوش مرتسم کیے۔ معاشرت و اخلاق میں جو یادگار ابواب قائم کیے۔ شعر و ادب میں جن وسعتوں اور بلندیوں کو راہ دی ان سب کو انتہائی جوش فخر اور درد کے ساتھ بیان کیا ہے اسی کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں نے اسلام کی خدمات جلیلہ پر جس جس طرح پانی پھیرا تھا اور اسلام کے نام کو دھبہ لگایا تھا اس پر دل کھول کر اور نہایت سخت سے طنز اور نکتہ چینی بھی کی جس سے بعض لوگوں نے برا مانا۔ یہی وجہ تھی کہ چند سال بعد مولانا حالیؔ نے مسدس کے آخر میں ایک ضمیمہ کا اضافہ کیا جس میں امید سے خطاب کیا گیا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اربابِ وطن پر یہ صاف واضح ہو جائے کہ اسلام کے عروج و زوال کے بیان سے مقصد رونا رلانا نہیں، بلکہ اس بگڑے ہوئے گھر کو پھر بنانا اور اس خرابے کو از سر نو تعمیر کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ جیسے خشک موضوع میں جو واقعات و حالات کے بیان تک محدود ہوتا ہے شعر و شاعری کی نزاکتیں اور زبان و بیان کی خوبیاں پیدا کر دینا ایک بے جان چیز میں جان ڈال دینا صرف حالی کا کام تھا۔ پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حالی نے اپنے عقیدہ کے مطابق سارے مسدس میں کہیں بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا، صداقت و راست بازی سے جو ان کی زندگی اور شاعری کا جوہر تھا سرِ مُو تجاوز نہیں کیا اور اپنی نظم شاعری کے مقررہ اصولوں سے ہٹ کر اور مروجہ قواعد سے انحراف کر کے مرتب کی جس کے لیے وہ بہت بدنام بھی ہوئے اس وقت اور بھی حیرت ہوتی ہے کہ وہ اس نظم میں یہ درد و اثر، روانی و ترنم اور تسلسل و شگفتگی کس طرح پیدا کر سکے۔ شاید مسدس کے موضوع ہی میں یہ تمام صفات موجود تھیں۔ اس نظم کے بعض بند بغیر پُر آب آنکھوں اور گلو گیر آواز کے پڑھے نہیں جا سکتے۔ زوال بغداد اور تعمیر بلاد کے بند پڑھ کر آنکھوں کے سامنے ایک سماں پھر جاتا ہے اور دل پر تصویر اُتر آتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ چند

مصرعے لطف بیان اور نزاکت تخیل پر آخری لفظ ہیں:

ہوئی پہلوئے آمنہ رضی اللہ عنہا سے ہویدا دعائے خلیل علیہ السلام اور نوید مسیحا علیہ السلام

ٹپکتی ہے قادیس سے حسرت ان کی

نصیب ان کا اشبیلیہ میں ہے سوتا

خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے

اور اسی باغ رعنا سے بو ان کی پھوٹی

اگر شاعری اور تخیل کی معراج نہیں ہے تو مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ شاعری کس چیز کا نام ہے!

نعت پیغمبر اور قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے بیان میں رسمی شاعری کے خلاف صرف ان کے اخلاقی اور روحانی اوصاف نمایاں کیے گئے ہیں مگر کون ہے جو ان اشعار کو پڑھ کر اس ذات اقدس پر اپنی روح فدا کرنے اور اسلامیوں کے نام پر آنسو بہانے کو تیار نہ ہو جائے۔

مسدس کا شائع ہونا تھا کہ شعرا کے اس طبقہ نے جو رسمی اور تقلیدی شاعری کا اجارہ دار تھا اور جس کے کان نغمہ کی اس نئی لے سے نامانوس تھے اس کے خلاف ایک طوفان بپا کر دیا۔ اس کی زبان اور انداز بیان پر نکتہ چینیاں ہوئیں۔ اس کی نقالی کی گئی۔ ''مسدس خالی'' تصنیف ہوا، ملک کے رسائل میں مسلسل اختلافی مضامین شائع ہوئے۔

مسدس کی ادبی حیثیت پر جتنے اعتراضات ہوئے ہیں۔ انہوں نے ایک تاریخی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ مگر ایک بے لاگ نظر سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں اُردو کے اہل زبان ادب اور تنقید کے مفہوم سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ آرٹ کا مقصد بقول شلر ''زندگی میں لطف پیدا کرنا ہے'' اور اس سے لطف اندوز

ہونے کے لیے سب سے پہلی اور بڑی شرط اس امر کی ہے کہ آرٹ ناظر کی سمجھ سے باہر نہ ہو بلکہ پوری طرح سمجھ میں آئے پھر اگر زیادہ سے زیادہ ناظرین اس سے لطف اندوز ہوسکیں یا فائدہ اُٹھا سکیں تو یہ آرٹ کی معراج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں مشہور روسی آرٹسٹ ٹائلسٹائے کے نظریہ کے مطابق نقادوں کا ایک گروہ اس کا قائل ہے کہ آرٹ کا کمال ہے کہ جاہل اور غریب سے غریب لوگ اس کی قدر و قیمت سے صحیح طور پر واقف اور لطف اندوز ہوسکیں۔ اسی لیے سادگی آرٹ کا زیور سمجھا جاتا ہے۔ پھر اگر آرٹ کا موضوع اور تخیل مبارک اور نصب العین بلند ہوتو آرٹ میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ شاعری بھی ایک آرٹ ہے اور اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں آرٹ کے اس بلند نظریہ سے جب ہم مسدس حالی کو جانچتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی زبان نہایت صاف رواں اور سیدھی سادی ہے، گہرے اور معنی خیز مطالب اور عبرت انگیز و رقت خیز مضامین کو روز مرہ میں ادا کیا گیا ہے۔فن کی رعایات اور رسمی شاعری کی خصوصیات سے مطلق سروکار نہیں رکھا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ موضوع میں بلندی اور اثر آفرینی ہے۔ اس کا تعلق ایک قوم کی حیات و موت سے ہے اور اس کے اشعار درد و اثر اور سوز و گداز سے معمور ہیں۔

ڈاکٹر گریہم بیلی:

اُردو لٹریچر بزبان انگریزی کتاب میں مسدس کے بارے میں لکھتے ہیں۔
اُردو میں پچھلے سو سال کی بہترین مسلسل اور بیانیہ نظم ہے۔

حالؔی کی نظمیں ۔۔ تحقیقی گفتگو

اُردو کے ادیبوں مؤرخوں شاعروں محققوں اور ناقدوں کا یہ بھی عجیب مزاج اور طریقہ کار ہے کہ بغیر صحیح تحقیق اور ادبی چھان بین کے ہر مثبت اور منفی مسئلہ کو کسی ممدوح یا مطعون کے نامہ اعمال میں لکھ دیتے ہیں جو عموماً کسی معروف و مشہور شخص کی تحریر یا تقریر کا حصہ ہوتا ہے۔ تحقیق اور تنقید کا ایک اہم عمل حق دار کو اس کا حق دینا بھی ہے۔ حالی کی شاعری اور نظریہ شاعری کی تبدیلی اور شعری اور نثری انقلاب جس کی عمدہ مثالیں ان کی نظمیں بخصوص مسدس مدوجزر اسلام اور مقدمہ شعر و شاعری کے ہمراہ سوانح نگاری کے نمونے حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید ہیں وہ سب صرف اورصرف سرسید کی علی گڑھ ادبی تحریک کا نتیجہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسدس حالی سرسید کی تحریک پر تصنیف ہوا جس کا خود ذکر حالی نے کیا لیکن اس طرح کی نظم لکھنے کی مشق اور ایسی پرخلوص جذباتی سچی پرجوش نظم جس میں سماجی اخلاقی اقتصادی اور تہذیبی حقیقتوں کا سلیس اور واضح ذکر ہونا کہ عامی سے عالم تک اس سے فائدہ اٹھا سکیں صرف سرسید کی ایک ملاقات کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ایک طرف حالی کے دل کے الاؤ میں یہ خیالات پک رہے تھے تو دوسری طرف

انجمن پنجاب کی تحریک کے منعقدہ مشاعروں میں اس کی مشق جاری تھی۔ دلی کی بضاعت لٹنے کے بعد اُردو شعروادب کا جو قافلہ لاہور پہنچ کر شمع اُردو کی لَو کو اونچا کیا اس کے سرخیل محمد حسین آزاد تھے۔ ان کے ساتھ قافلے میں آہستہ آہستہ شامل ہونے والوں میں مولوی کریم الدین، سید احمد دہلوی، پنڈت من پھول پیارے لال آشوب، الطاف حسین حالی اور درگاہ پرشاد نادر شامل تھے۔ لاہور گورنمنٹ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لائٹز نے انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی اور محمد حسین آزاد نے اسے ایک فعال تحریک میں تبدیل کیا جس کا مقصد سیاسی نہیں بلکہ خالص ادبی سماجی اخلاقی اور اقتصادی تھا تاکہ برصغیر کے لوگوں کی اصلاح ہو سکے۔ آزاد کے ذہن میں ۱۸۶۷ء سے ہی اُردو شعر و ادب کی پاک سازی کا رجحان تھا چناں چہ غزل کے بے رمق عشقیہ شعروں پر سر دھننے کے بجائے نیچر کے موضوعات کو مشاعروں کا مضمون بنایا گیا۔ پنڈت کیفی لکھتے ہیں:

> ''مولانا آزاد کو ۱۸۷۴ء سے بہت برس پہلے اُردو کی تجدید اور اصلاح کا خیال پیدا ہوا تھا۔ تاریخی ثبوت ہمیں ۱۸۶۷ء تک پہنچاتا ہے۔ چناں چہ اگست ۱۸۶۷ء کے ایک جلسے میں آپ نے ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' پر ایک مفصل تقریر فرمائی۔''

شاید یہی جدید فکر نے برصغیر کے شعرا کو متحرک کیا جس کا نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُسی زمانے میں اسماعیل میرٹھی نے انگریزی کی چار نظموں کے منظوم ترجمے کیے جو کامیاب رہے۔ سرسید ۱۸۶۹ء انگلینڈ گئے اور پھر آنے کے بعد سائنٹفک سوسایٹی، مدرسہ دارالعلوم کی تاسیس اور تہذیب الاخلاق رسالے کا اجرا کیا جس میں وہ آزاد کی جدید نیچر کی شاعری کا ذکر کر کے اس پیغام کو اپنی تحریک کا حصہ بناتے ہیں۔ سرسید نے علی گڑھ گزٹ میں لکھا:

''اہل پنجاب کی کوششوں سے ہماری شاعری سے محبوب دور ہو رہے ہیں سال گزشتہ کا وہ پہلا مشاعرہ ہماری زبان کی تاریخ میں یادگار رہے گا جب لاہور میں فطری شاعری کی قلم لگائی گئی۔''

محمد حسین آزاد کی ایما پر ڈاکٹر ہال رایڈ کی کوششوں سے ۱۸۷۴ء اور ۱۸۷۰ء میں دس مشاعرے سکھشا سبھا ہال لاہور میں منعقد کیے گئے۔ ان مشاعروں میں جن موضوعات پر نظمیں پڑھی گئیں ان میں برسات، زمستان امید، حب وطن، امن، انصاف، مروت، قناعت، تہذیب اور اخلاق شامل تھے۔ ان مشاعروں میں پندرہ بیس شاعر شرکت کرتے تھے۔ محمد حسین آزاد ہر مشاعرے کی روح رواں تھے۔ حالی نے صرف چار مشاعروں میں شرکت کی جو ۱۸۷۴ء مئی، اگست، ستمبر اور نومبر کو برسات، امید، حب وطن اور انصاف کے موضوعات پر برگزار ہوئے۔ مشاعرے میں جو شعرا شریک ہوئے اُن میں سوائے حالی اور آزاد کے کوئی بڑا اور نامور شاعر نہ تھا۔ ان مشاعروں سے متاثر ہوکر انگریز حکام نے نظم کو نصاب میں شامل کیا۔ محمد حسین آزاد کے خیالات ''آفتاب پنجاب'' کے ذریعے اُردو شعرا کو متاثر کرنے لگے اُدھر تہذیب الاخلاق نے نئی نسل کو ہموار کیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے سچ کہا ہے:

''لاہور کے مشاعروں نے حالی کا ادبی مزاج بدلنے میں اتنا اہم کردار ادا کیا کہ وہ بالآخر ''مسدس مدوجزرِ اسلام'' جیسی مربوط اور اثر انگیز طویل نظم لکھنے پر قادر ہو گئے۔ حالی مشاعرہ انجمن کے کامیاب اور مقبول شعرا میں سے تھے۔ تاہم ان کی شاعری کا جدید انداز دلی کو مراجعت کے بعد نسبتاً زیادہ کھل کر سامنے آیا اور انھوں نے مستقبل کے ادبی منظر کو متاثر کیا۔ چناں چہ نظم جدید کو مقبول بنانے کا سہرا ان کے سر بھی بندھتا ہے۔ بلاشبہ حالی اس

اعزاز کے پورے حق دار ہیں تاہم انجمن پنجاب کی تحریک میں اوّلیت اور فوقیت کا جو بلند مقام آزاد کو حاصل ہے وہ صرف انہیں کو سجتا ہے تحریک انجمن پنجاب اپنے عہد کی ایک فعال سماجی اور ادبی تحریک تھی۔ مشاعرہ انجمن نے اُردو نظم میں انقلاب بپا کرنے اور شاعری کو فطرت اور صداقت کے قریب تر لانے میں قابلِ قدر خدمات سرانجام دیں۔"

حالی معترف ہیں کہ انہوں نے ابتدائی تعلیم قدامت پرست اساتذہ کی نگرانی میں حاصل کی۔ جب آزاد لاہور میں اُردو شاعری میں انقلاب لانے کے لیے انجمن پنجاب کی تحریک کو فروغ دے رہے تھے تو حالی عیسائی مبلغ پادری عمادالدین کے ساتھ مناظروں میں الجھے ہوئے تھے اور "ہدایت المسلمین" کے جواب میں "تریاق مسموم" لکھ رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شیفتہ کی صحبت نے ان کے خیالات کو منقلب کرنا شروع کر دیا تھا اور انہیں بے جا مبالغہ آرائی سے نفرت ہو گئی تھی تاہم جدید تصورات سے ان کا اولین سابقہ لاہور میں ہوا اور انجمن پنجاب نے مشاعرہ جاری کیا تو حالی نے نہ صرف اس میں شرکت کی بلکہ چار مثنویاں بھی لکھیں اور پیروی مغرب کی طرف مائل ہو گئے۔

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن   راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا
حالی اب آؤ پیرویٔ مغربی کریں   بس اقتدائے مصحفی و میرؔ ہو چکی

چناں چہ اسی لیے حالی نے جب آزاد کی آب حیات پر اعتراضات ہونے لگے تو آبِ حیات کی تائید اور آزاد کے خیالات کی حامی بھری۔ حالی آزاد کی بہت عزت کرتے تھے۔ شبلی بھی آزاد کے رطب اللسان تھے۔ مولوی عبدالحق کا "ہم عصر" میں آزاد کو حالی کا حاسد بتانا اور حالی کی تعریف نہ کرنے کا الزام دھرنا سوت کا رنگ نہیں

بلکہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتا ہے۔ جب تک آزاد ذہنی اعتبار سے تندرست رہے ہر اُردو خدمت گزار کے مدح خواں رہے۔

حالی نہ صرف آزاد کی آبِ حیات کے دل دادہ تھے بلکہ ان کی دیگر تصانیف کے عاشق تھے اور جدید خیالات کے مقلد۔ حالی گلچین تھے وہ ایک تخلیقی ذہن کے ساتھ ایک سلجھا ہوا تنقیدی رویہ بھی رکھتے تھے۔ اُردو نظم نگاری کے بانی نہ حالی تھے اور نہ آزاد اُردو کا سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے دیوان میں موضوعات پر کئی نظمیں ملتی ہیں اسی طرح نظیرا کبرآبادی نے بھی نظموں میں جان ڈالی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آزاد نے سب سے پہلے نظم معرّی اپنے دیوان میں شامل کی جس میں ردیف اور قوافی کو ترک کیا ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری سے بیس (۲۰) سال پہلے آزاد نے جو نیچرل شاعری پر لیکچر دیا اُس کے اقتباسات کو مقدمہ کے متن سے ملا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ نقوش حالی کے ذہن میں پختہ تجربوں کی طرح محفوظ تھے۔ آزاد کہتے ہیں:

> ''اے گلشن فصاحت کے باغبانوں، فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغے اور بلند پروازی کے بازوؤں سے اڑے۔ قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے۔ لفاظی اور شوکتِ الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم، کسی شے پر رغبت یا اس سے نفرت، کسی شے سے خوف یا خطر یا کسی شے پر قہر یا غضب، غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو اس کے بیان سے وہی اثر، وہی جذبہ، وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے۔ جو اصل کے مشاہدے سے ہوتا ہے۔ بے شک مبالغے کا زور، تشبیہہ

اور استعارے کا نمک، زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر پیدا کرتا ہے لیکن نمک اتنا ہی چاہیے کہ جتنا نمک کھانے میں۔ نہ کہ تمام کھانا نمک............''

''............ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں، لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے۔جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے، ہار، طرّے ہاتھوں میں لیے حاضر ہیں اور بے چاری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے لیکن اب وہ بھی منتظر کھڑی ہے کہ کوئی صاحبِ ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔''

''نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں انگریزی صندوقوں میں بند پڑے ہیں۔''

اُردو موضوعاتی نظم کا بانی کوئی بھی ہو ہمیں اُس سے سروکار نہیں مگر ہم اتنا جانتے ہیں جس شاعر نے سب سے پہلے نظم جدید کو مقبول اور معروف کیا وہ صرف الطاف حسین حالی تھے۔ حالی کا کمال یہ بھی تھا کہ وہ مغربی طرز کی شاعری کرتے ہوئے بھی مشرقی مثبت قدروں کے محافظ تھے۔ انجمن پنجاب کے مناظموں میں آزاد اور حالی کے علاوہ اشرف بیگ اشرف، الٰہی بخش رفیق، انور حسین ہما، محمد مقرب علی، قادر بخش، ولی دہلوی، علاالدین محمد اور دیگر مقامی شعرا شرکت کرتے تھے۔ اگرچہ آزاد کی نظمیں طوالانی اور زبان واسلوب سے استادانہ رنگ رکھتی تھیں لیکن حالی کی نظمیں جو مثنوی کی ہیئت میں

سادگی اور سلاست سے بھری رہتیں۔ گلدستہ شعر کا گل سرسبد قرار پائیں۔ چناں چہ لاہور کی ان نظموں کی شہرت برصغیر میں ہونے لگی۔ سرسید نے جو آگے چل کر حالی سے مسدس لکھوایا وہ انہی نظموں کی کشش اور قدرت سے مرعوب ہو کر کہا تھا۔ سرسید حالی کی ان نظموں پر جو مثنویوں کی ہیئت میں پیش ہوئیں تھیں ریویو کرتے ہوئے تہذیب الاخلاق ۱۲۹۲ ہجری میں لکھتے ہیں:

> ''مولوی خواجہ الطاف حسین........... کی مثنویوں نے تو ہمارے دلوں کے حال کو بدل دیا ہے ان کی مثنوی حب الوطن اور مثنوی ''مناظرہ رحم و انصاف'' جو پنجابی اخبار میں چھپی ہے۔ درحقیقت ہمارے علم و ادب کا ایک کارنامہ ہے۔ ان کی سادگی الفاظ، صفائی بیان عمدگی خیال ہمارے دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے۔ وہ مثنویاں آبِ زلال سے زیادہ خوشگوار ہیں۔ بیان میں، زبان میں، آمد میں، الفاظ کی ترکیب میں سادگی و صفائی میں کیسی عمدہ ہیں کہ دل میں بیٹھی جاتی ہیں۔''

برکھارت، عمدہ منظرنگاری کا شاہکار

حالی نے ۱۸۷۴ء میں ایک سو چوالیس (۱۴۴) اشعار کی مثنوی برکھارت اُس جدید مشاعرے میں پڑھی جو ہال رائڈ کی ایما پر محمد حسین آزاد نے موضوعاتی شاعری کے فروغ کے تحت لاہور میں برگزار کیا تھا۔ حالی کی یہ نظم پسند کی گئی اور اس پر سرسید کے علاوہ اخبار پنجاب نے بڑی تعریف کی جس کو گارساں دتاسی نے اپنے مضمون میں نقل کیا:

> ''جس نے یہ نظم نہ پڑھی ہو وہ پڑھ کر دیکھے کہ شاعر نے کس خوبی سے یہ تصویر بنائی ہے۔ جنھوں نے شاعر کی زبان سے اسے سنا وہ مرحبا کہہ اٹھے اور کوئی صاحب ذوق اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکتا۔ وطن کی خصوصیتوں کو ایسی عمدگی سے بیان کیا ہے کہ اور کسی مثنوی میں اس کی نظیر نہ ملے گی۔ بڑی بات یہ ہے کہ شاعر نے کوئی بے موسم کی راگنی نہیں چھیڑی اور نہ حسن وعشق کے چرچے کیے پھر بھی اس کی سادگی اور رنگینی جادو کا کام کرگئی۔''

مشہور ہے کہ اشیا اپنی ضد سے جانی جاتی ہیں۔ ہم روشنی کو اندھیرے سے، غم

کو خوشی سے، خشکی کو تری سے گرمی کو سردی سے جانتے اور ان کی اہمیت اور برکت سے آشنا ہوتے ہیں۔ چوں کہ جس موضوعی مشاعرے میں حالی نے یہ نظم پڑھی اس کا موضوع برسات تھا اس لیے شاعر نے برسات کی اہمیت اور اس کی ضرورت بتانے کے لیے خشک سالی اور گرمی کا بیان پہلے کیا کہ زمانہ مضطرب، جاندار بے چین اور پریشان، نباتات اور جمادات بھی ویران اور سنسنان ہو چکے ہیں۔ حالی کے چند مصرعے دیکھیے:

گرمی سے تڑپ رہے تھے جاں دار　　اور کھول رہا تھا آب دریا
اور لُو سے ہرن ہوئے تھے کالے　　چیتوں کو نہ تھی شکار کی سدھ
تھے شیر پڑے کچھار میں سست

پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کھار　　دولہا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
کرتے ہیں پپیہے پیہو پیہو　　اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو

ہر مذہب کے ماننے والے اپنے اپنے طریقے پر رحمت باری کا شکر ادا کر رہے ہیں۔

مسجد میں ہے ورد اہل تقویٰ　　یا رب لنا ولا علینا
''اے ربّ! اس سے ہمیں فائدہ ہو، نقصان نہ ہو۔''

مندر میں ہے ہر کوئی یہ کہتا　　کرپا ہوئی تیری میگھ راجا
کرتے ہیں گرو گرو گرنتھی　　گاتے ہیں بھجن کبیر پنتھی
رکھشک جو بڑے ہیں جین مت کے　　ڈھکنے ہیں دیوں پہ ڈھکتے پھرتے

حالی کے برسات کے مثبت اور کچھ منفی اثرات کو جمادات، نباتات، حیوانات اور انسانوں پر بڑے ہی خوبصورتی سے نظم کیا ہے۔ اس نظم میں منظر نگاری، آسان ذود فہم تشبیہات، استعارات سے اشعار کو رنگین بنایا گیا ہے...... یہ نظم بہار کا مرقع

معلوم ہوتی ہے، پرندوں کی نغمہ سرائی پھولوں کی جلوہ نمائی، دریاؤں کی تیز روانی، جھیلوں اور تالابوں کی طوفانی کے ساتھ ساتھ سڑکوں کی ناہمواری گھروں کی نابودی اور بیماریوں کی زیادتی وغیرہ کا بھی نقشہ کھینچا گیا ہے تاکہ برسات کے سکے کے دونوں رخ دکھائی دیں۔

قدرت کے عجائبات کی کان — عارف کے لیے کتاب عرفان
گلشن کو دیا جمال تو نے — کھیتی کو کیا نہال تو نے
طاوس کو ناچنا بتایا — کوئل کو الاپنا سکھایا
دریاؤں میں تو نے ڈال دی جان — اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان
دولت جو زمین میں تھی مخفی — آگے ترے اس نے سب اگل دی
جن باغوں میں اُڑتے تھے بگولے — واں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
ہیں دھیان میں کلفتیں سفر کی — آپے کی خبر ہے اور نہ گھر کی

اس نظم کے آخری چند شعر حالی نے اپنے گھر اور باطن کی یاد میں لکھے۔ یہاں یہ بات بھی خارج از محل نہیں کہ حالی کو لاہور کی آب و ہوا سازگار نہ تھی وہ ہمیشہ بیمار اور دکھی رہتے تھے چناں چہ اس نظم کے چند مہینوں بعد وہ ہمیشہ کے لیے دلی چلے گئے۔

پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد — جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی — چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
گرمی کا لگا ہوا تھا بھبکا — طوفان تھے آندھیوں کے برپا
اٹھتا تھا بگولے پر بگولا — شعلے تھے زمین سے نکلتے

حالی کے ان مصرعوں پر انیس کی گہری چھاپ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان مضامین میں انیس کا کینوس اس قدر وسیع ہے کہ مضمون باندھتے وقت اقلیم انیس سے نکلنا دشوار ہے۔ انیس کے مرثیے ''جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے'' میں جو انیس نے

آٹھ بندوں میں گرمی کا ذکر کیا ہے اس کے چند مصرعوں سے اوپر بیان کیے گئے حالی کے مصرعوں سے ملا کر دیکھیے:

گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر　　کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا
آہو جو کالے تھے تو تھے چیتے سیاہ فام

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے　　گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرداب پر تھا شعلۂ جوالہ کا گماں

یہی نہیں بلکہ اسی گرمی کے اثر کو حالی نے جو بچوں پر بتایا ہے وہ بھی مرثیے کی دین میں محسوب ہوگا۔

اور صبح سے شام تک برابر　　تھا العطش العطش زبان پر
بچوں کا ہوا تھا حال بے حال　　کمھلائے ہوئے تھے پھول سے گال
ہر بار پکارتے تھے ماں کو　　ہونٹوں پہ تھے پھیرتے زباں کو

کیا یہ اشعار مرثیہ کے معلوم نہیں ہوتے؟

حالی نے گرمی کی زحمت اور تکلیف بتانے کے بعد برسات کی رحمت اور نعمت کیا ذکر کیا ہے۔

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں　　جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا　　اک شور ہے آسماں پہ برپا
باغوں نے کیا ہے غسل صحت　　کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت

دولت اور وقت کا مناظرہ
دو مثبت قدروں کا جمال

اُردو شعر و ادب کی یہ بدقسمتی ہے کہ بعض گراں بہا جواہر اُردو کے پرستاروں سے ظاہر ہو کر بھی مخفی ہیں۔ حالی کی بہت سی نظمیں نہ صرف ہمارے مطالعے میں ہوتیں بلکہ ان کو اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں ہونا چاہیے تھا۔ حالی کے مسدس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ ان کی دوسری مثنویاں اس کے سامنے بے نور ہو کر اُردو دشت میں جلتی رہیں جن میں ایک سینتالیس (۴۷) اشعار کی مثنوی دولت اور وقت کا مناظرہ ہے۔ ہمارے مطالعے میں علم و دولت، شاعری و موسیقی، حسن و عشق اور کئی دوسرے قدروں کے مناظرے نظر آتے ہیں لیکن دولت کا وقت کے ساتھ جس میں دونوں قدروں کی مثبت جہتیں بتائی گئی ہیں کم ہے۔ حالی نے یہ مثنوی اُس دور میں لکھی جب وہ غزل گوئی سے زیادہ شغف نہیں رکھتے تھے۔ حالی کی دوسری نظموں، قطعوں، غزلوں، رباعیوں اور نظموں کی طرح اس مثنوی میں بھی سادہ سلیس زبان ملتی ہے۔ جس سے عامی اور عالم دونوں مستفید ہو سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حالی نے نہ صرف اُردو شاعری کے مضامین کو بدلا بلکہ اس کی زبان کو بھی زمانے کے اعتبار سے بنایا۔

مثنوی یوں شروع ہوتی ہے:

ایک دن وقت نے دولت سے کہا سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا

تو ہے سرمایہ عزت یا میں؟

کیوں کہ دولت کے آثار نمایاں ہوتے ہیں اور وقت کا اثر صرف کامیاب افراد سمجھ سکتے ہیں اس لیے......

وقت سے ہنس کے یہ دولت نے کہا سبز ہے گلشنِ دنیا مجھ سے

مجھ سے پاتے ہیں ہنر نشو و نما

نام اقبال ہے آنے کا مرے لقب ادبار ہے جانے کا مرے

خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر میں نہ ہوں تو نہیں کچھ قدر بشر

کوئی حاجت نہ ہو دنیا کی روا درمیاں گر نہ قدم ہو میرا

جس سے دنیا میں نہ میں راہ کروں ہو اگر شیر تو روباہ کروں

جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھ کو میری عظمت نہیں باور تجھ کو

مناظرہ کرتے وقت مثبت اور منفی قوتوں کو آمنے سامنے پیش کیا جاتا ہے لیکن یہ حالی کا کمال ہے کہ دونوں قدروں کی قدر و قیمت میں تقابل کر کے مناظرے میں جان ڈالتے ہیں اور ملٹن کے قاعدے کے مطابق شعر کو سچا اور سادہ بناتے ہیں۔ ہم کسی مزید تشریح کے رواں مصرعوں سے نثر کا کام لیتے ہیں۔ جو بقول شبلی نعمانی وہ شعر جس کی نثر نہ ہو سکے وہ اچھا شعر ہے کیونکہ سادہ سلیس الفاظ میں روز مرّہ میں کہا گیا ہے۔

وقت نے سن کے کہا اے دولت!

ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے مگر اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجھ کو خبر

کیجیے فرض تجھے گر چشمہ تو ہوں چشمے کا میں سرچشمہ

تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں

ہے عبث تجھ کو تفوق کا خیال
تو ہے گر مال تو میں راس المال

جن لوگوں نے وقت کا لحاظ رکھا وہی لوگ دنیا و آخرت میں کامیاب اور سرخ روٹھہرے۔ وقت دریا کے پانی کی طرح واپس نہیں لوٹتا، دنیاوی کام کاج وقت کے محتاج، دینی ذمہ داریاں سب وقت کی پابند، وقت کی اہمیت قدر و قیمت سے واقف دنیا کے عظیم افراد ہیں اگرچہ ان کے پاس شاید دولت کا انبار نہ ہو۔ دولت مٹھی میں رہتی ہے لیکن وقت آزاد ہے۔

ان کی مٹھی میں ہے تو اے دولت
طائرِ رشتہ بہ پا کی صورت

نہ کہ میں جس کا بدل ہے مفقود
جس کا نایاب ہے عالم میں وجود

کھو کے مجھ کو کوئی پاتا نہیں پھر
جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر

جانتے ہیں حکما و عرفا
مجھ کو سرمایۂ دین و دنیا

گن تو ہیں مجھ میں بہت اے دولت!
ہے مگر تنگ مجال فرصت

نشاط امید، ناامیدی زندگی کی موت ہے

حالی نے یہ اناسی (۷۹) اشعار کی مثنوی ۱۸۷۴ء میں محمد حسین آزاد کے موضوعی مشاعرے لاہور میں پڑھی۔ ہر دین میں اور خصوصی طور پر اسلام میں ناامیدی کو کفر قرار دیا گیا ہے شاعروں نے امید کو زندہ دلی اور ناامیدی کو مردہ دل کہہ کر اس بات کو بانگ دُہل کہنے کی کوشش کی ہے۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں

اس مثنوی کا اصلی محور جوہر اور مبدا اُمید ہے جو ایک صحت مند کارآمد اور کامیاب ذہن کی نشوونما کے لیے وہی کام کرتی ہے جو خون میں آکسیجن۔ حالی کی یہ نسبتاً طویل مثنوی عنوان کے گرد ہی گردش کرتی نظر آتی ہے۔ مثنوی کیا ہے ایک گلدستہ ہے جس میں خیالات جذبات واقعات تلمیحات، استعارات، تشبیہات، محاورات کو سلیقے اور رنگینی سے نرم خوش رنگ، الفاظ کی ڈور سے باندھا گیا ہے تاکہ خیالوں کے پھول ایک دوسرے سے الگ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بندھے رہیں۔

نظم کے آغاز میں امید کو جان نواز، دل سوز، کارساز، عیش اور رنج کی شفیق، دکھ اور سکھ کی رفیق وغیرہ بتایا گیا ہے۔ ہر مصرعہ سچا اور سادگی سے لبریز ہے۔

اے مری امید مری جاں نواز — اے مری دل سوز مری کارساز
عیش میں اور رنج میں میری شفیق — کوہ میں اور دشت میں میری رفیق
دل پہ پڑا آن کے جب کوئی دکھ — تیرے دلاسے سے ملا ہم کو سکھ
جی کو ہوا گر کبھی عسرت کا رنج — کھول دیے تو نے قناعت کے گنج
خاطر رنجور کا درماں ہے تو — عاشق مہجور کا ایماں ہے تو

تمہید کے بعد حالی قدیم واقعات کا ذکر تلمیحات اور اشارات میں کرتے ہیں یعنی مصرعہ میں پوری داستان کو گھول کر یہ بتاتے ہیں کہ یہی امید تھی جس سے کامیابی، روشنی، زندگانی اور کامرانی کا راستہ طے ہوا۔

نوح علیہ السلام کی کشتی کا سہارا تھی تو — چاہ میں یوسف علیہ السلام کی دل آرا تھی تو
تو نے ہی رانجھے کی یہ بندھوائی آس — ہیر تھی فرقت میں بھی گویا کہ پاس

ذیل کے شعر میں حالی کو رام کی جگہ پانڈو اور پانڈو کی جگہ رام لکھنا تھا کیوں کہ رام کو بن باس ملا ور پانڈوں کو جنگ کرنی پڑی۔ حالی کہتے ہیں:

رام کے ہمراہ چڑھی رن میں تو — پانڈو کے بھی ساتھ پھری بن میں تو

حقیقت یہ ہے کہ امید ایک ایسی مثبت قدر ہے جس میں منفی کا شائبہ بھی نہیں۔ امید ہی نیکی اور ایمان و ایقان سے بندھی ہے۔ امید ہی دین و دنیا کی کامیابی کا راز ہے اور یہی عاقبت کی کلید بھی ہے۔

دین کی تجھ بن کہیں پرسش نہ ہو — تو نہ ہو تو حق کی پرستش نہ ہو
دونوں جہاں کی ہے بندھی تجھ سے لڑ — دین کی تو اصل ہے دنیا کی جڑ
نام ہے سدرہ کبھی طوبیٰ ترا — روز نرالا ہے تماشا ترا
کوثر و تسنیم ہے یا سلسبیل — جلوے ہیں سب تیرے یہ بے قال و قیل

دنیا کے کاموں میں امید کی وجہ سے کامیابی ہے۔ امید کسی مثبت اور خوش

حالی ماحول سے پہلے اس کا نقشہ ذہنوں میں کھینچ دیتی ہے۔ امید ہی ہے جو لاعلاج مریضوں کو بھی تندرست ہونے کے خواب دکھاتی ہے۔ فقیر اور لاچار کو ہوائی محلوں میں سلاتی ہے۔ حالی نے مثنوی میں محاورے اور معروف فقروں کو جوڑ کر اشعار میں شعری چاشنی پیدا کی ہے۔

وعدہ وفا کرتی ہے گو چند تو — رکھتی ہے ہر ایک کو خورسند تو
آنے نہ دے رنج کو مفلس کے پاس — رکھے غنی اس کو رہے جس کے پاس
جن کو میسر نہیں کملی پھٹی — خوش ہیں توقع پہ وہ زربفت کی
چٹنی سے روٹی کا ہے جن کے بناؤ — بیٹھے پکاتے ہیں خیالی پلاؤ

حالی نے اُمید کی تمام قدریں بتا کر اس نظم کے آخر میں یہ بتایا ہے کہ جب ناامیدی انسان کو اسیر کر لیتی ہے اور اس سے دین و دنیا کے رشتے کو توڑ دیتی ہے تو زندگی وبال جاں بن جاتی ہے۔

ہوتا ہے نومیدیوں کا جب ہجوم — آتی ہے حسرت کی گھٹا جھوم کر
جی میں یہ آتا ہے کہ سم کھایئے — پھاڑ کے کپڑے باہر نکل جایئے
ہوتا ہے شکوہ کبھی تقدیر کا — اڑتا ہے خاکہ کبھی تدبیر کا

مگر جیسے ہی امید کی کرن چمکتی ہے۔

کان میں پہنچی تری آہٹ جو ہیں — رخت سفر یاس نے باندھا وہیں
ساتھ گئی یاس کے پژمردگی — ہو گئی کافور سب افسردگی

حب وطن۔ حالؔی کی وطن دوستی کا مستند حوالہ

حالی نے اپنے لاہور کے قیام کے دوران انجمن پنجاب کے برگزار مشاعرے میں شرکت کر کے ایک طویل مثنوی ''حب وطن'' ۱۸۷۴ء میں پڑھی جس کی دھوم شعر و ادب میں آج بھی باقی ہے۔ملٹن نے جو تین شرطیں اچھے شعر کے لیے بیان کی تھی وہ سادگی جذبات اور اصلیت تینوں یہاں موجود ہیں۔ اس مثنوی میں کل دو سو پندرہ (۲۱۵) اشعار محبت کے دھاگے میں پیروئے گئے ہیں۔ یہاں شاعر وطن کے ہم وطنوں کو باہم محبت اخوت ھمکاری ہمدردی ہمنوائی ہمراہی اور ہم بستگی کی طرف احساس ملی قومی اور وطنی سے جوڑ رہا ہے۔

حالی کے فن پر کام کرنے والوں نے اس مثنوی کے کئی اشعار مختلف پرائے میں نقل کیے ہیں۔ اس مقام پر ہم پوری مثنوی کا مختصر اور جامع جائزہ لیں گے۔ اس مثنوی کا حسن یہ بھی ہے کہ اسے بلاتفریق مذہب وملت صرف اہل وطن ہونے کی نسبت سے پیش کیا گیا ہے۔تمہید میں وطن کی تاریخ جغرافیہ کے علاوہ اس کی تہذیب اور تمدن کا ذکر بھی خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی زمین اس کے پربت اس کی ہوائیں اس کے موسم اس کے دشت و باغات اس کے چرندو پرند سب اہل وطن کے لیے دل شاد

اورنورچشم معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر کے دل و دماغ میں یہ تمام مناظر اور یادیں تازہ ہیں جن کی قدر و قیمت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب وطن سے دوری ہوتی ہے۔

اے پہاڑوں کی دل فریب فضا — اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
اے عنادل کے نغمۂ سحری — اے شب ماہتاب تاروں بھری
تیری دوری ہے مورد آلام — ترے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام
کوہ و صحرا و آسمان و زمیں — سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
مٹ گیا نقش کامرانی کا — تجھ سے تھا لطف زندگانی کا
سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے — یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
تیری اک مشت خاک کے بدلے — لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

وطن کی محبت کی تمہید کے بعد حالی نے قدیم تاریخ کا دروازہ کھولا جہاں ہندوستان کے اصلی باشندوں کو آریا قوم نے اپنا غلام بنالیا اور پھر اس وطن پر حملہ آوروں نے حکومت برقرار کی۔

گو غلامی کا لگ گیا دھبا — نہ چھٹا اُن سے دیس پر نہ چھٹا

وطن کی اہمیت اور محبت کو شاعر نے تین مختلف مقامات اور واقعات سے اجگار کیا۔ ہندوستان میں رام چندر جی کو ان کے وطن اجودھیا سے نکل کر چودہ برس پردیس میں بن باس میں گزارنا پڑا۔

جب ملا رام چندر کو بن باس — اور نکلا وطن سے ہو کے اُداس
پاؤں اٹھتا تھا اس کا بن کی طرف — اور کھنچتا تھا دل وطن کی طرف
گزرے غربت میں اس قدر مہ و سال — پر نہ بھولا اجودھیا کا خیال
تیر اک دل میں آ کے لگتا تھا — آتی تھی جب اجودھیا کی ہوا

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین سے جب وطن مکہ چھوٹا اور انہوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اس کا نقشہ یوں کھینچا۔

ہوئے یثرب کی سمت جب راہی ۔۔۔ سید بطحی کے ہم راہی
گو وطن سے چلے تھے ہو کے خفا ۔۔۔ پر وطن میں تھا سب کا جی اٹکا
دل میں آٹھوں پہر کھٹکتے تھے ۔۔۔ سنگریزے زمین بطحا کے
گھر جفاؤں سے جن کے چھوٹا تھا ۔۔۔ دل سے رشتہ نہ ان کا ٹوٹا تھا

حضرت یوسف علیہ السلام سے بھی کنعان وطن چھوٹا وہ ہمیشہ نہ صرف کنعان کی یاد میں تھے بلکہ وطن والوں کی مدد بھی کرتے تھے۔

ہوئیں یوسف علیہ السلام کی سختیاں جب دور ۔۔۔ اور ہوا ملک مصر پر مامور
یاد کنعاں جب اُس کو آتی تھی ۔۔۔ سلطنت ساری بھول جاتی تھی
دکھ اٹھائے تھے جس وطن میں سخت ۔۔۔ تاج بھاتا تھا اُس بغیر نہ تخت

ان کو بیان کر کے حالی گریز کرتے ہیں کہ وطن کی محبت اگر سچی ہو تو وہ صرف وہاں کے جمادات نباتات، حیوانات کی حد تک محدود نہ ہو بلکہ اصل چیز تو انسانوں اور ہم وطنوں کی محبت اخوت اور ان کی خوشی میں خوشی ان کے غم میں غم ہونا چاہیے۔ حالی نے ایک طولانی پند ونصیحت کیا ہے وہ اصلی وطن دوستی اہل وطن کی مدد سمجھتے ہیں۔

مرد ہوتو کسی کے کام آؤ ۔۔۔ ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
کھاؤ تو پہلے لو خبر ان کی ۔۔۔ جن پہ پپتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ ۔۔۔ کہ ہے اترن تمہاری جن کا بناؤ
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ ۔۔۔ تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ

شاعر کہتا ہے ہندوستان میں اتحاد اور اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے اُسے بیرونی حملہ آوروں نے آسانی سے زیر کرلیا۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی سب بھائی بھائی ہیں۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر　　نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو　　بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی　　جین مت ہووے یا ہو بیشوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو　　سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ہند میں اتفاق ہوتا اگر　　کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا　　کبھی درانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا　　کبھی محمود نے غلام کیا
سب سے آخر کو لے گئی بازی　　ایک شائستہ قوم مغرب کی

شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ صرف مختلف مذاہب اور ملتیوں کے نفاق کی بات کر رہا ہے بلکہ ایک ہی قوم کے مختلف گروہوں کی آپس کی رسا کشی جو خودکشی کے مترادف ہے ذکر کر رہا ہے۔

فاضلوں کو ہے فاضلوں سے عناد　　پنڈتوں میں پڑے ہوئے ہیں فساد
شاعروں میں بھی ہے یہی تکرار　　خوش نویسوں کو ہے یہی آزار
نسخہ اک طب کا جس کو آتا ہے　　سگے بھائی سے وہ چھپاتا ہے
سب کمالات اور ہنر ان کے　　قبر میں ان کے ساتھ جائیں گے

حالی اہل وطن کو غیرت اور حمیت کا سبق دے کر انہیں نصیحت کرتے ہیں۔

عزت قوم چاہتے ہو اگر　　جا کے پھیلاؤ ان میں علم و ہنر
ان کی عزت تمہاری عزت ہے　　ان کی ذلت تمہاری ذلت ہے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو　　قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو
گر نہیں سنتے قول حالی کا　　پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

زمزمۂ قیصری، ترجمے اور تشریح کی عمدہ مثال

مسدس مدوجزر اسلام کی تصنیف سے ایک سال قبل حالی نے 1878ء میں زمزمۂ قیصری کے زیرعنوان پینتیس بند کا ترکیب بند لکھا جس کے ہر بند میں سات شعر ہیں۔ اس دوسو پینتالیس اشعار کی طولانی نظم کا ترجمہ حالی نے انگریزی پویم سے کیا جس کے بارے میں ہم یہاں خود حالی کی توضیحاتی تحریر پیش کرتے ہیں۔ حالی لکھتے ہیں:

''یہ نظم ایک انگریزی پویم کے تین حصوں میں سے اول حصے کا منظوم ترجمہ ہے۔ شاید مسٹر ایسٹوک اس کے مصنف ہیں جنھوں نے کرنل ڈیوس کے توسط سے، جب کہ وہ دہلی میں کمشنر تھے، اس تمام پویم کو دلی کے چند لائق آدمیوں سے فارسی میں نظم کرا کر ولایت میں بڑے اہتمام سے چھپوایا ہے۔ فارسی نظم لکھے جانے سے پہلے صاحب کمشنر نے یہ پویم اردو میں ترجمہ کرا کر نظم کرنے کے لیے میرے پاس بھیجی تھی۔ میں اُن کے حکم سے صرف پہلے حصے کو اُردو میں کرنے پایا تھا کہ مصنف نے فارسی میں نظم کرانا چاہا۔ میں نے بہ سبب علالت کے فارسی نظم سرانجام کرنے سے اپنی معذوری بیان کی اور یہ کام اوروں کے سپرد ہو گیا۔ اس نظم

کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ہندوستان اور مسلمان بادشاہوں
اور انگریزی سلطنت کا ذکر ہے۔ دوسرے اور تیسرے حصے میں
تمام رئیسوں کا، جو دربار قیصری میں شریک ہوئے تھے، عموماً اور
حضور نظام کا خصوصاً تذکرہ ہے۔ مصنف نے پہلے حصے میں بعض
مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی بھی کی ہے۔ ناظرین اس کو دیکھ کر
مجھ سے خوش یا ناراض نہ ہوں۔ میرا صرف اتنا قصور ہے کہ میں
نے ان خیالات کو ایک ایسی زبان میں نظم کر دیا ہے۔ جس کو
میرے ہم وطن سمجھ سکتے ہیں۔ اس نظم میں جہاں کہیں ضرورت
نے مجبور کیا ہے، اپنی طرف سے بھی کوئی بات اضافہ کر دی ہے
اور اکثر تمیز کے لیے اس کو بریکٹ میں محدود کر دیا گیا ہے۔ باایں
ہمہ ممکن ہے کہ اس کے علاوہ اور بھی کہیں کہیں کچھ اختلاف پایا
جائے۔ لیکن جو لوگ انگریزی پولیٹکل خیالات کو اردو نظم میں بیان
کرنے کی دقتوں سے بخوبی واقف ہیں اُن سے اُمید ہے کہ ایسی
خفیف فروگزاشتوں سے چشم پوشی فرمائیں گے۔''

حالی نے اپنی زندگی میں اس نظم کو اہمیت نہیں دی اور نہ حالی کے ہم عصروں یا بعد میں آنے والے حالی شناسوں نے اس نظم کا تجزیہ کر کے اس کا حق ادا کیا۔ یہ سچ ہے کہ اس ترکیب بند کا مطلب اور متن انگریزی شاعری ایسٹوک کا ہے لیکن اس نظم پر لکھا گیا بسیط حاشیہ اور شاہکار ترجمہ تو حالی کا ہے جو صاف سلیس اور رواں دوان ہے جو عام طور پر ترجمہ کرتے ہوئے باقی نہیں رہتا۔ یہ سچ ہے کہ ہمیں کوشش کے باوجود انگریزی پویم یا اس کا فارسی مطبوعہ ترجمہ دستیاب نہ ہو سکا لیکن حالی کے تشریحی حاشیے سے یہ پتا چلتا ہے کہ انہوں نے ایمان داری سے ترجمہ کر کے جن مطالب سے وہ متفق نہ تھے

حاشیے میں اظہار کیا ہے۔

ہم یہاں اجمالی طور پر اس ترکیب بند پر اس لیے بھی گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ یہ طویل ترجمہ محنت او مشکل پسندی سے ہوا ہے۔ یہ ترکیب بند فن اور شعریت کے لحاظ سے حالی کی کئی نظموں مثنویوں قصیدوں مرثیوں قطعوں اور غزلوں سے بلند ہے۔

حالی نے اگر نظم میں کہیں مطلب اپنی طرف سے شعر کی تکمیل یا بند کی تشکیل کے لیے رکھا تو اُس کو ظاہر کرنے کے لیے براکٹ کے اندر لکھا۔

نظم کے آغاز میں کشور ہندوستان کو حصار عافیت کہنا اور اُسے سارا جہان کہہ کر اس کے نقشے کو یوں بیان کرنا کہ مضمون بھی ادا ہو جائے اور شعری نقش و نگار بھی دل لبھائے آسان کام نہیں۔

اے حصار عافیت اے کشور ہندوستاں — زیب دیتا ہے اگر کہیے تجھے سارا جہاں
اک طرف کھینچی ہے قدرت نے ترے دیوار کوہ — موج زن ہے ایک جانب تیرے بحر بیکراں

بلندی اور پستی شور اور خاموشی کا سماں دیکھیے۔ صنعت تضاد متن اور الفاظ سے یہ شعر بنے ہیں۔

چوٹیوں پر ہے پہاڑوں کی وہ عالم برف کا — ہے سدا چھایا ہوا جس پر خموشی کا سماں
بحر میں ہوتا ہے اک شور قیامت آشکار — جبکہ اس میں آ کے گرتی ہیں ہزاروں ندیاں

شاعر نے ہندوستان پر اسکندر اعظم اور یونان کے بادشاہ مینڈر کے حملوں اور فتوحات کا ذکر کر کے ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملے کو بیان کیا جس کا ترجمہ حالی یوں کرتے ہیں۔

پھر ہوا اسلام کے اقبال کا تارا بلند — جانب ہندوستان محمود نے ہانکا کمند
وہ مسلمانوں کے حق میں ابر رحمت تھا مگر — ہندوؤں کے دل رہے اس کے ستم سے دردمند
روندتا تھا جس کو وہ کھیتی نہ ہوتی تھی ہری — صلح سے بجھتا نہ تھا ہوتا تھا جو شعلہ بلند

خوف تھا دل میں خدا کا اور نہ کچھ بندوں پہ رحم　　غارت و تاراج تھا اک بازی سلطاں پسند
جب وہ آیا تھا تو سرتاپا گلستاں تھا یہ ملک　　جب گیا یاں سے تو مثلِ دشتِ ویراں تھا یہ ملک

حالی ان اشعار پر احتجاج اور اعتراض نثر کی صورت میں حاشیے میں کرتے ہیں۔

''انگریزی مؤرخوں اور شاعروں کو جب یہ منظور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحم دلی اور انسانی ہمدردی پر فریفتہ اور مسلمانوں پر غضب ناک اور افروختہ کریں تو وہ محمود غزنوی اور تیمور وغیرہ کی سختی اور تشدد کو خوب چھڑک چھڑک کر جلوہ گر کرتے تھے۔ جس طرح اس بند میں محمود کی بے رحمی اور ظلم کا بیان کیا گیا ہے، اسی طرح ایک انگریز نے اس کی شان میں کچھ اشعار لکھے ہیں، جن کا اردو ترجمہ یہ ہے:

(نظم)

اے ملک زرنگار قدم ہے وہ کون سا
حملے سے جس کے ہے تیرے ارکاں میں زلزلہ
وہ تیرے قصر اور ستوں دار سائباں
معبد وہ جو پہاڑوں کے غاروں میں ہیں نہاں
ٹھاکر اور اُن کے مندر، راجا اور ان کے تخت
حملے سے اس کے آ کے پڑا سب پہ وقت سخت
پتلا غضب کا کون سا وہ ہولناک ہے؟
اے ملک زرنگار وہ غزنی کی خاک ہے

آتا ہے لوٹتا ہوا اس بزم گاہ میں
پھرتے ہیں بکھرے تاج بہت اس کی راہ میں
کتے جو اسکے ساتھ شکاری ہیں بے شمار
ان کے گلوں میں ہیں وہ جواہر نگار ہار
بے رحم فوج لائی ہے جو لوٹ مار کر
مقتول رانیوں کے گلے سے اُتار کر
کرتا ہے قتل لڑکیوں کو وہ گھروں کے بیچ
اور بے گنہ پجاریوں کو مندروں کے بیچ

اگرچہ ان دونوں شاعروں نے محمود کے تشدد کو بہت مبالغے کے ساتھ بیان کیا ہے، مگر حق یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے اُن کے بعض بادشاہوں کی ظالمانہ کارروائیاں، گو وہ کیسی ہی تاریکی اور وحشت کے زمانے میں کی گئی ہوں، ہمیشہ باعث شرم و ندامت رہیں گی لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ آیا دنیا میں کوئی ایسی قوم ہے جو اس دھبے سے پاک ہو؟ یورپ کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ یورپ کی شائستہ قومیں، جو آج اپنے سوا تمام دنیا کی قوموں کو وحشی یا نیم وحشی کا خطاب دیتی ہیں، محمود کے زمانے میں بلکہ اس کے بعد کئی صدیوں ایشیا سے یہ مراتب زیادہ وحشت وخوں ریزی و بے رحمی میں مبتلا تھیں اور اگر انصاف سے دیکھا جائے تو بنی نوع انسان کی دو خصلتیں نہ کبھی بدلی ہیں، نہ آیندہ بدلنے کی امید ہے: ایک طمع اور خودغرضی، دوسرے زبردستوں کا زیردستوں کو دلنا اور پیسنا۔ جس طرح مگر مچھ مچھلیوں اور مینڈکوں کو یا شیر اور چیتا ہرن اور نیل

گائے کونوش جان کرتا ہے، اسی طرح جو انسان قوی اور زبردست ہیں، وہ ضعیف اور کم زور انسانوں کے شکار کرنے سے کبھی درگزر نہیں کرتے۔ سولھویں صدی کو جس میں اہل یورپ، امریکہ میں جا کر آباد ہوئے، کچھ بہت زمانہ نہیں گزرا۔ اس صدی میں یورپ کی بعض قوموں کے ہاتھ سے امریکہ کے اصلی باشندوں پر کون سا ظلم اور کون سی بے رحمی ہے جو روا نہیں رکھی گئی۔ میکسیکو اور پیرو جو کہ امریکا کے دو شائستہ ملک تھے، وہاں کے مفتوحین پر جو وحشیانہ ظلم ہسپانیہ والوں نے کیے، ان کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ کورٹیز جو کہ ہسپانیہ کا رہنے والا اور میکسیکو کا فاتح تھا، اس نے اور اس کے بعد نئے وارد ہونے والے جرنیلوں نے یہ ٹھان لی کہ میکسیکو کو قاطبۃً ویران کر دیجیے اور وہاں ہسپانیہ کی ایک کولونی آباد کیجیے۔ چناں چہ جہاں تک اُن سے ہو سکا، وہاں کے قدیم باشندوں کو نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ کورٹیز نے میکسیکو کے شہنشاہ مونٹی زوما کو گرفتار کر کے الٹا لٹکا دیا اور اس کی رعایا کو اس کی آنکھ کے سامنے جلایا اور قتل کرایا۔ یہ ہسپانیہ کے وہی مقدس اور بے عیب عیسائی تھے جنہوں نے ''کافروں'' یعنی مسلمانوں کو غنڈے اور ایک ناپاک اور گنہ گار قوم ہونے کا الزام لگا کر نکالا تھا اور جن کا قول تھا کہ ظالم اور بد دین مسلمان اس لائق نہیں ہیں کہ فرشتہ صفت عیسائیوں کے ہم سایہ اور ہم وطن ہو کر رہیں اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً ایک ملین بنی آدم ان مقدس عیسائیوں کے ہاتھ سے طرح طرح کی عقوبت اور سختی

کے ساتھ مارے اور جلائے گئے۔ یہی حال کچھ دنوں بعد پیرو کا ہوا۔''

ہماری نظر میں انگریز شاعر نے سکے کے دونوں رخ دکھائے ہیں۔ ہر دہی بیچنے والی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دہی کو میٹھا کہے چناں چہ اگر انگریز شاعر انگلستان کی مدح سرائی اور مسیحیت کی تبلیغ کر رہا ہے تو آتش زیر پا ہونے کی ضرورت اس لیے بھی نہیں کہ بعض اسلامی حکمرانوں نے اسلام کے اصولوں اور حضور نبی کریم ﷺ کے فرمودات پر عمل نہیں کیا۔ شاعر پوچھتا ہے۔

آخر اے دانا حکیمو! کچھ سبب اس کا بتاؤ ہے بنی آدم کو کیوں قتل بنی آدم کا چاؤ
کیا یہ زیبا ہے کہ دین حق کو اے ابنائے جنس زور سے منواؤ تم اور ندیاں خوں کی بہاؤ
یا یہ بہتر ہے کہ سچی دوستی اور پیار سے دل کرو اہل جہاں کے پہلے تسخیر اور پھر
حکم پھیلاؤ خدا کے اور یقین ان پر دلاؤ

اس کے اکبر اعظم کی تعریف ہوتی ہے اور مغلیہ سلطنت کے زوال کا سبب انگریز شاعر نے جو بتایا وہ حالی کی زبان سے آشکار ہے۔ اس ترجمہ کا حُسن یہ بھی ہے کہ نظم ترجمانی نہیں تصنیف کی طرح دلکش ہے۔ اشعار کا تسلسل مضمون کو اتنا صاف بیان کر رہا ہے کہ کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔

اے جلال الدین ہے تو ہی وہ شاہِ نام دار صلح کل جس کی زمانے میں رہے گی یادگار
بسکہ آزادی بنی نوع بشر کو تو نے دی رائے پر ہر شخص کی ٹھہرا عقیدے کا مدار
پر تری اولاد نے کی پیروی تیری نہ حیف ہو گیا ان کا تعصب خود گلے کا ان کے ہار
ثمرہ آخر مل گیا ان کے تعصب کا انہیں کر گیا رحلت جہاں سے جلد ان کا اقتدار

یہاں اورنگ زیب عالم گیر کی طرف اشارہ ہے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال کے دوران ہندوستان میں مرہٹے، سادات اور افغان وغیرہ کے اقتدار اور خانہ جنگی کے

مسائل رہے۔ اس کے بعد انگریز شاعر نے اپنی نظم میں انگریزی قوم کی ہندوستان میں آمد کو اس ملک کی نجات بتایا۔

ڈوبنے کے جب نظر آنے لگے آثار سے   آ کے انگلستان نے طوفاں کو للکارا کے بس
ہند کو اپنوں نے دی آ کر نجات اغیار سے

یہاں اپنوں سے مراد انگریز اور اغیار سے مراد مسلمان ہیں۔ اس نظم میں مہابھارت کے اساطیری واقعات کو نظمایا گیا ہے جہاں سمندر کے بلونا سے امرت برآمد کیا گیا۔

اہل انگلستان کا آنا سمندر پار سے   ہے سمندر کو بلونا فی المثل اے محترم
زندگی جو اس سے اہل ہند کو حاصل ہوئی   ہے وہ امرت جو کہ پہنچا ہے سمندر سے بہم

راجا اشوک کی لاٹھوں پر کندہ قوانین کا ذکر کر کے پھر انگلستان اور ملکہ انگلستان کی تعریف یوں کی گئی ہے۔

راج پر راجا اشوکا کے ہیں وہ لاٹھیں گواہ   ہے ہویدا ان سے اس کی وسعت تمکین و جاہ
ہم نے یہ مانا کہ پتھر پر ہیں جو کندہ حروف   وہ رہیں گے منقش اس پر ہزاروں سال و ماہ
نام ہے وکٹوریا کا ان سے بڑھ کر پایدار   نقش ہر اک صفحۂ دل پر ہے جس کا استوار

اس ترکیب بند میں زیادہ تر بند انگلستان کی تاریخ، فتوحات، دولت و عظمت کے بارے میں ہیں۔ ملکہ اور شاہزادوں کا ذکر احترام اور احتشام سے کیا گیا ہے جو یقینا اس نظم کی زیب داستان معلوم ہوتا ہے۔ انگریز شاعر کو ہندوستان کی خاک سے محبت ہے اور اس کے مناظر قدرتی اور ذرائع معدنی سے الفت ہے لیکن ہندوستانی عوام کے مسائل سے دلچسپی نہیں وہ قحط سالی کو قدرت کا آبادی کم کرنے کا نظام سمجھتا ہے۔

کچھ نہیں تو قحط کا دورہ سلامت چاہیے   بڑھنے پائے گا نہ آدم زاد کا حد سے شمار

اس نظم کو ہم کشمیر کی خوب صورت منظر کشی پر تمام کرتے ہیں۔ حالی نے تین

بندوں میں خوب صورت منظر نگاری کر کے کشمیر پر لکھے گئے عمدہ ترین اشعار میں شامل کر دیا ہے۔ کشمیر پر چند مصرعے اور شعر سنیے اور حالی کے فن کی داد دیجیے۔

ہے کوئی وادی جہاں میں ہمسر کشمیر آج　　شہر ہے جو مرکز کشمیر مانند طلسم
طرفہ کیفیت سے ہے لہروں میں ڈل کی جلوہ گر　　دیکھتے ہیں آب صافی میں جب اس کا انعکاس
دوسرا وینس کا نقشہ صاف آتا ہے نظر　　باغ شالیمار جو رونق فزا ہے اس کے پاس
ہے وہ اک نیرنگ قدرت کا تماشا سر بسر　　چوٹیاں پربت کی ہیں یوں برف میں لپٹی ہوئی
جا بہ جا گویا کھڑے ہیں دیو اور جن پہرہ دار　　جنت اے کشمیر کوئی تجھ سی دنیا میں نہیں
تو نہیں دیتا بھٹکنے اپنے طالب کو کہیں

حقوق اولاد، حالی کا تربیتی منظوم سبق

تصنیف : ۱۸۸۸ء

ہیئت : مثنوی

تعداد شعر : ۳۵۱

یہ مثنوی مکالمے کی صورت میں ایک قصے کے پیرائے میں لکھی گئی ہے جو باپ اور بیٹے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ یہاں سماج کی خرابیاں، بچوں کی تربیت میں کوتاہیاں جس میں باپ اور بیٹا دونوں ایک حد تک اس خرابی کے ذمہ دار ہیں بتائی گئی ہے۔

باپ نے لاڈلے بیٹے کو ہر طرح کا آرام اور آسایش دیا۔ پیسوں کی فراوانی محنت سے دوری کھیل کود کی فراوانی اور آوارہ گردی نے لاڈلے بچے کو نکمہ کر دیا چناں چہ سونے پر سہاگا ایسے بے کار نوجوان کی بڑی شاندار شادی رچائی۔ باپ نے جو کچھ پیسہ جمع کیا تھا وہ جھوٹی شان نبھانے اور لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے خرچ کر دیا جس کا نتیجہ بُرا ہوا اور یہ خاندان مالی اور اخلاقی مسائل سے دوچار ہوا۔ شادی کے بعد بھی لڑکا بگڑتا گیا اب اُسے کئی بُری عادتیں لگ چکی تھیں جبکہ اس کا باپ ضعیف اور غریب ہو چکا

تھا۔ بیٹے نے باپ کی پہلے تعریف کی کہ اُس کا بے حد خیال رکھا لیکن اس ناز و نعمت نے اُسے صحیح زندگی بسر کرنے سے باز رکھا۔ اگر باپ کی اتنی بے وجہ ہمدردیاں نہ ہوتیں تو وہ دنیا میں کام کرنے اور محنت سے روٹی اور روزگار کمانے کے قابل ہو جاتا۔ باپ نے یہ اعتراض سن کر یہ اقرار کیا کہ بچوں کے ساتھ حد سے زیادہ لاڈلا پن، آسانیاں، ان کی تربیت میں رکاوٹ بن جاتی ہیں لیکن پھر بیٹے کو دوبارہ نصیحت کی کہ اب بھی وہ جوان ہے وقت باقی ہے محنت اور سچی لگن سے دنیا میں کامیاب زندگی گزار سکتا ہے۔ یہ ساری نظم سیدھی سادی بیانیہ نظم ہے اس میں محاسن زبان، صنائع بدایع نہیں ہیں بلکہ عام بول چال میں مکالمے کی زبان ہے جیسے کوئی بات کر رہا ہے۔ سیدھے سادے مطالب نصیحتوں اور شکایتوں کے انداز میں بیان ہوئے ہیں اور نظم کے آخر میں اسی طرح سے نتیجہ گیری کی گئی ہے۔

راہ پر چاہو تو آ سکتے ہو تم   ہم نے جو کھویا ہے پا سکتے ہو تم
ہر کوئی بیج اپنا خود بوتا ہے خوب   کام اپنا آپ ہی ہوتا ہے خوب
پہلے اپنا سوچ لو انجام تم   دیتے رہنا پھر ہمیں الزام تم
ہم نے بچپن میں بگاڑا ہے مگر   اب تو تم عاقل ہو خود جاؤ سنور

چپ کی داد کا سرسری مطالعہ

تصنیف : ۱۹۰۵ء

ہیئت : ترکیب بند

تعداد شعر : ۷۴

یہ نظم رسالہ خاتون دسمبر ۱۹۰۵ء اور مخزن میں فروری ۱۹۰۶ء کو شائع ہوئی۔ حالی نے حیدرآباد دکن کے جلسہ عام میں اسے جون ۱۹۰۶ء میں پڑھا تھا۔

یہ نظم مناجات بیوہ کے تقریباً بیس سال بعد لکھی گئی۔ اس نظم میں حالی نے عورتوں کی عظمت اور سماج اور مذہب میں ان کا مقام دکھایا ہے۔ ان کی وجہ سے اولاد کی پرورش اور انسانی قدروں کی نمود بتائی ہے۔ پھر ان پر جو مظالم ہوئے جو حق تلفی ہر دور میں ہوئی اس کی طرف بڑے درد بھرے لہجہ میں گزارش کی۔ آخر میں ملکہ بھوپال سلطان جہاں بیگم کی مدد اور سرپرستی سے کئی مقامات پر خواتین کے حق میں مثبت کاموں کی نشان دہی کی۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

اے ماؤ بہنو، بیٹیو! دنیا کی زینت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہی قوموں کی عزت تم سے ہے

فطرت تمہاری ہے حیا طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا انساں عبارت تم سے ہے

دنیا کی تاریخ اور خاص طور پرعرب اور برصغیر میں عورتوں پر ظلم ہوئے یعنی لڑکی کی پیدایش کو ذلت جان کر اُسے زندہ دفن کیا گیا۔ بیوہ عورت کی زندگی کو ایک گناہ اور جرم سمجھ کر اُسے مردہ شوہر کے ساتھ زندہ زندہ جلایا گیا۔ بہت کم سنی میں بلوغ سے بھی پہلے شادی کے رشتے میں قید کر دیا گیا اور اگر وہ بیوہ ہو جائے تو اُسے دوسری شادی کا حق نہیں دیا گیا۔عورت ذات کے لیے تعلیم اور ہنر بے کار تصور کیے گئے چناں چہ صرف علم و ہنر مردوں کے لیے مخصوص سمجھا گیا۔ ان تمام عورتوں پر ہوئے مظالم اور ناانصافیوں کو اس نظم میں حالی نے بیان کیا۔

گاڑی گئیں تم مدتوں مٹی میں جیتی جاگتی
حامی تمہارا تھا مگر کوئی نہ جز ذاتِ خدا
زندہ سدا جلتی رہیں تم مردہ خاوندوں کے ساتھ
اور چین سے عالم رہا یہ سب تماشے دیکھتا
بیاہی گئیں اس وقت تم، جب بیاہ سے واقف نہ تھیں
جو عمر بھر کا عہد تھا وہ کچے دھاگے سے بندھا
بیاہا تمہیں ماں باپ نے اے بے زبانو! اس طرح
جیسے کسی تقصیر پر مجرم کو دیتے ہیں سزا
گزری اُمید و بیم میں جب تک رہا باقی سہاگ
بیوہ ہوئیں تو عمر بھر پھر چین قسمت میں نہ تھا
جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر

جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آبِ حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہرِ ہلاہل سربسر

چناں چہ عورتوں کے صبر اور حوصلوں نے مردوں کو متوجہ کیا اور اس طرح ان ناانصافیوں کو دور کرنے کوشش ہوئی۔ ستی کی رسم ممنوع قرار دی گئی۔ بچپن کی شادیوں پر پابندی لگائی گئی عورتوں کے حقوق کے لیے قوانین بنائے گئے۔ لڑکیوں کی تعلیم کا بندوبست شروع ہوا ڈاکٹر شیخ عبداللہ اور ان کے رفقا کی کوششوں سے علی گڑھ میں گرلز اسکول قائم ہوا۔ بھوپال کی ملکہ سلطان جہان نے لڑکیوں کا ہاسٹل بنوایا۔ عورتوں کے علاحدہ میگزین نکلنے شروع ہوئے۔ حالی نے ان نکات کی طرف اس نظم میں اشارہ کیا ہے۔

کی تم نے اس دارالمحن میں جس تحمل سے گزر
زیبا ہے گر کہیے تمہیں فخر بنی نوع بشر
آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب
آخر تمہاری چپ دلوں میں اہل دل کے چبھ گئی
سچ ہے کہ چپ کی داد آخر بے ملے رہتی نہیں
اے بے زبانوں کی زبانو بے بسوں کے بازوؤ
تعلیم نسواں کی مہم جو تم کو اب پیش آئی ہے
یہ جیت بھی کیا کم ہے خود حق ہے تمہاری پشت پر
بھوپال کی جانب سے یہ ہاتف کی آواز آئی ہے

قوم کا متوسط طبقہ، قلب ملت ہے

حالی نے ''قوم کا متوسط طبقہ'' ترکیب بند دسمبر ۱۸۹۱ء میں علی گڑھ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا۔ متوسط طبقہ سے مراد وہ لوگ جو سلف ہلپ علم و ہنر سیکھ کر دولت، عزت، نام و مقام پائے ہیں۔ یہ لوگ فقیر اور امیر دونوں گروہوں سے بہتر ہیں۔ ادنیٰ لوگ اپنی حالت میں کوئی تبدیلی لانے کی کوشش نہیں کرتے اعلیٰ طبقہ اشراف وہ لوگ ہیں جو دولت اور اپنی حالت میں مَست ہیں اس میں ترقی کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ حالی نے اس نظم میں جو ترکیب بند ہیئت میں لکھی گئی ہے قوم کے متوسط طبقہ کو کارمند کارکن اور کارآمد و کامیاب دکھایا ہے۔ اس نظم کا مطلع ہے۔

شکر اس نعمت کا یارب کر سکے کیوں کر زباں　　　　تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں

حالی نظم میں گدائی محتاجی اور ناداری کی مذمت کرتے ہوئے یہاں مولانا روم کے شعر کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ مولانا روم نے کہا تھا:

آنچہ شیراں را کند روباہ مزاج　　　　احتیاج است احتیاج است احتیاج

الحذر اس فقر و ناداری سے سو بار الحذر　　　　لومڑی جاتے ہیں بن جن کی بدولت شیر نر

حالی پھر یہ بتاتے ہیں کہ مسلسل کوشش اور محنت سے انسان کامیابی حاصل کر

سکتا ہے۔ حالی انگریزی ضرب المثل Rome was not built in a day کو یوں نظم کرتے ہیں۔

انجمن ہے قوم کی ہنگامۂ شادی نہیں ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

حالی متوسط طبقہ میں مزدور اور علم و ہنر کے اشخاص کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

متوسط طبقہ (مزدور)

قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی جس سے جاں آتی ہے مردوں میں وہ طاقت ہے یہی
آدمیت سیکھتے ہیں ان سے سب چھوٹے بڑے نوع انساں میں بقائے آدمیت ان سے ہے
کرتے ہیں اخلاق ادنیٰ اور اعلیٰ ان سے اخذ آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت ان سے ہے
پھونکتے ہیں روح قومیت یہی افراد ہیں ہے جہاں قوموں میں یک رنگی و وحدت ان سے ہے
دم سے ہے وابستہ ان کے قوم کا سارا نظام یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام

متوسط طبقہ (علم و ہنر)

شکر اس نعمت کا یا رب کر سکے کیوں کر زباں تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں
ہے عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی فقر کی ذلت سے اور ثروت کے فتنے سے بری
یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یاں رونق بازارِ جنس علم و حکمت ان سے ہے
پاؤ گے ان میں طبیب ان میں ادیب ان میں خطیب ہے اگر انساں کو حیواں پر فضیلت ان سے ہے
ان میں قوموں کے ہیں مصلح ان میں ملکوں کے وکیل آبرو قوموں کی اور ملکوں کی عزت ان سے ہے
مشکلیں اکثر انہی سے قوم کی ہوتی ہیں حل بھائیوں کے بازوؤں میں زور و طاقت ان سے ہے

سرسید اس نظم پر ریویو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اے دوستو! آج یہ نظم جو مولانا حالی نے پڑھی ایک عجیب نظم

ہے کہ شاید ایسی نظم فارسی اُردو عربی میں کسی شاعر نے نہیں لکھی........... جو طریقہ ہمارے مخدوم نے اختیار کیا ہے وہ ایسا مشکل ہے کہ اُس کا اختیار کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ جذبات انسانی کو سہل الفاظ میں بیان کرنا، اس طرح کہ لوگوں کے کان میں پڑتے ہی دل میں کام کر جائے، مولانا حالی ہی کا کام ہے۔ ہم کو خدا کا شکر کرنا چاہیے اور فخر کرنا چاہیے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا۔ آیندہ زمانے میں جو کہا جاوے گا کہ فخر قوم، فخر شعرا، فخر علما اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور ان سے نجات دینے والا قوم کا کون ہے؟ تو کہا جاوے گا کہ حالی!''

مناظرہ رحم و انصاف، حالؔی کی تقابلی تخلیق

۱۸۷۶ء میں حالی نے ایک (۱۱۹) اشعار پر مبنی مثنوی رحم اور انصاف کے درمیان گفتگو مکالمے کی صورت میں مناظرے کے عنوان سے تصنیف کی۔ یہ حالی کی تخلیقات کا وہ دور تھا جب ان پر جدید شاعری نے پورا تسلط حاصل کر لیا تھا وہ اب اپنی نظموں میں موضوع سے گلشن شعر سجا رہے تھے جس کا بیج پنجاب میں محمد حسین آزاد کے ترتیب دیے گئے مشاعروں سے حالی کے ذہن میں بو دیا گیا تھا۔ ان نظموں کی تخلیق کر کے حالی یہ بتانا چاہتے تھے کہ عشقیہ، فلاسفانہ اور تصوفی مضامین کے علاوہ بھی اُردو شاعری میں ایسے موضوعات کی کمی نہیں جس سے شاعری کو دلچسپ اور دل پسند بنایا جا سکتا ہے جس سے ہر طبقہ استفادہ کر کے اپنی اور معاشرے کی فکری صلاحیت کو بلند کر سکتا ہے۔ حالی جن دنوں ایسی نظمیں لکھ رہے تھے تو اس کا خیر مقدم اُس طرح کا نہیں ہوا جنکی حق دار یہ نظمیں تھیں جس کی وجہ قوم کی جہالت اور عوام و خواص کا خاص شعری مذاق تھا جس میں عشق کی تندی چوما چاٹی کے چٹخارے اور ہرزہ سرائی کے علاوہ اساتذہ شعرا کے دفتر جو ان لغویات سے خالی تھے لیکن فلسفہ اور تصوف سے بھرے ہوئے تھے۔ حالی کی شاعری کو بیانیہ کہہ کر اس کو سپاٹ اور بے مزا بتا کر ان نظموں کو کچھ اس طرح قدیم

بستوں میں باندھ دیا گیا کہ آج سوا سو سال گزرنے کے بعد بھی ان نظموں پر خاطر خواہ کام نہ ہوسکا۔ مناظرے کے لغوی معنی بحث کرنے کے یا باہمی مباحث کے ہیں۔ اس علم میں مدح اور قدح کر کے سکے کے دونوں رخوں کو دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالی کی کئی نظمیں مکالمے کی شکل میں مناظرہ پیش کرتی ہیں۔

اس مثنوی میں حالی نے انصاف اور رحم کا تعارف کر کے ان دونوں میں بحث کروائی اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا کہ یہاں دونوں فریقین کی جج عقل بنی اور دونوں کی لن ترانیاں سُن کر کہا کہ رحم اور انصاف سنو۔

خیر اک کان ہے تم جس کے ہو گو ہر دونوں	صاف کہتی ہوں سن اے رحم نہیں اس میں خلاف
تو ہے اک قالب بے روح نہ ہو گر انصاف	اور سُن اے عدل نہیں اس میں تکلف سر مو
گر نہ ہو رحم تو اک دیدۂ بے نور ہے تو	فرق اصلا نہیں تم دونوں میں لڑتے کیوں ہو
رحم کہلائے جو مظلوم کی فریاد سنے	عدل ٹھہرے جو سزا ظالم بے رحم کو دے
کہیں وہ مہر کی صورت میں عیاں ہوتی ہے	اور کہیں قہر کے پردے میں نہاں ہوتی ہے

انصاف اور رحم کا مکالمہ سنیے اور حالی کے فن کی داد دیجیے ہم کچھ اشعار اور مصرعے یہاں کسی ترتیب بغیر پیش کرتے ہیں۔

ایک دن رحم نے انصاف سے جا کر پوچھا	کیا سبب ہے کہ ترا نام ہے دنیا میں بڑا
اپنے بیگانے ہیں سب تیری نظر میں یکساں	دوست کو فائدہ ہے تجھ سے نہ دشمن کو زیاں
قتل انسان ہمیشہ سے ہے عادت تیری	سیکڑوں چڑھ گئے سولی پہ بدولت تیری
تیرے فتوے پہ کروڑوں ہوئے سرتن سے جدا	اور ترے حکم سے لاکھوں ہوئے مسکن سے جدا
اسی کرتوت پہ اے عدل یہ دعوے ہیں تجھے	کہ بنا امن کی دنیا میں ہے قائم مجھ سے
رحم ہے نام مرا لطف و کرم کام مرا	فیض ویرانہ و آباد میں ہے عام مرا
لطف ہے عام سدا اہل خطا پر میرا	ہاتھ اٹھتا نہیں خونی کی سزا پر میرا

حالی اپنی نظموں کے مضمون کو تلمیحات سے سجاتے ہیں۔

جان اور مال سے نمرود کو کھویا تو نے
اور فرعون کو دریا میں ڈبویا تو نے

فوج روان کی لڑائی میں کھپائی کس نے
آگ لنکا میں سوا تیرے لگائی کس نے

مصر میں قید سے یوسف کو نکالا میں نے
اور ایوب کے بٹیرے کو سنبھالا میں نے

بیڑا فرعون کا جب غرق فنا ہوتا تھا
میں وہاں ساحل دریا پہ کھڑا روتا تھا

رحم کی بات سن کر انصاف نے اپنی کارکردگی بتائی اور کہا۔

یوں تو اے رحم تری ذات میں جوہر ہیں بہت
خیر تھوڑی ہے مگر آپ میں اور شر ہیں بہت

بے مروت ہوں اگر میں تو یہ جوہر ہے مرا
جس کو تو عیب سمجھتا ہے وہ زیور ہے مرا

یہاں حالی بلاتفریق مذہب وملت دنیا میں جو ظلم ہوئے ہیں اس کا ذکر یوں کرتے ہیں۔ انصاف کہتا ہے:

جس قلم رو میں کہ جاری نہیں میرا فرماں
ظلم کے ہاتھ میں واں فکر وعمل کی ہے عناں

دوست اللہ کے ہیں ٹھہرتے معتوب وہاں
اور مسیحا سے زماں ہوتے ہیں مصلوب وہاں

نیک فرزند ہیں ماں باپ کے جو طبقہ بگوش
رام لچھمن کی طرح پھرتے ہیں وہاں خانہ بدوش

مان رکھا ہے جنہیں قوم نے اولاد رسول ﷺ
قوم کے ہاتھ سے ہو جاتے ہیں پیاسے مقتول

زہر سقراط سے ناصح کو پلا دیتے ہیں
اور یوسف سے برادر کو دغا دیتے ہیں

مناجاتِ بیوہ کا جائزہ

تصنیف : ۱۸۸۴ء

ہیئت : مثنوی

تعدادشعر : ۴۴۵

اس نظم میں حالی نے برصغیر کی بیوہ کے دکھ درد کے ساتھ ساتھ اس کے جذبات کی ترجمانی بھی کی ہے۔ جذبات نگاری میں گھریلو محاورات سادہ نرم اورشرین الفاظ سے نظم کو پُرتاثیراور دل نشین بنایا گیا ہے جونم آنکھوں ہی سے پڑھی جاسکتی ہے۔ اس نظم کا ترجمہ برصغیر کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ یہ نظم دراصل ہندوستانی زبان ہے اسی لیے بابائے اُردوعبدالحق نے مہاتما گاندھی سے کہا تھا اگر آپ اُس زبان کا نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہےتو حالی کی مناجات پڑھیے۔ مناجات بیوہ میں کم سن لڑکیوں کی شادیاں اور بیوہ ہونے کے بعد عمر بھر کی مصیبت اور افسردگی کا بیان ہے۔ حالی کی اس نظم کی وجہ سے کم سن لڑکیوں کی شادیاں قانونی طور پر ممنوع قرار دی گئیں اس کے علاوہ بیوہ عورت کی دوسری شادی بھی قانونی طور پر قبول کی گئی۔

دولہا نے جانا نہ دلہن کو — دلہن نے پہچانا نہ سجن کو
شرط سے پہلے بازی ہاری — بیاہ ہوا اور رہی کنواری
ایک کو تو نے شاد کیا ہے — ایک کے دل کو داغ دیا ہے
پھول کہیں کمھلائے ہوئے ہیں — اور کہیں پھل آئے ہوئے ہیں
عورت ذات کا تنہا جینا — ہر دم خون جگر کا پینا
گھونٹ اک ایسا مجھ کو پلا دے — تیرے سوا جو سب کو بھلا دے

اس نظم کی زبان اور تاثیر پر عبدالماجد دریابادی نے سچ کہا کہ
''باتیں اتنی سچی اور روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی کہ آسمان کے فرشتے بھی وجد میں آ آ کر رہیں۔ اگر حالی نے اس نظم کے علاوہ ایک شعر بھی نہ کہا ہوتا تو بھی دنیا وعقبیٰ کے لیے بس تھا۔''

حالی ایک پُردرد اور حساس قلب وجگر کے مالک تھے۔ انہوں نے صرف شاعری میں ان مسائل کو بیان نہیں کیا بلکہ عملاً اس پر عمل کیا۔ حالی اس زمانے میں عورتوں کے حقوق کے پاسبان اور ان کی تعلیم کے حامی تھے جب سرسید اکبرالٰہ آبادی اور دوسرے افراد اسے ضروری نہیں سمجھتے تھے انہوں نے پانی پت میں اپنے گھر کے قریب لڑکیوں کا مدرسہ کھولا۔ لکھنا پڑھنا اپنی پوتی مشتاق فاطمہ کو سکھایا چناں چہ تعلیم نسواں اور حقوق زنان میں حالی برصغیر کے بنیاد گزاروں میں صف اوّل میں نظر آتے ہیں۔

مناجات بیوہ لکھ کر حالی نے ذیل کی سماجی اور ادبی خدمات انجام دیں:

ا۔ برصغیر کے معاشرے میں رائج مضر اور نقصان رساں رسومات کا کھلے الفاظ میں انکشاف ان کی مخالفت اور ان کا علاج۔ اس قومی بیداری کی وجہ سے بچپن کی شادیوں کی روک تھام اور بیوہ کو دوسری شادی کا اختیار حاصل ہوا۔

اسی نظم سے متاثر ہو کر برصغیر کی دوسری زبانوں میں ایسی نظمیں لکھی گئیں جن کا متن مناجات بیوہ سے ملتا جلتا ہے۔

۲۔ مناجات بیوہ میں حالی نے جو ہندوستانی زبان کا نمونہ پیش کیا وہ عوام کا روزمرہ معلوم ہوتا ہے۔ عبدالحق نے اسی نظم کا ذکر کرتے ہوئے مہاتما گاندھی سے کہا تھا کہ اس نظم کی زبان عام فہم ہندوستانی زبان کا عمدہ نمونہ ہے یعنی جسے اہل زبان عامی اور عالم کے سوا غیر زبان کے افراد جو ہندوستانی سے واقف ہیں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۳۔ مناجات بیوہ سے عورتوں کے مسائل حل کرنے کے لیے کمیٹیاں بنیں، مختلف خواتین کے گروہوں نے اپنی اپنی محفلوں میں اسے پڑھا اور پڑھایا۔ اس نظم کی بدولت حقوق زنان کی پاسداری کا احساس شدید ہوا۔

۴۔ اگر اس نظم کا ادبی تنقیدی جائزہ لیں تو ہمیں اس میں کئی موضوعات کا پتا چلتا ہے۔ جنہیں حالی نے نظم کے رشتے میں پرویا ہے۔ یہاں ایک دکھیاری دل کی فریاد جو اپنے بھاگ اور قسمت پر نالاں ہے اور قسمت بنانے والے سے گلہ بھی ہے کیوں کہ گلہ اُس سے ہوتا ہے جس سے محبت اور توقع ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کے شکوہ میں گلہ خاکم بدہن ہو کر پیش ہوا یہاں ایک ان پڑھ معمولی بیوہ کا لہجہ اس طور ہوا۔

تو ہے ٹھکانہ مسکینوں کا   تو ہے سہارا غمگینوں کا
تو ہے اکیلوں کا رکھوالا   تو ہے اندھیرے گھر کا اجالا
تو ہی دلوں میں آگ لگائے   تو ہی دلوں کی لگی بجھائے
چمکارے چمکار کے مارے   مارے مارے پھر چمکارے

حالی کی اس نظم میں عبد اور معبود کے رشتے کو دکھایا گیا ہے۔ عشق کا رشتہ جتنا

مضبوط ہوگا لہجہ کا انداز اتنا رنگین ہوگا۔ حالی کا محور انسان اور اس کی زندگی ہے اور ایک قابل قبول زندگی جس میں لذت و درد، عشق اور محبت، مروّت اور شفقت، جذبہ اور گداز شامل ہو ہر مرد اور عورت کا حق ہے وہ حق کو حق دار تک پہنچانے کے حق میں ہیں۔ مناجات بیوہ میں ہمارے معاشرے کی فضا اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ ہر بات اور جذبے کو بے نقاب اور برہنہ بیان کیا جائے اس نزاکت کو جانتے ہوئے حالی نے اس نظم کو اشاروں، علامتوں، محاوروں، استعاروں اور تشبیہوں سے تیار کیا ہے۔

یہ عمل حالی کی اس نظم کو ان کی مشہور نظم مسدس مدوجزر اسلام پر فوقیت دیتی ہے۔ زندگی کے معمولی اور روزمرہ کے حالات سے بنائی گئی یہ نظم دل کے تاروں کو اس لیے بھی چھیڑ دیتی ہے کہ اس کے نغمے میں حقیقی زندگی کی خواہش کی بربادی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ چند منتخب اشعار دیکھیے:

چین سے جاگی اور نہ سوئی ‏ ‏ ‏ میں نہ ہنسی، جی بھر کے نہ روئی
گھر پر برہا پیا بدیسی ‏ ‏ ‏ آئیو برکھا کہیں نہ ایسی
اپنے پرائے کی دُھتکاری ‏ ‏ ‏ میکے اور سُسرال پہ بھاری
خوشی میں بھی سُکھ پاس نہ آیا ‏ ‏ ‏ غم کے سوا کچھ راس نہ آیا
کیسا تھا یہ بیاہ نناواں ‏ ‏ ‏ یوں ہی پڑا اُس کا پرچھاواں
چین سے رہنے دیا نہ جی کو ‏ ‏ ‏ کر دیا ملیا میٹ خوشی کو
دن بھیانک اور رات ڈراؤنی ‏ ‏ ‏ یوں گزری ساری یہ جوانی
آئے دن تیوہار کا آنا ‏ ‏ ‏ اور سب کا تیوہار منانا
وہ گرمی کی چاندنی راتیں ‏ ‏ ‏ وہ ارماں بھری برساتیں
رہ گیا دے کر چاند دکھائی ‏ ‏ ‏ چاند ہوا پر عید نہ آئی
راجا کے گھر پلی ہوں بھوکی ‏ ‏ ‏ سدا برت میں چلی ہوں بھوکی

رہی اکیلی بھری سبھا میں
پیاسی رہی بھری گنگا میں

سچ یہ کسی سائیں کی صدا تھی
سُکھ سمپت کا ہر کوئی ساتھی

گرسسرال میں جاتی ہوں میں
نحس قدم کہلاتی ہوں میں

میکے میں جس وقت ہوں آتی
رو رو کر ہوں سب کو رلاتی

سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی
بال نہیں برسوں گندھواتی

دو دو چاند نہیں سر دھوتی
اٹھواروں کنگھی نہیں ہوتی

اڑ گئیں دلکی سب وہ ترنگیں
چاؤ رہے باقی نہ امنگیں

یوں نہ بری اس جان پہ بنتی
ماں مجھ کو اے کاش نہ جنتی

پس اس نظم سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حالی نے دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ کر اثر کو پرتاثیر کیا اور تمام مسائل رکھتے ہوئے بھی یہ نظم ایک کامیاب تجربہ کی شکل میں ہمارے سامنے عمدہ ترین اُردو نظموں میں شامل رہی۔

علی گڑھ کالج کیا سکھاتا ہے؟

یہ کالج قوم کو آپ اپنے بل چلنا سکھاتا ہے
سہارا غیر کا چھوڑیں یہ ایک اک کو سمجھاتا ہے

نہ چھوڑیں دین کا دامن، رہیں دنیا میں عزت سے
سبق سب قوم کے بچوں کو یہ دونوں پڑھاتا ہے

نہیں پاتا کبھی عزت کی خواہش سے کوئی عزت
معزز کس طرح بنتے ہیں؟ گُر اُس کے بتاتا ہے

خدا نے کر دیا ہے حکمراں جس قوم کو ہم پر
خلوص اور دوستی اُس قوم کی دل میں بٹھاتا ہے

رعیت کو برابر حق دیے ہیں جو حکومت نے
طلب سے پہلے اُن کا مستحق بننا بتاتا ہے

زمانہ قوم نے غفلت میں جو پہلے گزارا ہے
ڈرانی صورتوں میں بار بار اس کو دکھاتا ہے

یہ باہم مذہبی فرقوں کو ہے شیر و شکر کرتا
یہ روٹھوں کو مناتا ہے، یہ بچھڑوں کو ملاتا ہے

کھلاتا ہے یہ کھانا ایک دستر خوان پر سب کو
نمازیں پنجگانہ ایک مسجد میں پڑھاتا ہے

وفا کا بیج بوتا ہے، تعصب دل سے کھوتا ہے
مسلمانوں کو گڈ سبجکٹ، بننا یہ سکھاتا ہے

نہ چھوڑے گا یہ باقی قوم میں دیکھے گا جو خامی
خدا کی برکتیں اُن پر جو اس کالج کے ہیں حامی

علی گڑھ کالج کا منظوم منشور

حالی نے اس ایک دس شعر کے قطعہ بند میں علی گڑھ کالج کا منشور مرتب کیا

ہے۔ یہاں انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں کے ساتھ سماجی مذہبی اور اقتصادی قدروں کی حفاظت کا درس دیا گیا ہے۔ اس پیغام میں قوم کو پسماندگی سے نجات اور انسانیت کی راہ پر گامزن رہنے کا حوصلہ سکھایا گیا ہے۔ وطن دوستی اہل وطن سے محبت اور حکمران جو عدل و مساوات کے حامی ہوں اُن سے خلوص کرنے کا سبق پڑھایا گیا ہے۔ مسلمان قوم کی تفرقہ بازی، کاہلی غفلت، جہالت، تعصب اور دوسری حیوانی عادتوں سے نجات کا سامان مہیا کر کے ان کو اچھے عوام بننے کی تلقین کی گئی ہے یہ چھوٹی سی نظم سلیس اور رواں بحر میں آبِ زلال کی طرح شیریں ہے جو مضطرب فکر کو سکون بخشتی ہے۔ آج کے اس دور میں علی گڑھ یونی ورسٹی کے علاوہ علی گڑھ المنائی انجمن دنیا کے مختلف ملکوں میں سرسید اور علی گڑھ کی یاد مناتی ہیں۔ کیا بہتر ہوگا اگر اس نظم کے منشور کو یہ ادارے اپنے مینوفسٹو میں شامل کریں۔

راست گوئی کی تاثیر

حالی کی یہ مثنوی (۱۲۱) اشعار سے بنی ہے۔ یہ عجیب طرز بیان کی مثنوی ہے جس میں راست گوئی یا سچ بولنے پر جو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا ذکر فقروں میں، محاوروں میں تشبیہوں اور استعاروں میں بیان کر کے شاعر نے اُن برگزیدہ ہستیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن کی حق گفتاری سے دنیا میں انسانی اور دینی قدریں باقی رہ گئیں اگرچہ وہ خود قربان ہو گئے۔ حالی کی یہ نظم اخلاقیات کا درس اور انسانی قدروں کو مہمیز کرنے کا عمل معلوم ہوتی ہے۔ سچائی یا راست گوئی تلخ ہے، تند ہے، کڑوی ہے، برہنہ تلوار، زہر ہلال اور شہادت ہے۔

اے راست گوئی کیا قہر ہے تو　　　شئے کوئی تجھ سے کڑوی نہ ہو گی
چلواتی گھر گھر تلوار تو ہے　　　تو آشتی کی رہتی ہے دشمن

یہ سچ گفتاری نے تاریخ میں وہ نقش بنائے جو آج بھی تروتازہ ہیں۔ حالی نے راست گویوں سربازوں کا ذکر کئی مقامات پر علاحدہ علاحدہ کیا ہم اسے کچھ مصرعوں کو جوڑ کر پیش کرتے ہیں۔

سقراط کو زہر تو نے دلایا　　　شبیر کو قتل تو نے کرایا
بدر و اُحد میں رن تو نے ڈالے　　　موسیٰ کو مدین تو نے بھگایا
احمد ﷺ سے مکہ تو نے چھڑایا

حالی نے راست گوئی کو ہر زاویہ سے دیکھا اور ہم کو دکھایا ہے۔ حالی اُس عظیم

شاعر کے شاگرد ہونے کا شرف رکھتے ہیں جس کے لیے مشہور ہے۔

ع: کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور ہم یہاں اس کی جھلک دیکھ رہے ہیں

اے راست گوئی اے تیغ براں — تیرا مخالف کیوں ہو نہ دوراں
ہوتی ہے جس جا تو جلوہ گستر — دفتر بہت سے ہوتے ہیں ابتر
اٹھتا ہے عملہ لات اور منا کا — ہوتا ہے گھر پر قبضہ خدا کا
ہوتے ہیں اغیار احمد کے ساتھی — بوجہل کے سب چھٹتے ہیں ناتی
ہوتی ہے سچ سے جب سب کو نفرت — تو جھوٹ پر واں کرتی ہے لعنت
یاں نام تیرا جس نے لیا ہے — عالم کو اپنا دشمن کیا ہے
کتنوں نے مانا ساحر نبی ﷺ کو — کتنوں نے جانا کافر علی رضی اللہ عنہ کو
طوفان اٹھائے اہل ھدٰی پر — بہتان باندھے زینِ عبا پر
نعمان رحمۃ اللہ علیہ کو دی بدعت سے نسبت — کی شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر برپا قیامت
مالک رحمۃ اللہ علیہ پہ لائے آفت جفا جو — یاں تک کہ اکھڑا مفصل سے بازو
کی ابن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی یہ مدارا — چہرے پہ تھوکا کوڑوں سے مارا
نکلے ایمّہ اکثر وطن سے — خالی ہوا رے ابنِ حسن سے
مرتد بنایا اہل یقیں کو — ٹھہرایا زندیق ارباب دیں کو

حالی یہ بتا رہے ہیں کہ ان تمام مشکلات اور تکالیف کے باوجود راست گوئی پیروز رہی اُس نے دلوں پر حکومت کی تاریکیوں کو اجالوں سے بدل دیا ظلم و جور کو نابود کر دیا اس لیے آج دنیا میں راست گویوں کے نام زندہ ہیں۔

اے کلمہ حق تیری بدولت — تجھ پر ہوئے وہ دیوانے جب سے
دامن انہوں نے تیرا نہ چھوڑا — دنیا نے ان پر گو ظلم توڑا
ہوتا نہ ہر گز جگ میں اجالا — حق کا نہ ہوتا گر بول بالا

جواں مردی کا کام

انگریزی حکایت سے ماخوذ عمدہ نظم

حالی کی قدیم ترین نظموں میں ایک مثنوی ۱۸۷۲ء کی تصنیف ''جواں مردی کا کام'' ہے جو ستر (۷۰) اشعار پر مشتمل ہے۔ حالی لکھتے ہیں کہ یہ حکایت ایک انگریزی نثر سے لی گئی ہے اور کچھ خیالات کے اضافے سے منظوم کیا ہے۔ اس مثنوی کی زبان سادہ سلیس اور بیانیہ ہے۔ نظم کا متن واقعہ نگاری اور مکالمہ بندی سے بنا عام فہم طرز بیان میں ہے تا کہ بچے جوان بوڑھے عامی اور عالم سب اسے سمجھیں اور انسانی قدریں سیکھیں۔ نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ

> ''ایک بوڑھا باپ جس کے تین بیٹے تھے اپنی جائیداد اور ثروت کو تینوں میں تقسیم کر کے جواہرات کو الگ ایک صندوق میں رکھ کر تینوں بیٹوں سے کہا یہ جواہرات کا مالک وہ ہو گا جس نے سب سے اچھا کام انجام دیا ہو۔ چناں چہ بڑے بیٹے نے بیان کیا کہ ایک شخص نے بغیر کسی گواہ یا رسید کے اس کے پاس بڑی رقم

امانت رکھوائی تھی جس کو وہ آسانی سے ہڑپ کر سکتا تھا لیکن اس نے امانت میں خیانت نہیں کی اور وہ رقم اس شخص کے مانگنے پر واپس کر دی اور اُس مال دار شخص سے وہ انعام بھی قبول نہیں کیا جو اُسے پیش کیا گیا تھا۔ اُس پر بوڑھے باپ نے کہا:

اک بُرائی سے بچے تم تو کیا　　اس سے بڑھ کر بھی کوئی کام کیا
اک خیانت کے نہ کرنے پہ یہ ناز　　شرم کی جا ہے تری عمر دراز

منجھلے بیٹے نے کہا کہ اُس نے ایک ڈوبتے لڑکے کو بچایا اور اس کی ماں سے ملا دیا۔ بوڑھے باپ نے کہا:

آدمیت کا کیا تم نے کام　　جاؤ بس ہے یہی اس کا انعام
فخر کی جا یہ مری جاں کیا ہے　　نہ ہو اتنا بھی تو انساں کیا ہے

چھوٹے بیٹے نے کہا کہ اُس نے ایک مدہوش شخص کو موت سے بچایا جو اُس کا جانی دشمن تھا چھوٹے لڑکے نے اس کام کو کرتے ہوئے اپنے چہرے کو ڈھانک لیا تاکہ وہ شخص شرمندہ نہ ہو۔ بوڑھے باپ اور دونوں بھائیوں نے یہ اقرار کیا کہ سب سے جوانمردی کا کام چھوٹے بیٹے نے کیا اور وہی اس جواہرات کے صندوق کا حق دار ہے۔''

اقتباس مسدسِ حالی

مسدس ایک بیانیہ طولانی نظم ہے جو (1374) اشعار پر مشتمل ہے۔ حالؔی نے مسدس کے بندوں کوایک دوسرے میں اس طرح پیوست کر دیا ہے کہ ان کا علاحدہ کرنا نظم کے حسن اور متن کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ ہم نے آج کے دور کے ذوق مطالعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہاں اہم بندوں کو اقتباسات کے طور پر اور موضوع کے اعتبار سے اِس لیے بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر دریا شیریں پانی پورا سینچا نہ جا سکے تو کم از کم اپنے ساغر میں اتنا تو کھینچا جا سکے کہ کسی حد تک تشنگی کم ہو جائے اور پھر دریا سے سیراب ہونے کی امنگ بڑھ جائے۔

مسلمان کی حالت:

کسی نے یہ بقراط سے جا کے پوچھا　　مرض تیرے نزدیک مہلک ہیں کیا کیا
کہا دکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا　　کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا
مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں

دورِ جاہلیت:

عرب جس کا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا
جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
تمدن کا اس پر پڑا تھا نہ سایا
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا
وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا
خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا
وہ تیرتھ تھا اک بت پرستوں کا گویا
جہاں نام حق کا نہ تھا کوئی جویا

ولادت ختمی مرتبت ﷺ:

یکا یک ہوئی غیرت حق کو حرکت
بڑھا جانب بوقبیس ابرِ رحمت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نویدِ مسیحا

سیرت نبی ﷺ:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگذر کرنے والا
بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

پیغامِ اسلام:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا قول ہادی عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی
نئی اک لگن دل میں سب کے لگا دی اک آواز میں سوتی بستی جگا دی
پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اُٹھے دشت و جبل نام حق سے

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اُٹھی پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور چمک دور دور اس کی پہنچی جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

تعلیم وتربیت کلمہ گویان:

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق زبان اور دل کی شہادت کے لائق
مبرا ہے شرکت سے اُس کی خدائی نہیں اُس کے آگے کسی کو بڑائی
سکھائے مشیت کے آداب ان کو پڑھائے تمدن کے سب باب ان کو
جتائی انہیں وقت کی قدر و قیمت دلائی انہیں کام کی حرص و رغبت
غنیمت ہے صحت علالت سے پہلے فراغت مشاغل کی کثرت سے پہلے
یہ کہہ کر کیا علم پر ان کو شیدا کہ ہیں دور رحمت سے سب اہل دنیا
سکھائی انہیں نوع انساں پہ شفقت کہا ہے یہ اسلامیوں کی علامت
کرو مہربانی تم اہل زمیں پر خدا مہرباں ہو گا عرش بریں پر
کہ حکمت کو ایک گم شدہ لال سمجھو جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو

قرون اولیٰ کے مسلمان:

سب اسلام کے حکم بردار بندے سب اسلامیوں کے مدد گار بندے
خدا اور نبی کے وفادار بندے یتیموں کے رانڈوں کے غم خوار بندے
رہ کفر و باطل سے بے زار سارے
نشے میں مئے حق کے سر شار سارے
جہالت کی رسمیں مٹا دینے والے کہانت کی بنیاد ڈھا دینے والے
سر احکام دیں پر جھکا دینے والے خدا کے لیے گھر لٹا دینے والے
ہر آفت میں سینہ سپر کرنے والے
فقط ایک اللہ سے ڈرنے والے
کنیز اور بانو تھیں آپس میں ایسی زمانہ میں ماں جائی بہنیں ہوں جیسی

صدر اسلام اور احوال دنیا:

ترقی کا جس دم خیال ان کو آیا اندھیرا تھا اک ربع مسکوں پہ چھایا
نہ ہنگامہ تھا گرم عبرانیوں کا نہ اقبال یاور تھا نصرانیوں کا
پراگندہ دفتر تھا یونانیوں کا پریشاں تھا شیرازہ ساسانیوں کا
جہاز اہل روما کا تھا ڈگمگاتا چراغ اہل ایراں کا تھا ٹمٹماتا
اِدھر ہند میں ہر طرف تھا اندھیرا کہ تھا گیان گن کا لدایاں سے ڈیرا
اُدھر تھا عجم کو جہالت نے گھیرا کہ دل سب کے کیش وکنش سے تھا پھیرا
نہ بھگوان کا دھیان تھا کہانیوں میں نہ یزداں پرستی تھی یزدانیوں میں

مسلمانوں کی ترقی:

ہر اک ملک میں ان کی پھیلی امارت ہر اک قوم نے ان سے سیکھی تجارت
نہیں اس طبق پر کوئی براعظم نہ ہوں جس میں اُن کی عمارات محکم
عرب ، ہند ، مصر ، اندلس ، شام ، دیلم بناؤں سے ہے اُن کی معمور عالم
ہوا اندلس ان سے گل زار یک سر جہاں ان کے آثار باقی ہیں اکثر
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر یہ ہے بیت حمرہ کی گویا زباں پر
کہ تھے آلِ عدنان سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمیں پر نشانی
کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے
جلال ان کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا
سنے گوش عبرت سے گر جا کے انساں تو واں ذرہ ذرہ یہ کرتا ہے اعلاں
کہ تھا جن دنوں مہر اسلام تاباں ہوا یاں کی تھی زندگی بخش دوران
پڑی خاک ایتھنز میں جاں یہیں سے
ہوا زندہ پھر نام یوناں یہیں سے

علم وحکمت کا گہوارہ:

وہ لقمان و سقراط کے در مکنون پڑے تھے کسی قبر کہنہ میں مدفوں
یہیں آ کے مہر سکوت ان کی ٹوٹی اسی باغ رعنا سے لو ان کی پھوٹی

حریم خلافت میں اونٹوں پہ لا کر چلے آتے تھے مصر و یوناں کے دفتر
پڑا غلغلہ جن کا تھا کشوروں میں وہ سوتے ہیں بغداد کے مقبروں میں

علم فلکیات اور رصد گاہیں:

وہ سنجار کا اور کوفہ کا میداں فراہم ہوئے جس میں سیّاح دوراں
کرہ کی مساحت کے پھیلائے ساماں ہوئی جزو سے قدر کل کی نمایاں
زمانہ وہاں آج تک نوحہ گر ہے کہ عباسیوں کی سبھا وہ کدھر ہے
سمرقند سے اندلس تک سراسر انہیں کی رصدگاہیں تھیں جلوہ گستر
سواد مراغہ میں اور قاسیوں پر انہیں سے صدا آ رہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں وہ اسلامیوں کے منجم کہاں ہیں

آزادی وحریت:

جو آزادی میں آج فایق ہیں سب سے
بتائیں کہ لبرل بنے ہیں وہ کب سے

ادب اور طب کا فروغ:

عرب کی جو دیکھی وہ آتش زبانی وہ خطبوں میں مانند دریا روانی
وہ جادو کے جملے وہ فقرے فسوں کے تو سمجھے کہ گویا ہم اب تک تھے گونگے
نوا سنجیاں ان سے سیکھی ہیں سب نے زباں کھول دی سب کی نطق عرب نے
زمانہ میں پھیلی طب ان کی بدولت ہوئی بہرہ ور جس سے ہر قوم و ملت
ابوبکر رازی ، علی ابن عیسا حکیم گرامی حسین ابن سینا

حنین ابن اسحاق قسّیس دانا ضیا ابن بیطار راس الاطبّا
انہیں کے ہیں مشرق میں سب نام لیوا انہیں سے ہوا پار مغرب کا کھیوا

اسلام کا زوال:

پہ گدلا ہوا جب کہ چشمہ صفا کا گیا چھوٹ سر رشتہ دین ہدا کا
رہا سر پہ باقی نہ سایا ہما کا وہ پورا ہوا عہد تھا جو خدا کا
کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک
وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک
رہا دین باقی نہ اسلام باقی اک اسلام کا رہ گیا نام باقی
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر
یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے
کیے پے سپر جس نے ساتوں سمندر وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آ کر

مسلمانان ہندوستان:

ہماری ہر اک بات میں سفلہ پن ہے کمینوں سے بدتر ہمارا چلن ہے
بزرگوں کی توقیر کھوئی ہے ہم نے عرب کی شرافت ڈبوئی ہے ہم نے
نہ اہل حکومت کے ہمراز ہیں ہم نہ صنعت میں حرفت میں ممتاز ہیں ہم
یہ اے قوم اسلام عبرت کی جا ہے کہ شاہوں کی اولاد در در گدا ہے
جسے سنیے افلاس میں مبتلا ہے جسے دیکھیے مفلس و بے نوا ہے
نہیں کوئی ان میں کمانے کے قابل اگر ہیں تو ہیں مانگ کھانے کے قابل
بہت آگ چلموں کی سلگانے والے بہت گھاس کی گٹھریاں لانے والے

بہت در بدر مانگ کر کھانے والے | بہت فاقہ کر کر کے مر جانے والے
جو پوچھو کہ کس کان کے ہیں وہ جوہر | تو نکلیں گے نسل ملوک ان میں اکثر
بہت آپ کو کہہ کے مسجد کے بانی | بہت بن کے خود سید خاندانی
بہت سیکھ کر نوحہ و سوز خوانی | بہت مدح میں کر کے رنگیں بیانی
بہت آستانوں کے خدام بن کر | پڑے مانگتے کھاتے پھرتے ہیں در در
مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں | ہنر اور پیشہ کو جو خوار سمجھیں
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں | فرنگی کے پیسے کو مردار سمجھیں
تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی | وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

ہمارے شاعر:

وہ شعر اور قصائد کا ناپاک دفتر | عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
زمیں جس سے ہے زلزلے میں برابر | ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر

ہوا علم و دیں جس سے تاراج سارا
وہ علموں میں علم ادب ہے ہمارا

برا شعر کہنے کی گر کچھ سزا ہے | عبث جھوٹ بکنا اگر ناروا ہے
تو وہ محکمہ جس کا قاضی خدا ہے | مقرر جہاں نیک و بد کی سزا ہے

گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے
جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے!

یہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے | کہیں مل کے ''خس کم جہاں پاک'' سارے

ہمارے علمائے دین:

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدا کا | کہ ہے ساری مخلوق کنبا خدا کا

یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے
وہ لے جا کے سب اہل مغرب نے جوڑے

رہا کوئی امت کا ملجا نہ ماوا
نہ قاضی نہ مفتی نہ صوفی نہ ملّا

یہ ہیں جادہ پیمائے راہِ طریقت
مقام ان کا ہے ماورائے شریعت

انہیں پر ہے ختم آج کشف و کرامت
انہیں کے ہے قبضہ میں بندوں کی قسمت

یہی ہیں مراد اور یہی ہیں مرید اب
یہی ہیں جنید اور یہیں با یزید اب

بڑھے جس سے نفرت وہ تحریر کرنی
جگر جس سے شق ہوں وہ تقریر کرنی

گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی
مسلمان بھائی کی تکفیر کرنی

یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

ہمیں یہاں یگانہ چنگیزی اور جمیل مظہری کے اشعار یاد آرہے ہیں۔ یگانہ کہتے ہیں:

سر پھرا دے آدمی کا ایسا خبط مذہب کیا
سب ترے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا

جمیل مظہری نے کہا تھا

کسے خبر تھی کہ لے کر چراغ مصطفویؐ
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

نہ سنی میں اور جعفری میں ہو الفت
نہ نعمانی و شافعی میں ہو ملت

وہابی سے صوفی کی کم ہو نہ نفرت
مُقلّد کرے نامُقلّد پہ لعنت

رہے اہل قبلہ میں جنگ ایسی باہم
کہ دینِ خدا پر ہنسے سارا عالم

مسلمانوں کی اخلاقی کمزوریاں:

تعصب کو اک جزو دیں سمجھے ہیں ہم
جہنم کو خلد بریں سمجھے ہیں ہم

گناہوں سے ہوتے ہو گویا مُبرّا
مخالف پہ کرتے ہو جب تم تبرا

نہیں دستیاب ایسے اب دو مسلماں کہ ہو ایک کو دیکھ کر ایک شاداں
اگر نشہ مئے ہو غیبت میں پنہاں تو ہشیار پائے نہ کوئی مسلماں
نشہ میں تکبر کے ہے چُور کوئی حسد کے مرض میں ہے رنجور کوئی
منھ اپنا ہو گو دین و دنیا میں کالا نہ ہو ایک بھائی کا پر بول بالا

امیرزادوں کے کرتوت:

شریفوں کی اولاد بے تربیت ہے تباہ ان کی حالت بُری ان کی گت ہے
کسی کو کبوتر اُڑانے کی لت ہے کسی کو بٹیریں لڑانے کی دھت ہے
چرس اور گانجے پہ شیدا ہے کوئی
مدک اور چنڈو کا رسیا ہے کوئی
اگر ماں ہے دکھیا تو ان کی بلا سے اپاہج ہے باوا تو ان کی بلا سے
جو ہے گھر میں فاقہ تو ان کی بلا سے جو مرتا ہے کنبہ تو ان کی بلا سے
جنھوں نے لگائی ہے لو دل رُبا سے
غرض پھر انہیں کیا رہی ماسوا سے
اگر شش جہت میں کوئی دل رُبا ہے تو دل ان کا نادیدہ اُس پر فدا ہے
اگر خواب میں کچھ نظر آ گیا ہے تو یاد اُس کی دن رات نامِ خدا ہے
بھری سب کی وحشت سے روداد ہے یاں جسے دیکھیے قیس و فرہاد ہے یاں
نمونے یہ اعیان و اشراف کے ہیں سلف ان کے وہ تھے خلف ان کے یہ ہیں
انہیں کے بزرگ ایک دن حکمراں تھے انہیں کے پرستار پیرو جواں تھے
یہی مامن عاجز و ناتواں تھے یہی مرجع دیلم و اصفہاں تھے
یہی کرتے تھے ملک کی گلہ بانی انہیں کے گھروں میں تھی صاحبقرانی

نسل جدید سے توقع:

وہ اسلام کی پود شاید یہی ہے کہ جس کی طرف آنکھ سب کی لگی ہے
بہت جس سے آیندہ چشم بہی ہے بقا منحصر جس پہ اسلام کی ہے
یہی جان ڈالے گی باغ کہن میں
اسی سے بہار آئے گی اس چمن میں
یہی ہیں وہ نسلیں مبارک ہماری کہ بخشیں گی جو دین میں استواری
کریں گی یہی قوم کی غم گساری انہیں پر امیدیں ہیں موقوف ساری
یہی شمع اسلام روشن کریں گی
بڑوں کا یہی نام روشن کریں گی!!

شمع امید:

جھلک اے امید اپنی آخر دکھا تو ذرا نا امیدوں کی ڈھارس بندھا تو
بہت تُو نے پستوں کو بالا کیا ہے اندھیرے میں اکثر اُجالا کیا ہے
یہ سچ ہے کہ حالت ہماری زبوں ہے جہالت وہی قوم کی رہنموں ہے
مگر اے امید اک سہارا ہے تیرا کہ جلوہ یہ دنیا میں سارا ہے تیرا
یہ سچ ہے کہ ہے قوم میں قحط انساں سفال و خزف کے ہیں انبار گر یاں
چھپے سنگریزوں میں گوہر بھی ہیں کچھ ملے ریت میں ریزہ زر بھی ہیں کچھ
یوں ہی کام دنیا کا چلتا رہے گا دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہے گا

ترقی کا عزم:

بہت دن سے دریا کا پانی کھڑا تھا کہ مکروہ تھی بُو تو کڑوا مزا تھا

حوادث نے ان کو ڈرایا ہے کچھ کچھ
زمانے کے غُل نے جگایا ہے کچھ کچھ
حوادث کے بن گذارا نہیں یاں
بلندی و پستی سے چارا نہیں یاں
بہت یکہ تازوں کو یاں گرتے دیکھا
سدا شہسواروں کو یاں گرتے دیکھا
نہ ہو تاب پرواز گر آسماں تک
تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

حرکت میں برکت:

ہلانے سے ڈوری کے گر ڈور ہلتی
تو روٹی نکموں کو ہرگز نہ ملتی
وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

فدا کاری:

بہت مخلص اور پاک بندے خدا کے
نمایش کے بے زار دشمن ریا کے
کسی پر چلے تیر آماج یہ ہیں
لٹے کوئی رہ گیر تاراج یہ ہیں
مہم بن کیے سر نہیں بیٹھتے یہ
جب اٹھتے ہیں اٹھ کر نہیں بیٹھتے یہ
انہیں پر ہے کچھ فخر ہے گر کسی کو
انہیں سے ہے گر ہے شرف آدمی کو
دم ان کا ہے دنیا میں رحمت خدا کی
انہیں کو ہے پھبتی خلافت خدا کی

محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے:

مشقت کی ذلت جنہوں نے اُٹھائی
جہاں میں ملی ان کو آخر بڑائی
کسی نے بغیر اس کے ہرگز نہ پائی
فضیلت نہ عزت نہ فرمانروائی
نہال اس گلستاں میں جتنے بڑھے ہیں
ہمیشہ وہ نیچے سے اوپر چڑھے ہیں
حکومت ملی اُن کو صفار تھے جو
امامت کو پہنچے وہ قصار تھے جو

وہ قطب زماں ٹھہرے عطار تھے جو
بنے مرجع خلق نجّار تھے جو
ابوالفضل یاں اٹھے سراج کتنے
ابوالوقت ہو گذرے حلاج کتنے

علم بڑی نعمت ہے:

ہمیشہ سے یہ کہتے آئے ہیں سب یاں
کہ ہے علم سرمایہ فخر انساں
عرب اور عجم ہند اور مصر و یوناں
رہا اتفاق اس پہ قوموں کا یکساں
یہ دعویٰ تھا اک جس پہ حجت نہ تھی کچھ
کھلی اس پہ اب تک شہادت نہ تھی کچھ
جواہر تھا اک سب کی نظروں میں بھاری
پرکھنے کی جس کے نہ آئی تھی باری
فضائل تھے سب علم کے اعتباری
نہ تھیں طاقتیں اُس کی معلوم ساری
پہ اب بحر و بر دے رہے ہیں گواہی
کہ ہے علم میں زور دست الٰہی
کیا کوہساروں کو مسمار اس نے
بنایا سمندر کو بازار اس نے
زمینوں کو منوایا دوار اس نے
ثوابت کو ٹھہرایا سیار اس نے
لیا بھاپ سے کام لشکر کشی کا
دیا پتلیوں کو سکت آدمی کا

قدیم طلاب اور درس گاہیں:

عراقین و شامات و خوارزم وتوراں
جہاں جنس تعلیم سنتے تھے ارزاں
وہیں پے سپر کر کے کوہ و بیاباں
پہنچتے تھے طلاب اُفتاں و خیزاں
جہاں تک عمل دین اسلام کا تھا
ہر اک راہ میں ان کا تانتا بندھا تھا
نظامیہ نوریہ مستنصریہ
نفیسیہ ستیّہ اور صاحبیہ
روحیہ غریہ اور قاہریہ
عزیزیہ زینیہ اور ناصریہ
یہ کالج تھے مرکز سب آفاقیوں کے
حجازی و کُردی و قبچاقیوں کے

مناجات:

الٰہی بحق رسول ﷺ تہامی
ہر اک فرد انساں کا تھا جو کہ حامی
جسے دور و نزدیک تھے سب گرامی
برابر تھے مکی و زنگی و شامی
شریروں کو ساتھ اپنے جس نے بنایا
بروں کا ہمیشہ بھلا جس نے چاہا
طفیل اُس کا اور اُس کی عزت کا یا رب
پکڑ ہاتھ جلد اُس کی اُمت کا یا رب
اک ابر اس پہ بھیج اپنی رحمت کا یا رب
غبار اُس سے جو دھوئے ذلت کا یا رب
کہ ملت کو ہے ننگ ہستی سے اس کی
ہوا پست اسلام پستی سے اُس کی
بچا اُن کو اُس تنگنائے بلا سے
کہ رستہ ہو گم رہرو و رہنما سے
نہ امید یاری ہو یار آشنا سے
نہ چشم اعانت ہو دست و عصا سے
چپ و راست چھائی ہوئی ظلمتیں ہوں
دلوں میں امیدوں کی جا حسرتیں ہوں
انہیں کل کی فکر آج کرنی سکھا دے
ذرا ان کی آنکھوں سے پردہ اُٹھا دے
کہیں گاہ بازی دوراں دکھا دے
جو ہونا ہے کل آج اُن کو سجھا دے
چھتیں پاٹ لیں تا کہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

حالؔی کے شخصی مرثیوں کا تجزیہ

حالی اُردو شخصی مرثیے کے مجدد تھے۔ اگرچہ عربی میں کربلائی مراثی سے پہلے اور بعد میں شخصی مرثیوں کا رواج تھا لیکن اُردو شاعری میں یہ کمی قطعہ تاریخ وفات سے منسلکہ چند شعروں میں پوری کی جاتی تھی چناں چہ اٹھارویں صدی کے اواخر میں بعض نظمیں مرنے والے کے غم اور اس کے اخلاق حُسنہ اور اعمال عمدہ سے متاثر ہو کر لکھیں گئیں لیکن اس صنف نے غدر کے بعد ایک بڑے شعرا کے گروہ کو اپنا طرف دار کر لیا جس کی وجہ سے ایک بڑا ذخیرہ شخصی مراثی کا اُردو شاعری میں جمع ہو گیا۔ غالب نے اپنی بیوی کے بھانجے زین العابدین عارف اور اپنی معشوقہ کے مرنے پر مرثیے لکھے۔ دونوں مرثیے غزل کی شکل میں ہیں جن میں درد و غم اور رنج ومحن سے لبریز جذبات اور احساسات ہیں۔ مومن نے اپنی معاشقہ کی وفات پر بارہ اشعار پر مشتمل مرثیہ لکھا جو ترکیب بند میں شمار ہوتا ہے۔ حالی نے دس سے زیادہ قطعات تاریخ وفات اور نو سے زیادہ شخصی مرثیے لکھے جس میں ایک مرثیہ فارسی میں سرسید پر بھی نظر آتا ہے۔ حالی نے شخصی مرثیے لکھنے کی تاکید بھی کی جس کے نتیجہ میں درجنوں شخصی مرثیے تخلیق ہوئے۔ حالی کے شخصی مراثی ترتیب وار نیچے دیے گئے ہیں:

۱۔ مرثیہ مرزا غالب ترکیب بند تصنیف ۱۸۶۹ء تعداد شعر سو (۱۰۰)

۲۔ مرثیہ بڑے بھائی خواجہ امداد حسین قطعہ کی شکل میں تصنیف ۱۸۸۵ء تعداد شعر بیس (۲۰)

۳۔ مرثیہ حکیم محمود خان مسدس کی شکل میں تصنیف ۱۸۹۲ء تعداد شعر (۱۳۸)

۴۔ مرثیہ ملکہ معظّمہ وکٹوریا ترکیب بند کی شکل میں تصنیف ۱۹۰۱ء تعداد شعر (۶۶)

۵۔ مرثیہ قیصر ہند بہ شکل غزل تصنیف ۱۹۰۱ء تعداد شعر (۹)

۶۔ مرثیہ سرسید کے دو رفیق قطعہ کی شکل میں تصنیف ۱۹۰۵ء تعداد (۳۹)

۷۔ مرثیہ محسن الملک ترکیب بند کی شکل میں تصنیف ۱۹۰۷ء تعداد شعر (۹)

۸۔ مرثیہ سرسید فارسی میں ترکیب بند تصنیف ۱۸۹۸ء تعداد (۷۰)

۹۔ مرثیہ سالار جنگ تراب علی خان فارسی میں ترجیع بند کی شکل میں تصنیف ۱۸۸۳ء تعداد شعر (۲۸)

حالی کے قطعات وفات تاریخ جو انہوں نے اُردو اور فارسی میں لکھے یہ ہیں۔

۱۔ قطعہ تاریخ وفات مرزا غالب دہلوی۔ (۸) شعر

۲۔ قطعہ تاریخ وفات خواجہ ناصر وزیر دہلوی۔ (۳) شعر

۳۔ قطعہ تاریخ وفات محمد حسین آزاد۔ (۸) شعر

۴۔ قطعہ تاریخ وفات محمد علی خان رشکی (فارسی) (۱۶) شعر

۵۔ قطعہ تاریخ وفات سید محمود علی (فارسی) (۱۰) شعر

۶۔ قطعہ تاریخ وفات خلیفہ سید محمد حسن (فارسی) (۱۹) شعر

۷۔ قطعہ تاریخ وفات خلیفہ سید محمد حسین (فارسی) (۱۹) شعر

۸۔ قطعہ تاریخ وفات مولوی چراغ علی (فارسی) (۱۰) شعر

۹۔ قطعہ تاریخ وفات خواجہ کرامت علی (فارسی) (۲) شعر

۱۰۔ قطعہ تاریخ وفات محمد ابراہیم (فارسی) (۲) شعر

۱۱۔ قطعہ تاریخ وفات خواجہ فریدالدین احمد (فارسی) (۲) شعر

۱۲۔ قطعہ تاریخ وفات مولوی چراغ علی (فارسی) (۲) شعر

۱۳۔ قطعہ تاریخ وفات نواب محسن الملک (فارسی) (۲) شعر

۱۴۔ قطعہ تاریخ وفات نواب ضیاء الدین نیر (فارسی) (۲) شعر

حالی نے مرثیوں اور تاریخ وفات کے قطعوں میں مبالغہ اور جھوٹی مدح کے بغیر سیدھے سادے اشعار میں مرحوم یا ممدوح کی صفتیں خوبیاں اور ہنرمندی کے کرشموں کو نظم کیا ہے جو ایک منظوم ریویو ہوسکتا ہے۔ ہم یہاں کچھ منتخب اور اہم مرثیوں کا تجزیہ کریں گے۔ محمد حسین آزاد متوفی ۹ محرم ۱۳۲۸ ہجری مطابق ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء کی تاریخ وفات کا قطعہ ہمارے بیان کا ثبوت ہے۔ ان آٹھ اشعار میں حقیقت سلیس الفاظ میں پیش کی گئی ہے۔ آزاد کا فن شخصیت سفر زندگی اور مرنے کی تاریخ سب کچھ اس قطعے میں موجود ہے۔

آزاد وہ دریائے سخن کا دُرِ یکتا — جس کی سخن آرائی پہ اجماع تھا سب کا
ہر لفظ کو مانیں گے فصاحت کا نمونہ — جو اُس کے قلم سے دمِ تحریر ہے ٹپکا
ملکوں میں پھرا مدتوں تحقیق کی خاطر — چھوڑا نہ دقیقہ کوئی رنج اور تعب کا
دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہل قلم میں — تصنیف کا، تدوین کا، تحقیق کا لپکا
صحت میں، علالت میں، اقامت میں، سفر میں — ہمت تھی بلا کی تو ارادہ تھا غضب کا
فرض اپنا ادا کر کے کئی سال سے، مشتاق — بیٹھا تھا کہ آئے کہیں پیغام طلب کا
آخر شب، عاشور کو تھی جس کی تمنا — آ پہنچا نصیبوں سے بلاوا اُسے رب کا
تاریخ وفات اُس کی جو پوچھے کوئی حالی — کہہ دو کہ ''ہوا خاتمہ اُردو کے ادب کا''

خواجہ امداد حسین نے جو حالی کے بڑے بھائی تھے حالی کی پرورش اور تربیت

اس خوبی سے کی کہ کبھی حالی کو ماں باپ کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ حالی ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کو باپ کی جگہ مانتے تھے۔ امداد حسین ہی کے کہنے پر حالی نے ماموں کی بیٹی اسلام النساء سے شادی کی تھی۔ حالی کے بڑے بیٹے اخلاق حسین کو انہوں نے گود لیا تھا کیونکہ ان کی خود کوئی اولاد نہیں تھی۔ حالی اپنے بڑے فرزند اخلاق حسین کو تمام عمر برادر زادہ کہہ کر یاد کرتے تھے۔ خواجہ امداد حسین کو شعر و ادب سے لگاؤ تھا اور وہ بھی شعر کہتے تھے اور مظہر تخلص کرتے۔

ان کا انتقال ۱۳۰۴ ہجری مطابق ۱۸۸۶ء۔ ۱۸۸۷ء میں دہلی میں ہوا اور وہ وہیں خواجہ باقی باللہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیے گئے۔ مرنے سے چند مہینے قبل وہ علاج کے سلسلے میں حالی کے پاس دہلی میں مقیم تھے لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

حالی کی لگن اور دن رات کی تیمارداری بھی ان کو موت سے بچا نہ سکی۔ خواجہ امداد حسین کی موت کا صدمہ حالی پر شدید ہوا۔ حالی نے ان کی موت پر ایک بیس (۲۰) اشعار کا مرثیہ لکھا جو ان کے جذبات کا ترجمان ہے اس کے چند شعر یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔

حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت — مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی
آتے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑنے — موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی — غم بھائی کا مرجانے کی ہے اس کی نشانی
جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا — سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی
جس بھائی کی آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا — جس بھائی کے سائے میں کٹی اس کی جوانی
شفقت نے دیا جس کی بُھلا مہر پدر کو — دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی
باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر — ہر چند کے فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

حالی نے سرسید اور مختار الملک تراب علی خان سالار جنگ کے مرثیے فارسی میں لکھے۔ سالار جنگ کا مرثیہ ۱۸۸۳عیسوی میں تصنیف کیا جس میں (۲۷) شعر ہیں جب کہ سرسید کے شاہکار مرثیے میں (۷۰) اشعار ہیں اور یہ ۱۸۹۸ء میں تصنیف کیا گیا۔ ان مراثی کے علاوہ حالی نے دس سے زیادہ قطعات تاریخ وفات فارسی میں لکھے۔ سرسالار جنگ کے انتقال پر جو مرثیہ ترجیع بند میں لکھا۔ اس کا تکراری شعر ہے۔

اے اجل گرتن بے جاں تہ خاکش سپری　　　نہ توانی کہ نکو نامیش از یاد بری

یعنی اے موت اگرچہ تو نے بے جان بدن کو خاک میں چھپا دیا ہے لیکن تو نیک نامی کو لوگوں کی یاد سے مٹا نہیں سکتی۔

سالار جنگ کی علی گڑھ کالج کو مدد کے علاوہ ان کی فکرو تدبر کا ذکر بھی کیا ہے کہ اس کی مثال مشکل ہے اور ہندوستان کی خاک سے ایسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے۔

آہ از آن عقل و کفالت کے نہ بینش مثال　　　سپس از ہند چنین مرد نہ خیزد صد سال

نواب اعظم یار جنگ بہادر مولوی چراغ علی کی وفات کی قطعہ تاریخ نکالی جو یہ ہے

زخمے از مرگِ چراغِ علی آمد بر دل　　　کہ ازد خاطرِ افکار بصد غم شدہ جفت

از خرد سال وفاتش جو بجستم ''محمود''　　　''شد نہاں حیف چراغ علی از دنیا'' گفت

مولوی چراغ علی کے انتقال پر ان کی تاریخ وفات ۱۸۹۰ء سرسید کے فرزند سیّد محمود نے نکالی:

حیف چراغ علی از دنیا نہاں شد

حالی نے اس تاریخ کو قطعہ میں نظم کیا۔ اس کے علاوہ مولانا حالی نے خود بھی ایک قطعہ مرحوم کی وفات پر لکھا ہے، جس میں گویا مرحوم کے کام اور سیرت کی کامل

تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ یہ ہے:

آہ آہ از رحلتِ بے گاہِ اعظم یار جنگ
کزمیانِ رہ زہمراہاں عناں پیچید و رفت

حیف دنیا را بہ پنجاہ سالگی کردہ وداع
بزم مارا بزمِ ماتم باز گردانید و رفت

مستفیداں پُر نہ کردہ دامنِ معنی ہنوز
مشتی از گنجینۂ لعل و گہر پاشید و رفت

از سحابِ فیض کلکش تاشدہ سیراب خلق
ساعتے برقِ یمانی از افق تابید و رفت

عقدہانکشودہ ماند و نکتہ ہا نوشتہ اند
بہر جوئے شیر کوہِ بے ستوں کند دید و رفت

کرد بے آزارِ خلق اعمالِ سلطانی اَدا
نے زکس رنجید و نے کس را برنجانید و رفت

یاوراں قوم را تازیست یاور بود و یار
ہر چہ بتو انست در تائید شاں کوشید و رفت

از دل پُردردِ او گاہے صدائے برنجاست
مدتے چوں بحر کامل درنہاں جوشید و رفت

طبعِ آزادش بہر ملت کہ بینی صلح داشت
دردل خویش و دل بیگانہ درگنجید و رفت

گر رسید صد سال کس انجامِ اومرگست وبس
چوں شر روضع دوراں مبتواں خندید و رفت

محمد چراغ علی سرسید کے ہم مصاحبین سے تھے۔ وہ پہلے یوپی میں سرکاری ملازم تھے بعد میں حیدرآباد چلے گئے انہوں نے مذہبی مناظروں اور بحثوں میں حصہ لیا۔ سرسید کی حیات میں 1895ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے مضامین عمدہ رسالوں میں چھپتے تھے۔ بقول سرسید کے عربی، فارسی کے علاوہ عبرانی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے دو اہم کتابیں انگریزی میں لکھیں جن کا اُردو ترجمہ تحقیق جہاد اور اعظم الکلامی فی ارتقاء الاسلام کے نام سے اُردو میں شائع ہوا۔

حالی کی تحریروں اور تقریروں کے علاوہ ان کے اشعار میں سرسید تحریک سے منسلک سرسید کے دوست و احباب، ان کے مصاحب اور ان کے حامیوں کے کارناموں پر عمدہ معلومات ملتی ہیں۔ حالی نے سرسید کے دو دیرینہ ساتھی خان بہادر ملک برکت علی خان اور سید زین العابدین کے انتقال پر 1905ء میں ایک مرثیہ سرسید کے دو رفیق کے

عنوان پر لکھا جس کے کچھ منتخب شعر یہ ہیں۔

حیف دنیا سے کیا برکت علی خاں نے سفر — جس سفر سے ہے جوانوں کو نہ بوڑھوں کو مفر
قوم کی خدمت کا جو سید سے سیکھا تھا سبق — وہ سبق مرحوم نے بھولا نہ ہر گز عمر بھر
ایسے مالی اور کمیرے گر نہ ہوتے دست یاب — پود سید کی نہ ہوتی تا قیامت بارور
دست و بازو تھے یہی اُسے جاں نثار قوم کے — جن کی سرگرمی سے لائیں کوششیں اس کی ثمر
ورنہ تھی چھائی ہوئی بیڑے پہ سرسید کے یاس — رات اندھیری وقت بھیانک اور دریا پر خطر
ان عزیزوں نے دیا اس وقت سرسید کا ساتھ — جب کہ پرچھائیں سے اس کی قوم کرتی تھی حذر
بعد اس ماتم کے زین العابدین خان کی وفات — وہ اگر داغ، جگر تھا تو یہ ہے داغِ دگر
کوئی چیز اُس نے کبھی رکھی نہ سید سے عزیز — بے تکلف اس کا گھر گویا کہ تھا سید کا گھر
کی علی گڑھ میں سکونت اس کی خاطر اختیار — سب وطن اور رشتہ داری کا تعلق توڑ کر
آخرش پہلو میں سید کے کیا اس نے مقام — جب کیا مہماں سرائے دار فانی سے سفر

حالی یہاں یہ بھی بتانا چاہ رہے ہیں کہ سرسید کے یہ قریبی دوست و مصاحب اگر چہ اختلاف رائے رکھتے تھے ان میں بعض مسائل پر بحث و رنجشیں ہوتی لیکن ان سب کا مقصد ایک تھا اور وہ قوم کی فلاح اور بہبود۔

دیکھتے اے کاش ان بوڑھوں کے یارانے کا رنگ — وہ جواں جو طعنہ زن بوڑھوں کے ہیں اخلاص پر
رنجشیں الفت بھری شکوے سراسر مہر خیز — چھیڑ لطف انگیز خفگی اس سے لطف انگیز تر
رائے ہر اک کی جدا تیل اور پانی کی طرح — متحد لیکن مقاصد صورت شیر و شکر

حالی نے محسن الملک کے نو(۹) شعر کے مرثیے میں انہیں سرسید ثانی کہا ہے۔

سید کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا — اُس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر
وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار — سر کر کے مہم قوم کے کام آ گیا آخر

ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ

حالی نے مارچ 1901ء میں علی گڑھ کالج کے ایک ٹرسٹی کی حیثیت سے ترکیب بند ہیئت میں (۷۵) اشعار پر مشتمل مرثیہ لکھا جس میں ملکہ اور انگریز حکومت کی تعریف کی۔

آج گھر گھر ہے وہی ماتم جہاں میں جس سے ہے ۔۔۔ زلزلے میں کینڈا سے لے کے تا ہندوستان
اے کوئن وکٹوریا اک تجھ کو کیا آئی اجل ۔۔۔ پچھمی دنیا کے ہاتھوں سے گئی گویا نکل
ہے دلیل اس کے لیے کافی فقط تیری مثال ۔۔۔ مرد پر عورت فضیلت کا کرے گر ادّعا
کی تجارت نے ترقی عہد میں یاں تک ترے ۔۔۔ سلطنت ہے اُس کے آگے ہیچ بے چون و چرا
جس قدر علمی فتوحات اس زمانے میں ہوئیں ۔۔۔ دہر کی تاریخ میں ملتا نہیں اُن کا پتا
علم میں روزِ ازل سے تھی جو اک طاقت نہاں ۔۔۔ صاحبی میں تیری یہ راز آشکارا ہو گیا
ہو گئے ہر براعظم میں ترے برپا علَم ۔۔۔ تیرے بیڑوں اور جہازوں سے سمندر پٹ گیا
شاعروں کے جس قدر مدحِ سلف میں تھے غلو ۔۔۔ حق میں تیرے وہ حقائق بن گئے سرتا بہ پا
سچ ہے "وہ وارث زمیں کے ہوں گے جو ہوں گے حلیم" ۔۔۔ حلم سے اپنے ملی آفاق میں مسکنت تجھے
"وہ تسلی پائیں گے دنیا میں جو جھیلیں گے غم" ۔۔۔ ہو چکے غم بس تسلی دے گی اب راحت تجھے
فرد تھی اقبال میں تو، بے نظیر اخلاق میں ۔۔۔ تیرے مرنے سے ہے سناٹا سا اک آفاق میں

وہ نہیں لاتے بجا شکر خدائے ذوالجلال

ہند نے پایا ترے دورِ حکومت میں وہ امن ۔۔۔ اگلے دوروں میں نہ تھا جس کا کہیں خواب و خیال
لی گئی قحط اور وبا میں ملک کی جویاں خبر ۔۔۔ تھا زمانہ تیرا اس میں آپ ہی اپنی مثال
شکر آزادی کا تیرے عہد کی ممکن نہیں ۔۔۔ سب کا اس احسان میں جکڑا ہوا ہے بال بال
ہم سمجھ لیتے کہ ہیں ہر قید سے آزاد ہم ۔۔۔ قیدِ احساں سے ترے چھٹنے کی گر ہوتی مجال

ہے علی گڑھ میں ہماری یہ جو قومی درس گاہ　　ہے حقیقت میں یہ تیرے نام کی اک یادگار
اس کی رسم فونڈیشن اور جشن قیصری　　دونوں تقریبیں ہوئی ہیں ایک ہی وقت آشکار
جب تلک قائم ہے کالج جب تلک باقی ہے قوم　　یہ شہنشاہی عطیہ یاں رہے گا یادگار

حالی نے ملکہ وکٹوریہ کے مرثیہ میں اس کی عورت ہو کر بھی مردوں سے زیادہ کام کرنے اور علم اخلاق و انصاف اور معاشرے کے مثبت اقدامات کا تذکرہ کر کے اُسے اعلیٰ انسانوں کی صف میں شمار کیا ہے۔علی گڑھ کی تاسیس اور ترقی میں اس کا گراں قدر حصہ بتایا ہے۔ ملکہ کی نجات اور اس کی رعایا پروری پر بائبل کے حوالے بھی دیے ہیں۔حالی نے اسی مرثیے میں ایڈورڈ ہفتم سے امید بھی دکھائی ہے۔

حالی کا ایک نو اشعار کا نوحہ بھی ہمیں ملا ہے جو رسالہ مصارف میں ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا تھا۔

ہند پر شاق ہے اے قیصرہ رحلت تیری　　تھی رعیت کے لیے موت قیامت تیری
کر لیا تھا تری سیرت نے دلوں کو تسخیر　　گو کہ دیکھی نہ تھی ہم نے کبھی صورت تیری

حالی کی اس قسم کی انگریزوں کی مدح و ثنا میں نظمیں خصوصاً اُن افراد کو جن کی آزادی ملک اور زندگی کو قیصر نے تسخیر کر لیا تھا وہ ملکہ کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے چناں چہ اگر انھوں نے حکومت کے دباؤ اور ظلم و ستم کی وجہ سے کچھ نہیں کہا تو ان کی نسلوں نے یہ نفرت اپنے سینوں سے اگل دی جو نسل در نسل سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی۔ چناں چہ حالی پر کیے گئے اعتراضات کا بڑی حد تک منصفانہ جائزہ صالحہ عابد حسین نے یادگار حالی میں لیا ہے جس کے کچھ اقتباسات ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

> ''حالی پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ وہ سچے محب وطن نہ تھے بلکہ انگریز کے بہی خواہ، مدح خواں اور ساتھی تھے۔ اُنھوں نے انگریزی حکومت کی تعریف کی ہے۔ ملکہ وکٹوریا اور بعض

دوسرے حاکموں کی شان میں قصیدے کہے ہیں۔ مسلمانوں کو انگریز حکومت کا ساتھ دینے اور مغربی تعلیم کا حامل بنانے کی تبلیغ اور کوشش کی ہے۔(یادگارِ حالی کے ایک محترم تبصرہ نگار نے اس پر یہ اعتراض فرمایا تھا کہ مصنفہ نے حالی جیسے انگریز پرست کو زبردستی قوم پرست بنانے کی ناکام کوشش کی ہے۔) ان اعتراضوں کا کچھ حصہ صحیح ہے اور کچھ غلط۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی نے ابتدا میں انگریزی یعنی ملکہ وکٹوریا کی حکومت کو ہندوستانیوں کے لیے خصوصاً مسلمانوں کے لیے رحمتِ الٰہی سمجھا تھا۔ انہوں نے انگریز حاکموں کی تعریف بھی کی اور مسلمانوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین بھی کی۔ مغربی تعلیم کے زبردست حامی تھے اور اہل وطن کی ترقی و فلاح کا واحد ذریعہ یہی سمجھتے تھے کہ وہ مغربی علوم حاصل کریں۔ لیکن کیا اس سے حالی کے محب وطن ہونے پر کوئی حرف آتا ہے؟ یا وہ انگریز پرست اور ابن الوقت ثابت ہوتے ہیں؟ یہ کہنا تعصب اور تنگ نظری کی دلیل اور حالی کی زندگی، سیرت اور خیالات سے ناواقفیت پر مبنی ہوگا۔ ہم حال اور ماضی کے فرق کو اور حالات کے تضاد کو پیش نظر رکھ کر ہی اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ حالی محب وطن، قوم پرور اور وطن پرست تھے یا انگریز پرست۔''

حالی نے جب ہوش سنبھالا تو اُدھر ایسٹ انڈیا کمپنی اپنا تسلط بیٹھا رہی تھی اور ایک کے بعد ایک ریاست ہڑپ کرتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ پہلے شورش پسند عناصر نے ملک کی آزادی کے نام پر ظلم و بربریت کے

مظاہرے کیے اور پھر کمپنی نے بدلے میں ظلم و استبداد کی انتہا کر دی۔ اس بغاوت میں مسلمان پیش پیش تھے اور انتقام کا شکار بھی زیادہ تر وہی ہوئے۔ دلی کی حکومت ختم کر دی گئی۔ بادشاہ کو قید کر کے جلاوطن کیا گیا۔ ملکہ وکٹوریا نے ہندوستان کو براہ راست اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔

> ''ہنگامی دور گزر جانے کے بعد برادرانِ وطن نے بہت جلد بدیسی حکومت کو اپنا لیا اور مغربی تعلیم حاصل کرنے میں بھی وہ پیش پیش نظر آنے لگے۔ لیکن دوسری طرف مسلمانوں کو ایک طرف ''اپنی حکومت'' کے جانے کا غم تھا تو دوسری طرف بدیسی حکومت سے مذہبی تعصب بہت بڑھا ہوا تھا۔ وہ انگریزی حکومت سے تو ٹکر نہ لے سکتے تھے البتہ غم و غصے میں مغربی علوم سے دشمنی مول لے لی تھی اور تہیہ کیے ہوئے تھے کہ اس حکومت کے رائج کردہ علوم سے روگرداں رہیں گے اور ہرگز کوئی فائدہ نہ اُٹھائیں گے۔
>
> لیکن ایک چھوٹا سا حلقہ ایسا بھی تھا جس کی دوراندیشانہ نگاہوں نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں کی یہ اور وہ ہندوستان میں نفاق، تعصب اور تفریق پیدا کر کے اپنی حکومت باقی رکھنا اور اپنا گھر بھرنا چاہتے ہیں تو بے اختیار وہ پکار اُٹھے:

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح — واں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی — یہ حرفِ سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر — مانو اُسے، اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو
کرنے کے ہیں جو کام کیے جاؤ وہ لیکن — جو بات سبک ہو اُسے منہ سے نہ نکالو

رائے کی جگہ سیاست کا لفظ رکھ دیجیے، انگریزی سامراج کی

ساری پالیسی اور حکومت کو چند شعروں میں کس طرح آئینہ کر دیا ہے۔ اور جب حالی نے یہ دیکھا کہ مغربی قوم کی لوٹ محض مادی چیزوں تک محدود نہیں بلکہ اس کی ''حکمت'' اور ''سیاست'' کی بدولت مشرقی قوموں کی اخلاقی حالت بھی بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے تو وہ اور بھی مایوس اور بددل ہو گئے۔ وہ جدید مغربی تعلیم کے حامی ضرور ہیں مگر مشرقی خوبیوں اور مشرقیت کو اپنا بیش بہا قومی سرمایہ بھی سمجھتے ہیں جسے کسی قیمت پر چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ ایک جگہ مغربی قوموں کی تاجرانہ لوٹ کا ذکر کس انداز میں کرتے ہیں۔

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن حذر اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے، نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں یہ گُل چینی ہے یا لٹس ہے گلچیں یا ہے قزاقی

جب وہ دیکھتے ہیں کہ بدیشی ہر جگہ دیسیوں کو ذلیل کرتے ہیں، ہر موقع پر ''کالے'' اور ''گورے'' کا فرق کیا جاتا ہے تو اُن کا غیرت مند دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ اُنہوں نے طنزیہ انداز میں اس فرق کو خوب بیان کیا ہے جو ایک کالا اور گورا اور دونوں کی تکرار اور بیماری کے سرٹیفکیٹ کے بارے میں ہے۔

حالی کو اپنی زندگی ہی میں اندازہ ہونے لگا تھا کہ انگریزی حکومت سے جو توقعات اُنہوں نے قائم کی تھیں وہ پوری ہوتی نظر نہیں آتیں تو اُن کے دل میں بار بار ایک کانٹا سا کھٹک اُٹھتا ہے۔

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا؟ دیکھا ہے ہم نے برسوں لُطف و کرم تمہارا

کبھی بے چین ہو کر کہہ اٹھتے ہیں

داد طلب سب غیر ہوں جب تو اُن میں کسی کا پاس نہ ہو بتلائی ہے زمانے نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں
صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آ گئے یاد احسان ہمیں

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حالی اگر دس بیس برس اور زندہ رہتے اور وہ سب آنکھوں سے دیکھتے جو ملک اور قوم کو بدیسی حکومت کی بدولت سہنا پڑا تو وہ ضرور آزادی کی پرخلوص اور پرجوش تحریک سے متاثر ہوتے۔ بہرحال یہ سچ ہے کہ

چھپ نہیں سکتا ہے شاعر شعر کے چھپنے کے بعد

افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑے گا کہ حالی کے اشعار ان کی نیک نیتی یا مثبت نظریہ کی وجہ سے ہمیشہ ان کے دامن پر عیب دار داغ بن کر باقی رہیں گے۔ ہم نے یہاں حالی کی شاعری کا وہ رخ بھی پیش کیا ہے جو عام طور سے پیش نہیں ہوتا۔ ہم حالی کا قصیدہ نہیں لکھ رہے بلکہ حالی فہمی کی دستاویز مکمل کر رہے ہیں جس سے حالی کے مرتبے اور مقام میں کوئی کمی کا امکان نہیں۔

مرثیہ حکیم محمود خان دہلوی

حالی کا سب سے طویل مرثیہ حکیم محمود خان دہلوی کا ہے جو دہلی کے ممتاز حکیم، عظیم شخصیت اور مہاراجہ پٹیالہ کے خاص طبیب تھے۔ یہ حکیم محمود خان کی دانشوری تھی کہ غدر کے موقع پر مہاراجہ پٹیالہ سے فوج طلب کر کے دلی کے کچھ علاقوں خصوصاً بلی ماران کی حفاظت کروائی چناں چہ یہ علاقہ غارت اور لوٹ سے محفوظ رہا۔ یہ مرثیہ مسدس کی شکل میں پینتالیس بند یعنی ایک سو پینتیس اشعار پر مبنی ہے۔ یہ مرثیہ ۱۳۱۰ ہجری مطابق ۱۸۹۲ء کی تصنیف ہے۔ اس مرثیے کے چہرے میں کوئی بیس (۲۰) بندوں میں دہلی کا تذکرہ ہے۔ اگرچہ دلی کا تذکرہ حالی کا محبوب مشغلہ ہے جیسے انہوں نے غزلوں، نظموں اور مرثیوں میں برتا ہے لیکن جس تفصیل سے اس مرثیہ کی تمہید میں

لکھا ہے وہ حالی کے دل کی آواز معلوم ہوتا ہے۔ حالی نے شاید مرثیے کی تمہید میں دلی کا تذکرہ اس لیے بھی کیا ہو کہ محمود خان دہلوی تھے انہوں نے دہلی کو تباہ ہونے سے بچانے میں مدد کی وہ دہلی کی تہذیب اوراس کے تمدن کی آخری شمع تھے جو ۱۸۹۲ء میں بجھ گئی۔ حالی جب دلی کا ذکر کرتے ہیں تو ہر لفظ سے خلوص محبت جذبہ اور صداقت ٹپکتی نظر آتی ہے۔ مرثیے کے مطلع کے بند میں لہجہ دیکھیے۔

اے جہاں آباد اے اسلام کے دارالعلوم — اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنرور تجھ میں اتنے جتنے گردوں پر نجوم — تھا افاضہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجھ کو جہاں آباد کا — نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا
تیری طینت میں ودیعت تھا مذاق علم ودیں — جیسے امی تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں
شاذ و نادر تھا تصوف میں کوئی تیرا نظیر — آب وگل کا تیرے تھا گویا تصوف سے خمیر
ہند میں جاری تجھی سے طب یونانی ہوئی — شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی
راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر — حسن معنی تیرا حصہ اے جہاں آباد تھا
رسم میں آئین میں اوضاع میں اطوار میں — طرز میں انداز میں رفتار میں گفتار میں

آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام

رہ گیا باہر سے آ کر جو کہ تجھ میں چند سال — ڈھل گئے سانچے میں گویا اس کے عادات اور فعال
جمگھٹا تھا تجھ میں ترک وفرس وروم وزنگ کا — دستہ تھا گویا کہ تو گل ہائے رنگا رنگ کا

گزری دلی کی عظمت بتا کر حالی نے لکھا کہ اس چمن کو نظر لگ گئی اور خزاں کا دور شروع ہو گیا۔

گردش افلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وار — تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر لگی کرنے بہار
دولت و اقبال کا بندھنے لگا رخت سفر — تجھ سے اے دارالعلوم اٹھنے لگا علم و ہنر
مجلسیں برہم ہوئیں زیروزبر دیواں ہوئے — خانقاہیں بے چراغ اور مدرسے ویران ہوئے

جھڑ گئے تاج شرف سے تیرے لب لعل و گوہر　　تجھ کو اے دارالخلافت کھا گئی کس کی نظر

حالی یہاں مرثیے میں وہ مقام لاتے ہیں جس میں محمود خاں کا وجود باعث روشنی ہے۔

خاک نے یاں تیری پھر اگلے وہ لعل بے بہا　　جن سے روشن ہو گیا کچھ دن کو نام اسلاف کا
علم و دیں و شعر و حکمت طب و تاریخ و نجوم　　ڈال دی پھر اپنی تو نے چار سو ہر فن میں دھوم
چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیر چھا گیا　　اٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی

پھر حالی نے محمود خاں دہلوی کے علم و ہنر اوصاف و کردار خدمات اور کارناموں کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے۔ ہم صرف کچھ اشعار اور مصرعے پیش کرتے ہیں۔

نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب　　خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب
اس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دارالشفا　　مفت بیماریوں کو اس کے در سے ملتی تھی دوا
راستی اور راست بازی اس کی تھی ضرب المثل　　اس کے کاموں میں ریا تھی اور نہ باتوں میں دغل

غدر کے بعد جو دہلی میں لوٹ اور قتل و غارت ہو رہا تھا اس کی روک تھام کا ذکر ہے۔

وہ زمانہ جب کہ تھا دلی میں اک محشر بپا　　شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار
بالیقیں جن ملزموں کو اس نے سمجھا بے خطا　　مارشل لا میں ثبوت ان کی گواہی کا دیا
زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا　　بے ٹھکانوں کو ٹھکانہ بے گھروں کو گھر دیا
بے گناہوں کے لیے وہ رات دن چکر میں تھا　　پاؤں اک اس کا عدالت تھا اور اک گھر میں تھا

محمود خان اس دور میں بھی عادی زندگی بسر کر رہے تھے۔

عمر کاٹی دوزخ دنیا میں جنت کی طرح　　مٹ گئی افسوس اک ایسی سلف کی یادگار
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

حالی اپنی شاعری کا نوحہ اس مرثیے سے جوڑ دیتے ہیں۔

گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ
پر ملی ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کے لینے دیا ہم کو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم
کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

نوحۂ قیصرۂ ہند

حالی نے ایک نو(۹) شعر کا نوحہ غزل کی ہیئت میں ''نوحۂ قیصرہ ہند'' کے عنوان سے لکھا۔ درحقیقت یہ نظم جنوری ۱۹۰۱ء کے رسالے معارف میں حافظ محمد یعقوب مجددی کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی جواہرات حالی میں لکھتے ہیں:

> ''میرے دریافت کرنے سے حافظ محمد یعقوب مجددی نے خود فرمایا کہ یہ نوحہ میری تصنیف نہیں بلکہ مولانا حالی نے میری فرمایش پر میرے لیے لکھا اور میرے ہی نام سے شائع ہوا تھا۔''

شریعت شعر میں کسی بھی شاعر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے اشعار کسی اور کو دے یہ بالکل جائز نہیں لیکن صحیفہ شاعری میں یہ ناجائز تحریریں نظر آتی ہیں۔ جن کو بعد میں نکال کر حق دار تک حق پہنچایا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہر بڑے اور معتبر شاعر کا ایک خاص رنگ اور کہنے کا ایک منفرد ڈھنگ ہوتا ہے۔ چناں چہ شعر شناسوں کے لیے اُسلوب اور طرز نگارش بڑی حد تک اس گھتی کو سلجھا دیتے ہیں۔

اس حقیقت کے بعد ہمیں یہ بھی جاننے کی ضرورت ہے کہ اور کتنے حالی کے اشعار دوسروں کے نام سے مشہور ہیں؟

حالی کا یہ نوحہ دراصل ملکہ وکٹوریا کا قصیدہ ہے جس میں مبالغہ غلطی بیانی جھوٹ اور چاپلوسی ہے۔ ایک مقبوض جابر حکومت کی سربراہ کے اخلاق کی تعریف اور ظالم کے وجود کو نعمت کہنا اپنے آپ کو ہی نہیں بلکہ قوم کو بھی دھوکا دینا ہے۔ یہ اشعار حالی کے دامن پر سیاہ دھبے ہیں جن کا مٹانا ممکن نہیں۔ کچھ شعر یہ ہیں:

ہند پر شاق ہے اے قیصرہ رحلت تیری — تھی رعیت کے لیے موت قیامت تیری
کر لیا تھا تری سیرت نے دلوں کو تسخیر — گو کہ دیکھی نہ تھی ہم نے کبھی صورت تیری
نام اخلاق میں اتنا ہی ترا تھا روشن — جتنی تھی دولت و اقبال میں شہرت تری
قدر نعمت کی سدا ہوتی ہے یاں بعد زوال — ہوئی معلوم ترے مرنے سے عظمت تیری
امن نے کھول ترقی کے دیے دروازے — ملک سب ہو گیا گلزار بدولت تیری

مرثیہ محسن الملک

حالی نے محسن الملک کے انتقال پر ایک (۹) شعر کا مرثیہ ترکیب بند ہیئت میں نظم کیا۔ یہ مرثیہ حالی کے دلی جذبات کا آئینہ ہے۔ سرسید کے بعد لوگوں کو محسن الملک سے بڑی توقعات تھیں کیوں کہ انھوں نے سرسید کے بعد تک و تنہا علی گڑھ کالج کو سنبھال رکھا تھا۔

سیّد کا بدل قوم کو مشکل سے ملا تھا — اس کو بھی وہی قوم کا غم کھا گیا آخر
وہ ملک کا محسن وہ مسلمانوں کا غم خوار — سر کر کے مہم قوم کے کام آ گیا آخر
جو خندہ زنی کرتے تھے ہر کام پہ اس کے — وہ خون کے آنسو انہیں رُلوا گیا آخر
مہدی کے لیے قوم عزا دار ہے ساری — کہرام ہے کشمیر سے تا راس کماری

حالی نے ان کی موت پر فارسی میں ایک قطعہ تاریخ وفات بھی لکھی اور ''انجمن آرائے بہشت بریں'' سے ۱۳۲۵ ہجری نکالی۔ یہ قطعہ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ

نومبر ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔

محسن الملک آہ از دنیا رفت　　خلق شد از رحلتش اندوہ گیں
سالِ وفاتش شدہ ملہم ز غیب　　''انجمن آرائے بہشتِ بریں''
۱۳۲۵ھ

حالی کا شاہکار مرثیۂ غالب

الطاف حسین حالی کا ایک زندہ شاہکار غالب کی موت پر شخصی مرثیہ ہے۔ غالب کی موت پر نثری تحریروں کے علاوہ منظوم گلدستۂ خراج عقیدت میں رباعی قطعات ترکیب بند اور ترجیع بند میں نظر آتے ہیں۔ غالب کا انتقال فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں ہوا۔ غالب کی وفات کے قطعات ان کی وفات کے فوری بعد ''اکمل الاخبار'' میں شائع ہوتے رہے اور ہر شمارے میں ایک سے زیادہ قطعات شائع ہوئے۔ مدیر ''اکمل الاخبار'' نے جولائی ۱۸۶۹ء میں میر مہدی مجروح کے ترجیع بند کو شائع کر کے اس سلسلے کو ختم کیا۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ غالب کے انتقال کے زیادہ سے زیادہ چار مہینے بعد مجروح نے دس بند کا مرثیہ لکھا جس کا ہر بند اس شعر پر ختم ہوتا ہے۔

رشک عرفیؔ و فخرِ طالبؔ مرد　　اسد اللہ خان غالب مرد

یہ شعر مجروح کے مرثیے میں ترجیع بند ہونے کی وجہ سے دس بار دہرایا گیا۔ اسی ترجیع بند شعر کو قربان علی بیگ سالک کے ترجیع بند مرثیے کے چھے بندوں میں دہرایا گیا اور حالی نے اپنے ترکیب بند میں اس شعر کو ایک بار استعمال کیا۔ ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان تینوں شاعروں میں کس نے سب سے پہلے غالب کا مرثیہ لکھا لیکن غالب کے خطوں سے یہ ظاہر ہے کہ خود غالب نے ۱۲۷۷ ہجری میں اپنی تاریخ وفات ''غالب مرد'' نکالی تھی جب مذکور تاریخ گزر گئی تو ان کے چہیتے شاگرد مجروحؔ نے لکھا کہ

''مذکور'' تاریخ سلامتی سے گزر گئی اب حضور کیا فرماتے ہیں۔''

غالب نے ۱۷ محرم ۱۲۷۸ کے خط میں لکھا:

''لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے۔

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میری کسر شان تھی۔''

اگرچہ مرزا غالب کی وفات پر مختلف شاعروں نے اشعار لکھے، تاریخ وفات نکالی، جن کا اجمالی ذکر کرنے سے پہلے ہم غالب کے دو اہم شاگردوں کے ترجیع بند پر حالی کے ترکیب بند پر مفصل گفتگو کرنے سے پہلے اس لیے بھی کریں گے یہ شخصی مرثیے ایک ہی بحر میں ہیں۔ ان کا تاریخی شعر بھی ایک ہی ہے لیکن رنگ اور مطالب جدا جدا ہیں۔ مجروحؔ کا مرثیہ جو دس بند اور ہر بند میں آٹھ مختلف اور ایک یکساں شعر یعنی (۸۱) اشعار پر مشتمل ہے۔ مجروحؔ نے غالب کی شخصیت اور ان کے فن سے آغاز کیا۔

کیوں نہ ویران ہو دیارِ سخن — مر گیا آج تاجدارِ سخن

بلبل خوش ترانہ معنی — گل رنگین شاخسارِ سخن

عرصہ نظم کیوں نہ ہو ویراں — ہے عنان کش وہ شہسوارِ سخن

کیوں نہ حرفوں کا ہو لباس سیاہ — ہے غمِ مرگ شہر یارِ سخن

ساتھ ان کے گئی سخن سنجی — ان کا مرقع ہی ہے مزارِ سخن

آبیاری تھی جس سے وہ نہ رہا — اب خزاں ہو گئی بہارِ سخن

نغمۂ پیرائیاں کہاں ویسی — اب یہ ہے نالہ ہائے زار سخن

رشک عرفی و فخر طالب مرد — اسد اللہ خان غالب مرد

غالب کے اس مرثیے میں مجروحؔ نے جو اشعار اپنے دیوان میں شامل کیے

ہیں وہ اکمل الاخبار کے ترجیع بند سے ذرا مختلف ہیں اور یہاں ان کی تعداد بھی زیادہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجروحؔ نے کچھ ترمیم کے ساتھ اشعار میں اضافہ بھی کیا۔ تمہیدی یا تشبیب کے بند میں غالب کو تاجدار سخن، شہسوار سخن، بہار سخن اور شہر یار سخن کہہ کر غالب کی موت سے جو ویرانی تباہی اور خزاں سخن پر چھائی اس کا ذکر کیا ہے یہاں فن کے لحاظ سے ان کی خوش ترانہ معنی، سخن سنجی اور نغمہ پیرائی کے ساتھ عرفی شیرازی اور طالب آملی کے رشک کے ساتھ غالب کی موت کا ذکر ہے۔ مجروح نے غالب کے مزاج کی تہذیب وشرافت، ان کا صلح جو برتاؤ ان کی گفتگو کی اثر اندازی اور بات سے بات بنانے کے ہنر کو خوبصورتی سے اشعار میں ڈھالا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ غالب کی ان شخصی باتوں سے مہدی مجروح سے زیادہ کون واقف ہوگا وہ غالب کے سب سے چہیتے شاگرد تھے جو غالب کے خطوں سے ظاہر ہے۔

مجروح کہتے ہیں:

تھی جو ان کے مزاج میں تہذیب — وہ جہاں میں نہیں کسی کو نصیب
صلح کل کا رکھا تھا وہ برتاؤ — تھے وہ دشمن کی بھی نظر میں حبیب
گفتگو میں بڑی وضاحت تھی — ہوتے تھے محو جس کو سن کے ادیب
تھا ہر اک بات کا نیا انداز — ہر سخن کی تھی ایک نئی ترکیب

مجروحؔ کا یہ کہنا کہ ہر بات کہنے کا ڈھنگ نرالا تھا یعنی ''ہر سخن کی تھی ایک نئی ترکیب'' غالب شناسی کا اہم نکتہ ہے کیوں کہ

کہتے ہیں کہ غالب کا تھا انداز بیاں اور

مجروح کے مرثیے میں جو غالب کی موت کا درد والم اور رنج وغم کا منظر نظر آتا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ غالب کے شاگردوں میں کوئی بھی اتنا غالب سے مانوس اور قریب نہ تھا۔

ان کی شفقت جو یاد آتی ہے　　چشم دریائے خوں بہاتی ہے
ان کی دوری میں ہے یہ بدمزگی　　کہ نہیں زیست اپنی بہاتی ہے
یہ انہیں کا مزار ہے شاید　　یاں سے کچھ بوئے الفت آتی ہے
ہائے جنگل میں اس کی قبر بنی　　کاخ معنی کی جو کہ تھا بنیاد

مقطع کے بند میں کہتے ہیں:

گرد تابوت تھا ہجوم کبیر　　اہل ماتم میں تھی یہی گفتار
جو کہ جاتے تھے ہمرہِ تابوت　　یہی کہتے تھے وہ پکار پکار
رشک عرفی و فخر طالب مرد　　اسد اللہ خان غالب مرد

اس تحریر میں آگے چل کر ہم یہ بتائیں گے کہ حالی اور مجروح کے مرثیوں میں متن کے لحاظ سے اور انداز بیان کی رو سے بڑا فرق ہے کیوں کہ دونوں بڑے فطری شاعر ہیں اگرچہ دونوں غالب کے شاگرد ہیں جن کو ایک ماحول ملا اور دونوں کا مبدا ماویٰ ملجا اور محسن ایک تھا جس نے دونوں پر عنایت شفقت اور محبت کی تھی۔

غالب کے ایک اور ممتاز شاگرد اور عمدہ شاعر قربان علی سالک نے بھی ترجیع بند میں چھے بند کا مرثیہ اسی بحر میں لکھا اور ہر بند میں

رشک عرفی و فخر طالب مرد　　اسد اللہ خان غالب مرد

کے ٹیپ کے شعر کو دھرایا۔ سالک نے حالی کی طرح ایک علیحدہ ۱۱۹ اشعار کا قطعہ تاریخ بھی لکھا جس کی ادب میں ان کے مرثیے سے زیادہ پذیرائی ہوئی کیوں کہ یہ مطلب ہماری گفتگو کا مقصد نہیں اس لیے ہم یہاں صرف ترجیع بند مرثیے پر اکتفا کرتے ہیں جس میں غالب کی شخصیت اور سالک سے ان کی نسبت ایک غم آلودہ فضا میں دکھائی گئی ہے۔

خضر راہ سخن جہاں سے گیا　　ہادی راہ کارواں سے گیا

اب کہاں گل فشانی مضمون　　خامہ حسرت فگار سونا تھا
تھا سکوں میں جو مرکز خالی　　نہیں اس دل کو مثل برق قرار
سطحِ خاک کی الٰہی خبر　　آج رکھتے نہیں ہیں دیدہ تر
غم استاد ہے اگر یہ بھی　　یا خدا کیوں کہ زندگی ہو گی
کیا کہوں کون مر گیا سالکؔ　　آپ کہتے ہیں طالب و عرفی
رشک عرفی و فخر طالب مرد　　اسد اللہ خان غالب مرد

حالی کے ترکیب بند پر تفصیلی تشریح اور تجزیے سے قبل ہم خدائے سخن میر انیسؔ اور دوسرے شاگردان غالب کے نمونوں کو پیش کرتے ہیں۔

نواب سید رضا دہلوی آگاہؔ

اب کہاں آگاہؔ غالبؔ سا شفیق　　روئے دل کھول کر استاد کو
یہ بھی اک رنگ ہے محبت کا　　روئیں ہم اور ہنسا کرے کوئی

شاہ باقر علی باقرؔ

کجا شد غالبؔ شریں نوا باقرؔ کہ آہ اکنون　　صدا زاں طوطیِ ہند خوش الحانم نمی آید

سید مدد علی اکبر آبادی تپشؔ

گل شد از مردنِ غالبؔ چراغِ شاعری　　اے تپشؔ در خلق مثلش کیست یکتائے دیگر

ہرگوپال تفتہؔ

غالب وہ شخص تھا ہمہ داں جس کے فیض سے　　ہم سے ہزاروں ہیچ مداں نامور ہوئے

فیض و کمال و صدق و صفا اور حسن و عشق | چھے لفظ اس کے مرنے سے بے پا و سر ہوئے

بال مکند بے صبرؔ

ہماں میرزا غالب استادِ من | بجاں آفریں جاں چو آخر سپرد
بہ پرسیدم از دل سنِ رحلتش | بنالید و گفت ''آہ غالب بمرد''
۱۲۸۵ھ

....

اسد اللہ خاں وہ غالب آہ | جس سے اہل کلام تھے مغلوب
جب سدھارے بسوئے خلد ہوئے | سخن ان کے الم میں سینہ کوب
اس سپہرِ سخن کے اختر کا | مجھکو سالِ غروب تھا مطلوب
کہا عیسیٰ نے از سرِ حسرت | ہوا حیف آفتابِ ہند غروب
۱۸۶۹ء

خدائے سخن میر انیسؔ (رباعی)

گلزار جہاں سے باغ جنت میں گئے | مرحوم ہوئے جوار رحمت میں گئے
مداحِ علی کا مرتبہ اعلیٰ ہے | غالبؔ اسداللہ کی خدمت میں گئے

حالی کے ترکیب بند مرثیے پر بات کرنے سے پہلے ہم ان کے اٹھ شعر کے قطعہ تاریخ وفات غالب پر یہ کہیں گے کہ اس قطعہ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ سال تاریخ ۱۲۸۵ء کا شعر خود غالب کے مصرع ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'' سے صنعت تخرجیہ کی مدد سے نکالی گئی ہے۔ یعنی پہلے مصرعے میں ''تاریخ'' ہم نکال چکے پڑھ بغیر ''فکر'' =۱۲۱۱ (تاریخ) + (۳۰۰) فکر=۱۵۱۱
۲۷۹۶

''حق مغفرت کرے عجیب آزاد مرد تھا'' ۱۲۸۵=۱۵۱۱-۲۷۹۶ھ

غالب کے مصرعہ کے اعداد سے اگر ''تاریخ'' اور ''بغیر فکر'' کے اعداد نکال

دیے جائیں تو غالب کی تاریخ وفات کے عدد نکلتے ہیں۔ اُردو شاعری میں حالی کا یہ عمل جدید تھا جس کو نہ صرف سراہا گیا بلکہ اس کی تقلید کی گئی اور ہم دیکھتے ہیں کہ میر انیس مرزا دبیرؔ، اقبالؔ، جوشؔ اور جگرؔ جیسے شاعروں کی تاریخ وفات بھی ان کے مصرعوں سے نکالی گئی۔

جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں (انیسؔ)
تحصیل سعادت کو دبیر آیا ہے (دبیرؔ)
میں شاعر آخرالزماں ہوں اے جوش (جوشؔ)

حالی نے اس قطع میں غالب کے پرستاروں غالب کے دلی اور سب سے اہم خود اپنی کیفیت بیان کی ہے جہاں تک غالب کی شخصیت اور ان کے فن کا تعلق ہے اس کا پرتوی اور ان کے مقام کا تعین بھی اس مختصر قطعے میں نظر آتا ہے۔ غالب کے موت کی خبر سن کر جو دلی کا حال ہوا۔

غالب نے جب کہ روضۂ رضواں کی راہ لی — ہر لب پہ آہ سرد تھی ہر دل میں درد تھا
اس دن کچھ اہل شہر کی افسردگی نہ پوچھ — دنیا سے دل ہر اپنے پرائے کا سرد تھا

حالی غالب کے مقام کو تقابلی انداز میں یوں پیش کرتے ہیں۔

تھا گو وہ اک سخنور ہندوستاں نژاد — عرفی و انوری کا مگر ہم نبرد تھا
اس قافلے میں آکے ملا گو وہ سب کے بعد — اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا

حالی کے حال کی تصویر کشی دیکھیے۔

حالی کہ جس کو دعویٰ تمکین و ضبط ہے — دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا
ہم اور صبح و شام یہ اندوہ جانگزا — دل تھا کہ فکر سال میں بے صرفہ گرد تھا

حالی غالب کے شاگرد ہیں ہر شاعری کی منزل پر غالب سے رہنمائی کے طلب گار رہیں یہ استاد غالب ہی کا فیض تھا کہ انہیں ایک جاویدانہ مصرعہ ملا جس میں

غیرفانی تاریخ نکلی جو غالب کی تاریخ وفات پر نکالی گئیں تمام تاریخوں میں عمدہ اور شاہکار ہے۔

ناگاہ دی یہ غالب مرحوم نے صدا سچ ہے کہ خواجہ راہنمائی میں فرد تھا
''تاریخ'' ہم نکال چکے پڑھ ''بغیرفکر'' ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا''

حالی کا ترکیب بند مرثیہ غالب کے انتقال ۱۸۶۹ء کی تخلیق ہے۔ اس مرثیے میں دس بند ہیں اور ہر بند میں دس شعر۔ ہر بند کے ٹیپ کا شعر جدا ہے اور تمہیدی بند کے بعد کے دوسرے بند کا آخری شعر وہی ہے جو مجروح سالک اور دوسرے شعرا نے نظم کیا ہے جس کا ماخوذ خود غالب کا فقرہ ''غالب مرد'' ہے۔

رشک عرفیؔ و فخر طالبؔ مرد اسد اللہ خاں غالبؔ مرد

بعض افراد نے اس شعر کی اولیت کا سہرا حالی کے سر باندھا ہے لیکن کوئی معتبر حوالہ ایسا نہیں پیش کیا جس میں یہ دکھایا جائے کہ حالی نے یہ مرثیہ مجروحؔ سے پہلے یعنی جون ۱۸۶۹ء سے قبل کہا ہو۔ البتہ مرثیے کے اس شعر کی اولیت اور تقدم سے اس بات پر کچھ اثر نہیں پڑتا کہ یہ مرثیہ غالب پر کہے گئے تمام مراثی اور قصاید سے بہت بلند و برتر ہے۔ مرثیہ کیا ہے غالب کی شخصیت، حیات، منزلت قابلیت اور فن کا مرقع ہے۔ اس مرثیے کے سو اشعار میں جن مطالب کی عکاسی کی گئی ہے ان کی تشریح تجزیہ اور تحلیل کے لیے پورے رسالے کی ضرورت ہے۔ حالی کے اس مرثیے نے برصغیر کی افسردہ پژمردہ سوسائٹی میں غالب کے نام و مقام زمانے کے پرآشوب ماحول میں مٹ جانے سے بتایا چناں چہ غالب کا کلام ہمیشہ عوام اور خواص میں مقبول رہا اور مسلسل شائع ہوتا رہا اور اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی جس کو پورا کرنے کے لیے بیس (۲۰) سال بعد حالی نے غالب کی سیرت اور فن کی شناخت کا تاج محل ''یادگار غالب'' تیار کیا جو آج تقریباً سوا سو سال کے گزرنے کے باوجود معتبر اور معروف صحیفہ مانا جاتا ہے۔ یہاں اس مرثیے

کے تجزیے اور تشریح سے پہلے یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ جس وقت یہ مرثیہ تصنیف ہوا اُس وقت حالی کی عمر (۳۲) سال تھی۔ حالی کی کچھ مشاعروں کی غزلوں کے علاوہ کوئی قابل دید فنی کاوش عوام کے سامنے نہ تھی۔ حالی اگر چہ شیفتہ اور دوسرے ارباب شعر و ادب دہلی کے مصاحب ضرور تھے اور سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ غالب کو اپنا کچھ کلام دکھا کر وہ فطری شاعر ہونے کی سند بھی لے چکے تھے۔ غالب نے کہا تھا:

> ''تمہارے بارے میں میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو
> اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے۔''

سچ تو یہ ہے کہ غالب کے اس جملے نے حالی کی شعری زندگی بنا دی جس طرح غالب کی آئین اکبری کی تقریظی مثنوی نے سر سید کو ان کی داخلی قوتوں سے آشنا کروایا یا دوسرے الفاظ میں سید احمد خان کو سر سید بنایا۔ حالی غالب سے چالیس سال چھوٹے تھے لیکن جوانی ہی سے جرأت اور اپنی فکر کے اظہار میں تامل نہیں کرتے تھے چناں چہ حالی نے جو خط قطعہ وغیرہ لکھا اور غالب نے اس کا جواب دیا اس بات کی دلیل ہے کہ غالب اور حالی کو ایک دوسرے کا لحاظ اور احساس تھا۔ شاید غالب اپنے آیندہ نشوونما پانے والے باغ کو دیکھ رہے تھے جہاں ان کا عندلیب چہچہائے گا۔ اسی لیے غالبؔ نے جو قطعہ لکھا اس میں حالی ہی کو محور سخن بنایا۔

چوں حالی از منِ آشفتہ بے سبب رنجید — تو گر شفیع نہ گردی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بہ فرض محال — بر آں سرم کہ در آں عمر ایں دو کار کنم
یکی ادائے عباداتِ عمر پشینہ — دگر بہ پیش گہہ حالی اعتذار کنم

اگر چہ حالی اور غالب کے تعلقات گیارہ بارہ سال سے زیادہ نہ تھے وہ بھی کبھی ملاقات کی صورت میں اور کبھی خط و کتابت کے ذریعے لیکن حالی غالب کی زندگی کے تمام تر واقعات اور حالات سے واقف تھے کیوں کہ غالب کی فطرت میں عیب و ہنر

سب کچھ لوگوں کے سامنے ہوتے یعنی وہ ایک عمدہ انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کھلی کتاب کے مانند تھا جسے ہر شخص پڑھ سکتا تھا۔ حالی نے اس کتاب زندگی کے ورق ورق کا مطالعہ کیا تھا تب ہی تو مرثیہ کے ایک شعر میں سو اشعار کا خلاصہ کر دیا۔

مظہر شان حُسن فطرت تھا　　　معنی لفظ آدمیت تھا

حالی نے مرثیہ غالب کے علاوہ ایک قطعہ تاریخ وفات بھی لکھا جس کی تاریخ غالب ہی کے مصرعے ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا'' سے نکالی۔ حالی کے اجتہادی تخلیقی رویے کی تقلید کی گئی اور کئی مصرعے تاریخی وفات انہی شاعروں کے مصرعوں سے نکالے گئے۔ میر انیس نے شہدائے کربلا رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مرثیوں کی آئین بندی کرتے ہوئے کہا تھا۔

لفظ بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے　　　مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

یہی آئین شخصی مرثیوں پر بھی عاید ہوتا ہے اس میں درد کا ہونا ضروری ہے۔ خود غالب نے مرثیۂ عارف، مومن نے محبوبہ کا مرثیہ وغیرہ کے علاوہ کئی قطعات تاریخ وفات مختلف شعرا کے جو ملتے ہیں وہ درد والم کے مضامین سے بھرے نظر آتے ہیں۔

ہم نے حالی کے اس مرثیے کو اس کے متن اور مضمون کے لحاظ سے تقسیم کر کے اشعار کو بندوں سے گل چین کیا ہے تا کہ بکھرے ہوئے پھولوں کو جن کا رنگ تقریباً ایک جیسا ہے گلدستہ بنا کر پیش کر سکیں۔

حالی نے اگرچہ انیس کے مرثیوں کا بغایت مطالعہ کیا تھا اور صنف مسدس میں آگے بڑھ کر انہوں نے مد و جزر اسلام لکھا۔ شخصی مرثیوں میں حکیم محمود خان دہلوی کا مرثیہ بھی مسدس میں تصنیف کیا لیکن یہاں ترکیب بند کا انتخاب، چھوٹی بحر میں اظہار اور مضامین کا بکھراؤ وغیرہ اس بات کا سراغ دیتے ہیں کہ وہ اس مرثیہ کا جاودانہ شعر

رشک عرفیؔ و فخر طالبؔ مرد　　　اسد اللہ خان غالب مرد

کو پیوند کرنا چاہتے ہوں۔ (اللہ ھوالعالم)

مرثیہ کی تمہید مرثیے کے مضمون کے اعتبار سے عمدہ ہے جو دنیا کی بے ثباتی چرخ کی بے رحمی، فلک کی جفاکشی کے ساتھ سوائے اللہ ہر چیز فانی، بے اعتبار ہے یعنی لاموجود الا اللہ کی تفسیر بھی ہوسکتی ہے۔

حالی مطلع کے شعر میں صاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ اس نظم میں اپنا درد بیان نہیں کرسکتا کیوں کہ

وقت کوتاہ قصہ طولانی

مرثیہ کا آخری شعر جو عربی شعر ہے۔ اس کے معنی ہیں:

''ہم اس کے غم میں کتنا روتے اور آہ وزاری کرتے ہیں اور کتنی مدت سے زمانے کو ملامت کررہے ہیں۔''

کم العافیہ من بکے و عویل و عتاب مع الزمان طویل

حالی نے تمہید مرثیے کے پہلے دو بندوں میں باندھی ہے۔ شاعر کہتا ہے دنیا فانی ہے ہر چیز یہاں کی وہم اور گماں کی کہانی ہے۔ تمام عیش وعشرت نام ونمود حقیقت نہیں بلکہ طلسم زندگانی ہے۔ شاعر کا ان چیزوں سے دل سیر ہو چکا ہے۔

حالی یہاں تلمیحات اور اصطلاحات سے مصرعوں کے کوزوں میں سمندر بھر دیتے ہیں۔ تاج فغفور چین کے بادشاہ کا تاج، تخت خاقانی ترکستان کے بادشاہ کا تخت، جمشید کا جام جس پیالے میں وہ ملک کے تمام حالات دیکھ سکتا تھا، راحِ ریحانی وہ خوشبو بھری شراب، عقل یونانی یعنی افلاطون ارسطو وغیرہ کی عقل مندیاں، حضرت داؤد علیہ السلام کا وہ لحن جس کو سُن کر پرندے تک مست ہو جاتے تھے۔ حسن کنعانی حضرت یوسف علیہ السلام کا حسن، چشمہ خضر جس سے حضرت خضر علیہ السلام نے آبِ حیات پیا ہے، خاتم سلیمانی یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی جس پر کہتے ہیں اسم اعظم لکھا ہوا تھا اور اس کے باعث

تمام مخلوقات آپ علیہ السلام کی مطیع تھیں۔ یہ تمام چیزیں فریب بے حقیقت غلط اور دھوکا ہے۔ میں ان تمام کی پروا نہیں کرتا۔

ہے سراسر فریب و ہم و گماں — تاج فغفور و تخت خاقانی
بے حقیقت ہے شکل موج سراب — جام جمشید و راحِ ریحانی
لفظ مہمل ہے نطق عرابی — حرف باطل ہے عقل یونانی
ایک دھوکا ہے لحن داؤدی — اک تماشا ہے حُسن کنعانی
بحر ہستی بجز سراب نہیں — چشمہ زندگی میں آب نہیں

اس لیے شاعر کہتا ہے:

نہ کروں تشنگی میں تر لب خشک — چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اک مشت خاک کے بدلے — گر ملے خاتم سلیمانی

اس لیے بہتر یہ ہے کہ عمر بے وفا پر بھروسہ نہ کیا جائے اور زمان اور مکان سے دل کو جوڑا نہیں بلکہ توڑا جائے۔

تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر — تو نے کی جس سے بے وفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ — ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
جس سے دنیا نے آشنائی کی — اس نے آخر کو کج ادائی کی

حالی نے مصرعوں میں صنعت تضاد سے معنی آفرینی پیدا کی ہے۔ آشنائی، بیگانہ، وفا، بے وفا، صلح اور لڑائی وغیرہ۔

صلح میں چاشنی لڑائی کی

پھر گریز کر کے اس درد اور بے وفائی کو غالب کی موت سے جوڑ دیتے ہیں۔ اس گریز کی خوبصورتی اور حاصل بند شعر کا کمال یہ ہے کہ غالب کا تقابلی اور مقام چار فارسی کے عظیم شاعروں یعنی خاقانی سنائی، عرفی اور طالب آملی سے اس طرح سے ہوتا

ہے کہ وہ اس گلدستہ کے گل سر سبد نظر آتے ہیں۔

بات بگڑی رہی سہی افسوس   آج خاقانؔی و سنائؔی کی
رشک عرفیؔ و فخر طالبؔ مرد   اسد اللہ خان غالبؔ مرد

دوسرے بند کا ٹیپ کا شعر فارسی میں ہے لیکن اُردو میں عام فہم ہے۔

حالی نے غالب کی نظم و نثر سے ایسے نکات چنے ہیں جن کو اگر عنوان بنا کر ان کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو دفتر تیار ہو سکتے ہیں۔ حالی نے غالب کو صرف دیکھا اور سُنا ہی نہ تھا بلکہ پڑھا اور بڑی حد تک سمجھا بھی تھا۔ جہاں تک غالب کے شاگردوں کا تعلق ہے کوئی بھی حالی کی غالب شناسی اور غالب فہمی تک نہیں پہنچا۔ حالی نے غالب کے کلام کے قطروں میں دجلہ دیکھا اور دکھایا۔ ممکن ہے دوسرے ارباب فکر و فراست نے بھی ان چیزوں کا بغور مشاہدہ کیا ہو لیکن کیوں کہ انہوں نے اس بصیرت کو فضا میں بکھیرنے کے بجائے قبر کی تاریکی میں سینوں میں بند رکھا ہم ان پر کیا کہہ سکیں گے۔ کچھ اشعار اور مصرعوں کو جوڑ کر ہم غالب کے فن کے کمال پر حالی کی فکر کی روشنی دکھاتے ہیں۔

بلبل ہند مر گیا ہیہات   جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس

نثر حسن و جمال کی صورت   نظم غنج و دلال کی صورت
قال اس کا وہ آئینہ جس میں   نظر آتی تھی حال کی صورت
اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی   شکل امکاں محال کی صورت
اس کی تاویل سے بدلتی تھی   رنگ ہجراں وصال کی صورت
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا   قلم اس کا تھا اور اس کی دوات

حالی نے اس مرثیے میں غالب کا ذکر فارسی کے دس بارہ شاعروں سے کیا ہے۔ حالی جانتے تھے کہ غالب نے اپنے ایک قطعہ میں خود کو بھی ان شاعروں کی محفل کا

شاعر کہا تھا۔

ای کہ راندی سخن از نکتہ سرایان عجم — چہ بما منت بسیار نہی از کم شان

ہند را خوش نفسانند سخن ور کہ بود — یاد در خلوت شان مشک فشان از دمشان

مومن و نیر و صہبائی و علوی وانگاہ — حسرتی اشرف و آزردہ بود اعظم شان

غالب سوختہ جان گرچہ نیرزد بشمار — ہست در بزم سخن ہم نفس و ہم دم شان

''یعنی اے کہ تو نے ایرانی شعرا کی بات کر کے ہم پر ان چند شعرا کے احسان دھرنے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان میں ایسے خوش گو شاعر موجود ہیں جن کی معطر سانس سے ہوا ان کی خلوت کو مشک کی خوشبو کر دیتی ہے۔ اُن میں مومن خان مومن، ضیاء الدین احمد خان نیر، امام بخش صہبائی، عبداللہ خان علوی، مصطفیٰ خان حسرتی، اشرف اور مفتی صدرالدین آزردہ جیسے عظیم شعرا موجود ہیں۔ اگرچہ غالب بدنصیب کسی شمارے کے قابل نہیں لیکن پھر بھی بزم سخن میں ان عظیم شعرا کا ہمدم اور ہم نفس ہے۔''

غالب نے متعدد مقامات پر اپنے فارسی کلام میں کہیں عجز و انکساری کے ساتھ اور کہیں تعلیٰ کے ساتھ اپنا تعارف کروایا۔

غریب شہر سخن ہای گفتنی دارد — بیاورید گر اینجا بود زبان دانی

''اگر کوئی زبان کا ماہر ہے تو لائیں میں جو اس شہر کی زبان کا بیگانہ ہوں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

من ہمائم مگس چرا باشم — زلہ بردار کس چرا باشم

''کسی کے دستر خوان کے ٹکڑے کھانے والا کیوں رہوں میں ہما ہوں مجھے مکھی بننے کی کیا ضرورت ہے۔''

مباش منکر غالب کہ در زمانہ تست ۔۔۔۔ تو ای کہ محو سخن گستران پیشینی

''تو جو گزرے بڑے شاعروں کا ذکر کر رہا ہے غالب کا منکر نہ ہو
جو تیرے دور میں موجود ہے۔''

جام دگران بادۂ شیراز نہ دارد ۔۔۔۔ کیفیت عرفیؔ طلب از طینت غالبؔ

''چاہتے ہو عرفی کی شعریت کا مزا چکھو تو غالب کا جام لو دوسرے
ساغروں میں شیرازی شراب نہیں۔''

مشو اسیرِ زلالی کہ بود خوانساری ۔۔۔۔ منج شوکتِ عرفی کہ بود شیرازی
روان فروز برو دوشھای زنّاری ۔۔۔۔ بہ سومناتِ خیالم در آی تا بینی

''تم شوکت عرفی کے شیرازی اور اسیر کے خوانساری یعنی ایرانی
ہونے کی وجہ سے مرعوب نہ ہو بلکہ تم میرے سومناتی خیالات کی
دنیا میں آ کر تو دیکھو جہاں میرے روحانی تجلی میرے کاندھوں
سے بکھر رہی ہے اگر چہ میرے سینے پر زنار پڑا ہوا ہے۔''

حالی نے مرثیہ میں غالب کے مقام کا تعین کیا ہے۔ آج تک کسی نے ایسا ہنرمندانہ تنقیدی کام نہیں کیا۔ کوئی فارسی غیر ملکی یہ کام نہیں کر سکتا۔ عربی محاورہ ہے کہ سب سے اچھی ہماری انگلی ہی ہوتی ہے جو اپنی پیٹھ کھجا سکتی ہے۔ حالی کے کچھ شعر دیکھیں۔

اہل ہند اب کریں گے کس پر ناز ۔۔۔۔ رشک شیراز و اصفہاں نہ رہا
چشم دوراں سے آج چھپتی ہے ۔۔۔۔ انوری و کمال کی صورت
بات بگڑی رہی سہی افسوس ۔۔۔۔ آج خاقانی و سنائی کی
رشک عرفیؔ و فخر طالبؔ مرد ۔۔۔۔ اسد اللہ خاں غالبؔ مرد
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح ۔۔۔۔ اہل انصاف غور فرمائیں

قدسیؔ و صائبؔ و اسیرؔ و کلیمؔ　　لوگ جو چاہیں اُن کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے　　ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالبؔ نکتہ داں سے کیا نسبت　　خاک کو آسماں سے کیا نسبت

ناظم ہروی نے فارسی کے عظیم شاعروں کو اپنی مثنوی میں نظم کیا تھا جس میں عنصری سے جامیؔ تک کا ذکر تھا اس مثنوی کے اشعار میں غالبؔ نے آخری شعر کا اضافہ کر کے فارسی کلاسیک شاعری پر مہر لگا دی۔ ناظم ہروی کہتے ہیں:

شنیدم کہ در دور گاہ کہن　　شدہ عنصری شاہ صاحب سخن
چو اورنگ از عنصری شد تہی　　بہ فردوسی آمد کُلاہِ نہی
چو فردوسی آورد سر در کفن　　بہ خاقانی آمد بساط سخن
نظامی چو جام اجل در کشید　　سر چتر دانش بہ سعدی رسید
چون اورنگ سعدی فروشد ز کار　　سخن گشت بر فرق خسرو نثار
ز خسرو چو نوبت بہ جامی رسید　　ز جامی سخن را تمامی رسید

اس مثنوی میں غالب نے اضافہ کیا۔

ز جامی بہ عرفی و طالب رسید　　ز عرفی و طالب بہ غالب رسید

غالب کے مرنے سے جو اقلیم سخن کو نقصان پہنچا اس کا ذکر بڑی خوبی کے ساتھ حالی نے کیا حالی جانتے تھے غالب کی مسند خالی رہے گی۔

نقد معنی کا گنج داں نہ رہا　　خوان مضموں کا میزباں نہ رہا
رونق حسن تھا بیاں اس کا　　گرم بازار گل رخساں نہ رہا
ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں　　گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا
اٹھ گیا تھا جو مایہ دار سخن　　کس کو ٹھہرائیں اب مدار سخن
شاعری کا کیا حق اس نے ادا　　پر کوئی اس کا حق گزار نہ تھا

لوح امکاں سے آج مٹتی ہے علم و فضل و کمال کی صورت
ہند میں نام پائے گا اب کون سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون
ملک یک سر ہوا ہے بے آئین اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
حصر تھی اک بیاں میں رنگینی کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں
لب جادو بیاں ہوا خاموش گوش گل وا ہے کیوں گلستاں میں

جہاں تک اخلاق انسان دوستی احترام عجز وانکساری اور بھائی چارگی تھی غالب ایک فرشتہ صفت آدمی تھے۔ حالی نے یہ اخلاق کچھ اپنی فطرت کچھ اپنے استاد غالب سے سیکھے تھے۔

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج رند اور مرجع کرام و ثقات
پاک دل پاک ذات پاک صفات
بے ریائی تھی زہد کے بدلے زہد اس کا اگر شعار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی سر بلندوں سے انکسار نہ تھا
مظہر شان حسن فطرت تھا معنی لفظ آدمیت تھا

حالی نے مرزا غالب کی شخصیت اور فطرت کو ''معنی لفظ آدمیت'' کہہ کر قلم توڑ دیا۔ غالبؔ دہلوی تھے۔ حالی دلی کے عاشق تھے۔ دلی غالب کی تھی اور غالب دلی کے لیے تھے۔ حالی نے غالب کے بغیر دلی کو ویرانہ بنا کر جو پیش کیا ہے وہ سچ ہے۔

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
شہر سارا بنا ہے بیت حزن ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں
اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے جا کے دلی سے آئے گا اب کون
غم سے بھرتا نہیں دل ناشاد کس سے خالی ہوا جہاں آباد
تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات — اس کے مرنے سے مر گئی دلی
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا — ایک روشن دماغ تھا نہ رہا

یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ آغا حیدر حسن نے حالی کے مصرعہ میں تضمین کر کے ''مرزا نوشہ تھا اور دلی برات'' ۱۸۷۹ء تاریخ وفات نکالی ہے۔

حالی کے اس مرثیے میں ایسے بھی مصرع موجود ہیں جن سے جلوس جنازہ اور تدفین کی منظر کشی کا سماں پیدا ہوتا ہے۔

اس کو دل سے بھلائے گا اب کون — اس نے سب کو بھلا دیا دل سے
غالب بے مثال کی صورت — دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
دوش احباب پر سوار ہے آج — بار احباب جو اٹھاتا تھا
اہل میت جنازہ ٹھہرائیں — لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج — کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر
سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں — لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو

مرثیے میں حالی نے شاگردی کا فیض استاد غالب کی اصلاح شاعری کے وہ رموز جس نے خالی ذہنوں کو عالی کر دیا بیان کیا ہے۔ ان شعروں میں جذبات کی شدت ہے جیسے وہی شخص پوری طرح سے درک کر سکتا ہے جس پر یہ سانحہ گزرا ہے۔

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل — کس سے داد سخن وری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب — کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں
پست مضموں ہے نوحۂ استاد — کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
مر گیا تشنۂ مذاق کلام — ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون
مر گیا قدر دانِ فہم سخن — شعر ہم کو سنائے گا اب کون
تھا بساط سخن میں شاطر ایک — ہم کو چالیں بتائے گا اب کون
شعر میں ناتمام ہے حالؔی — غزل اس کی بنائے گا اب کون

سرسید کا مرثیہ، حالؔی کی زبانی

سچ ہے:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

یہ مرثیہ حالی کے فن اور ان کے سرسید سے خلوص کا شاہکار ہے۔ حالی نے سرسید کے مرثیہ کو فارسی میں ترکیب بند کے ساتھ بندوں میں تخلیق کیا جس کے ہر بند میں دس شعر ہیں۔ یہ مرثیہ ایرانی شاعر محتشم کاشؔی کے مرثیے کی بحر میں ہے۔ یہ فارسی کا مرثیہ مئی ۱۸۹۸ء میں مطبع مجتبائی دہلوی سے شائع ہوا۔ مرثیہ کے پہلے حصے میں سرسید کے انتقال سے جو رنج وغم کی لہر برصغیر میں پھیلی اوران کی کمی سے جو شدید نقصان قوم کو ہوا اس کا ذکر بڑے ہی خوبصورت اور پرتاثیر انداز میں کیا ہے جو ان کی قلبی واردات اورفن پرمہارت کی دستاویز بھی ہے۔

اے عجب کز مردنِ یک پیر مردِ سال خورد — تاب وتب در کودک و پیر و جواں انداختند
اے عجب کز سوزِ اندوہِ وفات مسلمے — مردمِ ہر کیش را آتش بجاں انداختند
سید اندر قوم نقدے بود اندر کیسۂ — کیسہ خالی ماندہ و نقد از میاں انداختند
قوم را سرمایۂ مجد و علا از دست رفت — بعد ازاں کایں گنج را در خاکدان انداختند

''یعنی تعجب ہے کہ ایک بڑھے کے مرنے سے اضطراب اور بے چینی بچوں جوانوں اور بزرگوں میں پھیل گئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ ایک مسلمان کی موت نے ہر قوم و ملت کے لوگوں کے دلوں کو جلا دیا ہے۔ سرسید قوم کی تھیلی کی نقدی تھے چناں چہ نقدی گر گئی اور اب تھیلی خالی ہے۔ قوم کی تعمیر اور عظمت کی دولت ہاتھ سے نکل گئی اور بعد میں اُسے خاک میں دفن کر دیا گیا۔''

سرسید نے تمام عمر ملت اور دین کی حفاظت کی یہی ان کا حج تھا یہی روزہ اور یہی ان کی نماز وہی قوم کا سید اور سردار ہے جو قوم کا خدمت گزار ہے یقیناً سرسید کی سیادت اس کی گواہی بھی دے رہی ہے۔

در مصافِ دہر بودن دین و ملت را سپر — حج او ایں بود ایں نیش صوم و ایں بودش صلوٰۃ

سید القوم ست ہر کس قوم را خدمت کند — خدمت او بر سیادت بس بود او را گواہ

حالی مرثیے کے تیسرے بند میں انسان بننے کی اہمیت کو بہت خوب صوت تمثیلوں اور تلمیحوں سے مضمون باندھ کر ظاہر کرتے ہیں۔ حالی کہتے ہیں کوئی فضل و علم میں نابغۂ روز ہوسکتا ہے۔ کوئی فصاحت میں مثل سحبان یا عقل و حکمت میں لقمان جیسا بن سکتا ہے، دولت میں قارون کو پیچھے کر سکتا ہے سلطنت اور ثروت میں خسرو اور پرویز بن سکتا ہے۔ کہیں بہادری میں رستم تو کبھی قطب اور غوث سب کچھ ہوسکتا ہے مگر انسان ہونا دوسری چیز ہے۔

انسان وہ ہے جو ہمسائے کے رنج و درد سے بے تاب رہتا ہے۔ وہ جنت کی ہوا میں بھی محرومیوں کی زندگی سے افسردہ رہتا ہے۔ وہ دوسروں کے مقابل خود کو خوار و ذلیل محسوس کرتا ہے۔ اس کا دل دکھ سے بھرا رہتا ہے اگرچہ شبستان ہی میں کیوں نہ ہو کیونکہ وہ محنت کشوں کی زحمتوں کا احساس رکھتا ہے۔

می تواں در فضل و دانش شہرۂ دوراں شدن | در فصاحت ہمچو سحباں، در خرد لقماں شدن
می تواں در جاہ و ثروت گوے از قاروں برد | می تواں در زہد و طاعت غیرت صنعان شدن
می تواں در ملک و دولت خسرو پرویز گشت | می تواں در زور و طاقت رستم دستاں شدن
می تواں قطبِ زماں شد، می تواں شد غوث وقت | ہر چہ خواہی می توانی شد بجز انسان شدن
چیست انسانی؟ تپیدن از تپ ہمسائیگاں | از سموم نجد در باغِ عدن پژماں شدن
خوار دیدن خویش را از خواری ابنائے جنس | در شبستاں تنگ دل از محنت زنداں شدن

پھر اس مضمون کو خوب صورت گریز سے دو آتشہ بنا دیتے ہیں۔ قوم کی فکر میں زندگی گزارنا اور قوم ہی کے زندان میں گھٹ کر مر جانا اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ سرسید احمد خان بن سکتا ہے۔

زیستن در فکر قوم و مردن اندر بند قوم | گر توانی می توانی سید احمد خاں شدن

حالی نے مرثیے کے چوتھے بند میں بتایا کہ سرسید کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ سرسید کو ہر طرح سے بُرا کہا گیا۔ سرسید پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا یعنی ایک پورا محاذ سرسید کے خلاف کھڑا کیا گیا لیکن سرسید کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی وہ شیر مردوں کی طرح اپنی داخلی روشنی اور حرارت سے کام کرتا رہا وہ محفل کو روشن رکھنے کے لیے شمع کی طرح خود پگھلتا رہا لیکن اپنے گھوڑے کی مہار آخری وقت تک منزل مقصود کے پہنچے تک تھامے رہا اگرچہ رستہ کانٹوں بھرا تھا حیف کہ نادانوں میں جو دانا تھا چلا گیا جو بنجر زمین میں میوہ دار درخت تھا اکھڑ گیا۔

بود در امت بہ بدعت متہم از راستی | ارے ایں باشد دریں عالم سزائے راستاں
یار جز علمش نہ بود و علم دانی نا درست | ایں چنیں بے کس سزد کز جہل پر دازد جہاں
بود یاراں را سپر تا بود در ہر شور و شر | لیک یاراں بر سرش تیغِ جفا می آختند
خواجہ در فکر صلاحِ دین و ملت در گزشت | لیک اہلِ دین و ملت قدر او نشناختند

کار کارِ شیر مردان است کز سوزِ دروں — بزم را افروختند و شمع ساں بگداختند

سید از رہ تا دمِ آخر عناں را بر نتافت — گر چہ در راہش بسے خار و خسک انداختند

حیف کاندرِ جمعِ مستاں ہوشیارے بود، رفت — در زمینِ شور نخلے بار دارے بود، رفت

”اے علی گڑھ! ذرا تو ہی بتا کس نے تجھے شہروں میں شہرت یافتہ

کیا کس نے تیری خاک کو آسمان پر پہنچا دیا۔“

اے علی گڑھ آں کہ کردت شہرہ در امصار، کو؟ — آں کہ از خاکت بہ گردوں برد آں معمار کو؟

حالی مصلح بھی ہیں مجدد بھی ہیں۔ وہ سب سے زیادہ قوم کی فکر میں ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ ہمارے قدم رکنے نہ پائیں یہ تعلیمی تربیتی ادارے اسی طرح ترقی کے راستے پر گامزن رہیں۔ وہ مرثیہ کے آخری بند میں اپنا فریضہ ادا کرتے ہیں جس کے لیے یہ سارا مرثیہ کہا گیا۔ وہ ملت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں سرسید نے دارالعلوم تمہارے لیے بنایا ہے تاکہ نسل در نسل دولت علم سے مالا مال رہے انہوں نے پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر نکالی ہے جو پانی نالے میں بہہ چکا تھا اُسے واپس لوٹا دیا ہے مجھے خوف یہ ہے کہ مخالفت کے زور سے یہ چشمہ کا پانی استعمال کے قابل نہ رہے ہاں یہی اور صرف یہی وقت ہے کہ ہم سب باہم متفق ہو جائیں۔ عزم و استقلال کے ساتھ کھڑے ہوں ہاتھوں میں ہاتھ ہو اور ہماری کمریں کام کرنے کے لیے کسی ہوئی ہوں۔

خواجہ دارالعلمے از بہر شما بگزاشت است — تا بود نسلِ شما از علم و دولت بہرہ ور

کوہ با کندہ است تا ایں جوے شیر آوردہ است — بو کہ آبِ رفتہ در جوے شما آید ز سر

ترسم ایں سرچشمہ گردد تیرہ از سنگ خلاف — ہان و ہاں وقت است، وقتِ اتفاق ہم دگر

عزمِ جزم آرید و برخیزید و ہم دستاں شوید — دست بکشائید و بربندید دامن بر کمر

جہاں تک زبان و بیان سوز و تاثیر زور و جذبات کا تعلق ہے یہ فارسی کا مرثیہ حالی کی فارسی تصنیف کا گل سرسبد ہے۔ یہاں تشبیہات کی ندرت استعارات کی لطافت

ترکیبوں کی بلاغت اور لفظوں کی فصاحت حالی کی فارسی شاعری کا سکہ منوا رہی ہے۔
خلیفہ سید محمد حسن خان اور خلیفہ سید محمد حسین خان جو ریاست پٹیالہ کے وزیر تھے اور حالی سے ان کے تعلقات ان کی آنکھ کے آپریشن کے سلسلے میں برقرار تھے۔ دونوں بھائی سرسید کے حامی تھے اور علی گڑھ کے خیر خواہ تھے حالی نے دو جداگانہ قطعات میں دونوں مرحومین کی علم دوستی تدبر اور پختہ کاری پر روشنی ڈالی ہے۔ دونوں بھائیوں کا انتقال کچھ سالوں کے فاصلے سے ہوا۔ ان نونو اشعار کے دونوں قطعات سے دو دو شعر یہاں ذکر کیے جاتے ہیں۔ خلیفہ سید محمد حسن کے بارے میں حالی لکھتے ہیں:

گر بکاوند ہمہ مملکت خالصہ را ایں چنین صاحب تدبیر و خردنتواں دید
در علی گڑھ کہ بنا یافتہ دالعلمی از مددگاری و یارش بسی داشت امید

''یعنی اگر ریاست خالصہ یعنی پٹیالہ کو پوری طرح تلاش کیا جائے تو اس طرح کا عقل مند اور مدبر وزیر نہیں مل سکتا۔ علی گڑھ جو دارالعلوم بنایا گیا موصوف کی مدد اور یاری سے مستفید ہے۔''

خلیفہ سید محمد حسین خان بھی بڑے عالی مدبر اور سیاست مدار تھے۔ وہ ایک پختہ کار مشیر سلطنت تھے۔

آن بہ صورت انس در سیرت ملک آن بہ دانش پیرو در ہمت جواں
آن بہ تدبیر و خرد بوزرجمہر آن بہ حزم و رائے سولونِ زماں

''یعنی وہ اگرچہ صورت شکل میں انسان تھے لیکن فرشتہ صفت سیرت کے مالک تھے ان کی حکمت عملی پختہ اور ان کی ہمت جوان تھی۔ وہ عقل اور تدبیر میں ایران کے بوزرجمہر معلوم ہوتے تھے جب کہ رائے اور مشورے میں اپنے دور کے سولون تھے۔''

حالؔی کی بچوں کی نظموں کا تجزیہ

علم و ہنر، اخلاق و کردار، تعلیم و تربیت کی نشوونما بچپن سے کی جاتی ہے اسی لیے مہذب خاندانوں تعلیم یافتہ گھرانوں میں بچوں کے لیے اتالیق رکھے جاتے جو ہر قدم پر موقع ومحل کے حساب سے بچوں کی تہذیب کی پرورش کرتے تھے۔شعر و ادب بھی ایک ایسی آموزش گاہ ہےجس میں شاعراور ادیب استاد معنوی تصور کیے جاتے جو تحریروں اورتقریروں کے ذریعے بچوں کا ادب تشکیل دے کران کی تفریح کے سامان کے ساتھ تعمیری فرایض بھی انجام دیتے ہیں۔

ادب برائے ہدف شاعری برائے زندگی جسے مقصد ادب وشاعری بھی کہتے ہیں اُس کا ایک اہم جز انسان سازی بھی ہے جو مہد سے لحد تک جاری رہتی ہے چناں چہ اس تربیت میں بچوں اورنسل جوان کے ادب کی ضرورت رہتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اُردو شعر و ادب میں دوسری زبانوں کے مقابل بچوں کے ادب پرکم کام ہوا ہےجس پر ہم آگے روشنی ڈالیں گےلیکن پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون کون سے لوازمات اورنکات وخصوصیات ہیں جو بچوں کےادب کے لیےضروری ہیں۔

بچوں کے ادب کی زبان سیدھی سادی، سلیس وشگفتہ اور پیچیدہ تشبیہات اور

استعارات سے پاک ہونی چاہیے۔ ایسی صنعتیں بھی نہ ہوں جس سے سمجھنے میں دقت پیش آئے۔ ان کے علاوہ اگر ادب میں بچگانہ پن یا بچپن نہ ہوتو وہ صحیح معنوں میں بچوں کا ادب نہیں کہلا سکتا۔ یعنی شعر و ادب میں موضوع کا انتخاب بچوں کے سن و سال سے ہم آہنگ ہو اور پھر طرز بیان کچھ ایسا ہو جو بچوں کی نفسیات اور جذبات سے میل کھاتا ہو جس کی وجہ سے بچوں کا کامیاب ادیب و شاعر خود اس تخلیق کے وقت بچہ بن جاتا ہے۔ ایسے اشعار کو کم درجے کے بے روح اور سبک سستے شعر نہیں کہنا چاہیے یہ وہ اشعار ہیں جو بچپن سے بڑھاپے تک ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات اشعار اگر چہ بہت آسان اور عام فہم بھی بچوں اور نسل جوان کی عمروں کے مطابق نہ ہو لیکن بچوں کو یاد ہو جاتے ہیں اور وہ ان کے بچپن کی یادداشت بن جاتے ہیں جس کی وجہ آسان شعروں کا بچوں کی فکر اور جذبات سے یکساں ہونا ہوتا ہے۔ جیسے علامہ محمد اقبال کا یہ شعر

لب پہ آتی ہے دُعا بن کے تمنا میری زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

اس شعر کے مقابلے میں جہاں بچگانہ پن ہر لفظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ شعر اسماعیل میرٹھی کا ہے۔

رب کا شکر ادا کر بھائی جس نے ہماری گائے بنائی

جہاں تک اُردو شعر و ادب میں بچوں کے ادب کا تعلق ہے اس کی کمی کی وجوہات میں اُردو کی کم عمری بچپن کی کوتاہ مدت اور اُردو کے بچپن میں اس کا زیادہ تر بڑوں کے ساتھ ملاپ شامل ہے۔ بچوں کی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے بچوں کے ادب کی پذیرائی بھی ویسے نہیں ہوئی جس طرح ہونی تھی۔

چناں چہ بچوں کے ادب کے ادیب و شاعر بھی کچھ دن کے بعد ہمیشہ کے لیے بڑوں کے ادب کے ہو کر ہو گئے۔ بعض عمدہ شاعروں اور ادیبوں نے یہ روشنی ہمیشہ

جاری رکھی جن میں نظیرا کبرآبادی، میرامن، اسماعیل میرٹھی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، حالی، اقبال، حفیظ جالندھری، راشدالخیری، امتیاز علی تاج اور کوئی چھوٹے بڑے جدید شاعروں اورادیبوں کے نام اورکام شامل ہیں۔

نظیرا کبرآبادی کی شاعری کے وہ حصے جس میں تماشا کھیل طنز و مزاح سادگی کے ساتھ ملتا ہے بچوں کی توجہ کا باعث رہا۔ بچوں کی خاص نظمیں ''ہنس'' ریچھ کا بچہ ان کے تماشے کی یادتازہ کر دیتا تھا۔ میرامن کے پاس کہانی کا جو تجسس اور شیرین بیانی تھی وہ بچوں اورنسل جدید کواپنی طرف کھینچتی تھی۔

محمد حسین آزاد حقیقت میں استاد تھے ان کی نظموں اور نثر کی کتابوں میں وہ سب چیزیں تھیں جنہیں شاگردوں کے لیے لکھا تھا۔ آزاد کی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں میں ''قصص ہند'' اور ''نصیحت کا کرن پھول'' اُس دور میں پسند کی گئی تھیں۔ اسماعیل میرٹھی سب سے مشہور بچوں کے شاعر گزرے ہیں ان کی نظموں کو جو بچپن سے لبریز ہیں اور سادگی میں تازہ مضامین کی پیش کش ہے ایک کامیاب شاعر میں ڈھال دیتی ہے۔

علامہ محمد اقبال نے فارسی میں بچوں اور نسل جواں جاوید سے خطاب وغیرہ لکھا اور اُردو میں بھی ان کا کلام بچوں کے لیے کم مگر پرتاثیر ہے اسی وجہ سے ان کے اشعار بچوں کو یاد ہیں ایک مصرعہ پڑھیے دوسرا وہ اٹھا لیتے ہیں۔ حالی نے ایک معلم کی حیثیت سے اپنی عمر کا ایک عمدہ حصہ گزارا وہ بچوں اور نسل جواں کی نفسیات جذبات اور ضروریات سے واقف تھے۔ وہ تہذیب وتمدن کی امانت نئی نسل کوسپرد کرنے سے پہلے انہیں اس قابل بنانا چاہتے تھے کہ وہ قومی قدروں کو اضافوں کے ساتھ اپنی آیندہ نسلوں کوپیش کرسکیں۔

حالی نے اگرچہ نثر میں کوئی علیحدہ کتاب نہیں لکھی مگر مجالس النسا میں بچوں کے

لیے کارآمد باتیں کیں جن سے عورتیں اور ان کی آغوش کے پلے بچے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ حالی کی شاعری خصوصی طور پر ان کی نظمیں اور مسدس سے بچے جوان بڈھے سب اپنی اپنی فکر اور علمی استطاعت کے مطابق استفادہ کر رہے تھے۔ اسی لیے ان کی نظموں اور مسدس کے بند کو درسی کتابوں میں جگہ دی گئی تھی۔ اگر چہ ان شعروں کا مقصد اخلاق سازی اور قوم سازی تھا اور اس میں بچپن کا چلبلا پن اور معصومیت نہیں تھی۔ اس لیے ہم ان اشعار کو نسل جدید کی تعمیر و تربیت کے شعر تو کہہ سکے ہیں لیکن انہیں مکمل طور پر بچوں کے ادب میں جگہ نہیں دے سکتے۔

بچوں کے ادب کے متعلق ناقدوں نے انہی اشعار کو مورد بحث و تنقید کیا کیوں کہ وہ حالی کی اُن بچوں کی نظموں سے واقف نہیں تھے جنہیں حالی نے محکمہ تعلیم کے تقاضے اور فرمایشات پر لکھی تھیں۔

یہ وہ دور تھا جب ٹریننگ کالج لاہور کے پرنسپل نولٹن کی زیر نگرانی بچوں کی نظموں کا مجموعہ ''اطوار بازیچہ'' شائع ہو چکا تھا اور بچوں کے متعلق نظمیں ''بچوں کا اخبار'' میں بھی شائع ہوئی تھیں۔

یہاں ہم پہلے حالی کی اُن مخصوص نظموں پر بات چیت کریں گے جو خاص بچوں کے لیے لکھی گئیں ہیں۔ اوپر دیے گئے چودہ نظموں کے تقریباً پونے چار سو شعروں میں ایک شعر بھی مشکل سے ایسا نہیں نکلے گا جو کم عمر بچہ کی سمجھ سے باہر ہو گا۔ خدا کی شان کے عنوان سے اس چھوٹی سی سترہ (۱۷) اشعار کی مثنوی میں خدا کی معرفت، خدا کی محبت، خدا کی نعمتیں، خدا کی رحمتیں ان مثالوں اور حالات سے بیان کی گئی ہیں جس سے بچہ واقف ہے۔ اِسے تک بندی نہیں بلکہ بچوں کی شاعری سمجھنا چاہیے اور اس کی لذت سے آشنا ہونے کے لیے ناقد کو بچہ بننا ضروری ہے۔

تو ہی ہے سب کا پالنے والا کام سب کا نکالنے والا

مغربی دنیا میں چھوٹے بچوں کے مکتب اور مدرسوں کو کنڈرگارڈن کہتے ہیں وہاں سب سے پہلے بچے کو اُس کے اعضا اور ان کے کاموں سے روشناس کیا جاتا ہے۔ حالی نے اس کام کے ساتھ بچے کے ذہن میں ہر نعمت کے والی اور ہر مشکل کے حل کرنے والے کے ساتھ ایک ابدی رشتہ بھی پیدا کیا ہے۔

آنکھ دی تو نے دیکھنے کے لیے — کام کرنے کو ہاتھ پاؤں دیے
بات کے سننے کو دیے دو کان — بات کہنے کو تو نے بخشی زبان

بھوک پیاس گرمی سردی جاڑا برسات سب کا یہاں ذکر کر کے اس کا ربط خدا سے کر دیا کہ جب لوگ ان سے تنگ آ جاتے ہیں تو صرف خدا ہی ان سے نجات دلاتا ہے۔

کیں سدا تو نے مشکلیں آساں — تیری مشکل کشائی کے قرباں

ایک ہلکی پھلکی لیکن موسیقی سے بھرپور نظم جو مربع کی شکل میں ہے اور کورس کے طور پر مل کر پڑھی جا سکتی ہے۔ اخلاق کا سبق ہے۔

چاہو اگر بڑائی کہنا بڑوں کا مانو — سر پر بڑوں کا سایہ، سایہ خدا کا جانو
وہ کام مت کرو تم جس کام سے وہ روکیں — اُس بات سے بچو تم جس بات پر وہ ٹوکیں
تم کو نہیں خبر کچھ اپنے بُرے بھلے کی — جتنی ہے عمر ہے چھوٹی اتنی ہے عقل چھوٹی
سیکھو گے علم و حکمت ان کی ہدایتوں سے — پاؤ گے مال و دولت ان کی نصیحتوں سے

یوں نظم نصیحت سے سجی ہے لیکن نصیحت آمیز کچھ مبالغہ مصرعوں کے باوجود دل کو چھونے والی ہے۔ ابتدائی مکتب کے بچوں کے لیے اچھا ترانہ ہے۔ حالی نے بچوں کے لیے چھوٹی بڑی چودہ نظمیں لکھی ہیں۔ یہ نظمیں حالی کی زندگی کے آخری دور کی نشانیاں ہیں۔ حالی نے ان نظموں کے لیے مربع، مخمس، مسدس اور مثنوی کی ہیئت استعمال کی۔ حالی کی ان نظموں کا زمانۂ تصنیف ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۸ء بتایا گیا ہے۔

جدول

عنوان	ہیئت	تعداد شعر
ا۔خدا کی شان	مثنوی	۱۷شعر
۲۔ بڑوں کا حکم مانو	مربع	۱۸شعر
۳۔مرغی اور اس کے بچے	مثنوی	۱۴شعر
۴۔ بلی اور چوہا	قطعہ	۶شعر
۵۔شیر کا شکار	مسدس	۱۵شعر
۶۔ پیشے	مثنوی	۸۴شعر
۷۔گھڑیاں اور گھنٹے	مسدس	۲۴شعر
۸۔دھان بونا	مثنوی	۹شعر
۹۔روٹی کیوں کر میسر آتی ہے	مثنوی	۷۸شعر
۱۰۔موچی	مخمس	۱۲شعر
۱۱۔چٹھی رساں	قطعہ	۲۲شعر
۱۲۔سپاہی	مثنوی	۸شعر
۱۳۔ایک چھوٹی بچی کے خصائل	مثنوی	۳۹شعر
۱۴۔نیک بنو نیکی پھیلاؤ	مسدس	۲۱شعر

ان نظموں کا ماخذ جواہرات حالی ہے صرف آخری نظم مجموعہ نظم بچوں کا اخبار لاہور سے لی گئی ہے۔ حالی کی نظموں کی یہ تعداد صحیح نہیں بلکہ اگر تلاش اور تحقیق کی جائے تو مزید نظموں کے ملنے کا امکان ہے۔ سب سے بڑی نظم مثنوی ''پیشے'' کے عنوان سے لکھی اور سب سے چھوٹی نظم قطعہ ''بلی اور چوہا'' چھے شعر کا لکھا۔ حالی کی ان نظموں میں بیانیہ انداز ہلکے پھلکے مگر دلچسپ موضوعات تفریحی اور معلوماتی اشعار جو آسانی سے بچوں کو یاد ہو جائیں نظر آتے ہیں۔ ان نظموں میں حالی نے بچوں کی نفسیات کا خاص خیال رکھا ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے پڑھنے والے کو بچہ بن کر پڑھنا پڑے گا ورنہ اس کے لطف و مزے سے فائدہ اٹھا نہیں سکے گا۔ حالی نے کسی حد تک بچوں کی نظموں میں اسماعیل میرٹھی کی نظموں کی تقلید کی ہے۔ اگرچہ وہ اُس سطح تک پہنچ نہ سکے اسماعیل میرٹھی نے ۱۸۹۳ء میں اپنی بچوں کی نظموں سے زینت دے کر ابتدائی کلاسوں کے لیے ایک درسی کتابوں کا سلسلہ جاری کیا تھا جو محکمہ تعلیم کی ترغیبات کا نتیجہ بھی تھا۔ ان درسی کتابوں میں شامل بچوں کی نظمیں بہت مقبول ہوئیں اور کئی لوگ اُس دور میں اس میں دلچسپی لینے لگے۔

مرغی اور اس کے بچے کی مثنوی میں لاشعوری طور پر بچے اور ماں کی رشتے کو مضبوط کیا گیا ہے کہ بچے ماں کے ساتھ رہیں ماں کا کہنا سنیں اور یہ ممتا کی محبت ہی ہے جو حیوانوں اور انسانوں میں زندگی کا رنگ بھرتی ہے اور اس ممتا سے کئی گنا زیادہ خدا کی محبت ہے جو بندوں کی حفاظت اور ہدایت کرتا ہے۔ اس نظم میں بچے جو سنتے ہیں جو دیکھتے اُس کو نظم کیا گیا ہے۔

یہ جو ہے گھر میں تمہارے مرغا　　چیختا زور سے ہے ککڑوں کوں
دن نکلتے ہی ادھر مرغی بھی　　فوج بچوں کی لیے نکلے گی
ٹکڑے روٹی کے ہوں یا ہو دانہ　　چونچ سے دے گی وہ منہ میں ان کے

مرغی جس طرح کہ ان بچوں کی کرتی ہے شام و سحر رکھوالی
بس اسی طرح سمجھ لو کہ خدا ہے ہماری بھی حفاظت کرتا

حالی کی ان نظموں میں ہندوستانی اور ہندی کے الفاظ حسب ضرورت مصرعوں میں خوبصورت طریقے سے جڑ دیے گئے ہیں۔ ان نظموں میں شاید ہی کوئی ترکیب اضافت تلمیح یا ادق خارجی لفظ ہو۔ محاورے وہ بھی روزمرہ میں جو بچوں کی علمی اور فکری معیار سے نسبت رکھتے ہوں نظم میں خوب صورتی اور تاثیر پیدا کرتے ہیں۔ حالی کی شاعری میں ترقی پسندی کا عنصر یہاں کھل کر سامنے آتا ہے جہاں ہر کام کی قدر اور اس کی عزت کی گئی ہے۔ کوئی بھی معمولی یا جاگیردارانہ لہجہ میں ادنیٰ پیشہ حقیقت میں ادنیٰ نہیں ہوتا اور اُس پیشہ کو عمدگی سے کرنے والا کسی دوسرے اعلیٰ پیشے سے کم نہیں ہوتا۔ حالی قوم کی تربیت کر رہے تھے جہاں روسا حکمران اونچے خاندان کے افراد شاہی کے بجائے گدائی کر رہے تھے۔

روٹی کپڑا اور مکان کے محتاج ہو گئے تھے لیکن اُن پیشوں کو ہاتھ بھی لگانا نہیں چاہتے تھے جن میں محنت مشقت عرق ریزی کی ضرورت ہوتی تھی۔ قوم جل چکی تھی لیکن رسی کا بل ابھی باقی تھا جس کا اثر ان خاندان کے بچوں پر منفی پڑ رہا تھا ایسے حساس موقع پر حالی نے کئی بچوں کی نظمیں لکھ کر انہیں ترغیب دی کہ ہر پیشہ معتبر اور مقتدر ہے۔ ایک کاریگر جو جوتے بنانے میں ماہر ہے اس کی مہارت اور کاریگری کسی طرح سے یونان کے فلاسفر افلاطون کے فلسفہ کلام سے کم نہیں۔

حالی کی نظمیں پیشے، چٹھی رساں، موچی، سپاہی وغیرہ وہ نظمیں ہیں جن میں اوپر بیان کیے گئے مطالب کے ساتھ ساتھ اُن پیشوں کی معلومات اور اصطلاحوں سے بچوں کو آگاہ کیا گیا ہے۔ حالی نے پیشہ کے عنوان سے مثنوی کی شکل میں چوراسی (۸۴) اشعار پر مشتمل بچوں کی طویل ترین نظم لکھی ہے۔ یہ نظم ماں اور بیٹوں کے

درمیان بات چیت ہے۔ یہاں حالی نے سات بیٹوں کی گفتگو کونظم کیا ہے جو اپنی ماں سے مخاطب ہوکر باری باری سے کہتے ہیں:

میں بڑا ہوں گا جب تو اماں جان اپنے مقدور بھر بنوں گا کسان
میں جواں ہوں گا جب تو اماں جان فوج میں جا کے ہوں گا میں بھرتی

آپ کے باغ کا بنوں مالی
کہ بڑا ہو کہ میں بنوں دھوبی
کنسٹبل بنوں گا اوّل بار
ہو سکا تو بنوں گا چٹھی رساں
اک بڑھئی مستری بنوں گا میں

ہمارے معاشرے میں کسان، دھوبی، سپاہی، ڈاکیا، کانسٹیبل، بڑھئی اور مالی بننا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ صرف اعلیٰ ملازمتوں، انجینئروں، ڈاکٹروں، پروفیسروں اور تاجروں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا جس کا نتیجہ ہم نے دیکھ لیا کہ لوگ بیکاری اور گدائی کے شکار ہوکر ذلیل وخوار ہوئے۔ حالی بچوں کے ذہنوں اور ان کی نفسیات سے واقف تھے وہ یہ بیج بچپن کے زرخیز ذہن میں بو رہے تھے تاکہ جب وہ بڑے ہوں تو یہ صحیح فکر کا تناور درخت بن جائے۔ وہ ہر پیشہ کے کام وکاج کے ساتھ اس میں ترقی اور مہارت کے اپچ بھی بچہ کی زبان سے دوہرا رہے تھے۔

کسان

ہلا چلاؤں گا بیج بوؤں گا وقت پر جب کہ غلہ کاٹوں گا
بھائی بہنوں کا حصہ باٹوں گا جو کماؤں گا گھر میں لاؤں گا

سپاہی

سیکھ لوں میں کہیں قواعد جنگ مشق بندوق کے لگانے کی
جنگ کی ہے مہم سے کیا ڈرنا آدمی کو ہے ایک دن مرنا
کیا عجب ہے رسالہ دار بنوں اونچی ہو جائے گی تمہاری ناک
سب کہیں گے رسالہ دار کی ماں

مالی

کیاریاں ہر طرح کی کھودوں گا نت نئے پھول میں اُگاؤں گا
موتیا اور چنبیلی اور جو ہی دیکھنا کیسے گل کھلاؤں گا

دھوبی

اونچے کر کر کے دست و بازو میں کپڑے دھویا کروں چھوا چھو میں
اجلے براق صاف اور ستھرے برف شرمائے دیکھ کر جن کو
کھاؤں گا اور کھلاؤں گا اماں تم کو میں حق حلال کا لقما

کانسٹبل

بدمعاشوں کو تنگ کر دوں گا جیل خانوں کو ان سے بھر دوں گا
جو کروں گا تو میں دل و جاں سے راست بازی سے اور ایماں سے

ڈاکیا

لے کے سب چٹھیوں کا میں طومار بانٹ آیا کروں گا نام بنام
خط کسی کا نہ میں کروں گا تلف نہ بنوں گا ملامتوں کا ہدف

بڑھئی

نہ بڑھئی وہ ہے جن کا نام بڑھئی
جو کہ پھرتے ہیں کہتے کام بڑھئی
اس ہنر میں بنوں گا میں استاد
اور کروں گا نئے نئے ایجاد
کارخانہ خود اک بنا لوں گا
ہو گی جب ہر طرف مری شہرت
دیکھنا گاہکوں کی پھر کثرت
مستری ایک ہو اگر ہشیار
ہر جگہ اس کے مشتری ہیں ہزار

حالی یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ کوئی کام گرا ہوا بے کار یا ذلیل نہیں ہوتا۔ اگر ایک ظاہر طور پر معمولی کام ہو لیکن کارگر اُسے کمال سے انجام دے تو اس کاریگر کی حیثیت کسی عظیم شخصیت سے کم نہیں۔ حالی معاشرے کی خامیوں کو خوبیوں سے بدل رہے تھے جس کا پھل ہم نے برصغیر میں دیکھا۔ اس موقع پر ہم ایک واقعہ جیسے مولوی عبدالحق نے اپنے خطبوں میں لکھا ہے۔ پیش کر کے حالی کے انقلاب ذہن کی نشان دہی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال ایک زمانے میں انارکلی میں رہتے تھے، اس بازار میں رہنے کے مکان اوپر تھے اور نیچے دُکانیں تھیں جہاں ڈاکٹر محمد اقبال رہتے تھے، اس کے عین نیچے ایک درزی کی دُکان تھی، جس نے نہایت جلی حروف میں خوش خط شیشے کے ایک چوکھٹے میں غالب کا یہ مصرع لکھ رکھا تھا:

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اقبال نے کہا: اس درزی کی فراست کا قائل ہونا پڑتا ہے، وہ قوت کے تقاضا کو کیا خوب سمجھا اور اس نے اس مصرع سے کیا خوب کام لیا، اس نے ہماری بھی ایک مشکل حل کر دی یعنی انسان اب درزی کی دکانوں، ہیر کٹنگ سیلون اور بیوٹی کلچر ایوانوں

میں بنتے ہیں۔

حالی کی ایک چھوٹی بارہ شعر کی نظم موچی ہے۔ جہاں ایک بچہ جو کہتا ہے ''میں موچی کہلاتا ہوں'' اس میں بتایا گیا ہے کہ موچی کیسے چمڑے سے جوتا بناتا ہے اس میں موچی کے اوزار اپنی اور برشا اور اس کام میں بھی محنت عمدگی کی سفارش بھی کی گئی ہے۔ ہم کچھ مصرعوں کو جوڑ کر پیش کرتے ہیں۔

چمڑا مول منگاتا ہوں دھو کے اُسے سکھلاتا ہوں
مَل کر نرم بناتا ہوں کرتا ہوں خوب ان کو صفا
پھر لے پنا اور تلا سیتا ہوں دونوں کو ملا
پھر جوتی قالب پہ چڑھا ٹھوک ٹھکا اور کوٹ کٹا
راپنی سے برشا کے تلا سیتا ہوں دونوں کو ملا
سال کے اندر میرا بوٹ میں ضامن جو جائے ٹوٹ

اسی طرح سپاہی اور چٹھی رساں یعنی پوسٹ مین کے بارے میں قدرے تفصیل سے اُن کے کام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

حالی کی ایک عمدہ بچوں کی نظم ہے ''روٹی کیوں کر میسر آتی ہے'' یہ نظم مثنوی کی شکل میں تقریباً اسی (۸۰) اشعار سے بنی ہے۔ یہاں حالی نے پہلے تو بچوں کو یہ بتایا ہے کہ کسان گیہوں اگاتا ہے اور اسے بازار میں فروخت کرتا ہے جیسے خرید کر گھر میں ماں چکی سے پیس کر آٹا بناتی ہے اور چھان کر اس کو گوندھ کر روٹی پکاتی ہے۔ لیکن ان سادے کام کاج بیان کرتے ہوئے حالی بچوں کے لیے نصیحت کے علاوہ مزاح کے پہلو بھی نکالتے ہیں۔

کسانوں کا ہے یہ احسان ہم پر کہ ہوتے ہیں گیہوں ہم کو میسر
خدا کے گھر کا سمجھو ان کو مودی

وہ بے چاری ہمیشہ صبح ہوتے   کہ جب تم بے خبر ہوتے ہو سوتے
جھٹ آٹا پیسنے جا بیٹھتی ہے
اسی چکی کا پیسا تھا وہ آٹا   چڑھے پروان ہو تم جس کو کھا کھا
لگی جب گوندھنے آٹا جھپا جھپ   اور اس میں مارنے مکی شپاشپ
وہ یوں آٹے کو ہے دیتی ٹھپکتی   کہ گویا لڑ رہی ہے اس سے کشتی

حالی نے روٹی جو گھر پر توے پر پکائی جاتی ہے اور باہر تندور پر بنائی جاتی ہے دونوں کو خوبصورت طریقے سے بیانیہ شعروں میں نظم کیا ہے۔ کچھ الفاظ جیسے روٹی کو جس کپڑے کے گدھے پر لگا کر تنور میں لگاتے ہیں بچوں کو سکھاتے ہیں۔

گھڑی ہاتھوں پہ پھیلائی بڑھائی   رفیدے پر دھری اور چٹ لگائی

اس نظم کا خاص حُسن اس میں ماں کی محنت اور اس کی بچوں کی خاطر ہر قسم کی زحمت کو برداشت کرنا ہے۔ جس سے بچوں کے دل و دماغ میں ماں کی محبت اور احترام کا جذبہ پیدا ہو۔

بھلا ماں کے سوا کس سے بن آئے   نہ کھائے آپ اور سب کو کھلائے
یہی رہتا ہے دن رات اس کو رونا   پکانا ریندھنا سینا پرونا
اُسے تم کو کھلانے سے ہے مطلب   نہیں کچھ اپنے کھانے سے ہے مطلب
وہ کرتی رہتی ہے تم سب کی خدمت   نہیں ملتی اُسے مرنے تک فرصت
نہیں کر سکتے حق ان کا ادا تم   کرو ان پر سے گر جاں بھی فدا تم
سمجھ لو اس سے ماں کی قدر و عظمت   کہ اس کے پاؤں کے نیچے ہے جنت

ایک نو شعر کی مثنوی ''دھان بونا'' میں دھان کس طرح بویا جاتا ہے جس میں کئی ہندی الفاظ سیوا، سہاگا، گیانی اور محاورے دھان پان استعمال کیا گیا ہے۔

بس دھان کو نازک ایسا ہی جان   ہو جیسے کہ دھان پان انسان

حالی کو بچوں کی نظموں میں سب سے نسبتاً مشکل نظم گھڑیاں اور گھنٹے کے عنوان سے مسدس کی شکل میں چوبیس اشعار کی نظم ہے جس کا محور وقت ہے یعنی گھڑیاں جو وقت بتانے کا آلہ ہیں وہ دن رات کام کرتی رہتی ہیں۔ انہیں دن رات گرما سرما اوپر نیچے امیر غریب بلندی پستی شاہ وگدا سب کے پاس ایک ہی حالت میں مسلسل چلتی رہتی ہے تھکن اور آرام ان کے لیے موت ہے چناں چہ انسان کو بھی رکنا نہیں چاہیے بلکہ زندگی کا سفر ہر طرح اور ہر طریقے سے جاری و ساری رہے۔ سچ کہا ہے؟ حرکت میں برکت ہے، کچھ شعر نمونے کے پیش کر رہے ہیں۔

جب دیکھیے چلنے سے سدا اپنے انہیں کام دوپہر ہو یا رات ہو یا صبح ہو یا شام
رکھے انہیں پاس اپنے سکندر کہ قلندر مینار کے اوپر ہوں کہ تہہ خانے کے اندر
اپنی اسی ٹک ٹک سے سروکار ہے ہر دم ان کو نہیں یاں اونچ کا یا نیچ کا کچھ غم
لو وقت چلا ہاتھ سے کچھ کر لو کمائی دیتے ہیں سنو غور سے ہر دم یہ دہائی

حالی نے مسدس کی شکل میں ٹیپ کے شعر کو ساتوں بندوں میں یکساں رکھ کر ترجیع بند لکھا۔

قوم کو اچھے کام دکھاؤ نیک بنو نیکی پھیلاؤ

سچ بولو، صاف اور ستھرائی رکھو، ہمسایے سے اچھے برتاؤ کرو، محنت کرو علم حاصل کرنے کے لیے کمانے کے لیے اور رحم دل رہو۔ بُری عادتوں میں مت پڑو۔

سچ بولو سچے کہلاؤ سچ کی سب کو ریس دلاؤ
ہو گی تم میں گر ستھرائی سب سیکھیں گے تم سے صفائی
جو پڑھنے میں کرتے ہیں محنت سیکھتی ہے شوق اُن سے جماعت
نیک ہے نیکی سب کو بتانا بد اوروں کو بد ہے بناتا

جواہرات حالی میں ایک مثنوی انچاس شعر کی ایک چھوٹی بچی کے خصائل کے

عنوان سے شامل ہے۔ یہ نظم حالی نے ۱۹۰۹ء میں ممتاز فاطمہ عرف سیدہ خاتون کے لیے لکھی جب وہ ڈھائی سال کی تھی۔ سیدہ خواجہ غلام ثقلین کی بیٹی اور غلام سیدین کی چھوٹی بہن تھی۔ حالی اسے بہت چاہتے تھے۔ حالی نے اس نظم میں نہ صرف سیدہ کی رفتار و گفتار صورت و شکل عادت و مزاج کو اس نظم میں پیش کیا ہے بلکہ اُس کی نفسیات اور بچوں کے نکات کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس نظم کو ہر دو ڈھائی سالہ بچے کی نفسیات عادات اور خصوصیات سے جوڑا جا سکتا ہے۔

سیدہ کیسی پیاری بچی ہے　　صورت اچھی سمجھ میں اچھی ہے
ہے ابھی دو برس کی خیر سے جان　　پر سب اچھے بُرے کی ہے پہچان
ہے ادب سے بڑوں کا لیتی نام　　سب کو کرتی ہے ہاتھ اٹھا کے سلام
نہیں منہ سے نکلتے پورے بول　　بولتی ہے سدا ادھورے بول
نئے آتے ہیں گھر میں جب مہمان　　دیکھتی ہے مڑ مڑ وہ سب کو
پر ذرا بھائی سے ہے لاگ اس کو
بس جہاں بھائی ماں کے پاس آیا　　اور وہیں اُس نے ہاتھ پھیلایا
عمر اس کی خدا دراز کرے　　علم سے اس کو سرفراز کرے

حالی لڑکیوں کی تعلیم کے حامی تھی وہ دُعا کے ساتھ اس کا بندوبست بھی کرتے تھے چناں چہ اپنے خاندان اور محلے کی لڑکیوں کے لیے لڑکیوں کا مدرسہ کھولا تھا۔ حالی کے تمام تر کلام کا مطالعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ان کی شاعری کا ایک اہم مقصد بچوں اور نئ نسل کے نوجوانوں میں تعلیم و تربیت کا شوق محنت اور کوشش کی عادت، شرافت اور انسانیت کی نمو اخلاق و کردار سازی کے ساتھ ساتھ وقت کی قدر ہمت و استقلال کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ وہ جانتے تھے بزرگوں پر اخلاقی فرض ہے کہ وہ بچوں کی رہنمائی کریں اور اکثر لوگ غفلت برتتے تھے۔ چناں چہ خود انہوں نے سیدھی سادی زبان میں میٹھے

انداز میں ان قدروں کو اپنی نظموں میں ایسا پیش کیا جو فوری دل نشین ہو گئے۔ قطعات ہو کہ رباعیات، غزلیات ہو کہ مثنویات مسدس ہو کہ ترکیب بند ہر صنف شاعری میں موقع کی نزاکت اور متن کی رعایت سے مذہبی، قومی، علمی، وطنی، اخلاقی، تعلیمی اور رفاہی نکات لکھ دیتے جوان کے کلام میں مختلف طولانی نظموں اور چند قطعات کے علاوہ غزلوں کے اشعار میں بکھرے ہوئے ہیں۔ خدا پر ایمان اور پیغمبر اسلام سے محبت جیسے خود رکھتے اُسی طرح نسل جوان کو بھی نصیحت کرتے۔

حالی قصے کہانی کے ذریعہ بچوں اور نوجوانوں میں نیکی ہمدردی اور مدد کا جذبہ ابھارتے ہیں۔ کہیں یہ بتاتے ہیں کہ ایک چھوٹا سا چراغ جو راستے پر بڑھیا نے رکھا ہے۔ وہ محلوں کے اُن فانوسوں اور برقی جھاڑوں سے بہتر ہے کیوں کہ یہ مٹی کا چراغ کئی لوگوں کا مونس اور مددگار ہے دراصل یہی وہ چراغ ہیں جن کی معنوی روشنی افلاک تک پھیلی ہوئی ہے۔

چھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا ... ایک بڑھیا نے سرِ رہ لا کے روشن کر دیا
تا کہ رہگیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں ... راہ سے آسان گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور فانوس سے ... روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں سے باہر دیکھیے ... ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا
سرخرو آفاق میں وہ رہنما مینار ہیں ... روشنی سے جن کی ملاحوں کے بیڑے پار ہیں

حالی نے اسی طرح ایک دولت مند باپ اور اس کے تین بیٹوں کی کہانی نظم کی جس میں بتایا کہ خیانت نہ کرنا کسی معصوم زندگی کو بچانا نیک اور عمدہ کام ہیں۔ لیکن سب سے اہم اور مبارک کام دشمن سے انتقام کے بدلے رحم کرنا ہے۔ جیسا کہ اُس کے چھوٹے بیٹے نے دشمن کو بچا کر اپنی صورت بھی نہ بتائی یہ سب سے بڑا احسان تھا۔

مارنا اس کا نہ تھا کچھ دشوار اک اشارہ میں تھا وہ لقمۂ غار
منہ کو دامن سے مگر ڈھانک لیا اس کو شرمندۂ احسان نہ کیا

حالی خود محب وطن تھے اور اس جذبہ کو عام کرنے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ ان کی خوب صورت نظم حب وطن ان کے ایمان کا جز معلوم ہوتی ہے۔ حالی نے اس محبت کو صرف زبانی نہیں رکھا بلکہ اہل وطن کے ساتھ محبت اخوت ہم کاری، ہمدردی، خوش اخلاقی، ایثار و قربانی کا جذبہ بھی ضروری بتایا۔ حالی وطن کو خوش حال توانا اور پریم کا ساگر دیکھنا چاہتے تھے۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

حالی ایسے وطن کی ایک مشت خاک کو بہشت سے بدلنے کو تیار نہ تھے۔

تری اک مشت خاک کے بدلے لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

حالی چوں کہ خود مذہبی ذہن کے مالک تھے اس لیے وہ نئی نسل میں خدا کی شان اس کی نعمتوں کا ذکر اس کی عبادت کا مزا اور حقوق اللہ کے ساتھ حقوق بندے پر زور دیتے تھے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ ایمان کا بیج بچپن ہی سے بویا جائے اس لیے نرم اور سلیس زبان میں معرفت کے درس دیتے تھے۔

تو ہی ہے سب کا پالنے والا کام سب کے نکالنے والا
بھوک میں تو ہمیں کھلاتا ہے پیاس میں تو ہمیں پلاتا ہے

وہ خدا پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کرتے اور اسی پر ایمان کو کامیابی کی کنجی سمجھتے تھے۔

خدا کے سوا چھوڑ دے سب سہارے | کہ ہیں عارضی زور کمزور سارے
پڑے وقت تم دائیں بائیں نہ جھانکو | سدا اپنی گاڑی کو تم آپ ہانکو

حالی نے اپنے کلام میں جا بجا عشق رسول ﷺ کو ظاہر کیا ہے۔ وہ سیرت رسول ﷺ کو شریعت کا لازم جانتے تھے۔ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات، اخلاقیات، حقوق انسان کی حفاظت، حریت اور حضور نبی کریم ﷺ کی اور ان کی اولاد پاک رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت کو جزو دین مانتے تھے اور یہ محبت کا بیج وہ بچپن سے ہی دل میں بونا چاہتے تھے تا کہ وہ آگے چل کر عشقِ محمدی ﷺ کا توانا درخت بن جائے۔

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے | وہ تیری محبت تری عترت کی ولا ہے

حالی نے ضمیمہ مسدس کے ساتھ ایک نعتیہ نظم عرض حال بجناب سرور کائنات ﷺ لکھی۔

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دُعا ہے | امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے | اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
جس قوم میں اور دین میں ہو علم نہ دولت | اسی قوم کی اور دین کی پانی پہ بنا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے | اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے

ایک دوسری نعتیہ نظم دیکھیے:

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا | مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا | وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ | یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے درگزر کرنے والا | بد اندیش کے دل میں گھر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا | قبائل کا شیر و شکر کرنے والا
اتر کا حِرا سے سوئے قوم آیا | اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

قصاید حالؔی کا تجزیہ

حالی کے کلام میں آٹھ (۸) قصیدے نظر آتے ہیں۔ جن کے مجموعی اشعار کی تعداد (۳۲۶) ہے۔ ان آٹھ قصیدوں میں پانچ قصیدے مکمل اور دو قصیدے نامکمل ہیں۔ حالی کے پانچ مکمل قصیدوں میں دو نعتیہ قصیدے، ایک قصیدہ نواب سر آسمان جاہ حیدرآباد، ملکہ وکٹوریہ اور دو قصیدے نظام دکن کی شان میں ہیں۔ نا تمام قصیدوں میں ایک قصیدہ سرسید اور نواب کلب علی رام پور کی مدح میں ہے۔

ایک نا تمام قصیدے میں صرف تشبیب کے کچھ اشعار ہیں۔ ان قصیدوں کے علاوہ حالی شناسوں نے کئی نظمیں جو موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے قصاید لگتی ہیں اگرچہ ان کا عنوان قصیدہ نہیں ہے ۔قصیدوں ہی میں شامل کیا ہے۔ جن کی فہرست ذیل کے جدول میں دی گئی ہے۔ جن کی تعداد سولہ (۱۶) اور اشعار کی تعداد (۲۹۷) ہے۔ اس طرح حالی کے کل قصاید اور منظومات مدحیہ کی کل تعداد (۶۲۳) ہے۔

جدول قصاید

عنوان	سنہ تصنیف	ہیئت	ماخذ	تعداد شعر
۱۔قصیدۂ نعتیہ	۱۲۸۱ھ (۶۵۔۱۸۶۴ء)	قصیدہ	دیوان	۳۳شعر
۲۔قصیدۂ نعتیہ (رائیہ)	۸۸۔۱۲۸۷ھ (۷۱۔۱۸۷۰ء)	--	--	۷۵شعر
۳۔قصیدۂ ناتمام (درمدح نواب کلب علی خاں)	۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء)	--	--	۲۹شعر
۴۔قصیدۂ ناتمام (درمدح سید احمد خاں)	۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء)	--	--	۱۴شعر
۵۔قصیدۂ جشن جیوبلی	۱۸۸۷ء	--	مجموعہ نظم حالی	۲۷شعر
۶۔قصیدۂ تہنیت عیدالفطر (بہ حضور نواب سرآسمان جاہ)	۱۳۰۶ھ (۱۸۸۹ء)	--	دیوان	۴۶شعر
۷۔قصیدۂ درشکر وسپاس نظام دکن واعیان سلطنت	۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱ء)	قصیدہ	دیوان	۶۵شعر
۸۔قصیدۂ تہنیت (بہ حضور نظام دکن)	۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء)	--	جواہرات	۴۷شعر

کل تعداد قصاید = ۸ کل تعداد شعر = ۳۲۶

جدول منظومات مدحیہ

عنوان	سنہ تصنیف	ہیئت	ماخذ	تعداد شعر
۱۔ مبارک باد	(۱۸۷۵ء)	قطعہ	کلیات مرتبہ اسماعیل پانی پتی (جلد اوّل)	۱۰ شعر
۲۔ مژدہ قدوم حضور شاہزادہ ویلز	۱۸۷۵۔۷۶ء	قطعہ	دیوان	۵ شعر
۳۔ شکریہ تشریف آوری سر چارلس ایچی سن	۱۸۸۲ء	ترجیع بند	جواہرات	۱۲ شعر
۴۔ قطعہ بہ جناب نواب سر آسمان جاہ	۱۳۰۵ھ (۱۸۸۸ء)	قطعہ	دیوان	۲۷ شعر
۵۔ شکریہ حضور لیفٹیننٹ گورنر بہادر	۱۸۸۹ء	ترجیع بند	جواہرات	۲۱ شعر
۶۔ قطعہ در تہنیت ولادت فرزند ارجمند	۱۳۰۸ھ (۱۸۹۰۔۹۱ء)	قطعہ	دیوان	۱۳ شعر
۷۔ قطعہ در شکر و معذرت	۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱ء)	قطعہ	دیوان	۷ شعر
۸۔ قطعہ در شکر اضافۂ وظیفہ	۱۳۰۹ھ (۱۸۹۱ء)	قطعہ	دیوان	۷ شعر

۹۔ شکریہ عطائے مدرسہ نواب غازی الدین مرحوم	۹۲۔۱۸۹۱ء	ترجیع بند	دیوان	۳۶شعر
۱۰۔ اشعار مدحیہ بحضور سرڈینس فٹز پیٹرک	قبل ۱۸۹۳ء	قطعہ	دیوان	۱۱شعر
۱۱۔ شکریہ مسٹر برور	قبل ۱۹۰۰ء	قطعہ	جواہرات	۱۱شعر
۱۲۔ مسٹر آرنلڈ کی روانگی ولایت	۱۹۰۴ء	ترکیب بند	جواہرات	۵۸شعر
۱۳۔ مسٹر ماریسن کی روانگی ولایت	۱۹۰۵ء	--	--	۲۲شعر
۱۴۔ خطاب بہ حاذق الملک	۱۹۰۸ء	قطعہ	--	۵شعر
۱۵۔ تہنیت مسند نشینی حضور نظام	۱۹۱۱ء	قطعہ	--	۲۹شعر
۱۶۔ شکریۂ مساعی جمیلہ ظفر علی خاں	۱۹۱۳ء	--	--	۲۳شعر

کل تعداد منظومات = ۱۶

کل تعداد شعر منظومات = ۲۹۷

کل تعداد اشعار قصائد اور منظومات = ۶۲۳

حالی قصیدے کی صنف کو ضروری جانتے ہیں۔ وہ مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں:

''قصیدہ بھی اگر اس کے معنی مطلق مدح و ذم کے لیے جائیں اور

اس کی بنیاد محض تقلیدی مضامین پر نہیں بلکہ شاعر کے سچے جوش اور ولولے پر ہو تو شعر کی ایک نہایت ضروری صنف ہے جس کے بغیر شاعر کمال کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا اور اپنے بہت سے اہم اور ضروری فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ ہم دیکھتے ہیں اکثر اوقات کسی چیز کو دیکھ کر یا کسی واقع کو سُن کر بے اختیار ہمارے دل میں مدح و ستایش یا نفریں و ملامت کا جوش اٹھتا ہے۔ ایسے موقعوں پر شاعر کا فرض ہے کہ جو ملکہ خدا نے اُس کی طبیعت میں ودیعت کیا ہے اُس کو معطل اور بے کار نہ چھوڑے اور اس سے جیسا کہ اس کی فطرت کا مقتضا ہے کچھ کام لے۔ اسی لیے مدح ایسے اسلوب میں کرنی چاہیے کہ وہ منجر بہ خوشامد نہ ہو جائے اور مذمت ایسے عنوان سے ہونی چاہیے کہ دل سوزی کا پہلو طعن و تشنیع کی بہ نسبت غالب تر ہو۔"

حالی کے بیان سے ہمیں معلوم ہوا کہ انہوں نے اس صنف میں کیوں خامہ فرسائی کی جس کا حسن مبالغہ جس کا رنگ خوشامد جس کا ڈھنگ بناوٹی اور جس کا آہنگ حسن طلب کی تکرار ہو۔ غالب کے شاگرد حالی شاید خود کو بقول استاد پورا شاعر کہلوانا چاہتے تھے۔ جیسا کہ انہوں نے یادگار غالب میں لکھا:

"خود مرزا کا قول تھا کہ جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اس کو شعرا میں شمار نہیں کرنا چاہیے اور اس بنا پر وہ شیخ ابراہیم ذوق کو پورا شاعر اور شاہ نصیر کو ادھورا شاعر جانتے تھے۔"

حالی کے قصاید اور مدحیہ منظومات پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم اُردو قصیدہ نگاری اور ممتاز اُردو قصیدہ نگاروں پر روشنی ڈالیں گے تا کہ اس گلستان رنگ و بو میں حالی

نے کیا کیا گل کھلائے اور گلشن کو خس و خاشاک سے صاف کرنے میں کیا کیا کام کیے۔

دکنی قصیدوں کے بعد شمالی ہند میں ولی دکنی کے قصیدوں کا پتا چلتا ہے جو صرف حمدیہ، نعتیہ اور منقبتی موضوعات پر سیدھی سادی زبان پر مشتمل ہیں۔ فارسی قصیدوں کو سامنے رکھ کر اُسی ہیئت اور حدود میں قصیدہ نگاری کی ہے۔ ولی کے قصیدے ان کی دوسری اصناف کے سامنے معمولی اور قصیدے کے شکوہ بیان، رنگینی اور زور تخیل سے خالی ہیں اگرچہ ولی نے تعلی کر کے فارسی کے عظیم قصیدہ گو شعرا سے داد حاصل کی ہے۔

یقیں ہے مجھ کو اگر یہ قصیدۂ رنگیں سنیں تو وجد کریں انوریؔ و خاقانیؔ

اُردو شاعری کا عظیم قصیدہ گو سودا ہے۔ سودا کے تقریباً پینتیس (۳۵) قصیدے اُردو اور ایک قصیدہ فارسی میں ہے۔ جن میں چار نعتیہ قصیدے، ۱۱ منقبتی اور بیس (۲۰) قصیدے حکمرانوں امراؤں اور بادشاہوں کی شان میں لکھے گئے ہیں۔ مصحفیؔ لکھتے ہیں:

''سودا نقاش اول نظم قصیدہ در زبان ریختہ است''

سوداؔ نے خاقانی اور انوری و سعدی کے قصیدوں کو سامنے رکھ کر عالی قصیدے لکھے۔ ایک قصیدے میں خود کو ان تین شاعروں کا ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔

یار و مہتاب گل شمع بہم چاروں ایک

شبلی نے قصیدے کے حُسن میں مطلع مقطع اور تخلص کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ سوداؔ نے نہ صرف ان پر بلکہ تشبیب، گریز، مدح، حسن طلب، اور دعائیہ اشعار پر بھی استادانہ عمل دکھایا ہے۔ سوداؔ کا مطلع صاف اور زور دار تشبیب میں جدت خیال اور بوقلمونی گریز سبک اور پرلطف حسن طلب خاتمہ اور دُعائیہ مضامین میں سحر کاری کا استادانہ عمل ہے جو انہیں قصیدوں میں میر کی سادگی اور حقیقت نگاری سے زیادہ محبوب بنا دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مبالغہ اور خیالی مضامین جس کی نسبت شیخ چاند لکھتے ہیں:

’’سوداؔ نے مبالغہ آرائی میں کوئی تامل نہیں کیا۔ ان کا پورا سرمایہ
مدح مبالغہ سے بھرا پڑا ہے۔‘‘

یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ حالی مقلد ہیں میر کے جہاں مبالغہ نہیں بلکہ سادگی، اصلیت اور جوش ہے وہ شیفتہ سے مستفید ہیں اس لیے ان کے پاس مبالغہ آرائی نہیں۔

استاد ذوق نے جنہیں اکبر ثانی نے خاقانی ہند کا ادبی خطاب دیا پچیس سے زیادہ قصاید لکھے لیکن ذوق کا کوئی قصیدہ حمد نعت یا منقبت میں نہیں ملتا۔ یہی نہیں بلکہ سوائے لال قلعہ کے بادشاہ اور ولی عہد کے کسی بیرونی حکمران یا شخصیت پر بھی قصیدہ نہیں۔ غیر مطبوعہ قصیدہ مغل بیگ کا دستیاب ہوا ہے۔ آزاد نے لکھا کہ کئی ابتدائی دور کے قصیدے تلف ہو گئے۔ موجودہ قصیدوں میں اگرچہ ابتدائی دور کے قصاید بھی موجود ہیں۔ ذوق کے ممدوح محدود تھے اس لیے موضوعات کو قوت فکر مہارت زبان و بیان سے رنگین کر کے ہر سال عید وغیرہ پر نئے نئے قصیدے پیش کر کے انعام اور خلعت حاصل کرتے تھے۔

استاد غالب نے فارسی میں (۱۷) قصیدے لکھے جن کی مجموعی اشعار کی تعداد (۳۹۱۷) ہے۔ حالی کا خیال ہے کہ غالب کے قصاید کمیّت اور کیفیت کے لحاظ سے اُن کے اصناف نظم میں سب سے زیادہ ممتاز صنف ہے۔ اگرچہ اغلب ناقدین غالب کی غزلیات کو ان کی سب سے ممتاز صنف مانتے ہیں۔ بعض غالبیات کے اسکالرس غالب کی مثنویات کو ممتاز صنف میں جگہ دیتے ہیں۔ یہاں مسئلہ ذوق و مذاق کا ہے غالب کا کرشمہ سخن ہر صنف میں ممتاز ہے۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جاہ اینجاست

حالی یادگار غالب میں لکھتے ہیں:

''قصیدے کی شان جیسی ہونی چاہیے اوّل سے آخر تک یکساں طور پر جلوہ گر ہے۔قصاید میں مرزا نے کہیں خاقانی کا تتبع کیا ہے کہیں سلمان وظہیر کا اور کہیں عرفی ونظیری کا اور ہر ایک منزل کامیابی کے ساتھ طے کی ہے۔مرزا کی تشبیب بہ نسبت مدح کے نہایت شاندار اور عالی رتبہ ہوتی ہے اور اسی سے قصیدے کی پستی و بلندی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب اپنے قصاید پر نازاں تھے۔غالب اپنے شاگرد ہرگوپال تفتہ کو خط میں لکھتے ہیں۔۔۔''وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھے نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔میرے قصیدے دیکھو تشبیب کے شعر بہت پاؤ گئے اور مدح کے شعر کمتر۔'' جب نبی بخش حقیر نے غزل کے اشعار کی تعریف لکھی تو کہتے ہیں۔''بھائی تم غزل کی تعریف کرتے ہو اور میں شرماتا ہوں میرے فارسی کے قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے کوئی ان کا لطف ہی نہیں اُٹھاتا۔''

مثال کے طور پر اگر ہم غالب کے اس قصیدے کو جو ایک انگریز چیف سکرتر مسٹر تھواپی پرنسب کی تعریف میں ہے کہہ کر طاق نسیان پر رکھ دیں تو تشبیب کے ان جان فزا اشعار جن میں شراب پر عمدہ اور نادر مضامین ہیں محروم رہیں گے۔

بی می نکند در کف من خامہ روائی   سرداست ہوا آتش بی دود کجائی
باید کہ صراحی بود آبستن صہبا   تا ناطقہ را روی دھد نادرہ زائی
نگراشتہ ہر چند نشان لاغری از من   از نالہ کنم سوے خودش راہ نمائی

''بغیر شراب کے قلم میرے ہاتھ میں نہیں چلتا، موسم ٹھنڈا ہے

اے بغیر دھویں کی آگ تو کہاں ہے، صراحی کو چاہیے کہ وہ شراب سے حمل دار رہے تا کہ پینے والے کے منہ سے نادر (مضامین) نکلیں۔ لاغری نے میرا نشان مٹا دیا اب میں لوگوں کو فغان و آہ کر کے اپنی طرف رہنمائی کرتا ہوں۔''

غالب مضمون نگاری کے شہنشاہ ہیں۔ ملکہ کی مدح میں جو قصیدہ ہے اُس میں خود کو مغلیہ دور کے درباری شعرا اور خراسانی درباری شعرا سے مقایسہ کر کے کہتے ہیں کہ ان کی طرح میں بھی تمہارے دربار کا درباری شاعر ہوں۔ یہ غالب کا طرز بیان ہے جس میں تعلّی کر کے اپنی تعریف کو ممدوح کی تعریف سے بڑھا دیتے ہیں۔ یہی انداز غالب کا نعت و منقبت میں بھی ہے۔ جس میں ان برگزیدہ ہستیوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے عرفؔی شیرازی کی طرح اپنے آپ پر فخر کرتے ہیں۔

سخن ز نکتہ سرایان اکبری چہ کنی چو من بخوبی عہد توام ز خویش گواہ
نزول من بہ جہان بعد یک ہزار و دویست ظہور سعدی و خسرو بہ شش صد و پنجاہ
ہبہ فن شعر چہ نسبت بہ من نظیری را نظیر خود بہ سخن ہم منم سخن کوتاہ
کنون تو شاہی و من مدح گو تعال تعال گزشت دور نظیری و عہد اکبر شاہ

''اکبر اعظم کے درباری شاعروں کا ذکر کیوں کر رہے ہو مجھ جیسا عظیم شاعر تیرے دربار میں موجود ہے میری پیدایش (۱۲۰۰) ہجری ہے اور سعدی اور خسرو کی پیدایش (۶۵۰) ہجری ہے۔ شاعری میں نظیری نیشاپوری کو مجھ سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ میرا خود سخن نظیر ہے قصہ مختصر۔ اس وقت تو پادشاہ ہے اور میں تیرا مدح گو وہ دور نظیری اور اکبر شاہ چلا گیا۔''

حالی کے قصیدوں پر ان کی شاعری کی دوسری اصناف کی طرح یہ الزام ہے

کہ وہ انگریزوں کے مدح خواں ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ حالی نے درجنوں اشعار انگریز حکمرانوں، امراؤں اور عہدیداروں کے لیے لکھے یہی کام نہ صرف ان کے استاد غالب بلکہ اُس زمانے کے کئی شاعروں نے کیا جس نے نہیں کیا اُس کو یا تو پھانسی کے پھندے پر سید محمد باقر کی طرح لٹکا دیا گیا یا منیر شکوہ آبادی کی طرح کالا پانی بھیج دیا گیا۔ حالی کے اگر ان اشعار کا دقیق مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مثبت قدروں یعنی روٹی روزگار تعلیم تربیت رفاہی کام ملک کا نظم ونسق غریب پروری وغیرہ کی تعریف کی ہے تا کہ انگریز قوم کو ترغیب ہو اور اس سے محروم قوم کو فائدہ پہنچے۔

جب لاہور کے گورنر سر لائل اینگلو عربک اسکول دہلی آتے ہیں تو حالی نے ایک طویل مدحیہ نظم لکھی جس کے کچھ اشعار یہ ہیں۔

کہاں یہ اس مدرسے کی قسمت — کہ لائیں تشریف خود بہ دولت
کریں غریبوں پہ جو عنایت — ہمیشہ ان پر خدا کی رحمت
ہے جب سے لائل نے سایہ ڈالا — ہوا ہے پنجاب میں اجالا
ہمیشہ جب تک کہ علم و حکمت — جہاں میں کرتے رہیں حکومت
حضور قیصر کا ظل رافت — ہمارے سر پر رہے سلامت

حالی ۱۸۷۵ء کو ملکہ وکٹوریا کی سالگرہ پر کہتے ہیں جو علی گڑھ کی بھی افتتاح کی تقریب تھی۔

دولت جاوید کی پڑتی ہے بنیاد یاں — قوم کی بے طالعی ہند سے رخصت ہے آج
مدرسۂ علم و دیں کرتے ہیں قائم ثقات — مزرعہ قوم پر بارش رحمت ہے آج
دولت برطانیہ روز افزوں ہوجیو — قوم کو یہ دن نصیب جس کی بدولت ہے آج
قوم کے بدخواہ سب مل کے پڑھیں فاتحہ — نکبت وادبار کی ملک سے رخصت ہے آج

حالی نے کورس کی شکل میں ایک مدحیہ نظم لکھی جو بچوں نے گورنر پنجاب کی

جانب سے مدرسہ کی عمارت اور وظیفے ملنے پر اظہار تشکر کے لیے گائی۔ چند شعر یہ ہیں:

تھے تعلیم میں کم سب سے ہم　　تم نے مدد کی اپنی پیہم
مدرسہ تھا بے ٹھور ہمارا　　تھا نہ کہیں ٹکنے کا سہارا
آپ کو ہم پر رحم جو آیا　　گھر یہ عطا ہم کو فرمایا
آر کلاک احسان کا پتلا　　آدمی کی صورت میں فرشتہ
آپ نے ہم پر بھیجے ہیں افسر　　کیسے کیسے رعیت پرور
جن سے ہے ہندوستان منور　　فخر ہے انگلستان کو جن پر
جب تک شہر آباد رہے گا　　نام تمہارا یاد رہے گا

حالی کا قصیدہ ''جشن جوبلی'' جو ۱۸۸۷ء میں ایک سپاس نامے کے ساتھ انجمن اسلامیہ لاہور کی طرف سے ملکہ وکٹوریا کے حضور میں پیش کیا گیا۔ مورد اعتراض اور انگریزوں کی چاپلوسی اور جھوٹی تعریف سمجھا گیا۔ انگریز حکمران بہرحال کولونیل ماسٹر تھے اور انھوں نے پوری برصغیر کی آبادی کو غلام بنا رکھا تھا چناں چہ اس حکومت کی تائید اور تحسین حالی جیسے رہنما کے لیے ننگ تھی۔ اس قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں:

یہ عہد کہ گزرے ہیں برس جس کو پچاس اب　　ست جگ سے ہے یہ ہند کے حق میں کہیں بہتر
وہ دور تعصب تھا یہ ہے دورۂ انصاف　　وہ جنگ کا موجد تھا یہ ہے صلح کا رہبر
سچ یہ ہے کہ فاتح کوئی تجھ سا نہیں گزرا　　محمود نہ تیمور نہ دارا نہ سکندر
گر برکتیں اس عہد کی سب کیجیے تحریر　　کافی ہے نہ وقت اس کے لیے اور نہ دفتر
گو منت قیصر سے ہے ہر قوم گراں بار　　احساں مگر اسلام پہ اس کے ہیں گراں تر
بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا　　سنکھ اور اذاں گونجتے ہیں روز برابر

شاید ایسی ہی فکر کے لیے علامہ اقبال نے کہا تھا۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت　　ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اس جشن جوبلی میں انگریزوں کے حقیقی مثبت کارنامے جن میں دختر کشی اور ستی کی رسم کی ممنویت کا بھی ذکر ہے۔

اس عہد نے وہ خون بھرے ہاتھ کیے قطع جو پھیرتے تھے بیٹیوں کے حلق پہ خنجر
دی اُس نے مٹا ہند سے یوں رسم ستی کی گویا وہ ستی ہو گئی خود عہد کہن پر

حالی نے انگریزوں کے دور میں جانوروں کے حقوق کی بات کی ہے اور دُعا پر قصیدہ تمام کیا ہے۔

اس عہد میں انساں ہی نہیں ظلم سے محفوظ مظلوم نہ اب بیل نہ گھوڑا ہے نہ خچر
قیصر کے گھرانے پہ رہے سایہ یزداں اور ہند کے نسلوں پہ رہے سایۂ قیصر

سرسید کی شان میں جو قصیدہ لکھا اُس میں تعلیم و تربیت اور علی گڑھ کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

تعلیم کی تمہاری بنیاد اس نے ڈالی ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے
بعد از قرون اولیٰ کس نے کیا بتاؤ سید نے کام آ کر جو قوم میں کیا ہے

نواب رام پور کے قصیدے میں کہتے ہیں:

ہورہے تھے دودمان علم و دولت جاں بہ لب تو نے اک اک کے چوایا حلق میں آب بقا
کول میں پودا لگا ہے جو پئے تہذیب یہ آبیاری سے ہے تیری ہی اسے نشوونما

میر محبوب علی پاشا کے قصیدے میں طرز بیان دیکھیے:

جب سے کالج کی علی گڑھ میں بنا ڈالی گئی دولت عالی مدد کرتی رہی اس کی سدا
جو لگایا تھا درخت اس کی ہمیشہ لی خبر دم بہ دم پانی دیا یاں تک کہ بار آور ہوا
خود علی گڑھ کالج اور اس کے در و دیوار سب راگ گائیں گے سدا احسان آصف جاہ کا
تھا پڑا سید کا سچ پوچھو تو خشکی میں جہاز دولت عالی نے اس خشکی میں دی گنگا بہا

ایک اور قصیدے میں علی گڑھ کے محسن کا ذکر دیکھیے:

علی گڑھ میں رہے گا بن کے دارالعلم یہ کالج — یہی عالم ہے گر بذل و عطائے خسروانی کا
وہ کالج مردہ قوم میں پھر جان ڈالی ہے — اسی منبع سے جاری ہے وہ چشمہ زندگانی کا

مسٹر تھیوڈور ماریسن جو علی گڑھ کالج کے انگریزی زبان کے استاد تھے ان کی انگلستان کی روانگی کے وقت یہ چند اشعار اُس مدحیہ نظم میں سے ہیں جو ۱۹۰۵ء میں لکھی گئی۔

گو کہ یاں تعلیم کا بویا تھا سرسید نے بیج — پر پھلا پھولا تمہاری سعی سے اس کا چمن
تم نے کی کالج کی خدمت جس خلوص وصدق سے — بس یہی خدمت تمہارا ہے صلہ اے مارسن
تم نے سرسید کی جو اصلاح میں حصہ لیا — قوم کی سنت ادا کی ہے یہ تم نے بے سخن

حالی نے صرف علی گڑھ ہی نہیں بلکہ جہاں کہیں بھی قوم وملت کی جہالت کو دور کرنے کے لیے علم کدہ مدرسہ کالج کھولا گیا اُس کی ضرورت اور اس کے بانیوں اور محسنوں کی قصیدوں اور مدحیہ نظموں میں قدر دانی کی ہے۔

حالی نے گورنر سرجان سکاٹ ہیوٹ کی شان میں شبلی کے کہنے پر یہ مدحیہ اشعار ندوۃ العلما کے افتتاح پر لکھے:

ہیوٹ نے ڈالی تیری نیو اے ندوہ کر شکر خدا — بے گھر تھا تو اے ندوہ تجھ کو گھر دیا سرجان نے
ویرانہ تھا آباد تجھ کو کر دیا سر جان نے — اب تو قدم آگے بڑھا خواہش ہے گر اس سے سوا
ہم سے تمہارا شکر اے برطانیہ کیا ہو ادا — اڈورڈ ہفتم اور شہنشاہی رہے اس کی سدا

نعتیہ قصیدوں کے سوا حالی کے دوسرے قصاید روایتی معیار پر پورے نہیں اترتے۔ اُن میں کلاسیک قصیدوں کی شان وشوکت، مبالغہ آرائی، پرزور مذمت اور خیال بندی نہیں۔ بہت سے قصیدوں میں پورے اجزائے قصیدہ بھی موجود نہیں اس لیے حالی نے صرف مختصر سی تمہید جو موقع اور مقام کی نسبت سے ہے کی ہے پھر مدحیہ مضامین لکھ کر دُعا پر خاتمہ کیا ہے۔ حالی کے قصیدوں میں خوشامد نام کو بھی نہیں۔ شکریہ اور سپاس

گزاری نظر آتی ہے لیکن حسن طلب کی بھیک نہیں۔ غالب نے تشبیب پر زور دیا تھا اور اسی پر تفتہ کے خط میں ناز بھی کیا تھا۔ حالی کے قصیدے اس سے خالی ہیں۔ حالی کو مبالغہ اور دروغ خیال بندی سے نفرت تھی چناں چہ قصیدے پھیکے اور بیانیہ ہو کر رہ گئے۔ وہ حکمران جن کے ذائقے مبالغہ آرائی کے چٹخارے سے تند و تیز ہو گئے ان کے لیے حالی کے قصیدوں کا اثر شاید ایک شکریہ کا خط ہو۔ بعض قصاید میں حالی مدح کا پہلو عمدگی سے پیش کرتے ہیں اگر ممدوح کی خدمات قومی فائدہ اور ملک کی تعمیری صلاحیتوں کے ہمراہ ہو۔ حالی کے وہ قصاید اور مدحیہ منظومات جو علی گڑھ کے محسنوں اور قومی خدمت گزاروں کے لیے لکھے گئے اس میں مداحی دل کی گہرائیوں سے ابل رہی ہے وہ اپنے قصیدوں میں اُن نکات کی جلوہ نمائی کرتے ہیں اور ان خصوصیات کو نمایاں کرتے ہیں جن میں تعلیم و تربیت، فلاح و بہبود، علم و ہنر کی تشہیر و تنظیم کے پہلو ہوتے ہیں۔ سر سید جیسے مصلح پر ہر طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ حالی نے قوم کو خطاب کر کے کہا:

اس دور آخری میں جب یوں بگڑ چلے ہو — اک ہاشمی تمہارا مصلح کھڑا کیا ہے
وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا — یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے
تعلیم کی ہماری بنیاد اس نے ڈالی — ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے

حالی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مدحیہ قصیدے کا جس میں جھوٹ اور مبالغہ ہو لکھنا میرے لیے سخت مصیبت ہے۔''

حالی کو قصیدہ نگاری سے دلچسپی نہ تھی اسی لیے انھوں نے قصیدے حکمرانوں نوابوں کے کم لکھے اور بعض کو ادھورا چھوڑ دیا۔

دل چاہتا نہیں تو زباں میں اثر کہاں

جن قصیدوں میں ممدوح کی عالی ظرفی سخاوت شجاعت قومی ہمدردی تھی اُسے

بیان کیا ہے اور بعض قصیدوں میں ان افراد کو اپنی قومی اخلاقی اور انسانی ذمہ داریوں سے باخبر بھی کیا ہے جو عام طور سے قصیدوں میں نہیں ہوتا۔ قصیدوں میں یہ رنگ حالی نے سعدی کے قصیدوں اور انیسؔ و دبیرؔ کے مرثیوں سے حاصل کیا۔

رام بابو سکسینہ نے حالی کے قصیدوں پر ریویو کرتے ہوئے صحیح کہا ہے:

''پرانے روایتی قصیدوں کی طرح حالی کی ساری قابلیت ممدوح کی صرف مداحی اور محض لفظی شان وشوکت میں صرف نہیں ہوتی بلکہ وہ ممدوح کو اس کی ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کرتے ہیں اور موقع متوقع پر اُسے نصیحت اور عبرت کی باتیں بھی بتاتے ہیں۔''

چند نظمیں انجمن میں اس لیے ہم نے پڑھیں　　شکر کرنا تھا ہمیں سرکار عالی کا ضرور
جھوٹ جو اشعار کا زیور ہے وہ اُن میں نہیں　　اور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں ان میں مگر

حالی نظام دکن کا قصیدہ لکھنے سے قبل مولوی عبدالحق سے نظام کے ذاتی اوصاف اور رفاہ عامہ کے کاموں کی تفصیل دریافت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجھے بے سروپا مدح سرائی اور بھٹئی کرنی نہیں آتی اس لیے میں چاہتا ہوں قصیدے میں سرتاپا فیکٹس اور واقعات کا بیان ہو۔''

چناں چہ نواب میر عثمان علی خان نظام دکن ہفتم کی مسند نشینی کے موقع پر ۱۹۱۱ء میں کہتے ہیں۔

فلک مرتبت میر عثمان علی خاں　　مبارک تمہیں مسند شہر یاری
مبارک ہو تم کو وہ دشوار منزل　　جہاں چپے چپے پہ ہے ذمے داری
مبارک بزرگوں کی میراث تم کو　　جنھوں نے کہ جھیلی ہیں کڑیاں یہ ساری
مبارک یہ بار گراں تم کو شاہا　　اٹھانے سے ہیں جن کے افلاک عاری
سمجھنا ہر اک قوم و ملت کو یکساں　　کہ خصلت ہے یہ زیور شہر یاری

جو زردار ہیں ان کی ہے پاسبانی　　جو نادار ہیں ان کی حاجت برآری
دُعا گوئے دیرینہ ناچیز حالی　　کہ مدحت گری کہ ہنر سے ہے عاری

حالی کے قصیدوں اور مدحیہ منظومات میں دو موضوعات جگہ جگہ پر ابھرتے ہیں۔ ایک تو وہ ملک میں قوموں کے درمیان اتحاد و محبت کا ذکر چھیڑتے ہیں اور دوسرے تعلیم کی اہمیت اور تعلیمی درس گاہ علی گڑھ کی دامے درمے سخنے پشتبانی کرتے ہیں۔ نظام دکن محبوب علی پاشا کے قصیدے میں لکھتے ہیں:

جتنی یاں قومیں ہیں سب رکھتی ہیں باہم میل جول　　بے تعصب بے تکلف بے تصنع بے ریا
دولت عالی نے حق سب کو برابر ہیں دیے　　ایک پر ترجیح کچھ رکھتا نہیں یاں دوسرا
پارسی ہندو مسلماں یا مسیحی کوئی ہو　　ہے دکن کو ہر کوئی اپنی ولایت جانتا

ایک اور نظام دکن کے قصیدے میں لکھتے ہیں:

ہر اک مذہب ہر اک ملت سے ہے یکساں سلوک اس کا　　کوئی گُر سیکھ لے اس سے جہاں کی پاسبانی کا
تعصب اجنبیت اختلاف مذہب و ملت　　نہیں کوئی مزاحم اس کے دریا کی روانی کا

شاید یہ کہنا صحیح ہے کہ فارسی اور اُردو قصیدوں میں سعدی کے بعد حالی ہی وہ تنہا شاعر ہے جس کے پاس مبالغہ خوشامد گوئی کی جگہ صداقت سادگی اور خلوص قصیدوں میں موجود ہے۔ حالی نے جن امراؤں سے وظیفے امداد انعامات پائے ان کی شکرگزاری کی ہے۔ ان قصیدوں میں خوشامد نہیں لیکن عجز، انکساری، حقیری، فقیری غریبی وغیرہ کا رنگ ہے۔ وہ زیادہ تر حالی کی افتادِ طبع کا نتیجہ تھا۔ غالب نے بھی نواب رام پور کے سو روپے کے ماہانہ وظیفہ کے لیے ڈیڑھ سو بار کہا تھا۔

تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

غالب نے صرف دُعا ہی نہیں دی بلکہ مدح بھی ضرورت سے زیادہ کی جبکہ انیس نے بڑی بڑی رقم ٹھکرا دی۔

غیر کی مدح کروں شہ کا ثناخواں ہو کر مجرائی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

نواب آسمان جاہ نے ۱۸۸۸ء میں سرکار حیدر آباد کی طرف سے حالی کا ماہانہ وظیفہ مقرر کیا ایک مدحیہ قطعہ حالی نے بھیجا جس کے دو شعر یہ ہیں۔

آسمان جاہ کی خدمت میں یہ حالی کی ہے عرض کہ اگر میرا ہر اک رونگٹا ہو جائے زباں

شکر ممکن نہیں اس کا کہ مجھے گھر بیٹھے اس نے ممتاز کیا بھیج کے شاہی فرماں

حالی احسان فراموش شخص نہ تھے اگر کوئی کسی بھی قسم کی خدمت کرتا حالی اس کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ منظوم طریقے سے یا مکتوب کے ذریعے سے۔

غالب کی نعتیہ غزل پر حالیؔ کی شاہکار تخمیس

حالی نے غالب کی ایک مشہور فارسی نو(۹) اشعار پر مشتمل نعتیہ غزل کے سات شعروں پر ایک فارسی مخمس تضمین کیا جو ان کے کلیات میں ضمیمے مشتمل بر کلام فارسی وعربی میں شامل ہے۔ حالی نے یہ تضمین مرزا غالب کی زندگی میں کی لیکن ہمیں اس کی دقیق تاریخ تصنیف نہیں معلوم گمان یہ ہے کہ یہ نعت حالی نے ۱۸۶۳ء اور ۱۸۶۹ء کے درمیان لکھی جب وہ شیفتہ کے پاس ان کے بیٹے کے اتالیق تھے اور فارسی میں شیفتہ کے ساتھ مشق سخن جاری تھی اور غالب سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ غالب کی یہ نعتیہ غزل ان کے فارسی کلام مطبوعہ ۱۸۴۱ء میں موجود ہے۔ حالی کی تضمین شدہ سات بند کا مخمس نعت کا ترجمہ اور تجزیہ سے پہلے ہم غالب کی اس نعت کے بارے میں گفتگو کر کے غالب کے اُن سات اشعار کا سلیس ترجمہ اور تجزیہ کریں گے جن پر حالی نے تضمین کی تا کہ استاد اور شاگرد کے کلام اور مقام کا مظاہرہ ہو جائے اگرچہ غالب سے ہم یہاں حالی کا تقابل نہیں کر رہے ہیں کیونکہ غالب خدائے سخن ہے اور حالی اقلیم سخن کا ایک مطیع بندہ لیکن یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ حالی نے استاد سے کیا اور کیسے استفادہ کیا اور چراغ سے چراغ جلا کر کتنی روشنی اپنے کلام میں پیدا کی۔

غالب کی یہ نو(۹) شعر کی غزل مردف ہے اور اس کی ردیف ’’محمد ست(ﷺ)‘‘ ہے۔ اگر چہ اس نورانی ردیف سے مصرعے میں غضب کا اُجالا پیدا ہو گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس اجالے میں عمدہ مضامین کو ٹٹولنا اِس لیے ہر شاعر کے بس کی بات نہیں کہ اس روشنی سے عقل اور فکر کی آنکھیں مند ہو جاتی ہیں۔ اس غزل کا ایک حسن یہ بھی ہے کہ اس میں دس قافیے ہیں اور کسی قافیے کی تکرار نہیں اگر چہ قافیہ پیمائی ذوق کا پسندیدہ مشغلہ تھا اور غالب نے کبھی اس راستے کو نہیں اپنایا اور قافیے سے شعر نہیں بنایا بلکہ ان کے شعر میں قافیے نے خود اپنی جگہ بنائی جو ان کے کمالِ فن کی دلیل ہے۔ اس غزل میں آٹھ بار اللہ تعالیٰ کے ناموں میں پانچ بار حق اور ایک ایک بار کردگار، یزداں اور ذاتِ پاک استعمال ہوا جو مصرعوں اور مضمون کی رعایت سے رکھا گیا۔

شعر(۱)

حق جلوہ گرزِ طرزِ بیان محمد ست ﷺ　　　آری کلامِ حق بزبانِ محمد ست ﷺ

ترجمہ: ’’حق ظاہر ہوا حضرت محمد مصطفی ﷺ کے اندازِ بیان سے ہاں حق کا کلام محمد ﷺ کی زبانِ پاک سے جاری ہوا۔‘‘

تشریح و محاسن: ’’خدا کی معرفت اور دینِ اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ کی گفتگو سے ظاہر ہوئے اور بے شک قرآنِ کریم اور احادیثِ قدسی کو ہم نے حضرت محمد مصطفی ﷺ کی زبان پاک ہی سے سنا۔ مصرعہ اوّل میں ترکیب ’’طرزِ بیان‘‘ غالب کا منفرد ’’طرزِ بیان‘‘ ہے اور یہی پورے شعر کی جان بھی ہے۔ مسلمانوں سے ہٹ کر قریش کے کفار اور مکہ و مدینہ کے مشرکین بھی اس بات کے قائل تھے کہ حضور نبی کریم ﷺ سچے، امین اور صادق تھے۔ ان کی زبان مبارک سے کبھی غلط یا جھوٹا بیان ادا نہ ہوا۔ یہی حضرت محمد مصطفی ﷺ

کا طرزِ بیان تھا اور یہی حضرت محمد مصطفی ﷺ کے لہجہ کا اثر بھی تھا کہ جو شخص بھی انہیں سنتا تھا وہ دل سے ان کی صداقت کا قائل ہو جاتا۔ اسی لیے قرآن کریم اور احادیثِ قدسی کو جب لوگوں نے آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے سنا تو بلا کسی تامل اور شک کے فوراً قبول کیا اور ان کو من وعن محفوظ کیا۔ مختصر الفاظ میں اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے خدا کو، دینِ خدا کو اور کلامِ خدا کو حضرت محمد مصطفی ﷺ کے ذریعہ سے پہچانا۔ غالبؔ نے اس شعر میں سورۂ النجم کی آیت تین اور چار سے استفادہ کیا کہ

''اور نہ اپنی خواہش سے منہ سے بات نکالتے ہیں یہ تو حکم خدا کہتے ہیں جو بھیجا جاتا ہے۔''

اس شعر میں صنعتِ مراعات النظیر کی دو مثالیں ہیں یعنی بیان، زبان، اور کلام کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے جو ایک دوسرے سے مناسبت رکھتے ہیں۔ حق، کلامِ حق اور محمد ﷺ کو بھی ایک ہی جگہ نظم کیا گیا ہے۔ اس شعر میں صنعتِ تلمیح ہے جس میں حق سے مراد ہو الحق حقِ تعالیٰ اور کلامِ حق سے مراد قرآنِ مجید ہے۔ پورا شعر صنعتِ تعلیق میں ہے۔''

صنعتِ مسجع متوازی میں دونوں قافیے ''بیان اور زبان'' ہیں جو ہم وزن ہم عدد اور حروف روی میں برابر ہیں:

شعر (۲)

شانِ حق آشکار شانِ محمد ست ﷺ آئینہ دار پر توِ مہر ست ماہتاب

ترجمہ: ''جس طرح چاند سورج کی روشنی کا مظہر (آئینہ دار) ہے اُسی طرح خدا کی شان بھی حضرت محمد مصطفی ﷺ کی شان سے ظاہر

ہوتی ہے۔‘‘

تشریح ومحاسن: ’’جیسا ہم سب جانتے ہیں چاند کا اجالا سورج کی روشنی کی بدولت ہے یعنی رات کے وقت ہم جو روشن چاند کو دیکھتے ہیں اُس کی روشنی چھپے ہوئے سورج کی بدولت ہے جسے ہم نہیں دیکھ پاتے۔ چاند، سورج کی روشنی کا آئینہ ہے اسی طرح سے حضرت محمد مصطفی ﷺ خدا کی شان وشوکت کے مظہر ہیں۔ ہم نے حضرت محمد مصطفی ﷺ کی شان اور عظمت میں اللہ کی شان و شوکت کی جھلک دیکھی ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر یہ حضرت محمد مصطفی ﷺ کی شان اور منزلت ہے جس کی وجہ سے ہم اللہ تعالیٰ کی شان وشوکت کو محسوس کر سکے۔ اس شعر کی ادبی خوبی یہ ہے کہ اس میں خوب صورت تشبیہہ کی بنیاد پر پورا شعر تعمیر کیا گیا ہے۔ ذات اقدس کو سورج جس کی روشنی اور گرمی ذاتی ہے اور ذات ختمی مرتبت کو چاند جس کی روشنی اکتسابی ہے پیش کیا گیا ہے۔ اس شعر میں غالب نے کم از کم تین قرآنی آیات جو حضور نبی کریم ﷺ کی شان میں نازل ہوئے ہیں اس کی روشنی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس میں روشنی نور اور رسالت آپ ﷺ سے منسوب ہیں۔ سورہ الاحزاب آیت ۴۵ اور ۴۶ جس کا ترجمہ ہے:

’’اے نبی (ﷺ)! ہم نے آپ ﷺ کو گواہ بنا کر، خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا آپ ﷺ اللہ کے حکم سے اللہ کی طرف بلانے والے چمکتے چراغ ہو۔‘‘

سورہ المائدہ کی پندرھویں (۱۵) آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

’’بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور روشن کتاب آئی۔‘‘

سورہ النساء کی آیت (۱۷۴) میں ارشاد ہوتا ہے:

''اے لوگو! بے شک اللہ کی جانب سے تمہاری طرف روشن دلیل اور روشن نور آیا۔''

صنعت مراعات النظیر میں مہر (سورج) ماہتاب (چودھویں کا چاند) پرتوی (عکس) آئینہ شامل ہیں۔ صنعت لف ونشر مرتب بھی اس شعر میں موجود ہیں۔ مہر اور ماہتاب اوّل اور اسی ترتیب سے ہیں جس طرح سے اللہ تعالیٰ اور حضرت محمد مصطفی ﷺ مصرعہ ثانی میں ہیں۔ صنعتِ تکرار میں شان کی تکرار نے شعر کی غنائیت، روانی، شگفتگی کے علاوہ اس کے معیار کو بلند کر دیا ہے۔ یہ شعر بھی صنعتِ تعلیق میں ہے جس میں پہلے مصرعے کی محکم دلیل نے دوسرے مصرعہ کو معتبر بنا دیا یعنی حضرت محمد مصطفی ﷺ کی شان بھی بلند اور ارفع اس لیے ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ ہے۔ یہ شعر بھی نعتیہ مضمون کا عالی شعر ہے جو بہت سادہ ہوتے ہوئے بھی عمیق مطالب کا ترجمان ہے۔''

شعر (۳)

تیر قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق ست اما کشاد آن ز کمانِ محمد ست ﷺ

ترجمہ: ''تقدیر کا تیر بے شک حق تعالیٰ کے ترکش میں ہے لیکن وہ حضرت محمد مصطفی ﷺ کی کمان ہی سے چھوٹتا ہے۔''

تشریح و محاسن: ''بے شک کاتبِ تقدیر حق تعالیٰ ہی ہے لیکن تقدیر پر عمل حضرت محمد مصطفی ﷺ کے وسیلے سے ہوتا ہے۔ یعنی بگڑی ہوئی تقدیریں حضور نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک ہی سے بن جاتی ہیں۔ یعنی حضور نبی کریم ﷺ کی رضامندی حق تعالیٰ کی رضا مندی ہے۔ اس شعر میں بھی

غالب نے دو قرآنی آیات کے مطالب نظم کیے ہیں:

''جو لوگ آپ ﷺ کی بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔''

(سورۃ الفتح آیت:۱۰)

''جو خاک آپ ﷺ نے پھینکی وہ آپ ﷺ نے نہ پھینکی وہ اللہ نے پھینکی۔''

(سورۃ الانفال آیت:۱۷)

یہ شعر مطلب اور بیان کے لحاظ سے عمدہ ترین شعر ہے اور یہ سہل ممتنع میں شمار ہوسکتا ہے۔ تیرِ قضا، ترکشِ حق اور کمان محمد ﷺ عمدہ اور نادر ترکیبیں ہیں۔ یہ شعر بلاغت کے لحاظ سے کم ترین الفاظ میں کثیر معنی کا نقیب ہے۔ چناں چہ اس طرزِ بیان سے غالب کے مصرعہ کی تصدیق بھی ہوتی ہے۔

''کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور''

شعر(۴)

دانی اگر بہ معنیِ لولاک وارسی   خود ہر چہ حق ست ازانِ محمد ست ﷺ

ترجمہ: ''اگر تو لولاک کے معنی سمجھ لے تو تجھے معلوم ہوگا جو کچھ خدا کا ہے وہ سب حضرت محمد مصطفی ﷺ ہی کا ہے۔''

تشریح و محاسن: ''اگر تو حدیث قُدسی ''لولاک لما خلقت الافلاک'' کے معنی جان لے (اے محمد (مصطفی ﷺ)! اگر تم نہ ہوتے تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا) یعنی یہ کائنات کے باعثِ حضرت محمد مصطفی ﷺ ہیں۔ پھر تجھ کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا کی اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب حضرت محمد مصطفی ﷺ ہی

کے طفیل سے ہے۔ مصرعہ اوّل میں صنعتِ تلمیح اور تضمین ہے۔ لولاک سے مراد حدیث قدسی لولاک ہے اس میں صنعتِ تعلیق ہے یعنی حضور نبی کریم ﷺ کے صدقے میں کائنات بنی ہے تو یقینا جو کچھ کائنات میں ہے وہ سب حضرت محمد مصطفی ﷺ کی وجہ سے ہے۔ یہ شعر بھی نعت کے کلیدی موضوعاتی مضامین میں شامل ہے۔''

شعر(۵)

ہر کس قسم بہ آنچہ عزیز ست می خورد   سوگندِ گردگار بجانِ محمد ست ﷺ

ترجمہ: ''ہر کوئی اس کی قسم کھاتا ہے جو اسے پیارا ہوتا ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفی ﷺ کی جانِ پاک کی قسم کھائی ہے۔''

تشریح و محاسن: ''غالب نے ایک عقلی اور منطقی معروضہ اور تجربہ پیش کیا ہے ہر شخص اپنی بات معتبر ثابت کرنے کے لیے اپنی پسندیدہ چیز کی قسم کھاتا ہے اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے سب سے زیادہ محبوب بندے حضرت محمد مصطفی ﷺ کی جان کی قسم کھائی ہے۔ غالب کے اس شعر کا مرکزی نقطہ محبت اور حُب ہے جو نعت کے موضوعات کا بھی مرکزی نکتہ ہے۔ یہاں غالب سورۃ الحجر کی آیت (۷۲) کی طرف اشارہ کر رہے ہیں:

''آپ ﷺ کی جان کی قسم! بے شک یہ لوگ اپنے نشے میں بہک رہے ہیں۔''

اس شعر میں محاورہ ''قسم می خوردہ'' کے استعمال نے شعریت میں اضافہ کیا ہے یہ شعر صنعت تضمین میں بھی ہے۔''

شعر(۶)

واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گذار   کاین سخن ز سروِ روانِ محمدست ﷺ

ترجمہ: ''اے واعظ! طوبیٰ کے سایۂ کی بات چھوڑ دے کیوں کہ اب یہاں حضرت محمد مصطفی ﷺ کے سروِرواں کا ذکر ہو رہا ہے۔''

تشریح و محاسن: ''طوبیٰ جنت کا وہ بلند درخت ہے جس کے سایہ میں جنتی رہیں گے۔ غالب نے اس مضمون سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ اے واعظ! یہ طوبیٰ کی لن ترانی کو چھوڑ دے اب ہمیں طوبیٰ کے سایہ کی ضرورت اس لیے نہیں کہ اب ہمارے درمیان سروِ محمد مصطفی ﷺ بلند قامت وجود ہے جس کا سایہ رحمت طوبیٰ سے زیادہ آرام بخش ہے اب ہم رحمۃ للعالمین ﷺ کے سائے میں رہیں گے۔ یہاں یہ بھی ایہام ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس اور بلند مرتبت شخصیت کا سایہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ ہے۔ غالب نے اس شعر میں صنعتِ تلمیح یعنی سایہ طوبیٰ سے شعر میں رنگ بھرا ہے اس میں صنعت تقابل اور صنعت استتباع بھی موجود ہیں۔ طوبیٰ چوں کہ بلند ترین بہشتی درخت ہے اس کی نسبت سروِ قد حضور نبی کریم ﷺ سے دی گئی ہے جس میں صنعتِ رجوع ہے۔ ان صنعتوں کے علاوہ اس میں صنعتِ مبالغہ کا مزا بھی موجود ہے۔ اگرچہ غالب صنعت گر نہیں لیکن لاشعوری طور پر یہ صنعتیں ان کے کلام میں اس قدر زیادہ تعداد میں نظر آتی ہیں جس کی وجہ سے غالب کی زبان پر مہارت اور صنائع اور بدائع سے واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔''

شعر(۷)

بنگر دو نیمہ گشتن ماہِ تمام را کان نیمہ جنبشی زبنانِ محمدست ﷺ

ترجمہ: ''تو ذرا بدرِ کامل کو دو ٹکڑے ہوا دیکھ جو حضور نبی کریم ﷺ کی مبارک اُنگلی کے اِک معمولی اشارے کا نتیجہ ہے۔''

تشریح و محاسن: ''غالب نے معجزہ شق القمر کو بیان کرنے میں صناعی سے کام لیا ہے یعنی یہاں قدرتِ مصطفی ﷺ کا دکھانا مقصود ہے جن کی انگلی مبارک کی معمولی حرکت سے چاند کے دو ٹکڑے ہوئے تھے۔ غالب ایک عظیم شاعر ہے اور ان کا فن ہر لفظ کی مصرعہ میں نشست سے ظاہر ہے۔ مشہور ہے کہ بڑا شاعر ہر چھوٹے لفظ کو بھی بڑے اہتمام سے ایسے مخصوص مقام پر جڑ دیتا ہے جیسے جوہری نگینہ کو۔ اس شعر میں چاند کی نسبت سے لفظ ''بنگر'' (دیکھ) رکھا گیا ہے اس کے علاوہ اس شعر میں نادر اور اچھوتا قافیہ ''بنان'' بھی عظمتِ فن کی دلیل ہے۔ یہ شعر صنعتِ تلمیح میں ہے جہاں معجزہ شق القمر کا ذکر ہے۔ صنعتِ اشتقاق میں دو نیمہ اور نیمۂ جنبشی شامل ہیں۔''

شعر(۸)

خود ز نقش مہر نبوت سخن رود آن نیز نامور ز نشانِ محمدست ﷺ

ترجمہ: ''اگر مہر نبوت (جو حضور نبی کریم ﷺ کی پشت پر پیدائشی نشان تھا) کی بات ہو تو یہ جاننا چاہیے کہ وہ حضور نبی کریم ﷺ کی نسبت سے ارفع اور معتبر ہوئی۔''

تشریح و محاسن: ''مہر نبوت کا اعتبار اور اس کی وقعت حضور نبی کریم ﷺ کے جسمِ اقدس

کی نسبت سے ہی ہے۔ یہ شعر صنعت تلمیح میں ہے۔ اس شعر کی اصل خوب صورتی صنعت ایہام ہے یہاں مہر کے معنی وہ دفتری مہر بھی لی جا سکتی ہے جو منصب دار یا عہدہ دار استعمال کرتے ہیں چناں چہ منصب کی مہر یا نبوت کو حضور نبی کریم ﷺ کی ذات سے زینت ملی نہ کہ نبوت سے حضور نبی کریم ﷺ کو۔ یعنی انبیاؤں علیہم السلام میں حضور نبی کریم ﷺ سا عظیم المرتبت نبی پیدا نہ ہوا۔ اس شعر میں نقش، نشان، مہر، صنعتِ مراعات النظیر میں ہے۔''

شعر(۹)

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزدان گزاشتیم کان ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدست ﷺ

ترجمہ: ''غالبؔ نے حضرت محمد مصطفی ﷺ کی ثنا کو حق تعالیٰ پر چھوڑ دیا اس لیے کہ وہی حضرت محمد مصطفی ﷺ کے مقام اور مرتبہ سے واقف ہے۔''

تشریح ومحاسن: ''یہ غالب کے معروف مقطعوں میں شمار ہوتا ہے اس شعر میں شاعر کے عجز وانکسار کے ساتھ حضور نبی کریم ﷺ کی بلند قامت کا ذکر بھی ہے جس کا احاطہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ بہ قول جامیؔ:

لا یمکن الثنا کما کان حقّہ بعد از خدا بزرگ توئی قصّہ مختصر

حالی نے استاد غالب کی اس نعتیہ غزل کے دوسرے اور ساتویں شعر کے سوا تمام اشعار پر تضمین کیا ہے۔ صنعتوں میں کامیاب تضمین اُسے کہتے ہیں جس میں مضمون تازہ شعر میں ایسا جڑ جائے کہ کوئی فرق محسوس نہ کر سکے اور اگر پڑھنے والے کو تضمینی شعر سے واقفیت ہو تو معانی آفرینی ایسی ہو کہ شعر کی قدر و قیمت اور منزلت بڑھ جائے۔

اساتذہ کی زمینوں اور ان کے اشعار پر تضمین کرنا بڑے جگر گردے کی بات ہے۔ ہمارے مطالعے میں بہت سے بودے شعرا نے تضمین کر کے ٹاٹ میں مخمل کے پیوند لگانے کی کوشش کی ہے۔ حالی اس خوب صورت کاوش سے سرخ رو ہو کر نکلے۔ استاد کے مصرعوں نے حالی کی عمارت کے بلند میناروں پر طلائی کلس کا کام کیا اور مضمون نور علیٰ نور ہو گیا۔ ہم یہاں حالی کی نعت لکھ کر اس کا ترجمہ اور تجزیہ پیش کریں گے۔

تخمیس غزل نعتیہ جناب مرزا غالب مرحوم کہ در حیات ایشاں نوشتہ شدہ بود

اعجاز از خواصِ لسانِ محمد ﷺ است — عین الحیٰوۃ گم بہ دہانِ محمد ﷺ است
گر نور و گر ہدیٰ کہ ازانِ محمد ﷺ است — حق جلوہ گر زِ طرزِ بیان محمد ﷺ است
آرے کلامِ حق بزبانِ محمد ﷺ است

اے خامہ وصفِ قامت معشوق کم نگار — اے دل سخن ز راست قداں درمیاں میار
قمری ز ذکرِ سرو نفس را نگاہ دار — واعظ حدیث سایۂ طوبیٰ فرو گذار
کایں جا سخن ز سروِ روانِ محمد ﷺ است

شاہد بہ قتل عاشق و عاشق بہ خال و خد — مجنوں بہ پاے لیلیٰ و لیلیٰ بہ فرقِ خود
مومن بہ آلِ احمد ﷺ و آلش بروحِ جد — ہر کس قسم بدآنچہ عزیز ست می خورد
سوگندِ کردگار بجانِ محمد ﷺ است

آں جا کہ از مناقب عترت سخن رود — وز آل و از صحابہؓ امت سخن رود
واں کایں ہمہ زختمِ رسالت سخن رود — خود ز نقش مہر نبوت سخن رود
آں نیز نامور ز نشانِ محمد ﷺ است

بینی اگر بدیدۂ دراک وارسی — گوئی اگر بہ عالمِ ادراک وارسی

سنجی اگر بہ مرتبۂ خاک وارسی — دانی اگر بہ معنیِ لولاک وارسی
خود ہر چہ حق ست ازانِ محمد ﷺ است

لطفِ خداست گر بہ سرِ کس نہاد دست — قہرِ خداست چوں ز سرِ کیں بجملہ جست
داند کسے کہ شد ز مئے ''مارمیت'' مست — تیر قضا ہر آئنہ در ترکشِ حق ست
اما کشاد آن ز کمانِ محمد ﷺ است

ہمت بہ مدحِ شہ من و حالی گماشتیم — گفتیم و از نگاشتی ہا نگاشتیم
چوں کام و لب فراخورِ وصفش نہ داشتیم — غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد ﷺ است

ترجمہ بنداوّل

''معجز بیانی حضور نبی کریم ﷺ کی زبانِ پاک کی خاصیت ہے۔ آبِ حیات حضور نبی کریم ﷺ کے لعبِ دہان کا نام ہے کیوں کہ روشنی اور ہدایت حضور نبی کریم ﷺ کے وجود سے ہے اس لیے حق ظاہر ہوا حضرت محمد مصطفی ﷺ کے بیان سے بے شک حق کا کلام حضور نبی کریم ﷺ کی زبان سے جاری ہوا۔''

ترجمہ بند دوم

''اے قلم! معشوق کے پیکر کی تعریف میں مبالغہ نہ کر، اے دل! بلند قدوں کی یہاں بات چیت نہ کر، اے قمری سرو کی مدح سرائی سے منہ بند کر لے، اے واعظ! طوبیٰ کے سایہ کی بات چھوڑ دے کیوں کہ اب یہاں حضرت محمد مصطفی ﷺ کے سروِ رواں کا ذکر ہو رہا ہے۔''

ترجمہ بند سوم

''معشوق عاشق کے قتل کی اور عاشق معشوق کی صورت اور خال کی، مجنوں لیلیٰ کے پاؤں اور لیلیٰ اپنے سر کی، مومن آل نبی ﷺ کے اور آل نبی ﷺ اپنے جد اقدس ﷺ کی عظمت اور محبت کی قسم کھاتے ہیں اسی لیے اللہ نے بھی حضرت محمد مصطفی ﷺ کی جان کی قسم کھائی ہے۔''

ترجمہ بند چہارم

''جہاں خاندانِ رسول ﷺ کے فضائل کی بات چھڑی ہے جس مقام پر آل نبی ﷺ اور اصحابِ رسول ﷺ کی گفتگو ہوئی ہے جہاں ختم رسالت ﷺ کا چرچا ہے اور نقش مہر نبوت کا ذکر ہے سب کی فضیلت اور اہمیت حضور نبی کریم ﷺ کی نسبت سے ارفع اور معتبر ہوئی۔''

ترجمہ بند پنجم

''اگر تو عمیق نظر سے سمجھنے کی کوشش کرے گا تو معلوم ہو گا کوئی کہے اگر کہ وہ عالم محسوسات یعنی کہکشاں کو سمجھتا ہے تو معلوم ہو گا اگر کوئی اس خاک دان سے واقفیت رکھتا ہے تو معلوم ہوگا اور اگر لولاک کے معنی سمجھ لے تو تجھے معلوم ہو گا جو کچھ خدا کا ہے وہ سب حضرت محمد مصطفی ﷺ ہی کا ہے۔''

ترجمہ بند ششم

''اللہ کا لطف و فضل ہوتا ہے جب کسی کے سر پر ہاتھ رکھ دے۔ اللہ کا قہر

شامل ہو جاتا ہے جب کوئی درشت بات نکل جائے وہ جانتے ہیں جو شراب مارمیت کے نشے سے مست ہیں کہ تقدیر کا تیر بے شک اللہ کے ترکش میں ہے لیکن وہ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی کمان ہی سے چھوٹتا ہے۔"

ترجمہ بند ہفتم

"حضور نبی کریم ﷺ کی مدح کرنے میں (غالبؔ) اور حالیؔ نے ہمت باندھی ہے۔ ہم نے کہا اور جو کچھ بھی ہم سے لکھا گیا ہم نے لکھا۔ لیکن ہمارے زبان اور لب حضور نبی کریم ﷺ کی ثنا کے لائق نہ تھے اس لیے غالب نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ثنا کو حق تعالیٰ پر چھوڑ دیا بے شک وہی حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مقام اور مرتبہ سے واقف ہے۔"

قصیدۂ نعتیہ میں حالؔی کی تعلّی

حالی کا ایک نعتیہ قصیدہ جس کا مطلع ہے۔

میں بھی ہوں حسن طبع پر مغرور مجھ سے اٹھیں گے ان کے ناز ضرور

چار وجوہات کی بنا پر انفرادیت اور اہمیت کا حامل ہے۔ اولاً یہ قصیدہ حالی کی قدیم شاعری کا نمونہ ہے جس کی تاریخ تصنیف ۱۲۸۸ ہجری مطابق ۱۸۷۰ء ہے۔ دوم اس قصیدہ میں (۴۱) اشعار پر مشتمل تمہید ہے جو حالی کی تعلّی سے رنگین ہے۔ حالی نے کسی اور مقام پر اس طرح کی خود ثنائی نہیں کی سوم اس تمہید کی توضیح خود حالی نے اپنے دیوان مطبوعہ ۱۸۹۳ء میں کی ہے جو ان کے مزاج کی تبدیلی اور عجز وانکساری سے بھری ہوئی ہے۔ چہارم صرف کمتر از تیس (۳۰) فی صد اشعار نعت کے ہیں وہ بھی قدیم وضع کی نعت جس میں فضائل شمائل خصائل کے ساتھ شاعر کی معاصیت اور طلب بخشش اور رحمت کا ذکر ہے۔

یہاں ہم مضمون کے حوالے سے صرف نعتیہ اشعار پر اکتفا کریں گے۔

حضور نبی کریم ﷺ کی نعت نگاری پر عرفؔی شیرازی نے بھی فخر کیا تھا جس کا رنگ اور آہنگ منفرد تھا۔ حالی نے اس نعت کی تمہید سے مدح شاہ کونین ﷺ کو ربط

دینے کے لیے جو گریز کیا ہے اس میں بھی فخریہ تعلّی کی جھلک ہے جو نعت گو کا اعزاز ہے۔

گر لکھوں نعت سرور ﷺ جمہور　　لوں ملائک سے داد حسن کلام

اس کے بعد حضور نبی کریم ﷺ کے اخلاق کریمانہ، گفتار شریفانہ، رفتار عزیزانہ کے ساتھ آپ ﷺ کی رحمت، محبت، شفقت اور شفاعت کا ذکر ملتا ہے۔

دوست بھی شاد غیر بھی مسرور　　لب شیریں کلام سے اس کے

موج زن ہو وہاں سے چشمۂ نور　　ہو جہاں لطف سے وہ سایہ فگن

نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور　　ہو سکے اس کی خوبیوں کا شمار

پھر شاعر اپنے نفس امّارہ غفلتِ غرق دنیا سے شرم سار ہو کر حضور نبی کریم ﷺ ختمی مرتبت میں عرض کرتا ہے:

نشۂ کبر میں ہوں بالکل چور　　بحر غفلت میں ہوں سراسر غرق

بخل و حرص و ہوا و فسق و فجور　　حسد و بغض و غیبت و بہتاں

جیسے زنگی کا نام ہو کافور　　فی المثل ہے مری مسلمانی

نام تیرا شفیع روز نشور　　میں ترے در پہ سن کے آیا ہوں

اور یہ نعت دعائیہ اشعار پر تمام ہوتی ہے۔

ہے بہت تنگ حالی مہجور　　دوری آستان والا سے

جب کروں بحر زندگی سے عبور　　جا لگے تیرے در پہ کشتی عمر

مرتے دم لب پہ ہو ترا مذکور　　جیتے جی دل میں یاد ہو تیری

حاؔلی کے نعتیہ قصائد کا منفرد رنگ

حالی کی قصیدہ نگاری درحقیقت نعتیہ قصیدوں میں کھلتی ہے۔ نعتیہ قصائد نہ صرف کلاسک قصیدے ہیں بلکہ اس میں دلی تاثیرات اور داخلی سوز وگداز کو محسوس بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں حالی کے دو نعتیہ قصیدے اور ایک نعتیہ نظم عرض حال کے اقتباسات پیش کریں گے ہم نے نعتیہ خمسہ جو ۱۸۵۶ء کی تصنیف ہے اور جو ''خستہ'' تخلص نامی شاعر کی نعت ہے حالی کے کلام میں شامل نہیں کی۔ حالی نے جو ضمیمہ مسدس میں عرض حال لکھی ہے وہ حالی کی مشہور ترین نعت ہے۔

حاؔلی کی تینوں نعتیہ نظموں کا رنگ الگ الگ ہے۔ پہلا قصیدہ نعتیہ جو ۱۲۸۱ ہجری مطابق ۱۸۶۴ء کی تخلیق ہے جس میں (۳۳) اشعار ہیں۔ یہاں مدحت سرکار دوعالم ﷺ تشبیہات، استعارات، تلمیحات، اصطلاحات سے مزین ہے۔ یہ اُس دور کی نعت ہے جب حالی بھی روایتی اور کلاسیک شاعری سے متاثر تھے۔

ہم یہاں نسبتاً تفصیل سے کام لے رہے ہیں کیوں کہ اس قسم کا نمونہ کلام حالی کے پاس خال خال ہے۔ مطلع ہی میں حالی نے اپنے وجود کو اور اپنی تخلیق کو مدحت نبی ﷺ کے لیے مختص بتایا ہے۔

بنے ہیں مدحت سلطان دو جہاں ﷺ کے لیے
سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

استعاروں میں جدت اور خوب صورتی دیکھیے:

وہ چاند جس سے ہوئی ظلمت جہاں معدوم — رہا نہ تفرقہ روز و شب زماں کے لیے
وہ پھول جس سے ہوئی سعیٔ باغباں مشکور — رہی نہ آمد و رفتِ چمن خزاں کے لیے
ہلال مکہ کا ماہِ دو ہفتہ یثرب کا — فروغ قوم کے اور شمع دودماں کے لیے

حالی کی پہلی نعت میں جوش بیان اور شعری آمد میں غضب کا حُسن ہے۔ عربی اور فارسی الفاظ کے ہوتے ہوئے بھی ابلاغ میں دشواری نہیں۔ دو شعروں میں قرآن، جبریل، کعبہ انس و جاں طواف و سجود اور آستاں کی نقش بندی دیکھیے:

گھر اس کا مورد قرآن و مہبط جبریل — در اس کا کعبہ مقصود انس و جاں کے لیے
سپہر گرم طواف اس کی بارگاہ کے گرد — زمین سر بسجود اس کے آستاں کے لیے

اس نعت میں اخلاق نبی ﷺ شفاعت نبوی ﷺ معراج اور ولایت نبی ﷺ کے خوبصورت مصرعے پڑھیے جو نعت کے اصلی نکات ہیں:

گہ افتخار مقابل میں اہل نخوت کے — گہ انکسار مدارات مہماں کے لیے
صفات قلب حسودانِ کینہ خواہ کے ساتھ — دعاے خیر بد اندیش و بدگماں کے لیے
شفیع خلق سراسر خدا کی رحمت ہے — بشارت امت عاصی و ناتواں کے لیے
شفاعت نبوی ﷺ ہے وہ برق عصیاں سوز — کہ کلمہ خس ہے جہاں کفر دو جہاں کے لیے
نہ حرف وصوت میں وسعت نہ کام ولب میں سکت — حقیقتِ شب معراج کے بیاں کے لیے
خدا کی ذات کریم اور نبی ﷺ کا خلق عظیم — محک ہے حُبِّ نبی ﷺ دل کے امتحاں کے لیے

عربی ادق الفاظ اور تراکیب کو مصرعوں میں ایسا کھپا دیتے ہیں کہ وہ بھی رواں دواں ہو جاتے ہیں۔

کہیں مقدمۃ الجیش انبیا و رسل علیہم السلام کہیں وہ خاتمہ الباب داستاں کے لیے
مدینہ مرجع و ماوائے اہل مکہ ہوا مکیں سے رتبہ یہ حاصل ہوا مکاں کے لیے
عبور لجہ عصیاں سے کس طرح ہو اگر وہ ناخدا نہ ہو اس بحرِ بے کراں کے لیے

حالی کی نعت میں مدحت سرای کا عجز ہے جس طرح عرفی غالب اور دیگر شعرا نے کیا ہے اور آخر میں حالی کی تمنا بھی درج ہے۔

حریف نعت پیہم نہیں سخن حالی کہاں سے لائیے اعجاز اس بیاں کے لیے

غالب نے نجف میں دفن ہونے کی آرزو ظاہر کی تھی شاگرد غالب حالی نے جنت البقیع مدینہ کو جنت فردوس پر ترجیح دی ہے۔

اگر نصیب ہو یثرب میں جا کے شربت مرگ پیوں نہ آب بقا عمر جاوداں کے لیے
اگر بقیع میں گز بھر زمیں میسر آئے کروں نہ طولِ امل روضۂ جناں کے لیے

حالی نے دوسرا نعتیہ قصیدہ ۱۸۷۱ء میں لکھا جو کئی لحاظ سے ممتاز ہے۔ یہ حالی کا طویل ترین نعتیہ قصیدہ ہے جس میں (۷۵) پچھتر شعر ہیں۔ اس میں ایک لمبی (۳۴) اشعار کی تشبیب ہے جس میں حالی نے اپنے فن پر ناز کیا ہے اور حالی کے تمام تر کلام میں کہیں ایسی تعلّی نہیں ملے گی۔ حالی نے اس قصیدہ پر ایک نوٹ لکھا ہے جو حالی کے روایتی دور کا ذہنی بخار دکھا رہا ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

> ''اس قصیدے کی تمہید ۱۲۸۷ہجری یا ۱۲۸۸ہجری (مطابق ۱۸۷۰۔۷۱ء) کے ہذیانات میں سے ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مومن، ذوق، آزردہ، غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے۔ انہی دنوں میں سیتارام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا۔ مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوے

سے لکھی گئیں۔ جن لوگوں کی جا و بے جا تحسین و آفریں سے دماغ میں خلل آ گیا تھا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اصرار کے مشاعرے میں نہ آئے۔ بسوا اپنے خریدار کی بے التفاتی سے شاید ایسی کھسیانی نہیں ہوتی جیسا کہ شاعر ان لوگوں کے التفاتی سے جن کو وہ سچ مچ اپنے شعر کا قدرداں سمجھتا ہے۔ اسی خام خیالی کے جوش میں اس قصیدے کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اگر یہ لوگ ہماری قدر نہیں کرتے تو آپ ہی اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں کیوں کہ اس زمانے کے خیالات کے موافق اس بات کا یقین تھا کہ جس طرح آج کل تجارت کی گرم بازاری اشتہارات کے ذریعے سے ہوتی ہے اسی طرح شاعری بھی منوانے سے مانی جاتی ہے۔ لیکن جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھ گیا تو دفعتاً اپنی غلطی پر تنبہ ہوا لہٰذا قصیدے کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا تا کہ فخر کے لیے ایک وجہ پیدا ہو جائے۔''

اس نعت میں حالی اپنی شاعری پر فخر کرتے ہیں اور انہیں شکایت ہے کہ زمانہ ان کے مقام سے ناواقف ہے کیوں کہ شعر شناسوں سے محفل خالی ہو چکی ہے۔ نعت کی تمہید کے کچھ مصرعوں اور شعروں کو جوڑ کر بغیر کسی تشریح کے ہم بات کو آگے بڑھاتے ہیں۔

میں بھی ہوں حسن طبع پر مغرور   خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ
خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے   میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور
دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت   مجھ کو پروا نہیں کہ ہوں مشہور

جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں — اس سے شکوہ نہیں کہ ہے معذور
لذت مے سے جو نہ ہو آگاہ — اس کو کیا قدر خوشۂ انگور
کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز — انوری ہے نہ عرفی و شاپور
کون دیکھے مرے چمن کی بہار — مر گیا عندلیب نیشاپور

ایک طویل تمہید کے بعد فوراً گریز کرتے ہیں۔

لوں ملائک سے داد حسن کلام — گر لکھوں نعت سرور ﷺ جمہور

پھر حضور نبی کریم ﷺ کی مدحت سرائی کی ہے جس میں آپ ﷺ کا خلق عظیم، آپ ﷺ کا کرم، رحم، حشم اور فہم پر عمدہ مصرعے لکھے ہیں۔ حالی نے پھر اپنی ذات کو حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حقیر و ذلیل گناہ گار اور خود غرض بتا کر حضور نبی کریم ﷺ سے شفاعت اور رحمت کی درخواست کی ہے۔ اس نعت میں تمہید اور حسن طلب نے خوب صورت رنگ پیدا کر دیا ہے۔

طبع غالب ہے اور میں مغلوب — نفس قاہر ہے اور میں مقہور
مہر فرزند و خواہش زر و سیم — طمع جاہ و فکر عیش و سرور
نفس امارہ اور دیو مرید — یہ ہے افعی تو وہ ہے کلب عقور
مجھ سے جو کام چاہیے لیجیے — جھوٹ ہو یا فریب ہو یا زور
فی المثل ہے مری مسلمانی — جیسے زنگی کا نام ہو کافور

اور دُعائیہ اشعار پر نعت کو ختم کرتے ہیں:

جا لگے تیرے در پہ کشتیِ عمر — جب کروں بحر زندگی سے عبور
دوریٔ آستان والا سے — ہے بہت تنگ حالی مہجور

اس مقام پر خارج از محل نہیں اگر ہم حالی کی عرض حال کے بارے میں مختصر کچھ تحریر کریں۔ حالی نے ۱۸۸۸ء میں اس تریسٹھ اشعار کا قصیدہ لکھا جو شاید اشعار کی

تعداد کے لحاظ سے حضور سرورِ کائنات ﷺ کی طبعی عمر کے عدد سے مساوی ہو۔ اس قصیدہ کی زبان عام فہم اور یہ سب کے لیے لکھی گئی ہے۔ جو نعت کے ساتھ مناجات اور دعا میں کی ہے۔ حالی نے جو مسائل مسدس کے بندوں میں لکھے اُس کی تلخیص اس نعت میں کی ہے۔ نعت کی تمہید یا تشبیب میں مسلمانوں کا عروج اور پھر عصر حاضر میں ان کا زوال دکھایا گیا ہے جس کا ذمہ دار خود موجودہ نسل کو بتایا گیا ہے کہ وہ سب کچھ کھو کر خواب غفلت میں سو رہے ہیں۔ یہ نعتیہ قصیدہ مطلع کے اس مصرعہ

اے خاصۂ خاصانِ رسل ﷺ وقت مدد ہے

سے شروع ہو کر فارسی مصرعہ

یاں جنبش لب خارج از آہنگ خطا است

پر ختم ہوتا ہے۔

اس نعت کے اشعار کی خوب صورتی یہ ہے کہ مصرعہ اولیٰ میں مسلمانوں کا عروج بلندی اقبال اور چڑھاؤ بتا کر مصرعہ ثانی میں ان کا زوال پستی بدبختی اور اتار دکھایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار یہ ہیں:

جس دین کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ — خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے

وہ دین ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں — اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے — اس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے

جو دین کے ہمدرد بنی نوع بشر تھا — اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے

تمہید کے اٹھارہ انیس اشعار کے بعد گریز کرتے ہیں۔

گو قوم میں تیری نہیں اب کوئی بڑائی — پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے

لیکن پھر حالی قوم کا مرثیہ جاری رکھتے ہیں۔ امتوں نے حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ ظلم و ستم کیے لیکن حضور نبی کریم ﷺ نے ان کا جواب رحم و کرم سے دیا

جنہوں نے بُرائی کی ان کی بھلائی کی، ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے حضور نبی کریم ﷺ سے فریاد کرتے ہیں:

ذوالّلسانی شعر دیکھیے:

اے چشمۂ رحمت بابی انت و امی ... دنیا پہ تیرا لطف سدا عام رہا ہے
جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا ... جب تو نے کیا نیک سلوک ان سے کیا ہے
صدمہ در دنداں کو ترے جن سے کہ پہنچا ... کی اُن کے لیے تو نے بھلائی کی دُعا ہے
کی تو نے خطا عفو ہے اُن کینہ کشوں کی ... کھانے میں جنہوں نے کہ تجھے زہر دیا ہے
جو بے ادبی کرتے تھے اشعار میں تیری ... منقول انہی سے تری پھر مدح و ثنا ہے

ان تمام شعروں میں حالی نے تاریخ حضور رسالت مآب ﷺ اور سیرت کے واقعات نظم کیے ہیں۔ پھر حضور نبی کریم ﷺ سے التماس کرتے ہیں کہ انہیں ہدایت اور توفیق دے اور اسی امت کو غرق ہونے سے بچائے۔

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے ... نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے
کر حق سے دُعا امت مرحوم کے حق میں ... خطروں میں بہت جس کا جہاز آ کے گھرا ہے
ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے ... وہ تیری محبت تری عترت کی ولا ہے
جو خاک ترے در پہ ہے جاروب سے اڑتی ... وہ خاک ہمارے لیے داروے شفا ہے

کیا حالؔی کا تخلص خستہ تھا؟ تحقیقی گفتگو

یہاں یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ کیا حالی نے پہلے اپنا تخلص ''خستہ'' رکھا تھا۔ حالی کی خودنوشت، حالی کی تحریروں یا معاصر تصانیف سے کہیں بھی یہ ثبوت فراہم نہیں ہوتا کہ حالی نے کبھی ''خستہ'' تخلص اختیار کیا ہو۔

حالی کے انتقال کے آٹھ سال بعد جب شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے جواہرات حالی تدوین کی اس میں ایک تضمین شدہ مخمس نعت کو حالی کے نام سے شائع کیا جس میں شاعر کا تخلص ''خستہ'' تھا۔ اس نظم کے تعارف میں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی جواہرات حالی صفحہ ۸۹ پر لکھتے ہیں:

> ''قدسی کی مشہور و معروف نعتیہ غزل پر سیکڑوں اشخاص نے تضمین کہی ہیں۔ اس قسم کی بہت سی تظمین قاضی محمد عمر صاحب، ساکن ضلع مظفرنگر نے جمع کیں اور ۱۲۷۲ ہجری میں حدیث قدسی کے نام انہیں شائع کیا۔ اس میں مولانا کے نام سے مندرجہ ذیل نظم کتاب کے صفحہ ۲۳ پر لکھی ہوئی ہے۔ لیکن آخر میں تخلص بجائے حالی کے ''خستہ'' ہے۔ اب نہ معلوم اس وقت مولانا کا تخلص ہی عام طور پر

خستہ تھا یا اس خاص نظم میں مولانا نے اپنا یہ تخلص رکھا تھا۔ بہر حال
یہ یقین ہے کہ یہ نظم مولانا ہی کی ہے، کسی اور کی نہیں۔۔۔''

یہاں تعجب اس بات پر ہے کہ جب ''خستہ'' تخلص یقین کے ساتھ حالی کا نہیں کہا جا سکتا تو پھر یہ نعت یقین کے ساتھ کس طرح حالی کی ہوسکتی ہے۔ اس مشکوک تحریر کو یقین میں بدل کر تقریباً ہر مصنف اور مولف نے اپنی اپنی تصنیف اور تالیف میں حالی کا ابتدائی تخلص ''خستہ'' لکھا۔ چناں چہ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، حالی بحیثیت شاعر میں، ڈاکٹر غلام مصطفی خان حالی کا ذہنی ارتقا میں، صالحہ عابد حسین نے یادگار حالی میں مالک رام نے حالی میں لکھا کہ حالی پہلے خستہ تخلص کرتے تھے اور بعد میں شیفتہ نے اس کو حالی میں تبدیل کر دیا۔ ذیل کے حقائق اور مستند حوالے مزید اس مسئلہ کو واضح کرتے ہیں۔

الف: قاضی محمد عمر نے حدیث قدسی کو ۱۸۵۵ء۔۱۸۵۶ء کے درمیان شائع کیا جب حالی کی عمر سترہ اٹھارہ برس تھی۔ حالی ۱۸۵۴ء۔ ۱۸۵۵ء کے زمانے میں ڈیڑھ سال تک جامع مسجد کے قریب مدرسے میں تعلیم حاصل کر رہے اور وہ بقول ان کے فرزند سجاد حسین فاقوں میں گزر بسر کر کے کبھی کبھار سر کے نیچے اینٹ کا تکیہ بنا کر سو جاتے تھے۔ حالی نے اس زمانے میں دلی کالج اور دلی کی ادبی شعری محافل کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

ب: حالی خود اپنی کہانی میں لکھتے ہیں اُس زمانے میں ایک آدھ غزل مشکل سے لکھی تھی۔

ج: حالی نے اپنی پہلی نعت جو اس نعت کے دس سال بعد بھی ''بنے ہیں مدحت سلطان دو جہاں کے لیے'' اس کے حاشیے میں لکھا۔ اس سے پہلے نعت میں کبھی کچھ لکھا نہ گیا۔

ط۔ حالی کا ابتدائی کلام ۱۸۶۳ء سے ملتا ہے جو اس نعت کے آٹھ نو سال بعد کا

ہے۔سوال یہ ہے کہ اس طویل مدت میں حالی جیسا پُرگو شاعر ایک آدھ غزل کہے اور وہ بھی ان کے کلام میں موجود نہ ہو۔

ی۔ کلیات نظم حالی کے مرتب ڈاکٹر افتخار صدیقی بھی یہ مانتے ہوئے کہ خستہ حالی کا تخلص نہیں تھا نعت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس تضمین کو حالی سے منسوب کرنے کا بہ ظاہر کوئی جواز نہیں لیکن چوں کہ اس کے خلاف بھی کوئی حتمی دلیل نہیں ملتی اس لیے احتیاط کا تقاضا ہے کہ اِسے کلیات میں شامل کیا جائے۔''

راقم نے کوئی حتمی دلیل حالی سے اس نعت کے انتساب کی نہیں پائی اس لیے اسے جزو کلیات حالی نہیں کیا۔مزید ہم یہ بھی صحیح نہیں سمجھتے کہ حالی کا کبھی تخلص خستہ بھی تھا۔اس سے حالی کے کلام اور مقام میں کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ حق حق دار تک پہنچتا ہے۔

ک: نہ جانے کس تحقیقی مدرک کی بنا پر مالک رام نے لکھا کہ شیفتہ نے الطاف حسین کا تخلص ''خستہ'' سے حالی کیا۔ہمیں کوئی ایسی تحریر نہ مل سکی۔

ل: شہزاد انجم نے مالک رام کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے یہ بتایا کہ یہ کام غالب کی وجہ سے ہوا۔لیکن کوئی حوالہ یا سند پیش نہیں کی۔

سچ بات تو یہ ہے کہ جو افراد تحقیقی مسائل موارد اور طریقہ کار سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے وہ اگر ایک سوراخ دار لوہے کا ٹکڑا کسی دشت و بیاباں میں دیکھ لیتے ہیں تو اُسے نال کا ٹکڑا ثابت کر کے نہ صرف گھوڑے کی شناخت اور سوار کے حالات لکھ دیتے ہیں بلکہ نقشہ جنگ بھی کھینچ دیتے ہیں۔اُردو تحقیق میں ایسے سورما قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔جن کا نعرہ

''مستند ہے مرا فرمایا ہوا''

ہے اسماعیل پانی پتی نے حالی کے انتقال کے بعد بغیر تحقیق و کاوش کے یہ داستاں سرائی کی، حالی کے خاندان کے فرد نے اسے واقعہ نگار سے معتبر کیا پھر اہل محفل نے صدقنا کا ورد کیا۔

ا۔ خمسۂ نعتیہ

(۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء)

مرحبا زیب دہ مسند عالی نسبی
مرحبا سرور دیں ہاشمی و مطلبی
مرحبا صاحب اورنگ شفاعت طلبی
''مرحبا سید مکی مدنی العربی
دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی''

یونس و یوسف و یعقوب و مسیح و موسیٰ علیہم السلام
حق تو یہ ہے کہ تو ے مثل ہے چوں ذات خدا
سب ترے مائدۂ فیض سے ہیں زلہ ربا
''نسبتے نیست بہ ذات تو بنی آدم را
برتر از عالم و آدم تو چہ عالی نسبی''

ہو گیا بے خود و بے تاب و تواں اور بے دم
کہا نقاش نے کی جب تری تصویر رقم
اک نظر جس نے ترے نور کا دیکھا عالم
''من بیدل بہ جمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بوالعجبی''

آپ وہ نور مجسم ہیں شہنشاہِ امم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نکلے بے ساختہ حضرت کی زباں سے پیہم
دیکھے خواب میں گر حسن کا اپنے عالم
''من بیدل بہ جمال تو عجب حیرانم
اللہ اللہ چہ جمالست بدیں بوالعجبی''

ایک تو یہ کہ فصاحت ہے عرب کی مشہور
تیسرے یہ کہ بہ فرمان خداوند غفور
دوسرے دینی تھی زک اہل زباں کو منظور
''ذات پاک تو دریں ملک عرب کرد ظہور
زاں سبب آمدہ قرآں بہ زبان عربیؑ''

اے شہنشاہِ امم، اے شہ فرخندہ مقام ﷺ
نہیں اعجاز سے خالی ترا جو کچھ ہے کام

فخر دیں، فخر رسل، فخر جہاں، فخر انام ﷺ
"نخل بستان مدینہ ز تو سرسبز مدام
زاں شدہ شہرہ بہ آفاق بہ شیریں رطبی"

خستہ خاموش کہ مشکل ہے بہت وصف نبی ﷺ
پڑھ زباں سے زرہ صدق یہ شعر قدسی

ہاتھ اٹھا سوے مدینہ دم حاجت طلبی
"سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی ﷺ
آمدہ سوے تو قدسی پے درماں طلبی"

حالؔی کے کلیات فارسی کا مطالعہ

جدول

کلیات	تعداد	تعداد شعر
غزلیات	۲۰	۱۶۲ شعر
رباعیات	۲۰	۴۰ شعر
قصائد	۴	۱۴۹ شعر
مراثی	۲	۹۶ شعر
قطعات	۳۳	۲۲۶ شعر
مخمس	۱	۱۴ شعر

ضمیمہ کے کل فارسی اشعار: ۶۸۷

ضمیمہ کلیات حالی: تدوین = ۱۹۱۲ء

اشاعت = اگست ۱۹۱۴ء مطبع تحفہ ہند پریس دہلی

صفحات = ۱۵۶

متن = عربی اور فارسی میں جو نثر اور نظم کا متفرق کلام تھا اُس کو

جمع کر کے کتابی شکل دی گئی۔ اس میں بیشتر کلام ۱۳۲۰ ہجری تک کا ہے آخری فارسی نظم مرثیہ سرسید ہے جو ۱۸۹۸ء میں تصنیف ہوئی۔ کتاب میں ۱۲۰ صفحات فارسی اور ۳۶ صفحات عربی کے ہیں۔ اسے تین ضمیموں اُردو فارسی اور عربی میں تقسیم کیا گیا ہے۔ فارسی حصے میں مراثی جدید و قدیم نثری تراجم اور خطوط شامل ہیں۔ عربی حصے میں قصائد، قطعات تقریظ، مکتوبات اور سرسید کی شخصیت اور فن پر مقالہ بھی موجود ہے۔

حالی جس وقت اپنے عربی فارسی کلام کو جمع کر کے شائع کر رہے تھے اُس وقت برصغیر میں ان دونوں زبانوں کا رواج اور اثر کم ہو چکا تھا اسی وجہ سے حالی نے بھی اس طرف پہلے خاص توجہ نہ دی لیکن بعد میں دوستوں اور رشتہ داروں کے اصرار پر ڈاکٹر لیاقت حسین کے گھر واقع فریدآباد میں چار مہینے رہ کر تدوین و ترتیب دیا۔ عربی کی نسبت حالی کی فارسی منجھی ہوئی تھی ویسے انہوں نے اپنے اُردو کلام میں دونوں زبانوں کے سو سے زیادہ اشعار بھی نظم کیے ہیں جو ان زبانوں پر ان کی مہارت کی دلیل ہیں۔

حالی ضمیمہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ

> ''عربی و فارسی کی نظم و نثر کے مسودے جو کبھی کبھی کے لکھے ہوئے پڑھے تھے ان کی نسبت متردد تھا کہ ان کو کیا کیا جائے۔ قوم میں ایسی محفوظ لائبریری نظر نہ آئی تھی جہاں افرادِ قوم کے ورکس اچھے یا بُرے احتیاط کے ساتھ رکھے جائیں۔ پھر اہلِ وطن کا ان دونوں زبانوں سے عموماً ناآشنا ہونا اپنے اس قدیم شعر کا مضمون یاد دلاتا ہے۔

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا　　یہ دفتر کسی دن ڈوبونا پڑے گا

لیکن مذکورہ بالا مسودات کچھ تو اس وجہ سے کہ بڑی کاوش سے لکھے گئے تھے اور زیادہ تر اس خیال سے کہ قومی خصوصیات کی یادگار تھے ان کو رائیگاں کھونا گوارا نہ ہوا۔ چناں چہ تمام پرچے جس قدر بہم پہنچ سکے ادھر اُدھر سے فراہم کیے گئے۔‘‘

حالی کی فارسی کلام میں بیس غزلیں ہیں۔ دو غزلیں ناتمام ہیں۔ حالی نے ان غزلوں کے شروع میں لکھا ہے کہ

’’یہ غزلیں اُسی زمانے کی ہیں جب کہ خیالات میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں ہوا تھا جس قسم کے مضامین غزلوں میں اوپر سے بندھے چلے آئے تھے اسی روش پر چند غزلیں لکھی گئی تھیں جن کو معدودے چند کے سوا میں اپنے موجودہ خیالات کے موافق پبلک میں پیش کرنے کے لائق نہیں سمجھتا تھا لیکن بعض احباب کے اصرار سے ان کو اس مجموعے میں شامل کرنے پر مجبور ہوا۔‘‘

حالی کی فارسی غزلیں ہلکی پھلکی ہیں۔ غزل میں کم از کم تین شعر اور زیادہ سے زیادہ چوبیس (۲۴) شعر ہیں۔ چند غزلوں میں اساتذہ کے مصرعوں پر تضمین یا کہیں پر تعلّی کی گئی ہے۔ کل غزلیہ اشعار کی تعداد (۱۶۲) ہے۔ کچھ مقطع کے اشعار اور کچھ چیدہ غزل کے شعر نمونہ کے طور پر پیش ہیں۔

قدر حالی زقوم کس نہ شناخت　　عاقبت رفت از میانۂ ما

خاکساری از جہانی دیگر است　　این زمین را آسمانی دیگراست

’’خاکساری دوسرے جہان کی چیز ہے اس زمین کا آسمان جدا ہے۔‘‘

دل کہ بود از چشم موری تنگ تر　　چون نظر کر دم جہانی دیگراست

''دل جو چیونٹی کی آنکھ سے بھی چھوٹا ہے جو میں نے غور سے دیکھا
تو اس کی وسعت ایک عالم کی طرح معلوم ہوئی۔''

منتہای راہ عشق افتادگی ست　　منزل ما را نشائی دیگر است

''عشق کے راستے کی انتہا فنا پذیری ہے ہماری منزل کی نشانی
کچھ اور ہی ہے۔''

کار حالی نیست کا احمد است　　درس عشقت را بیانی دیگراست

''یہ حالی کا کام نہیں بلکہ احمد جام کا کام ہے جنہوں نے کہا تھا عشق
کے سبق کا بیان ہی کچھ اور ہے۔''

صید عنقاست پریدیم عبث　　راہِ دور است دویدیم عبث

''شکار نہیں تھا بے کار چھلانگ لگا دی۔ راستہ بہت لمبا تھا خوامخواہ
بھاگتا رہا۔''

دل ہماں بت کدۂ پندارست　　جامے در کعبہ گزیدیم عبث

''دل تو وہی غرور کا بت کدہ تھا خوامخواہ کعبہ میں کپڑوں کو چاک کیا۔''

عشق از خویش بریدن می خواست　　حالی از خلق بریدیم عبث

''عشق تو فنا یا اپنے آپ سے جدائی چاہتا ہے حالی ہم خلق سے
بیکار جدا ہو گئے۔''

غالب نے کہا تھا۔

در تہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ ای　　تاز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن

''غالب نے ہر حرف کے نیچے میخانہ سجا رکھا ہے تا کہ جو بھی اُسے
پڑھے وہ شعر کے نشہ سے مست ہو جائے۔''

حالی اپنی ایک غزل کے مقطع میں کہتے ہیں:

حالی تہ ہر حرف دو صد نکتہ نہفت ست سنجند دریں بزم اگر نکتہ وارانند

''حالی نے ہر حرف کے نیچے دو سو نکات چھپا دیے ہیں اگر کوئی محفل میں کوئی نکتہ داں ہے تو وہ سمجھ سکے گا۔''

حالی نے غالب کے ایک اور شعر سے استفادہ کر کے غزل کے مقطع میں کہا۔

حالی ز سخن خواہی رفتن ز پئے غالبؔ دولت بہ غلط بنود از سعی پشیماں شد

حالی نے غالب کی مشہور فارسی نعت جس کا مقطع ہے۔

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزدان گزاشیتم کان ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمد ﷺ است

''یعنی غالب ہم نے حضور نبی کریم ﷺ ختمی مرتبت کی مدح کو اللہ پر چھوڑ رکھا ہے کیونکہ صرف اللہ ہی پوری طرح سے حضرت محمد مصطفی ﷺ کے مقام و مرتبے سے واقف ہے۔''

حالی نے اس نعت کے اشعار پر مخمس تضمین کیا ہے۔ اس خوب صورت تضمین کا صرف ایک بند بطور تبرک ملاحظہ کریں۔

شاہد بہ قتل عاشق و عاشق بہ خال و خد مجنون بہ پای لیلیٰ و لیلیٰ بہ فرقِ خود

مومن بہ آل احمد ﷺ و آلش بروح جد ہر کس قسم بد انچہ عزیز ست می خورد

سوگند کردگار بجانِ محمد ﷺ است

حالی نے بیس (۲۰) رباعیات فارسی میں مختلف موضوعات پر لکھی ہیں جنکے موضوعات حمدیہ، رثائیہ، اخلاقی مدحیہ، اور تاریخی واقعات اور تاریخ وفات پر مشتمل ہیں۔ ذیل کی رباعی میں انیسؔ کی حمدیہ رباعی کی ترجمانی کی ہے۔

یارب کرمی کہ شرمسار آمدہ ایم سرمایۂ ناکسی بہ بار آمدہ ایم

شائستۂ دوزخیم و جویاے بہشت دریاب کہ پر امیدوار آمدہ ایم

عباسؓ و علی اکبرؓ آن غیرت ماہ بو دند شبیہ احمد ﷺ و شیر الہ ؓ
درنوحۂ ایں ہر دو جوان بر لبِ شاہؓ گہہ ''واابتاہ'' بود گہہ ''واجداہ''

رباعی نواب ضیاء الدین احمد خان کی مدح میں جو اُردو میں رخشاں اور فارسی میں نیر تخلص کرتے تھے۔

عمر یست کہ دہلی جسد بے جان است و ز قحطِ رجال سر بسر ویران است
اما صد شکر کوکب منخفش روشن ز فروغ نیر رخشان است

اس ضمیمہ میں چار قصیدے موجود ہیں جن کی تفصیل یوں ہے۔

الف: قصیدہ محمد کلب علی خان نواب رامپور۔(۷۸) اشعار ہیں۔

ب: قصیدہ نواب آسمان جاہ کی خدمت میں عید فطر کے موقع پر (۲۴) اشعار پر مشتمل ہے۔

ج: قصیدہ نواب آسمان جاہ کی خدمت میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر (۲۷) اشعار پر مشتمل ہے۔

د۔ قصیدہ حبیب اللہ خان والی افغانستان مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے معائنہ کے موقع پر (۲۰) شعر پر مشتمل ہے۔

قصیدوں کے ڈیڑھ سو شعر تاریخی حیثیت کے حامل ہیں اور بیانیہ طرز میں لکھے گئے ہیں۔نواب کلب علی صاحب کے قصیدے میں قرآنی، حدیثی اور عربی فقرے خوب صورت طور پر نظم کیے گئے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ حالی کے محسن آسمان جاہ نے انہیں مصنفین کی مد سے پچھتر (۷۵) روپے ماہانہ کا وظیفہ کیا تھا۔ ان تمام قصیدوں میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی مدد اور سرپرستی کا ذکر ہے۔ یہ قصاید ۱۸۷۷ء سے ۱۹۰۷ء کی تصانیف ہیں۔

قصائد کے بعد مرثیہ سرسید ترکیب بند میں ستر (۷۰) شعروں میں ہے جو

۱۸۹۸ء کی تصنیف ہے مرثیہ سالار جنگ تراب علی خان ترجیح بند کی شکل میں (۲۷)اشعار پر مشتمل ہے۔ قطعات تواریخ وفات میں محمد علی کان رشکی (۱۶)شعر، سید محمود علی (۱۰)شعر، خلیفہ سید محمد حسن (۱۹)شعر، خلیفہ سید محمد حسین (۱۹) شعر، مولوی چراغ علی (۱۰)شعر، خواجہ کرامت علی، محمد ابراہیم، خواجہ فریدالدین، چراغ علی اور نواب محسن الملک کے دو دو شعر کے قطعات بھی موجود ہیں۔ کئی مرثیوں اور خصوصی طور پر مفصل سرسید کے مرثیہ پر شخصی مرثیوں میں گفتگو ہو چکی ہے۔

شبلی نعمانی ۱۸۹۹ء میں شدید بیمار رہے۔ صحت یاب ہونے پر ایک قصیدہ کشمیریہ اپنے دوستوں کو بھیجا جس کا مطلع تھا۔

دوستاں ای کہ رہ و رسم وفا کیش شماست   ہیچ دانی کہ شبلی بچہ حال ست و کجاست

''دوستو! تمہاری وفا شعار فطرت اور وفا نبھانے کی عادت ہے۔

کچھ جانتے ہو شبلی اب کس حال میں اور کہاں ہے؟''

حالی نے اس قصیدے کی رسید دیتے ہوئے سات شعر کا ایک قطعہ لکھا جس میں شبلی کے ہنر کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کے تین شعر ترجمانی کے ساتھ یہاں پیش کرتے ہیں۔ شبلی کا نام کمالات میں دنیا کی داستانوں میں لکھا ہوا ہے۔ وہ عالم میں شمش العلماء مشہور ہے۔ اُس نے پرکھوں کی تاریخ میں جان ڈالی ہے اور قوم اُس پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ وہ اس دنیا میں دراز مدت تک زندہ رہے کیوں کہ تحقیق کی پوشاک کسی اور کے جسم پر ان کے بعد ٹھیک نہیں بیٹھے گی۔

آن کہ نامش بہ کمالات سمر در گیتی ست   آن کہ مشہور در آفاق بہ شمس العلما ست

بسکہ او روح دمیدہ است بہ تاریخ سلف   ہر قدر فخر بہ ذاتش بکند قوم رواست

زندہ تا دیر بماناد کہ بر قد کسی   بعد ازو خلعت تحقیق نمی آید درست

حالی نے فصلی سال کے بارہ مہینوں کو ایک قطع میں نظم کیا ہے۔

آذر و دی بہمن اسفند ار فروردین بہشت — باز خورداد ست و تیر است و مرداد اے جوان
باز شہر یور سپس مہر ست و آبان بعد ازو — بریک از ماہِ جلالی پیش تو کردم بیان

اسی ضمیمہ میں غالب کو جو قطعات لکھے تھے جس کا خود حالی نے یادگار غالب میں مفصل ذکر کیا ہے پیش کرتے ہیں۔

ا۔قطعہ

تو اے کہ رونق پشینیاں بہم بشکست — ز نظم و نثر تو کا ذر زمانِ ما گفتی
چہ نغمہ ہا کہ بہ قانونِ ذوق سنجیدی — چہ بذلہ ہا کہ بانداز دل رُبا گفتی
رسید نشۂ عرفاں چو ذکر مے راندی — شگفت خاطرِ یاراں گر از صبا گفتی
دوید ریشہ بدلہا چو حرفِ مہر زدی — دمید نخل تمنا چو از وفا گفتی
گرہ بہ بزم فشاندی اگر ثناخواندی — اثر ز لفظ دماندی اگر دُعا گفتی
ہزار عقدۂ سربستہ باز بکشودی — ہزار نکتہ پوشیدہ برملا گفتی
ز سرِ تفرقۂ جمع قصہ ہاراندی — ز سیرانفس و آفاق راز ہا گفتی
بر آمد از دلِ بیگانگاں ترانۂ ذوق — بہ محفلے کہ سخنہائے آشنا گفتی
لطیفہا کہ بلفظ و بیاں نمی گنجید — تو چوں فرشتہ ز غیب آمدی و وا گفتی
بحق لطف کلامست کہ ہست بر دل ما — کہ پایۂ سخن افراشتند تا گفتی
تواے کہ ہر سخن نغز تو بدل جا کرد — جز آں کہ در حق حالی بہ رمز وا گفتی
ہر انچہ گفتۂ اندر جواب عرض نیاز — خطا بود کہ بگیرم اگر خطا گفتی
ولے بعربدہ از حرفِ چند باخویشم — کہ گر نگفتہ ام آخر تو از کجا گفتی
عجب کہ قاعدہ دانِ نیاز مندی را — سفیہ و معجب و خود بین و خود نما گفتی
عجب کہ چاشنی اندوزِ خاکساری را — رہین ذوق نوا سنجی انا گفتی

عجب کہ منفعلے را ز نقد ناسرہ اش — یہ رزق در گرو عرض کیمیا گفتی
نہ راہِ حرف بسویت نہ جاے من بدلت — جواب چیست اگر پرسم از کجا گفتی
اگر نہ روے سخن با تو بود، می گفتم — چگونہ گفتی؟ و چون گفتی و چرا گفتی
ولیک شرط ادب نیست برتو خردہ گرفت — ہر انچہ در حق من گفتہ بجا گفتی

راقم کے ساتھ مرزا کا معاملہ

حالی یادگارِ غالب میں لکھتے ہیں:

''اتفاق سے انہیں دنوں میں نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے ہمراہ میرا دلی میں آنا ہوا۔ چوں کہ مجھ کو ان نالائق گمنام خطوں کے آنے کا حال معلوم نہ تھا، ایک روز مجھ سے ایک ایسی غلطی ہوگئی جس کے تصور سے مجھ کو ہمیشہ نہایت شرمندگی ہوتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مذہبی خود پسندی کے نشہ میں سرشار تھا۔ خدا کی تمام مخلوق میں سے صرف مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے تہتر ۷۳ فرقوں میں سے اہل سنت کو اور اہل سنت میں سے صرف حنفیہ کو اور ان میں سے بھی صرف اُن لوگوں کو جو صوم وصلوٰۃ اور دیگر احکام ظاہری کے نہایت تقید کے ساتھ پابند ہیں، نجات اور مغفرت کے لائق جانتا تھا۔ گویا دائرہ رحمتِ الٰہی کوکوئن وکٹوریا کی وسعت سلطنت سے بھی جس میں ہر مذہب وملت کے آدمی بہ امن وامان زندگی بسر کرتے ہیں زیادہ تنگ اور محدود خیال کرتا تھا جس قدر کسی کے ساتھ محبت یا لگاؤ زیادہ ہوتا تھا اسی قدر اس بات کی تمنا ہوتی تھی کہ اس کا خاتمہ ایسی حالت پر ہو جو ہمارے زعم

میں نجات اور مغفرت کے لیے ناگزیر ہے چوں کہ مرزا کی ذات کے ساتھ محبت اور لگاؤ بدرجہ غایت تھا اس لیے ہمیشہ ان کی حالت پر افسوس ہوتا تھا۔ گویا ہم یہ سمجھتے تھے کہ روضۂ رضواں میں ہمارا ان کا ساتھ چھوٹ جائے گا؟ اور مرنے کے بعد پھر اُن سے ملاقات نہ ہو سکے گی۔ ایک روز مرزا کی بزرگی، استادی اور کبر سنی کے ادب اور تعظیم کو بالائے طاق رکھ کر خشک مغز واعظوں کی طرح اُن کو نصیحت کرنی شروع کی۔ چوں کہ ان کا ثقل سماعت انتہا کے درجے کو پہنچ گیا تھا اور اُن سے بات چیت صرف تحریر کے ذریعہ سے کی جاتی تھی۔ نماز پنجگانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا لکچر لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا۔ جس میں اُن سے اس بات کی درخواست تھی کہ آپ کھڑے ہو کر، یا بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے غرض جس طرح ہو سکے نماز پنجگانہ کی پابندی اختیار کریں۔ اگر وضو نہ ہو سکے تو تیمم ہی سہی مگر نماز ترک نہ ہو۔

مرزا کو یہ تحریر سخت ناگوار گزری، اور ناگوار گزرنے کی بات ہی تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ انھیں دنوں میں لوگ گمنام خطوں میں ان کے اعمال و افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفرین و ملامت کر رہے تھے اور بازاریوں کی طرح کھلم کھلا گالیاں لکھتے تھے۔ مرزا صاحب نے میری لغو تحریر کو دیکھ کر جو کچھ فرمایا وہ سننے کے لائق ہے۔ انھوں نے کہا:

''ساری عمر فسق و فجور میں گزری، نہ کبھی نماز پڑھی نہ روزہ رکھا نہ کوئی نیک کام کیا۔ زندگی کے چند انفاس باقی رہ گئے ہیں، اب

اگر چند روز بیٹھ کر یا ایما و اشارے سے نماز پڑھی تو اس سے ساری عمر گناہوں کی تلافی کیونکر ہو سکے گی؟ میں تو اس قابل ہوں کہ جب مروں میرے عزیز اور دوست میرا منہ کالا کریں اور میرے پاؤں میں رسی باندھ کر شہر کے تمام گلی کوچوں اور بازاروں میں تشہیر کریں اور پھر شہر سے باہر لے جا کر کتوں اور چیلوں اور کوؤں کے کھانے کو (اگر وہ ایسی چیز کھانا گورا کریں) چھوڑ آئیں۔ اگرچہ میرے گناہ ایسے ہی ہیں کہ میرے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کیا جائے لیکن اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں ''لاالٰہ الااللّٰہ''، ''لاموجودالااللّٰہ''، ''لاموثر فی الموجودالااللّٰہ''

لطیفہ

''شاید اُسی روز جب کہ یہ گفتگو ہو چکی تھی اور مرزا صاحب کھانا کھا رہے تھے۔ چٹھی رساں نے ایک لفافہ آ کر دیا۔ لفافے کی بے ربطی اور کاتب کے نام کی اجنبیت سے اُن کو یقین ہو گیا کہ یہ کسی مخالف کا ویسا ہی گمنام خط ہے جیسے پہلے آ چکے ہیں۔ لفافہ مجھ کو دیا کہ اس کو کھول کر پڑھو۔ میں خود دیکھتا ہوں تو فی الحقیقت سارا خط فحش و دشنام سے بھرا ہوا تھا۔ پوچھا کس کا خط ہے؟ اور کیا لکھا ہے؟ مجھے اس کے اظہار میں تامل ہوا۔ فوراً میرے ہاتھ سے لفافہ چھین کر فرمایا کہ شاید آپ کے کسی شاگرد معنوی کا لکھا ہوا

ہے۔ پھر اوّل سے آخر تک خود پڑھا۔ اس میں ایک جگہ ماں کی گالی بھی لکھی تھی۔ مسکرا کر کہنے لگے:

''اس اُلو کو گالی دینی بھی نہیں آتی۔ بڈھے یا ادھیڑ آدمی کو بیٹی کی گالی دیتے ہیں تا کہ اُس کو غیرت آئے۔ جواں کو جورو کی گالی دیتے ہیں کیونکہ اس کو جورو سے زیادہ تعلق ہوتا ہے۔ بچے کو ماں کی گالی دیتے ہیں کہ وہ ماں کے برابر کسی سے مانوس نہیں ہوتا۔ یہ قُرمساق جو بہتر (72) برس کے بڈھے کو ماں کی گالی دیتا ہے اس سے زیادہ کون بے وقوف ہوگا؟''

اس کے بعد میں اُن سے رخصت ہو کر چلا آیا۔ دوسرے روز حضرت نے ایک غزل لکھ کر میرے پاس بھیجی جس میں اگرچہ میرے نام اور تخلص کی تصریح نہ تھی لیکن اس کے بعض مضامین اور اشارات سے معلوم ہوا کہ اس میں جو طعن و تعریض ہے وہ میرے ہی نسبت ہے۔ غزل یہ ہے:

بمقصدے کہ مرآں را رہِ خدا گویند | بروبرو کہ ازاں سوبیا بیا گویند
کسیکہ پاے ندارد چگونہ راہ رود | خود اہل شرع دریں داوری چہا گویند
ز رمزِ نخل انا اللہ گوے نا آگاہ | حدیث جلوہ گہ و موسیٰ و عصا گویند
مگر ز حق نہ بود شرم حق پرستاں را | کہ نام حق نبرند و ہمیں انا گویند
ز قول شاں نہ بود دل نشیں اہل نظر | جز آں صفات کہ از ذاتِ کبریا گویند
نخواندہ در کتب و ناشنیدہ از فقہا | بغیر بے مزہ وا گو یہ ہا کہ واگویند
دم از وجودُک ذنبٌ زدند بیخبراں | چہ ساں عطیہ حق را گناہِ ما گویند
بلے گناہ بود دعویٰ وجود از ما | باہل را ز چنیں گوی تا بجا گویند

دگر ملامتیاں را چہ زہرۂ پا سُخ اگر بہ خشم گرایند و ناسزا گویند
نکردہ زرمسِ خود را و بہرِ عرض قریب بہ پیش خلق حکایت ز کیمیا گویند
کساں کہ دعویٰ نیکی ہمی کنند مرا اگر نہ نیک شمارند بد چرا گویند؟
طمع مدار کہ یابی خطابِ مولانا بس است ہمچو توئی را کہ پارسا گویند
بگوی مردہ، کہ درد ہر کارِ غالب زار ازاں گزشت کہ درویش و بینوا گویند

اس غزل کو دیکھ کر مجھ کو اس بات کا موقع ملا کہ مرزا کے کمالِ شاعری کی نسبت جو خیالات مکنون خاطر ہیں اور کبھی ان کے اظہار کی نوبت نہیں آئی ان کو کسی قدر شکایت کے ساتھ ایک مختصر قطعے میں بیاں کیا جائے۔ چناں چہ قطعہ ذیل ترتیب دے کر مرزا صاحب کی خدمت میں بھیجا۔

ا۔قطعہ

تو اے کہ عذر فرستادۂ بسوے رہی سزد کہ جان گرامی براں نثار کنم
شکایتے کہ تواں گفت عین اخلاصش گرم تو دوست شماری ہزار بار کنم
نماندہ قاعدۂ شکر بے ریا بجہاں اساس دوستی از شکوہ استوار کنم
چو شکوہ جز بہ تقاضای دوستی نہ بود ز غیر شکر و شکایت ز دوستدار کنم
سرشتِ پاک و دل صاف دادہ اند مرا بحرف تلخ ولے خالی از غبار کنم
خوش آنکہ ساز کنم از تو شکوۂ بیجا تو اعتذار کنی و من افتخار کنم
براں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد زیں پس زکارہاے جہاں خاصہ ایں سہ کار کنم
زکردہ توبہ نمایم ز گفتہ استغفار وگر سپاس تو پنہان و آشکار کنم

جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اس زمانے میں مجھ کو نواب محمد مصطفیٰ خان مرحوم متخلص بہ شیفتہ وحسرتی رئیس جہانگیر آباد کے ہاں تعلق تھا اور اُن دنوں میں وہ دلی آئے ہوئے تھے اور میں اُنہیں کے مکان پر مقیم تھا۔ جب یہ قطعہ مرزا صاحب کی نظر سے گزرا تو انہوں نے چار بیت کا ایک نہایت لطیف قطعہ نواب مرحوم کے پاس لکھ بھیجا جو ذیل میں درج ہے:

قطعہ

تواے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری   ہمی بہ لطفِ تو خود را امید وار کنم
چو حالی از من آشفتہ بے سبب رنجید   تو گر شفیع نگردی بگوچہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرض محال   براں سرم کہ دراں عمرایں دو کار کنم
یکے ادائے عباداتِ عمر پیشینہ   دگر بہ پیشگہ حالی اعتذار کنم

اگرچہ مجھ کو شرم آتی ہے کہ مرزا کے عالی رتبہ کلام کے ساتھ اپنا کم وزن و بے وقت کلام ناظرین کے سامنے بار بار پیش کروں، مگر مقام اور موقع اس بات کا مقتضی ہے کہ جس واقعے کا ذکر چھڑ گیا ہے اس کو انجام تک پہنچایا جائے۔ مرزا صاحب کے اس قطعے پر میں نے ایک اور قطعہ لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجا جو ذیل میں لکھا جاتا ہے۔ جب یہ قطعہ مرزا صاحب کے پاس پہنچا اس پر یہ لکھ کر کہ ''بس اب بیت بحثی موقوف'' میرے پاس بھیج دیا۔ اس کے بعد پھر اور کچھ نہیں لکھا گیا۔''

حالی نے دوشعر کا قطعہ محبوب علی پاشا کی تخت نشینی ''برای او مبارک تاج و

اورنگ جہاں بانی'' لکھا۔ حالی نے کرنل ہال رائیڈ، مسٹر وٹن، نواب حامد علی خان والی رام پور کو شکرے کے قطعات لکھے۔ مختلف شادیوں کے رقعے، مکانوں کی تعمیر کے علاوہ مہمان سرا، مسجد، باغ اور کنویں کی تعمیر کی تاریخیں نکالیں اور ان عمارتوں اور تعمیروں کی نسبت سے مصرعے تخلیق کیے۔

الف۔ تاریخ تعمیر مکان سید عوض علی ......سال ہجرش داں، ''ظفر منزل''
(۱۳۰۷ ہجری)(۲)شعر

ب۔ تاریخ تعمیر مسجد سونی پت ...... بگفتا ''چہ خوش کرد مسجد بنا''
(۱۲۹۳ ہجری)(۵)شعر

ج۔ تاریخ تعمیر مکان سید مہربان علی...... ''مکان بے نظیر آباد بادا''
(۱۲۹۹ ہجری)(۵)شعر

د۔ تاریخ تعمیر مہمان سرای مون...... ''تکیہ گہہ بر غریب'' آمدہ سالش
(۱۸۷۷ عیسوی)(۲)شعر

ھ۔ تاریخ تعمیر باغ تسہ ضلع مظفر نگر...... خرد فرمود ''باغ نو مبارک''
(۱۳۲۲ ہجری)(۳)شعر

ز۔ تاریخ تعمیر چاہ سونی پت ...... کہ ہست سال بنا ''چشمہ بہشت برین''
(۱۳۱۷ ہجری)(۲)شعر

حالی نے ایک خوب صورت قطعہ تاریخ میر مہدی مجروح کے دیوان کا لکھا۔ اس گیارہ شعر کے قطعہ میں دہلی مرحوم کے نامور شعرا کے جانشیں مجروح کی شخصیت اور فن پر تبصرہ ہے۔ اس قطعہ کا سلیس ترجمہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ مجروح سے بزرگوں کا نام زندہ ہے۔ اس کی ذات اس دور کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ دہلی جو ہنر کی کان اور کمال کی معدن تھی آج اس میں کمال کا وجود نہیں۔ جو شخصیتیں فلک بوس تھیں وہ آہستہ

آہستہ جنت چلے گئے اور جو کچھ باقی بچے ہیں وہ بھی وقتاً فوقتاً موت کو لبیک کہہ رہے ہیں۔ غالب گئے، نیر اور آزردہ گئے ذوق و مومن حسرتی اور عارف ہمارے درمیان سے اٹھ گئے۔ ان لوگوں کے جانے سے جوان کی جگہ خالی ہوئی تو کوئی اُس جگہ کو بھرنے والا نہ رہا۔ مجروح ان یادگاروں میں باقی ہے۔ اے خدا اُسے تو اپنی امان میں رکھ کیونکہ یہ بلبل بہار کے قصے سناتا ہے یہی پھول ہمیں گلستان کے دور کی خبر دیتا ہے۔ اس کا دیوان اُردو شعری گلستان کی آخری بہار ہے جو نکتہ سنجوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ وہ شراب جو میر تقی میر اور مرزا غالب کی بچی ہوئی ہے وہ تشنہ جگروں کو پلاتا ہے۔ قصہ مختصر یہ دولت بے بہا شائع ہو کر ارزاں دستیاب ہے جیسے تمام عمر کی پونجی دے کر لینا اچھا سودا ہے۔ اگر کوئی حالی تجھ سے اس کی تاریخ پوچھے تو کہنا ''نظم دل فریب'' (۱۳۱۶) اس کی اشاعت کا سال ہے۔

قطعۂ تاریخ طبع دیوان میر مہدی مجروح دہلوی

مجروح آں کہ نامِ سلف زندہ است ازو
ذاتش بود غنیمت کبریٰ دریں زماں

دہلی کہ بود کانِ ہنر، معدنِ کمال
امروز از کمال نیابی درو نشاں

جمعے کہ داشت سر بفلک از وجود شاں
راندند سوے جنت ماویٰ یگاں یگاں

و انانکہ ماندانداز ازاں جمع یادگار
لبیک می زنند اجل را زماں زماں

غالب برفت و نیر و آزردہ رفت و ذوق
مومن برفت و حسرتی و عارف از میاں

رفتند و جاے خود ہمہ خالی گزاشتند
کس بر نخاست تا بنشیند بجاے شاں

مجروح ماندہ است ازاں جمع یادگار
یارب بدار از بد دورانش در اماں

کایں عندلیب قصہ ہمی خواند از بہار
ویں گل خبر ہمی دہد از عہدِ گلستاں

دیوان او کہ ریختہ را دورِ آخر است
خوش می زند صدا بہ حریفانِ نکتہ داں

کایں مے کہ واگزاشتۂ میر و میرزا ست — می بخشمش بہ ہر جگرِ تشنہ رائگاں
القصہ چاپ گشتہ و ارزاں شد آں متاع — کانرا بہ نقدِ عمر خریدن ہمی تواں
پرسد اگر کسے ز تو تاریخ حالیا — گو، ''نظم دلفریب'' بود سالِ طبعِ آن

۱۳۱۶ھ

عیدنوروز جو بہار کا پیغام لاتی ہے برصغیر خصوصی طور پر دہلی میں مغلیہ دور کے بعد جشن بہاراں کے نام سے منائی جاتی تھی۔ جس کا رواج آج کل تقریباً کم ہو چکا ہے۔ آج بھی دہلی میں کامنا پرساد جی ہر سال جشن بہاراں کے نام پر سالانہ مشاعرہ کرتی ہیں اور اُردو کے شعرا کو دنیا بھر سے مدعو کرتی ہیں۔ حالی کا دوشعر کا قطعہ دیکھیے۔

رفت آسیب ز مستاں باد نوروزی وزید — دوستداراں را بشارت باد و یاراں را نوید
طرحِ بزمِ خرمی باہم دگر باید نہاد — نغمۂ شکر الٰہی دم بہ دم باید کشید

جاڑوں کی بلا گئی اور نوروز کی نسیم خوشگوار آئی۔ دوستوں کو مژدہ اور رفیقوں کو خوش خبری دیں۔ اب محفل نشاط سب مل کر سجائیں جس میں اللہ کے شکر کے گیت دم بدم گائیں جائیں۔

حالؔی کی تاریخ گوئی

اُردو ادب کے تقریباً ہر بڑے شاعر نے تاریخ گوئی کی ہے اور بعض تاریخیں آج بھی زبان زدعام ہیں۔ اگرچہ اس فن میں تخلیق سے زیادہ تشکیل کا دخل ہے پھر بھی یہ فن آج بھی جاری ہے۔ حالی تاریخ گوئی کے پرستار نہ تھے۔ جیسا کہ خود لکھتے ہیں:

> ''راقم کو فی الواقع تاریخ نکالنے کا ڈھب نہیں ہے اور اگر کبھی ایسی ضرورت پیش آئی ہے تو نہایت دقت سے اکثر تخرجہ یا تعمیہ کے ساتھ اور کبھی حسن اتفاق سے بغیر اس کے بھی تاریخ سرانجام ہوئی ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مادہ تاریخ کسی دوست نے نکال دیا اور اس پر صرف مصرعے لگا کر تاریخ کے خود مالک بن بیٹھے لیکن چوں کہ غلطی سے تاریخ گوئی کو جزو شاعری سمجھا گیا ہے اس لیے اکثر طوعاً کرہاً یاروں کی فرمایش سے اور کبھی کبھی اپنی اپچ سے بھی تاریخیں لکھنی پڑی ہیں۔ اعتبار بڑھ جاتا ہے۔ راقم چوں کہ تاریخ نکالنے میں سدا سے ہیٹا تھا اس لیے ہمیشہ اس

امتحان سے کتراتا رہا۔ لیکن بری بھلی چند تاریخیں جو کبھی کبھی دوستوں یا بزرگوں کی فرمایش یا اپنے دل کی خواہش سے لکھی تھیں ان میں سے جس قدر سردست بہم پہنچیں دیوان میں شامل کر دی گئیں تاکہ دیوان کے ضروری اخلاط میں سے ایک خلط کم نہ ہو جائے۔"

حالی اُردو کے وہ پہلے ممتاز شاعر ہیں جنھوں نے غالب کی تاریخ وفات خود غالب کے مصرعے سے نکالی۔ بعد میں یہ طریقہ عوام اور خواص میں پھیل گیا چناں چہ میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، جوشؔ، اقبالؔ، جگرؔ وغیرہ کی تاریخ وفات انہی کے مصرعوں سے نکالی گئیں۔ اس موقع پر ہم صرف قطعہ تاریخ سے وہ شعر جس میں تاریخی اعداد وشمار ہے پیش کرتے ہیں۔

تاریخ وفات مرزا غالب

تاریخ ہم نکال چکے پڑھ "بغیر فکر" "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا"

تاریخ وفات محمد ابراہیم جواں مرگ طالب علم دہلی کالج

بگفتم ز روے "الم" سال فوتش "بجان آفرین جانِ شیرین سپردہ"

ا

۱۲۹۲+۱=۱۲۹۳ھ

تاریخ بناے چاہ درمحوطہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ

زروے سال بعثت چوں کہ تھی تاریخ کی خواہش کہا ہاتف نے حالی سے کہ "چشمہ فیض احمد کا"

۱۳۱۲ھ

تاریخ وفات مولانا محمد حسین آزاد

تاریخ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ ”ہوا خاتمہ اُردو کے ادب کا“
۱۳۱۲ھ

تاریخ طبع ترجمہ درباری قیصری

چھپ کر ہوا تمام تو حالی نے یوں کہا
”دربار قیصری کا مرقع چھپا ہے خوب“
۱۸۸۲ء

تاریخ بنائے ہماں سرا موضع مون

ساختہ منزل گہہ چو بہر غریباں
”تکیہ گہ ہر غریب“ آمدہ سالش
۱۸۷۷ء

تاریخ وفات مصطفیٰ خان شیفتہ

جَزَاھُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّاتٍ وَّحَرِیْرًا
۱۲۷۷ھ

تاریخ وفات نقش بند خان فرزند شیفتہ

وَحُلُّوْا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّہ
۱۲۹۴ھ

تاریخ بنائے آئینہ خانہ بہاول پور

کَاَنَّہٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنَ الْقَوَارِیْر
۱۲۹۶ ہجری

تاریخ ولادت فرزند آسمان جاہ

حَاشَ لِلّٰہِ مَا ھٰذَا بَشَرًا اِنْ ھٰذَا اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ

۱۳۰۸ ہجری

تاریخ وفات برادر خواجہ امداد حسین

سَلٰمٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

۱۳۰۳ھ

تاریخ وفات خلیفہ سید محمد حسین خان

گفت سال رحلتش مغفور داں

۱۳۲۶ھ

تاریخ وفات خواجہ ناصر وزیرؔ

عیش میں شعر و غزل لوگ میں تاریخ مرگ غیب سے آئی ندا ''خلد میں ناصر وزیر''

۱۲۹۲ھ

تاریخ طبع جغرافیہ شہاب الدین

ہو مطلوب تاریخ گر عیسوی کہو اس کو ''جغرافیہ بے مثال''

۱۸۸۲ء

تاریخ بنائے سید مہربان علی

چنین گفتمش حالی سالِ تعمیر ''مکانِ بے نظیر آباد بادا''

۱۲۹۹ھ

تاریخ اورنگ نشینی محبوب علی پاشا

بہ تخت سلطنت بنشت و حالی گفت تاریخش "برائے وے مبارک تاج و اورنگ جہاں بانی"
۱۳۰۱ھ

تاریخ تالیف قواعد اردو مولفہ شہاب الدین

اگر نام اس کا تاریخی ہو مطلوب تو ہے اے طالبو "اکسیر اعظم"
۱۳۰۲ھ

تاریخ وفات ضیاء الدین احمد خان

از طاق و ز ایوان و ز بزم و جلسا بگستہ بہ "رحمت الٰہی" پیوست
۱۱۰+ ۶۸ + ۴۹ + ۹۴ ۱۳۰۱ھ

دردا کہ ضیاء دین احمد[1] بر بست رخت سفر از جہاں کہ جای الم است
۹۲۹

تاریخ دیوان اقبال حسین عاشقؔ

چو حالؔی ہمی جست تاریخ طبع "صنم خانۂ عاشق" آمد سنین
۱۳۰۷ھ

الحاقی قطعات تاریخ وفات

حالی کے بڑے بھائی خواجہ امداحسین مظہر نے جو تاریخ گوئی کی تھی وہ قطعات غلطی سے حالی کے نام سے کئی دیوان حالی میں شائع ہوئے۔ اگرچہ حالی نے اپنے مطبوعہ دیوان ۱۸۹۳ء میں لکھا تھا:

[1] یہ تاریخ اس طرح نکلتی ہے کہ ۹۲۹ میں سے جو کہ ضیاالدین احمد کے اعداد ہیں۔ ۳۲۱ جو کہ طاق ایوان بزم اور جلسا کے اعداد کا مجموعہ ہے تجرجہ کر کے باقی ۶۰۸ کو ۶۹۴ میں جو کہ رحمت الٰہی کے اعداد ہیں ملانے سے ۱۳۰۲ حاصل ہوتے ہیں اور یہی ضیاالدین مرحوم کا سال وفات ہے۔ (حالی)

''چوں کہ برادر مرحوم کی بہت سی تاریخوں میں سے یہ چند قطعے
باقی رہ گئے تھے اور ان کی اشاعت کے لیے کوئی اور موقع نہ تھا۔
اس لیے بطور یادگار کے ان کو بھی اپنے دیوان میں شامل کر لیا گیا
ہے۔''

ہم یہاں ان قطعات کے اشعار کو پیش کر رہے ہیں تا کہ آیندہ یہ غلطی نہ ہو۔

تاریخ وفات قلندر علی زبیری

گفت سال وفات او مظہرؔ رفت عالم بہ جنت ابدی

۱۲۹۳ھ

تاریخ وفات حافظ سعد اکبر

چنین سال وفاتش یافت مظہرؔ شدہ جنت مقامِ سعد اکبر

۱۳۰۰ھ

تاریخ اورنگ نشینی حضور محبوب علی پاشا

سال جلوسش خرد گفت کہ بے سر شدہ فتنہ و فسق و فجور شر و فریب و فساد

۱۳۰۱ھ

خرد فرق اعدا تراشیدہ گفت کہ نصر من اللہ و فتح قریب

۱۳۰۱ھ

تاریخ ولادت حضور نظام

مظہرؔ اندر فکر تاریخ ولادت رفتہ بود عقل گفت این لعل از کان شرافت آمدہ

۱۳۰۱ھ

تاریخ مدار المہامی لایق علی خان

گفتمش خواجہ کے شود دیواں گفت ''حق می رسد مرکز خود''

۱۳۰۱ھ

تاریخ بنا مسجد ابراہیم حسین انصاری

خبرش داد ملہم صادق کرد تعمیر کعبہ ابراہیم

۱۳۰۰ھ

تاریخ طبع دیوان میر مہدی مجروحؔ

پرسد اگر کسی ز تو تاریخ حالیا گو ''نظم دل فریب'' بود سال طبع آں

۱۳۱۶ھ

تاریخ بنائے مکان سید عوض علی

چون بہ پایاں رسید ہاتف گفت سال ہجرش داں ''ظفر منزل''

۱۳۰۷ھ

پس بکن لفظ'' بے مثال ''فزوں تا شود سال عیسوی حاصل

۵۸۳ + ۱۳۰۷ = ۱۸۹۰ء

تاریخ تعمیر مسجد واقع سونی پت

بگفتا ''چہ خوش کرد مسجد بنا''

۱۲۹۳ھ

تاریخ وفات خواجہ کرامت علی

یافت رحلت بہ سال غفاری

۱۲۹۱ھ

تاریخ بنائے باغ سید فیاض علی

خرد فرمود ''باغ نو مبارک''

۱۳۲۲ھ

تاریخ بنائے چاہ در محوطۂ مدرسۃ العلوم مسلماناں واقع علی گڑھ

کہا ہاتف نے حالی سے کہ ''چشمہ فیض احمد'' کا

۱۳۱۲ھ

تاریخ تعمیر چاہ سید محمد ذکی

کہ ہست سال بنا ''چشمہ بہشت برین''

۱۳۱۷ھ

تاریخ وفات خواجہ فریدالدین احمد

دیدہ بخندہ باز گفت ''جا بہ بہشت یافتم''

۱۲۴۴ھ

تاریخ وفات چراغ علی

''شد نہاں حیف چراغ علی از دنیا'' گفت

۱۸۹۵ء

تاریخ وفات محسن الملک

''انجمن آرائے بہشت برین''

۱۳۲۵ھ

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مادہ تاریخ کا فقرہ یا مصرعہ بعض مقامات پر حالی کا نکالا ہوا نہیں بلکہ حالی نے اُس مصرعے یا فقرے کو قطعہ کا جزو بنا کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ خواجہ فریدالدین احمد جو سر سید کے نانا تھے ان کی تاریخ وفات کا فقرہ خود ان کے فرزند نے نکالا تھا جسے بعد میں سر سید کے کہنے پر حالی نے نظم کیا۔

حالؔی کی نثر نگاری

حالی کی ادبی شعری اور نثری صلاحیتوں کو سنوارنے اور چمکانے میں جن چند اہم شخصیتوں کا ذکر ہوتا ہے۔ ان میں غالب شیفتہ ہالرایڈ سرسید اور محمد حسین آزاد شامل ہیں۔ غالب، شیفتہ اور سرسید کے اثر سے ہم سب واقف ہیں۔ ہال رائیڈ نے حالی کو مغربی لٹریچر کی دنیا کی سیر کروائی حالی کے لاہور کے قیام کے موقع پر مغربی شعر و ادب کے تراجم کی اصلاح مطالعے اور ایسی محافلوں میں شرکت کے مواقع سب اس اُردو پرستار انگریز کے تعاون ہی سے ہوئے۔ محمد حسین کی انجمن پنجاب، موضوعاتی مشاعرے، تذکروں کی ڈگر سے ہٹ کر نئے انداز کی تاریخی تنقیدی کتاب آبِ حیات کے فیض نے حالی کو پہلی علمی تنقیدی کتاب مقدمہ شعر و شاعری کا مصنف بنا دیا۔ چناں چہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آزاد اور حالی اُردو کے ایسے با قاعدہ نقاد تھے جن کی تنقیدی صلاحیتوں کو ترقی دینے اور اجگار کرنے میں انجمن پنجاب نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مہدی افادی لکھتے ہیں:

> ”سرسید کے بعد اگر ان کے رنگ میں کوئی قلم لے سکتا ہے تو وہ حالی ہیں۔“

یہ بھی مسلم ہے کہ تحریر کی دلکشی اور رنگینی میں آزاد کا کوئی ہم پلہ نہیں۔ لیکن ادبی اصلاح اور ادبی افادیت پر جہاں حالی قیام کرتے ہیں وہاں سرسید اور آزاد نہیں پہنچ سکتے۔ یہی فرق ہے غالب اور ذوق کے شاگردوں میں۔

سرسید آزاد اور حالی کی نیچر اور جدید شاعری کے پرستار تھے اور جب کبھی موقع ملتا ان کی تعریف کرتے۔ چناں چہ ایک مقام پر کہتے ہیں:

> ''حالی کی مثنوی ''حبِ وطن'' اور ''مناظرۂ رحم و انصاف'' کو دورِ حاضرہ کی اخلاقیات کا تذکرہ سمجھنا چاہیے۔ ان کے خلوص کا سکہ سب کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ ان کی تنظیم بہتے ہوئے پانی کی طرح نرمل اور رواں ہے۔''

حالی کی نثر اور نظم کے مطالعے سے ان کے خیالات اور طرز بیان کی ارتقائی منزلوں کا پتا چلتا ہے۔ جوانی میں وہ ایک مولوی معلوم ہوتے ہیں لیکن اس دور میں بھی انھوں نے عربی، فارسی، اُردو کے مطالعے کے ساتھ تاریخ اسلام، مسلمان قوم کی فلاکت اور برصغیر میں اسلام کی زبوں حالی کے اسباب کا مطالعہ کیا۔ پادری عمادالدین کی کتاب ہدایت المسلمین کے جواب میں تریاق مسموم اس کا ثبوت ہے۔ اس کتاب میں حالی کا لہجہ تیز اور تند ہے اور بقول پروفیسر احمد خان ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حالی اپنے وقت کی مسلم کش تحریکات کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ حالی کا لہجہ مخلصانہ متین اور استادانہ بن جاتا ہے لیکن اس میں حق گفتاری کی آواز میں کمی نہیں ہوتی۔

حالی کے ہم عصروں میں کئی صاحب طرز تھے۔ ہر ایک کا ایک خاص اسلوب اور طرز نگارش تھا۔ ان میں سے بعض اردو ادب کو جدید چہرہ دے رہے تھے۔ حالی بھی اسی سخن کے میدان کے مرد تھے جن کا نثری میدان سوانح نگاری، تنقید اور علمی ادبی

مقالات پر مشتمل تھا۔ حالی بھی اُردو ادب کے بے تکی رنگینی اور بے فایدہ صناعی مسجع اور مقفٰی شاعرانہ تحریروں سے بیزار تھے اور اس طرز نگارش کو صاف سادہ سلیس شگفتہ رواں دواں عبارت سے بدلنے پر مصر تھے۔ وہ اُردو کے دامن کو یورپی لٹریچر کے گراں بہا جواہرات سے بھرنے میں سرگرم تھے جہاں وہ صاف ستھری ٹکسالی زبان لکھتے وہاں لفظ کی پاکیزگی اور محاوروں کی صحت کا بھی خیال رکھتے تھے۔ وہ عربی فارسی کے خارجی الفاظ فقروں اور ضرب المثلوں کے ساتھ ہندی اور بھاشا کے نرم میٹھے اور رسیلے شبدوں سے کام لیتے تھے۔ حالی کا مقصد عبارت آرائی نہیں تھا بلکہ وہ مطالب اور نکات کو آسان طریقے سے ذہن نشین کرنا چاہتے چناں چہ اس کامیابی کے ساتھ بعض اوقات ان کو منشیانہ لہجہ اختیار کرنا پڑتا جو پھیکا اور بے مزہ ہوتا۔ بعض اوقات ادق اور بھونڈے انگریزی کے الفاظ بھی جیسے لبرل Liberal، لایف Life، ٹائم سرور Time server اُردو مخمل میں ٹاٹ کے پیوند معلوم ہوتے لیکن ان مثبت اور منفی پہلوؤں کے باوجود بیسوی صدی میں جس طرز بیان اور اُسلوب و نگارش کی سب سے زیادہ تقلید کی گئی وہ حالی کا طرز بیان ہے۔ حالی کی سوانح نگاری میں ان کی تینوں کتابیں شاہکار ہیں جس میں حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید شامل ہیں۔

سب سے مشہور اور مقبول نثری دستاویز مقدمہ شعر و شاعری ہے جو سوا سو سال گزرنے کے بعد بھی سب سے اہم تنقیدی مقالہ تصور کیا جاتا ہے۔ مقدمہ اُردو تنقید کا ایک ایسا باقاعدہ علمی رسالہ ہے جس میں شعر و ادب کی ماہیت ساخت تاثیر افادیت اور اس کی اصلاحی اور تعلیمی اقدار پر بحث کر کے نتائج فراہم کیے گئے ہیں جو اُردو ادب کے لیے صحت مند ثابت ہوئے۔

الف۔ شاعری صرف تفریح نہیں بلکہ تعمیری قدروں کے لیے بھی کارآمد ہے۔

ب۔ فرضی خیالات کی جگہ اصلیت اور جوش کو جگہ دی جائے۔

ج۔ ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے ہدف یعنی اس میں مقصدیت ہو۔

د۔ اُردو کے دامن کو مغربی ممالک کے لٹریچر سے روشناس کر کے اس کو وسعت دی جائے۔

ھ۔ شاعری سے اخلاق سازی اور انسان سازی کا کام لیا جا سکتا ہے۔

و۔ اُردو ادب کے افادی پہلو کو پیش کیا گیا۔

ز۔ اُردو شاعری میں تصنع اور غیر ضروری صنعتوں سے گریز کی تاکید کی گئی ہے۔

ح۔ اُردو شاعری کی اہم اصناف پر جدا جدا تفصیلی ریویو کر کے ان کی اصلاح کے پہلو دکھائے گئے ہیں۔

مقدمے میں ایسے کئی مسائل ہیں جن سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ مغربی ترازو پر اُردو شاعری کا تولنا ہمیشہ ٹھیک نہیں دونوں زبانوں کے مزاج اور ماحول جدا جدا ہیں۔ اُردو اصناف پر ریویو کرتے ہوئے صرف منفی اثرات مثالوں سے واضح کیے گئے ہیں جب کہ ضرورت یہ تھی سکہ کا دوسرا رخ مثبت روشن حصہ بھی دکھاتے۔ پروفیسر سید مسعود حسن ادیب نے ہماری شاعری میں بہت عمدہ اور سچا سوال اٹھایا ہے کہ اُردو شاعری میں سب کچھ خس و خاشاک نہیں بلکہ اس گلشن میں بہت کچھ گل و بہار کا اثاثہ بھی موجود ہے جس کا ذکر بھی ضروری ہے۔ ادیب ہماری شاعری میں کہتے ہیں:

> ''حالی کا مقدمہ اور مسدس دونوں سے صاف ظاہر ہے کہ شعر و شاعری کے بارے میں ان کا نقطہ نظر اخلاقی ہے۔ پیش نظر کتاب کے مطالعے سے واضح ہو گا کہ اس کے مصنف کا نقطۂ نظر ادبی ہے۔ لیکن حالی کی یہاں رایوں سے اختلاف کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ جو کچھ اُنہوں نے چھوڑ دیا تھا اُسے پورا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی ہماری شاعری خواجہ حالی کی شعر و شاعری کا جواب

نہیں، اُس کا تتمہ ہے۔ حالی نے تصویر کا ایک رخ دکھایا تھا۔ اس کتاب میں اس کا دوسرا رُخ پیش کیا گیا ہے۔ جو لوگ ان دونوں کتابوں کا غور سے مطالعہ کریں گے وہ اُردو شاعری کے دونوں رُخ دیکھ کر صحیح رائے قائم کرسکیں گے۔

یہ مشہور ہے کہ حالی کی نثر سیدھی سادی سلیس مگر بعض مقامات پر یکسانیت اور منشیانہ لہجہ سے استفادہ کی وجہ سے خشک اور سپاٹ بھی ہو جاتی ہے۔ بقول آل احمد سرور محمد حسین کی صناعی، نذیر احمد کا زور بیان اور شبلی کی رنگینی سب اپنی اپنی جگہ خوب ہیں مگر آج ان لوگوں کا اثر بہت کم ہو گیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ حالی کا طرز ہی پائندہ طرز تھا جسے اُردو کے ادیب اپنا سکے اور ایسے ہی طرز کو حیات جاوید عطا ہوئی۔

پروفیسر گریہم بیلی کہتے ہیں کہ حالی کے طرز نگارش اور اسلوب بیان میں مصنوعی آرایش اور تصنع نہیں وہ کسی قدر پھیکا ضرور ہے لیکن زور اور صحت سے معمور ہے۔

شیخ چاند نے حالی کی نثر کو سنجیدہ جچی تلی اور متین بتایا ہے۔ حالی خیال کے اعتبار سے زبان و بیان اختیار کرتے ہیں اور موثر و دل نشین انداز میں اپنے مافی الضمیر کو پیش کرتے ہیں۔ ایڈیٹر زمانہ منشی دیا نرائن نگم کہتے ہیں اُردو میں سب سے پہلے حالی نے نئے طرز کی سوانح عمریاں لکھیں۔ اُردو کے ادیبوں انشا پردازوں اور ناقدوں کی مشترکہ ارائے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُردو نثر کا سکہ رائج الوقت حالی کا طرز بیان ٹھہرا جو کچھ کچھ تبدیلی سے آج بھی جاری وساری ہے۔ میر انیس نے اپنی نظم کے بارے میں کہا تھا

ایک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

حالی کی نثر کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ جس رنگ کا مضمون ہوتا اُسی رنگ کے الفاظ سے باندھتے۔ اگر خوشی اور شادی کا مضمون ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

الفاظ شہنائی بجا رہے ہیں۔ نغمہ سرائی کر رہے ہیں۔ زر بافت لباس پہنے ہوئے ہیں۔ اگر غم درد و حزن کا مضمون ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ آنسو بہا رہے ہیں اور افسردہ اور رنجیدہ ہیں۔ اگر حیرت اور استعجاب کا متن ہو تو ایسا لگتا جیسے الفاظ منہ کھولے بال بکھرائے ہوئے محو حیرت اور سرگرداں ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ شاعرانہ نثر کے معنی یہی ہیں۔

حالی اپنی نثر میں غیر مانوس اور ثقیل الفاظ استعمال کر کے اپنے علم و فضل کا پرچار نہیں کرتے اور نہ مضمون کو مشکل اور خارج از فہم بلکہ سلیس نرم دلکش سیدھے سادے الفاظ ایسے انتخاب کرتے ہیں جو خیال کے جسم پر موزوں اور چست ہوں جس سے وہ جلوے سب کے سامنے پیش ہو جائیں جو بحیثیت ایک تخلیق کاران کے تخیل اور ذہن میں ہوں۔ حالی کے اس عمل سے انشا اور بیان کی خوبیاں ضایع نہیں ہوتی۔

غدر سے کچھ پہلے غالب اور انیسویں صدی کے ربع آخر میں سرسید آزاد نذیر احمد، حالی اور شبلی نے اپنے اپنے نثری دبستان کھولے جس کے نصاب میں ایک خاص طرز نگارش تھا۔ سوائے نذیر احمد کے یہ سب شاعر تھے۔ نذیر احمد بھی کچھ اشعار موزوں کر کے اپنی تقریر سے پہلے ایک پھیپھی سی نظم پڑھتے جس سے لوگ بور ہوتے تو کہتے:

تم اپنی نثر کو لو نظم کو چھوڑو نذیر احمد! کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

حالی نے مغربی طرز کی سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے تین کتابیں حیاتِ سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید لکھی۔

حیات جاوید پر ان کو ہندوستان کا باسول Boswell کہا گیا۔ حالی کی تصانیف میں بھی سعدی کی طرح سادگی تھی۔

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تم

واکر Waker وکٹورین لٹریچر میں لکھتا ہے:

"کسی بڑے شخص کے ساتھ انصاف کرنے کے لیے کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو بڑائی اور عظمت کا خود بھی حامل ہو۔"

حالی نے غالب کی اس پیشین گوئی کو صحیح کر دکھایا۔

شہرت شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

یادگار غالب، غالب کی صحیح فہمی ہے یہ کتاب افراط اور تفریط سے خالی ہے جیسا کہ ڈاکٹر عبداللطیف کی منفی اور بجنوری کی مثبت میں غلو کا اندیشہ ہے۔ کیا یہ زبان سپاٹ اور پھیکی ہے یا ارسال و ابلاغ کا حق ادا کر رہی ہے۔ حیات جاوید کے دیباچہ میں حالی لکھتے ہیں:

"ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے، جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے، تقلید کی جڑ کاٹی ہے۔ بڑے بڑے علما و مفسرین کو لتاڑا ہے، اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے، قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں، جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق کا خطاب دیا ہے اور جس کو پالیٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے، تو کسی نے نہایت راست باز لبرل جانا ہے، ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے ضروری ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کے دیکھا جائے۔"

غالب فہمی کے ایک سرے پر عبدالرحمان بجنوری کا آفاقی جملہ۔ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ وید مقدس اور دیوان غالب دوسری طرف ڈاکٹر عبداللطیف کی منفی

سوانح کہ غالب بڑے شاعر اور بڑے لوگوں میں شمار بھی نہیں کیے جا سکے حالی کی یادگار غالب دراصل صحیح غالب کی شخصیت اور فن پر کھینچی گئی تصویر ہے لیکن غلام مہر رسول لکھتے ہیں:

’’یادگار غالب اپنی تمام خوبیوں کے باوجود غالب کی صحیح، مفصل اور مستند سرگزشت حیات نہیں ہے۔‘‘

’’غالب کی زندگی کے حالات کی تحقیق وفراہمی کے لیے خواجہ حالی کو جو مواقع حاصل تھے، وہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہو سکتے تھے، خواجہ مرحوم غالب کے عزیز شاگرد تھے، تمام شاگردوں میں علم وفضل کے اعتبار سے افضل تھے، غالب کے نہایت ہی عزیز اور دیرینہ دوست نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے رفیق تھے، اکثر غالب سے ملتے رہتے تھے اور ان کے تمام حالات پوچھتے اور سنتے رہے ہوں گے، انہوں نے غالب کی زندگی میں ان کی تمام تصانیف پڑھ لی ہو گی اور جو تحریرات غالب کی زندگی کے واقعات وحالات کا مرقع تھیں، ان کے غیر واضح یا کم واضح حصول کو خود غالب سے واضح کرا لیا ہو گیا یا واضح کرا لینا چاہیے تھا، لیکن افسوس کہ یادگار ان توقعات کو پورا نہیں کرتی جو حالی اور غالب کے گہرے تعلقات کی بنا پر اس کتاب سے وابستہ کی جا سکتی ہیں، اگر شاعر اور ادیب کے سوانح حیات کی ترتیب کا حقیقی مدعا یہ ہوتا ہے کہ اس کی تصانیف کے فہم میں زیادہ سے زیادہ مدد ملے، اس ماحول کے متعلق زیادہ سے زیادہ آگاہی حاصل ہو جائے جس میں صاحب سوانح نے زندگی گزاری جس کی آغوش میں اس کے

خیالات و افکار نے قالب حیات اختیار کیا اور نشو و نما پا کر حروف و
الفاظ کا لباس پہنا تو میری ناچیز رائے میں یادگار کی بلندی پایہ
کے اعتراف کے باوجود کہنا چاہیے کہ وہ اس مدعا کی تکمیل کا مرقع
نہیں بن سکتی۔ غالب کی تصانیف کے مطالعہ کے دوران میں جا
بجا سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کے جواب کے لیے مشتاق نگاہیں
یادگار کے صفحات کی طرف بے اختیار اٹھتی ہیں تو زیادہ تر ناکام
واپس لوٹتی ہیں۔''

حالی نے کم و بیش اٹھارہ کتابیں نثر میں اور چھوٹی بڑی سینتیس (۳۷) کتابیں نظم میں لکھی ہیں اور اس کے علاوہ نامکمل مسودات کا ذخیرہ بھی چھوڑا ہے۔ مولانا کی نثر میں کل حسب ذیل کتابیں ہیں:

''تاریخ محمدی، پر منصفانہ رائے، طبقات الارض، شواہدالالہام،
اصول فارسی، سوانح عمری حکیم ناصر، مجالس النساء، دو حصے،
مولود شریف، حیات سعدی، مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب
حیات جاوید، مقالات، مضامین، مکتوبات وغیرہ۔''

سچ تو یہ ہے کہ ہماری زبان اور ہماری شاعری مولانا کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی، بقول ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب:

''حالی بہت بڑے شاعر اور نقاد تھے اور کچھ اس سے بھی بڑھ کر
تھے، وہ اپنے زمانہ کے ادبی مجدد تھے، جنہوں نے ملک کے
بگڑے ہوئے مزاج کو سدھارا اور سنوارا اور اردو ادب کو پستی
سے نکال کر بلندی کی راہ دکھائی۔
حالی کی نثر بھی اپنے رنگ میں پختگی و سادگی کی وہی آن رکھتی ہے،

جو ان کی نظم میں ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عبارت کی
سلاست اور روانی کے ساتھ معانی کی صحت اور لہجہ کی متانت کو
ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ علمی مسائل اور ادبی نکات کو صاف
اور سلجھے ہوئے فقروں میں اس طرح لکھنا کہ ہلکا پن نہ پیدا
ہونے پائے اگر کسی کو آتا ہو، تو اس نے حالی ہی سے سیکھا ہوگا۔"

یہ سچ ہے کہ مولانا حالی کی چند نثری کتابیں مذہب پر بھی ہیں جس کی زبان بہت سادہ اور ابتدائی زمانے کی ہے۔ وہ حالی سے زیادہ ایک مولوی کی تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ حالی کی سب سے مشہور تصنیف مقدمہ شعر و شاعری ہے۔ جو تنقید نگاری کی سنگ بنیاد ہے۔ آج سو سال سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی اپنا خاص مقام رکھتی ہے۔ بعض معتبر افراد کا خیال ہے کہ اُردو ہی میں نہیں بلکہ عربی اور فارسی میں ایسی عمدہ کتاب کا وجود نہیں۔

شیخ چاند کہتے ہیں:

"یہ فن شعر پر ایسی بلند پایہ اور حکیمانہ تنقید ہے کہ اسلامی ادبیات میں
نہ تو اس سے پہلے لکھی گئی اور نہ آج تک کسی کو لکھنے کی ہمت ہوئی۔"

حالؔی کی پہلی تصنیف ’’مولود شریف‘‘ پر تبصرہ

حالی کی پہلی تصنیف ہے جو اگر چہ ۱۸۷۰ء سے پہلے تصنیف ہوئی مگر حالی کی زندگی میں چھپ نہ سکی۔ ملک رام نے اسے ۱۸۶۴ء کی تصنیف بتایا ہے مگر یہ حوالہ نہیں دیا کہ انہیں یہ تاریخ کہاں سے ملی جبکہ حالی کے بیٹے نے اس کی تاریخ نہیں بتائی۔ حالی کے نواسے خواجہ فرزند علی نے ۱۳۴۲ ہجری میں اپنے مطبع حالی پریس سے شائع کیا۔ یہ کتاب (۹۸) صفحات پر مشتمل ہے جس میں حالی کے چھوٹے فرزند سجاد حسین کی دو صفحہ کی تمہید، مطبوعہ اور زیر طبع کتابوں کا اشتہار کے ساتھ پبلشرز کا نوٹ بھی ہے کہ حالی پریس کا مقصد حالی کی تمام تصانیف کو سلسلہ وار ایک تقطیع پر پوری صحت کے ساتھ شائع کرنا ہے۔ خواجہ سجاد حسین لکھتے ہیں:

> ’’حال ہی میں والد مرحوم کے کاغذات میں ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا مجلد مسودہ مولود شریف کا دستیاب ہوا جو نقل کر کے مطبع کے سپرد کیا گیا۔ مسودے کے آخر میں مولانا مرحوم کے دستخطی یہ الفاظ ہیں:
>
> کاتبہ و مولفہ، محمد الطاف حسین عفی عنہ‘‘

موصوف کی زندگی میں مولود شریف کے نہ چھپنے کے دو سبب ہو سکتے ہیں اول تو غالباً کتاب چھپنے کا انتظام نہ ہو سکا یا بعد میں یہ خیال مانع ہو کہ ولادت شریف کے

متعلق جو روایات لکھی گئی ہیں اور جس پیرائے میں ان کو تالیف کیا گیا ہے وہ اس زمانے کے مناسب حال نہیں۔ اس کتاب کے متن سے معلوم ہوتا ہے کہ حالی فنا فی عشقِ رسول ﷺ تھے۔ مولودنامہ میں قرآنی آیات احادیث نبوی ﷺ تاریخ اسلام کے واقعات سلیس شگفتہ اور پُرتاثیر انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ حالی نے متن کو اشعار سے تزئین کیا ہے۔ عشق نبوی ﷺ کی علامتیں آیات قرآنی حوالوں سے پیش کرتے ہیں۔ اول علامت ہر بات میں اور ہر کام میں حضور نبی کریم ﷺ کی پیروی اور دل کی خواہشوں کو شرع کا تابع دار کر دینا۔ دوم علامت محبوب کو ہر وقت یاد رکھنا اس کا نام محبت ہے۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ　　　ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

تیسری علامت آپ کا ذکر سُن کر مراتب تعظیم وتکریم بجا لانا اور خضوع وخشوع اور عجز وانکساری کی صورت بن جانا۔ چوتھی علامت قرآن مجید کی تعظیم وتکریم ہے۔ کوئی شے ایمان کو مضبوط کرنے والی قرآن پڑھنے اور قرآن سننے سے زیادہ نہیں۔

پانچویں علامت مسلمان بھائیوں کی خیرخواہی اور اُن پر شفقت اور ان کی مشکلوں میں کام آنا۔ چھٹی علامت یہ ہے کہ آدمی جانور درخت پتھر شہر مسجد کنواں اور اس کے سوا جس شئے کو بھی حضرت کے ساتھ کچھ نسبت ہو اس کی محبت اور تعظیم بعینہ آپ کی محبت اور تعظیم ہے۔ کہیں کہیں کچھ اُردو فارسی اور عربی کے اشعار نظر آتے ہیں۔ کتاب کا خاتمہ مناجات پر ہے۔ حالی کے دو شعر جو اسی کتاب میں ہیں اُن پر اس مختصر ریویو کو تمام کرتے ہیں۔

اگر نصیب ہو یثرب میں جا کے شربت مرگ　　　پیوں نہ آب بقا عمر جاوداں کے لیے
اگر بقیع میں گز بھر زمیں میسر آئے　　　کروں نہ طول عمل روضہ جناں کے لیے

حآلی کی چار نثری کتابوں پر مختصر گفتگو

الف۔تریاق مسموم

پادری عمادالدین پانی پتی کی فتنہ خیز کتاب ’’ہدایت المسلمین‘‘ کا جواب ہے۔ پادری نے اسلام اور عیسائی مذہب کا تقابل کر کے میسیحیت کو اسلام سے اچھا مذہب بتایا تھا۔ اس کتاب میں پیغمبر اسلام پر شدید اعتراضات کیے گئے تھے۔ حالی نے سب اعتراضات کا مدلل اور محکم جواب دیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۶۷ء میں تصنیف ہوئی۔ حالی کے جوابات دہلی کے ماہوار رسالہ ’’خیرالواعظ‘‘ میں بھی سلسلہ وار شائع ہوتے رہے۔ حالی کے نواسے نے اس کتاب کا اڈیشن حالی پریس سے بھی شائع کیا۔

ب۔طبقات الارض

ڈاکٹر لٹز کی کتاب طبقات الارض کا عربی سے اُردو میں ترجمہ ہے۔ جو ۱۸۸۳ء پنجاب یونی ورسٹی سے شائع ہوا۔ یہ کتاب پنجاب یونی ورسٹی کے کالجوں کے نصاب میں شامل تھی۔ حالی نے اپنا حق تصنیف بغیر معاوضے کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا۔

ج۔ مجالس النساء

حالی نے ڈپٹی نذیر احمد کی ناول مراۃ العروس سے متاثر ہو کر اسی موضوع پر مجالس النساء کتاب لکھی جس میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلم و تربیت اور بچوں کی پرورش کے طریقوں کو ایک قصے کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔ حالی نے اس کتاب کو اپنے لاہور کے قیام کے دوران ۱۸۷۴ء میں تصنیف کی۔ کرنل ہال رائیڈ کتاب سے متاثر ہو کر حکومت سے انعام کی سفارش کی۔ وائسرائے نارتھ بروک نے پادشاہ ایڈورڈ ہفتم کی آمد پر ۱۸۷۵ء میں دلی میں منعقدہ دربار میں حالی کو چار سو روپے کا انعام دیا۔

مجالس النساء تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل کتاب ہے جس میں نو چاپڑ ہیں اور ہر چاپڑ کو مجلس کا نام دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں باتوں باتوں میں اخلاق کا درس علم اور تعلیم کی اہمیت اور ضرورت، سماجی اور فیملی قدروں کی نشوونما، نظافت اور صحت کی توجہ سلیس شگفتہ اور دل کش انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ سرسید کی تحریک اور انگریزوں کی علم نوازی اور ترقی بھی دیانت داری کے ساتھ معاشرہ کی بہبودی کو پیش نظر رکھ کر بیان کی گئی ہے۔ یہ کتاب انگریزوں کی تہذیب اور سیاست کی مدح سرائی نہیں بلکہ معاشرے کو اُبھرنے اور ترقی کرنے کے لیے ان ذریعوں سے استفادہ کی تلقین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برصغیر میں اس کتاب نے مثبت رول ادا کیا۔

اس کتاب میں حالی نے قصہ گوئی کے ساتھ ساتھ لطیفہ گوئی بھی کی ہے تا کہ کہانی دل کش اور دل نشین بھی ہو۔ ان کی گفتگو میں نرم، لہجہ اور دھیما پن ہے اور نصیحت کے جملے کچھ ایسے انداز سے کہے گئے ہیں کہ وہ حدیث دلبری معلوم ہوتے ہیں اور سننے والا دل سے اُسے قبول کرتا ہے کہ یہ نصیحت کرنے والا میرا ہمدرد اور مہربان شخص ہے۔

حالی پریس پانی پت سے یہ کتاب ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پوری کتاب کی زبان سادی سلیس شگفتہ اور روزمرہ میں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چند عورتیں باتیں کر رہی ہیں۔ مکالموں کی صورت میں گفتگو کی گئی ہے۔ جس میں برصغیر کی تہذیب اور معاشرے کی قدروں کو لاشعوری طور پر سطروں اور بین السطور رکھا گیا ہے۔ زیادہ تر قصے اصلیت کا رنگ لیے ہوئے ہیں بعض قصوں پر قدیم اساطیر قصوں کی چھاپ ہے مگر ان میں بھی کہانی پن موجود ہے۔ تشبیہات اور مثالوں سے اہم نکات کو ذہن نشین کیا گیا ہے۔

''علم بادشاہ ہے اور ہنر اس کا وزیر ہے جیسے بادشاہ بغیر وزیر کے نکما ہوتا ہے اسی طرح علم بغیر ہنر کے دنیا میں کچھ کام نہیں آتا۔''

''بچے کی پرورش کرنا ایسا ہے جیسے کھیتی کو پانی دینا جس طرح پانی کی طغیانی کھیتی کو نقصان پہنچاتی ہے اسی طرح حد سے زیادہ پیار بچے کو خراب کر دیتا ہے۔''

اس کتاب کی ہر مجلس کا آغاز ایک دلچسپ مکالمے سے ہوتا ہے اور اس میں ایک قومی، تہذیبی معاشرتی مسئلہ پر بات چیت کر کے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ جیسے مجلس اوّل میں علم کی اہمیت اور ضرورت بتا کر یہ سبق دیا جاتا ہے کہ اگر عورتیں اپنے بچوں کو خود تعلیم دیں تو ملک وقوم کی ترقی لازمی ہے۔ مجلس دوم میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح بچوں کو باتوں باتوں اور کھیل کود کے وقت درس اخلاقی دیا جا سکتا ہے۔ مجلس سوم میں ہمارے معاشرے کے زوال اور بربادی کی بے کار رسمیں تو ہم پرستی کو بیان کر کے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ چوتھی مجلس میں ایک خانہ دار شریف خاتون کے گھریلو کام کاج جیسے پکانا، سینا پرونا، گھر کی صفائی اور دھونا دھلانا وغیرہ کی اہمیت اور اس میں پوشیدہ ہنر کی داستان سرائی ہے۔ پہلے قصے کی آخری مجلس میں عورت کے معاشرتی زندگی سے جڑے

ہوئے چھوٹے بڑے کاموں اور رسومات و روابط پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اس کتاب کے دوسرے حصے میں زیادہ پھیلا کر اور قصوں کہانیوں کے پیکروں میں بیان کی گئی ہیں۔

د۔ حیاتِ سعدی

اُردو بیوگرافی کی پہلی اور عمدہ مستند کتاب ہے۔ جو شرف الدین مصلح سعدی شیرازی پر بھی اُردو اور فارسی میں ان کی سوانح نگاری شخصیت اور فن پر ریویو کے حساب سے بھی پہلی کتاب محسوب ہوتی ہے۔ یہ کتاب تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔

اس کتاب میں دو باب اور ایک خاتمہ ہے پہلے باب میں سعدی کی سوانح عمری اور دوسرے حصے میں ان کی تصنیفات کا مفصل ذکر ہے۔ خاتمہ میں ان کے حالات اور شاعری پر اجمالاً گفتگو کی گئی ہے۔ اس کتاب کے مواد کو حالی نے بڑی تحقیق اور کوشش سے فارسی، اردو اور انگریزی حوالوں سے جمع کر کے، ان کی صحت اور چھان بین کر کے پیش کیا چناں چہ اس گراں قدر تصنیف کا ترجمہ فارسی میں ہوا جس سے سعدی فہمی کے دروازے ساری دنیا میں کھلنے لگے۔ ذیل میں حیاتِ سعدی کے متن کے اقتباسات لکھ کر اس عظیم شاعر کے تعارف، مقام اور فن کو پیش کرتے ہیں۔

☆ نام شرف الدین، مصلح لقب اور تخلص سعدی۔ وفات ۶۹۱ ہجری

یکی پرسید سال فوت گفتم ز خاصان بود از ان تاریخ شد خاص

۶۹۱ ہجری

تاریخ ولادت نہیں معلوم۔ عمر کسی نے (۱۰۲) اور کسی نے (۱۲۰) برس بتائی ہے۔ اگر چہ شیراز میں پیدا ہوئے اور وہیں دفن ہیں لیکن زندگی کا ایک سوم حصہ مسافرت

میں گزرا۔ شیراز کی تاریخی اہمیت اور وطن دوستی پر شعر دیکھیے:

از نقش و نگار و در دیوار شکستہ   آثار پدید است صنا دید عجم را

''یعنی ٹوٹے ہوئے درودیوار کے نقش و نگار سے ایرانی عمارتوں کے آثار نظر آتے ہیں۔''

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت   کنار آب رکنا باد گل گشت معلیٰ را

لیکن جب شیراز تباہ ہوا تو بغداد جا کر ناظمیہ میں تعلیم حاصل کی۔ کہتے ہیں کہ

''اے سعدی! وطن کی محبت ٹھیک ہے مگر اس وجہ سے کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں سختیاں جھیل کر مرنا نہیں چاہتا۔''

سعدیا وطن گرچہ حدیث ست صحیح   نتوان مرد با سختی کہ من اینجا زادم

حالی لکھتے ہیں سعدی نے مدرسہ ناظمیہ میں زیادہ تر علم سلوک اور علم ادب، دینیات، وعظ و خطابت کی طرف توجہ کی اور پھر مختلف ملکوں کی سیر وسیاحت کی۔ حالی نے گوراوسلی اور دیگر افراد کی بات کو استدلال سے غلط قرار دیا کہ سعدی ہندوستان آئے تھے جو شعر سعدی کے نام سے مشہور ہیں وہ درحقیقت دکن ریختہ گو سعدی کے ہیں۔ حالی نے سعدی کی تصنیفات اور تالیفات کا مفصل ذکر کر کے ان پر عمدہ ریویو بھی کیا ہے۔ سعدی کا کلام ان کے انتقال کے چالیس سال بعد جمع کیا گیا جس میں سلوک اور تصوف پر چند مختصر رسالے، گلستان، بوستان، چار غزلوں کے دیوان، قصائد فارسی اور عربی پندنامہ، اور مجموعہ رباعیات، قطعات اور مفردات شامل ہیں۔ سعدی کی گلستان فارسی کی چار عظیم کتابوں شاہنامہ فردوسی، مثنوی معنوی مولانا روم اور دیوان حافظ میں شمار کی جاتی ہے۔ سعدی کو غزل کا پیغمبر بتایا گیا ہے۔

در شعر سہ کس پیمبراند   ہر چند کہ لانبی بعدی

ابیات و قصیدہ و غزل را   فردوسی و انوری و سعدی

''یعنی شاعری میں تین پیمبر گزرے ہیں اگرچہ حضور نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آیا۔ نظم، قصیدہ اور غزل میں فردوسی، انوری اور سعدی ہیں۔''

حالی نے یہ بھی بتایا ہے کہ امامی ہروی کو اگرچہ دوسرے شاعروں اور ادیبوں سے سعدی سے بڑا شاعر بتایا ہے لیکن سعدی پوری دنیا میں چھایا ہوا ہے اور امامی کتابوں میں بند پڑا ہے۔ حالی نے لکھا ہے کہ گلستان کے ترجمے عربی میں سعدی کے انتقال کے سو سال بعد ہی شروع ہو چکے تھے۔ لیکن یورپ کی زبانوں میں سولہویں صدی عیسوی سے تراجم ہونے لگے۔ ''گلستان'' کی طرز پر لکھی جانے والی جامی کی ''بہارستان''، خوافی کی ''خارستان'' اور قاآنی کی ''پریشان سے گلستان'' کا تقابل کر کے اس کی عظمت اور عالی مقام کو اشعار سے واضح کیا ہے ۔ حالی نے اشعار اور نثر سے مصرعے ضرب المثل کی ایک طویل فہرست بھی دی ہے۔ سعدی کے نثر اور نظم کا عمدہ نمونہ بھی اس کتاب میں شامل کیا ہے۔

حالؔی کے اخلاقی تعمیری اور سماجی منتخب اشعار

حالی نے سعدی کی گلستان اور بوستان سے متاثر ہوکر اپنی نظم اور نثر کو پرتاثیر کیا۔ وہ سعدی کے بہت سے نکات اُردو میں پیش کرتے ہیں اسی لیے انہیں سعدی ہندوستان کہا جاتا ہے۔ حالی کے کلام سے کتاب اخلاق مرتب کی جائے تو شاید ہی کوئی درس اخلاقی اس میں نہ رہے حکایت روایت، قصے کہانیاں پندو وعظ سب کچھ اس صحیفہ میں موجود ہیں۔ یہاں مشتی از خروار بطور ثبوت رقم کر رہے ہیں۔

جو چاہو فقیری میں عزت سے رہنا — نہ رکھو امیروں سے ملت زیادہ
کرو علم سے اکتساب شرافت — نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ
بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ — مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے — نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ
فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

یہ کہنا کہ حالی کی تمام تر شاعری سیدھی سادی سلیس وشگفتہ نرم و رواں دواں ہے۔ شاید صحیح نہیں اس میں ادق غیر مانوس مشکل عربی، فارسی کے الفاظ اور ترکیبیں بھی شامل ہیں۔ بعض مقامات پر تلمیحات اور اسلامی فقروں اور اصطلاحوں کی وجہ سے اشعار

عامی کی سمجھ سے باہر ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ غالب کی شاگردی کا اثر ہو جیسا ذیل کی غزل میں مقناطیس عصیاں، کمند صید غفراں کلید باب رضواں، دست برد اہرمن، مہر سلیمان اور دستاویز استخلاف رحماں جیسے تراکیب اور تلمیحات کا ہجوم ہے۔

جاذب رحمت ہے مقناطیس عصیاں اپنے پاس — رکھتے ہیں عاصی کمند صید غفراں اپنے پاس
عاجزوں سے مقتدر کرتے ہیں اکثر درگزر — عجز اپنا ہے کلید باب رضواں اپنے پاس
دست برد اہرمن کا جس کو کچھ کھٹکا نہیں — ہے بحمداللہ وہ مہر سلیماں اپنے پاس
دیکھنا حالی نہ دینا وضع فطرت کو بدل — ہے یہ دستاویز استخلاف رحماں اپنے پاس

پوری غزل اخلاقی اسلامی اور دینی قدروں سے لبریز ہے۔ حالی کی شاعری میں صرف واعظانہ اور ناصحانہ لہجہ ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ انسانی قدروں کی تعمیر میں اپنے وجود کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔

کاٹیے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح — جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح
رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرماں روا — نفس پہ رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح
آس کھیتی کے پنپنے کی انہیں ہو یا نہ ہو — ہیں اُسے پانی دیئے جاتے کسانوں کی طرح
کام سے کام اپنے ان کو گو ہو عالم نکتہ چیں — رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح
کیجے کیا حالی نہ کیجے سادگی گر اختیار — بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

حالی نے سخت لہجہ اور منفی فکر واعظ اور زاہد سے علاحدگی کا اعلان کیا ہے۔ زاہد کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

درگزر گر نہیں کرتا وہ گنہگاروں سے — تو ترا اور کوئی ہو گا خدا اے زاہد
میں تو سو بار ملوں دل نہیں ملتا تم سے — تو ہی کہہ اس میں ہے کیا میری خطا اے زاہد
عیب حالی کے بہت آج کیے تو نے بیاں — ذکر کچھ اور کر اب اس کے سوا اے زاہد

حالی غزل کے اشعار میں قوم کی کمزوریاں اور برائیوں کو چودہ اشعار میں

بیان کرتے ہیں۔ اس طرح وہ غزل کے دامن کو وسعت دیتے ہیں اور غزل کو صرف عشقیہ مضامین تک محدود نہیں رکھتے۔ ان اشعار میں قوم کی لغزشوں کی نشان دہی ہے جس کی اصلاح قوم کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر　　ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر
خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم　　گو دکھاتے آپ کو ہیں شیر نر
کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب　　کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر
گر کسی کا عیب سن پاتے ہیں ہم　　کرتے ہیں رسوا اسے دل کھول کر

حالی انتہا پسندی کے مخالف تھے۔ وہ مسائل کو نرمی اور محبت سے حل کرنا چاہتے تھے۔ ان کی اصلاح میں اعتدال اخلاص اور نیک نیتی تھی تمثیل سے واضح کرتے ہیں۔

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی　　کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے دھبے کو پہ اتنا نہ رگڑ　　دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا　　کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں
ہر بشر سے اس کی مختص ہیں عطائیں خاص خاص　　ہر مرض کو راس ہیں جیسے دوائیں خاص خاص
زہد وتقویٰ سے نہیں ہوتیں دُعائیں مستجاب　　وقت ہیں کچھ خاص خاص اور ہیں ادائیں خاص خاص
جو قناعت کے ہیں حالی مہماں　　ان کو فاقے ہیں مزعفر سے لذیذ
انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے　　جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا
جانور آدمی فرشتہ خدا　　آدمی کی ہیں سیکڑوں قسمیں
حالی کٹے گا کاٹنے ہی سے یہ بے ستوں　　حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کیے بغیر
ہلانے سے روزی کی گر ڈور ہلتی　　تو روٹی نکموں کو ہر گز نہ ملتی
وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی　　کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

دشمن سے بڑھ کے کوئی نہیں آدمی کا دوست
منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر

کمال کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے
یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی

جی گئے ہم پہ رہے مردوں سے بدتر حالی
دیکھ لی ہم نے طبیبوں کی مسیحائی بھی

قیاس آپ پر سب کو کرتے ہو حالی
نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خدائی

وہی جو کہ کرتا ہے رائی کو پربت
وہ پربت کو بھی کر دکھاتا ہے رائی

قوم کو حالی نہیں راس اتفاق
پھوٹ ہی کا بس کھلے گا ہم پہ رنگ

رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

گر نہیں سنتے قول حالی کا
پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

اسباب پہ گر نظم جہاں کا ہے مدار
اس قوم کا جینا ہے حالی دشوار

ادبار بھی دیکھو گے جہاں پاؤ گے اسلام
اسلام کا ادبار بھی اک نام ہے گویا

آ رہی ہے چاہ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

امت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر
اسلام ہے فقیہو ممنوں بہت تمہارا

تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے وقت کی
چھوڑے گا وقت انہیں نہ مسلماں کیے بغیر

قبر اویس پہ ہے بس فخر اب قرن کو
زندہ اویس کوئی باقی نہیں قرن میں

اس دورِ آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم
اک ہاشمی تمہارا مصلح کھڑا کیا ہے

سرسبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں
فتووں سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے

وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا
یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے

وار اس پہ قوم کے ہیں وہ قوم کی سپر ہے
قوم اس سے بدگماں ہے وہ قوم پر فدا ہے

تعلیم کی تمہاری بنیاد اس نے ڈالی
ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

آنکھ سب ایک کھلی رکھتے ہیں اور ایک مندی
اس میں مسلم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی

کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم

جہاز ایک گرداب میں پھنس رہا ہے
پڑا جس سے جوکھوں میں چھوٹا بڑا ہے

بچو گے نہ تم اور ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں

ہو مسلمان اس میں یا ہندو
بدھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

جعفری ہووے یا کہ ہو حنفی
جین مت ہو یا ہو بشنوی

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو
سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

کیا یہ حالی کے اشعار ہمارے لیے اکیسویں صدی کے لیے نہیں ہیں۔

حکومت نے آزادیاں تم کو دیں ہیں
ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں
نہیں بند صنعت و حرفت کی راہیں

بہت قافلے دیر سے جا رہے ہیں
بہت بوجھ بار اپنے لدوا رہے ہیں

مگر ایک تم ہو کہ سوتے ہو غافل
مبادا کہ غفلت میں ہو کھوئی منزل

نہ ہو تاب پرواز گر آسمان تک
تو واں تک اڑیں ہو رسائی جہاں تک

بنے قوم کھانے کمانے کے قابل
زمانے میں ہو منہ دکھانے کے قابل

تمدن کی مجلس میں آنے کے قابل
خطاب آدمیت کا پانے کے قابل

ضرورت نہیں یہ کہ فرماں رواں ہوں
رعیت ہو وہ خواہ کشور کشاں ہوں

’’مسدس حالی‘‘ سے منتخب اشعار

ہوئی پہلوئے آمنہ رضی اللہ عنہا سے ہویدا
دُعائے خلیل علیہ السلام اور نوید مسیحا علیہ السلام

کہ حکمت کو ایک گم شدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اُسے مال سمجھو

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے
مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے

لبرٹی میں جو آج خالق ہیں سب سے — بتائیں کہ لبرل بنے ہیں وہ کب سے
نواسنجیاں ان سے سیکھی ہیں سب نے — زباں کھول دی سب کی نطق عرب نے
کہ ہم نے بگاڑا نہیں کوئی اب تک — وہ بگڑا نہیں آپ دنیا میں جب تک
رہا دین باقی نہ اسلام باقی — اک اسلام کا رہ گیا نام باقی
شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے — وہ لے جا کے سب اہل مغرب نے جوڑے
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنا — مسلمان بھائی کی تکفیر کرنا
کتاب اور سنت کا ہے نام باقی — خدا اور نبی ﷺ سے نہیں کام باقی
رہے اہل قبلہ کی جنگ ایسی باہم — کہ دین خدا پر ہنسے سارا عالم
نہیں دستیاب ایسے اب دو مسلماں — کہ ہو ایک کو دیکھ کر ایک شاداں
اگر نشہ مئے ہو غیبت میں پنہاں — تو ہشیار پائے نہ کوئی مسلماں
اُسے جانتے ہیں بڑا اپنا دشمن — ہمارے کرے عیب جو ہم پہ روشن
وہ تیلی کے کچھ بیل سے کم نہیں ہیں — پھرے عمر بھر اور جہاں تھے وہیں ہیں
وہ شعر اور قصاید کا ناپاک دفتر — عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
گنہگار واں چھوٹ جائیں گے سارے — جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے
پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے — کہیں مل کے خس کم جہاں پاک سارے
یوں ہی کام دنیا کا چلتا رہا ہے — دیے سے دیا یوں ہی جلتا رہا ہے
نہ ہو تاب پرواز گر آسماں تک — تو واں تک اُڑیں ہو رسائی جہاں تک
ہلانے سے ڈوری کے گر ڈور ہلتی — تو روٹی نکموں کو ہر گز نہ ملتی
وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی — کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی
زمانہ اگر ہم سے زور آزما ہے — تو وقت اے عزیزو یہی زور کا ہے
چھپا دست ہمت میں زور قضا ہے — مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے

چھتیں پاٹ لیں تا کہ باراں سے پہلے
سفینہ بنا رکھیں طوفاں سے پہلے

تو اس سے زیادہ ہے بے عزتی کیا
کہ ہو آدمی کو نہ پاس آدمی کا

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اُس دین میں خود تفرقہ اب آ کے پڑا ہے

جس دین نے تھے غیروں کے دل آ کے ملائے
اُس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے

ایماں جسے کہتے ہیں عقیدے میں ہمارے
وہ تیری محبت تری عترت کی ولا ہے

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمہارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال بُرا ہے

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

حالؔی کے عمدہ اشعار نظموں اور قطعوں میں

پیشہ وری

پیشہ سیکھیں کوئی فن سیکھیں صناعت سیکھیں
کشت کاری کریں آئینِ خلافت سیکھیں
گھر سے نکلیں کہیں آداب سیاحت سیکھیں
الغرض مرد بنیں جرأت و ہمت سیکھیں
کہیں تسلیم کریں جا کے نہ آداب کریں
خود وسیلہ بنیں اور اپنی مدد آپ کریں

کام اچھا کرنا چاہیے نہ جلد

کام اچھا کوئی بن آیا اگر انسان سے
اُس نے کی تاخیر اس میں جس قدر اچھا کیا
کب کیا کیوں کر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں
بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

حالی مذہبی شخصیت تھے۔ نماز و روزہ کے پابند تھے۔ تمام احکام اسلامی کا احترام کرتے تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ حق العباد کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔ خدا اپنے حق میں کسر و کمی دیکھ کر بندے کو بخش سکتا ہے مگر حق العباد میں اس کی گنجایش نظر نہیں آتی۔

مقبول نہ حج ہیں نہ نمازیں ہیں نہ روزے
جب تک غم امت میں نہ جاں اپنی گھلاؤ

اعضا تو نمازوں میں بہت تم نے دکھائے
دل کو بھی کبھی ہاتھ سے کچھ دے کے دکھاؤ
قبل اس کے کہ حج کا کریں کعبے کے ارادہ
حج ہند میں جو اُن پہ ہے فرض ان کو جتاؤ
بن باپ کے بچوں کے ہیں ٹوٹے ہوئے جو دل
کعبے کی طرح گرد طواف ان کے کراؤ
ہندوستان میں کیوں کر باقی رہے نشانی
اس قوم کی کہ تھا کل جن کی وہ زیر فرماں
اک راہبر نے رستہ سیدھا بتا دیا ہے
رستے پہ دیکھیں چلتے اب کتنے کارواں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں
گھڑیال اور مگر مچھ ہیں ان کو نگلے جاتے
دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں

جہالت اور تعصب ترقی پسندی کی راہ میں رکاوٹ ہیں

اک قوی دشمن کا ہے درپیش سب کو سامنا
جس کی روندن میں ہزاروں ہو گئے ویراں چمن
روک دی دریا کی رو حملے سے جو اس کے بچا
کر دیا پربت کو رائی جس نے جیتا اُس سے رن
نام ہے اس کا تعصب اور جہالت ہے لقب
کج روی کا ہے وہ رہبر راستی کا راہ زن
یہ وہ دشمن ہے کہ غالب آ گیا جس قوم پر
ہو گئی وہ قوم آنکھوں دیکھتے زیرو زبر
سہل مت سمجھو تعصب کو بُری ہے یہ بلا
کر دیا ہے اس نے قوموں اور گھرانوں کو فنا
حکم ہے اس کا کہ کوئی قوم جس حالت میں ہے
بس وہی ہے اس کی عزت اور شرف کی انتہا
باپ داد جو گئے ہیں چھوڑیاں رسم و رواج
ناخلف ہے ایک انچ اس سے اگر آگے بڑھا
گر کرو زیر ایسے دشمن کو تو ہے مردانگی
جو ابھرنے کی نہیں دیتا تمھیں پروانگی

مسلمان معاشرہ

جتنے ہیں اوروں میں کھاؤ اتنے ہی واں ہیں کماؤ
یاں کماؤ ایک ہے تو کھانے والا قافلا
اور مفلس ہوں تو روزی کو پھریں کرنے تلاش
یہ جو مفلس ہوں تو قسمت کا پھریں کرتے گلا
اور ہیں سب سود لینے میں یہ دینے میں دلیر
اور ہیں سب لوٹنے پر یہ لٹانے پر فدا

حالؔی کے کلام میں اسقام

کلامِ خالق اور مخلوق کا ایک فرق یہ بھی ہے کہ ایک اغلاط اور سقم سے مبرّا اور دوسرا نقص اور اسقام سے مجہز۔ اُردو ادب کے شاعروں کے کلام میں دنیائے ادب کے شعرا کی طرح زبان اور بیان کی کم و بیش اغلاط موجود ہیں۔ اُردو کے خدائے سخن میر تقی میرؔ سے لے کر بندۂ سخن الطاف حسین حالی اس نقص سے محفوظ نہیں۔ اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کا دیوان ہو یا اُردو کے باوا آدم ولؔی دکنی کا کلیات ہمارے دعوے کے چشم دید گواہ ہیں۔ اگر میرؔ کے چھے دیوانوں میں پست سے پست اشعار میں کچھ بے رنگی اور بے نظمی ہو تو اس سے میرؔ کی عظمت میں کیا فرق آیا۔ اگر میر انیسؔ کے بیاسی ہزار مطبوعہ اشعار میں چند اشکال عبدالغفور خان نساخ نے انتخاب نقص میں جمع کیے تو کتنے لوگوں نے اس پر توجہ کی؟ کیا ہم نے غالب اور قتیل لکھنوی کی داستان نہیں سُنی۔ کہا علمائے عروض نے دل رک رک کے بند ہو گیا غالبؔ پر اعتراض نہیں کیا؟ علامہ محمد اقبال جو بہ ظاہر اپنے آپ کو شاعر کہنے سے بھی کتراتے تھے لیکن جو شخص بھی ان کے کلام میں زبان و سقم کی بات کرتا اُسے کبھی بخشتے نہ تھے۔ باقیات اقبال میں مطبوعہ نظم کے اشعار آج بھی بلند آواز میں رقیب روسیاہ کا پتا دے رہے ہیں۔

حالی فہمی کا تقاضا یہ ہے کہ سکے کے دونوں رخ دکھائے جائیں۔ حالی کے تقریباً ساڑے نو ہزار اشعار میں آٹھ سو اشعار فارسی اور عربی زبان میں ہیں۔ حالی کے اُردو

اشعار ہمیں کئی مقبول اصناف میں نظر آتے ہیں۔ رباعی ہو کہ قطعہ، غزل ہو کہ قصیدہ، نظم ہو کہ مرثیہ ترکیب بند ہو کہ ترجیع بند، مسدس ہو کہ مخمس وغیرہ سب میں کہیں کہیں سقم عیاں اور نہاں ہے جس کی بعض اساتذہ نے نشان دہی کی ہے۔ کسی بھی پُرگو بڑے شاعر کے کلام میں پورے طور پر اسقام کو نمایاں کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اس لیے ہم اس مختصر تحریر میں صرف چند اشارے کر کے علمائے عروض و قافیہ کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر ان کے پاس اضافی وقت میسر ہے تو کوہ کنی کا کام کریں جب کہ اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ کوہ کنی میں چوہا ضرور برآمد ہوگا ہاتھی کے نکلنے کی امید کم ہے۔

☆ حالی نے کئی مقامات پر تصرفات کیے ہیں یعنی انگریزی الفاظ کو کبھی انگریزوں کے تلفظ کے تحت باندھا ہے اور کہیں انگریزی اور اُردو الفاظ میں اضافت برتی ہے۔ کانسٹیبل بنوں گا اوّل بار۔ یہاں کانسٹیبل انگریزی تلفظ کے مطابق Constable باندھا گیا ہے۔ بدمعاش اہلِ پولیس کو نہیں گردانتے کچھ۔ اسی طرح ''رسمِ فانڈیشن'' اور دیگر اضافت صحیح نہیں۔

اودھ پنچ میں کئی نظموں کے اسقام دکھائے گئے۔ نیچری کانفرنس والی نظموں کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ حالی درحقیقت ہر لسانی اور عروضی پابندی کی پروا نہیں کرتے تھے۔ وہ ہندی کے شیرین اور انگریزی کے رائج الفاظ کا فراوان استعمال کرتے تھے۔ بعض اوقات حالی کچھ الفاظ پر نشان لگا کر حاشیے میں معنی لکھ دیتے تھے تاکہ شعر بے معنی نہ رہے اور مطلب واضح ہو جائے یہ عمل بھی حالی کی ترسیلی جدت تھا۔

لڑائی فیلڈ میں دیکھیں کلب میں یونین دیکھیں

بعض افراد نے حالی کے کچھ الفاظ کو مہمل اور غلط بتایا ہے جو صحیح نہیں۔

وہ بھٹیارا جو ہے تندور والا

تنور عربی لفظ ہے لیکن اُردو میں تندور بھی صحیح ہے۔

روز اک سانگ نیا بھر کے نکلنے والے

اصل لفظ سوانگ ہے یہاں سانگ عام تلفظ کے مطابق لکھا گیا ہے۔

بعض علمائے شعر نے لکھا ہے کہ حالی کی بعض نظمیں عروض کے دائرہ سے خارج ہیں۔ رام بابو سکسینہ نے لکھا کہ

''وہ عروض کے دائرہ سے نکل جاتے ہیں۔''

ڈاکٹر گیان چند بھی مناجاب بیوہ کا حوالہ دیتے ہیں اور اس کے مصرعوں کو خارج از بحر کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''حالی وزن فعلن فعلن فعلن فع کو چار فعلن کے مقابل شعر میں لاتے ہیں جو صحیح نہیں۔''

گیان چند نے ان مصرعوں کو جو خارج الوزن ہے نہیں لکھا۔ سچ تو یہ ہے کہ حالی کے کلام میں تعقید زیادہ ہے بعض لوگوں نے حالی کو تعقید کا شہنشاہ کہا ہے۔ ہمیں معلوم نہ ہوسکا وہ تعقید کا شہنشاہ ہے یا وزیر۔ بہرحال صاحب تعقید ضرور ہے۔

جب وہ آیا تھا تو سرتا پا گلستاں تھا یہ ملک — جب گیا یاں سے تو مثلِ دشتِ ویراں تھا یہ ملک

ہم کو نسبت پہ فخر ہے تیری — تو گئی بھول ہم کو خاکِ حجاز

یارب نگاہ بد سے چمن کو بچائیو — بلبل بہت ہے دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ

جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا — سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی

ان تمام کوتاہیوں کے باوجود ہم حالی کے اس شعر پر اس تحریر کو نامکمل ختم کریں گے۔

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے — کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

خطوط حالؔی کا تعارفی جائزہ

اگر سچ پوچھیں تو اُردو میں خطوط نگاری غالب سے پہلے نہ ہونے کے برابر تھی۔ پہلے زمانے میں کم پڑھے افراد یا تو پیغام زبانی بجھواتے یا کسی سے لکھواتے جو عموماً فارسی میں ہوتا اگر اُردو میں بھی ہوتا تو اس میں اُردو سے زیادہ فارسی کے الفاظ شامل رہتے۔ یہ تو غالب ہیں جنہوں نے اُردو میں ایسی خطوط نگاری کی بنیاد رکھی۔ جو پیغام رسانی کے ساتھ لذت بیان اور چٹخارے زبان سے آراستہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی سامنے بیٹھا گفتگو کر رہا ہے۔ ہر خط میں متن اور الفاظ جدا جدا ہوتے جو خط حاصل کرنے والے کی شخصیت اور قربت و مرتبت کے مطابق ہوتے۔ سچ ہے یہ خطوط نگاری غالب سے شروع ہو کر غالب پر ختم ہو گئی۔ جس میں لوگ کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور۔ حالی نے بھی خطوط لکھے لیکن وہ خطوط حالی کی شخصیت سیرت اور علمیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ خطوط میں سلاست، سادگی، محبت روزمرہ کے واقعات اور درد دل شامل ہے۔

حالی کے خطوط ان کے انتقال کے دس گیارہ سال بعد ۱۹۲۵ء میں حالی پریس پانی پت سے دو مجموعوں کی صورت میں شائع ہوئے۔ اسماعیل پانی پتی نے غیر

مطبوعہ خطوط کا ایک اور مجموعہ شائع کیا جس میں ایک سو گیارہ اُردو خطوط اور (۳۸) سے زیادہ فارسی عربی خطوط شامل ہیں۔ دو چار غیر مطبوعہ خطوط ادھر ادھر شائع ہوئے چناں چہ حالی کے مکتوبات کی تعداد (۷۵۰) ساڑھے سات سو خطوط پر مشتمل ہے۔ حالی کے یہ خطوط ان کی آخری عمر کے خطوط ہیں۔ حالی کے خطوط چوں کہ خانگی نوعیت کے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جن میں علی گڑھ اور دوسرے متنازعہ مسائل پر گفتگو تھی اس لیے حالی کے بیٹے سجاد حسین نے خطوط میں ان ناموں اور لفظوں پر سیاہ نقطے لگا دیے تا کہ کسی کے نام سے آزار نہ پہنچے۔ چناں چہ اس دستکاری کی وجہ سے حالی کے خطوط کی تحقیقی اور تحلیلی حیثیت بہت کم ہوگئی۔

اب یہ ممکن نہیں کہ پوری عبارت تحقیق کرنے والوں کے سامنے آئے۔ پھر بھی مطبوعہ مکتوبات سے بہت کچھ واقعات کا علم ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام خطوط کا تجزیہ کر کے حالی کے خاندان معاشرے علی گڑھ اور انگریزوں کے حالات اخذ کیے جائیں۔ حالی کا صرف ایک خط غالب کے نام مکتوبات میں ہے۔ سرسید پر کوئی خط نہیں بہرحال ہمارے درمیان یادگار غالب اور حیات جاوید موجود ہیں۔ اب اس مکتوبات میں کسی اضافے کا بھی امکان نہیں کیوں کہ حالی کا سارا ادبی زخیرہ پانی پت میں ۱۹۴۷ء کی لوٹ مار کی نذر ہو کر تباہ ہوگیا۔

حالؔی کی اصلاح کا نادر نمونہ

سیّد تمکینؔ کاظمی لکھتے ہیں:

’’مولانا حالی کے شاگرد دوسرے علوم وفنون میں تو بہت تھے مگر فن شاعری میں کوئی ان کا شاگرد سننے میں نہیں آیا۔ اگر کسی نے کوئی نظم یا غزل بغرض، اصلاح مولانا کے پاس پیش کی ہو اور مولانا نے اس پر اصلاح بھی دی ہوتو وہ آج تک نظر نہیں آئی۔

میں نے مشاہیر کے خطوط فراہم کرنے شروع کیے تو اپنے بزرگ مولانا سید خورشید علی وظیفہ یاب ناظم دفتر دیوانی مال و ملک حکومت حیدرآباد سے بھی مشاہیر کے خطوط کا تقاضا کیا،مولانا حیدرآباد دکن کے ان بزرگوں میں سے تھے جنہوں نے بچپن سے اپنی زندگی علم وادب ملک و مالک کے لیے وقف کردی تھی۔

موصوف سے ہندوستان، ایران، مصر اور انگلستان کے مشاہیر کی مدتوں مراسلت رہی ہے، مگر بدنصیبی سے موصوف نے ذخیرہ مکاتیب محفوظ نہیں فرمایا، میرے تقاضے پر چند نایاب اور اہم خطوط موصوف نے مجھے عنایت فرمائے ہیں جن میں سے ایک مولانا حالی کا خط بھی ہے، اس کو میں نے اس لیے اہمیت دے رہا

ہوں کہ یہ اصلاح ہے مولانا حالی کی۔

۱۹۰۵ء میں حضور میر محبوب علی خاں بہادر خسرو دکن کی جوبلی کے جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مولانا سید خورشید علی ان دنوں نوجوان تھے اور بیس سال کی عمر تھی، موصوف نے بھی ایک نظم کہی اور اصلاح کے لیے مولانا حالی کی خدمت میں روانہ کی۔ مولانا حالی سے آپ کے ذاتی مراسم تھے کیونکہ ۱۹۰۲ء میں جب مولانا حالی حیدرآباد آئے تھے تو اقبال کلب سے بڑی دلچسپی لی تھی اور مولانا سید خورشید علی اقبال کلب کی روح رواں تھے، اسی خصوصیت کی بنا پر مولانا حالی نے اس نظم کی اصلاح کی اور اصلاح شدہ نظم واپس بھیج دی............

۱۔ ہے جشن جوبلی کی آج اس کی تیاری | ہے زیب جس کو جہانبانی و جہانداری
۲۔ جو اپنے وقت کا نوشیرواں ہے نصفت میں | ہے جس کی ملک میں مشہور عام غمخواری
۳۔ جو دستگیر ہے بے آسروں کا عالم میں | ہے جس کے فیض کا دریا جہان میں جاری
۴۔ خرد میں جو ہے فلاطوں زور میں رستم | ہے بذل وجود میں جو برگزیدۂ باری
۵۔ ہے جو کہ معدن انصاف ومخزن اوصاف | عیاں ہے صورت وسیرت سے جس کی سرداری
۶۔ ہے جس کی ہمت عالی کی دھوم دنیا میں | ہے جس کو بزدلی و کاہلی سے بیزاری
۷۔ کیا ہے ملک کو جس نے نگین خاتم ہند | مٹائی جس نے جفا کاری وستم گاری
۸۔ ہنروروں کا ہے جو قدردان وقدرشناس | سکھائی جس نے رعیت کو ہے وفا داری
۹۔ ہے جو کہ دادگری میں یگانۂ دوراں | ہے بر راحت مخلوق جس کی بیداری
۱۰۔ وہ کون خسرو گیتی پناہ آصف جاہ | نظام ملک دکن زینت جہانداری
۱۱۔ یہ جشن جیوبلی چہل سالہ جشن ہے جس کا | پناہِ دیں شہ محبوب زیب سرداری

۱۲۔ مجھے ہو ناز نہ کیوں آج اپنی قسمت پر — کہ وصفِ شاہِ دکن ہے زبان پر جاری
۱۳۔ اگرچہ مجھ کو نہ تھا ذوق شعر گوئی کا — ولیک حسن عقیدت نے کی مری یاری
۱۴۔ ہوں منعقد ترے اے شاہ ایسے جشن ہزار — مری دُعائے دلی ہے بحضرتِ باری
۱۵۔ تو شادمان و سلامت رہے صدوسی سالہ — ترے ہی نام کا سکہ ہو تا ابد جاری
۱۶۔ ہو تیرے عہد میں یہ شہر روکش لندن — ہو تیرے ملک پہ اور تجھ پہ رحمت باری
۱۷۔ ہمیشہ فتح و ظفر ساتھ ساتھ ہو تیرے — نصیب ہو ترے اعداد کو ذلت و خواری

عکس اصلاح حالی

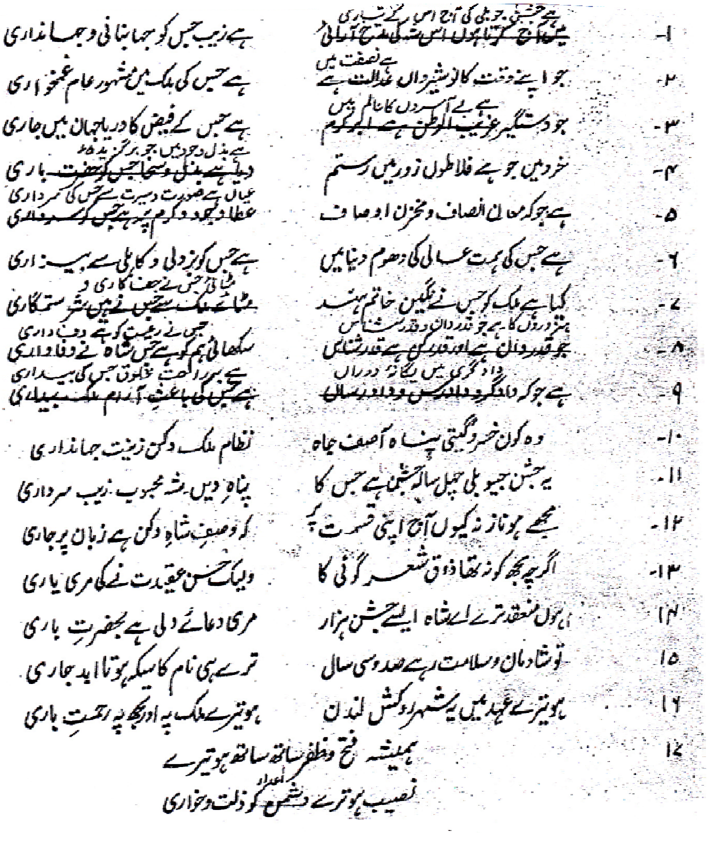

۱۔ ہے جشن جوبلی کی آج اس کے تیاری — ہے زیب جس کو جہانبانی و جہانداری
۲۔ جو اپنے وقت کا نوشیرواں عدالت ہے — ہے جس کی ملک میں مشہور عام غمخواری
۳۔ جو دستگیر غریب الوطن ہے ابر کرم — ہے جس کے فیض کا دریا جہان میں جاری
۴۔ خرد میں جو ہے فلاطوں زور میں رستم
۵۔ ہے جو کہ معدن انصاف و مخزن اوصاف
۶۔ ہے جس کی ہمت عالی کی دھوم دنیا میں — ہے جس کو نزدلی و کاہلی سے بیزاری
۷۔ کیا ہے ملک کو جس نے نگین خاتم ہند — مٹائے ملک سے جس نے ہیں شر ستمگاری
۸۔ جو قدر دان ہے اور قدر کی ہے قدرشناس — سکھائی ہم کو ہے جس شاہ نے وفاداری
۹۔ ہے جو کہ دادگر و ...
۱۰۔ وہ کون خسرو گیتی پناہ آصف جاہ — نظام ملک دکن زینت جہانداری
۱۱۔ یہ جشن جوبلی چہل سالہ جشن ہے جس کا — پناہِ دین، شہ محبوب، زیب سرداری
۱۲۔ مجھے ہو ناز نہ کیوں آج اپنی قسمت پر — کہ وصفِ شاہِ دکن ہے زبان پر جاری
۱۳۔ اگرچہ مجھ کو نہ تھا ذوق شعر گوئی کا — ولیک حسن عقیدت نے کی مری یاری
۱۴۔ ہوں منعقد ترے اے شاہ ایسے جشن ہزار — مری دعائے دلی ہے بحضرتِ باری
۱۵۔ تو شادمان و سلامت رہے صدوسی سال — ترے ہی نام کا سکہ ہو تا ابد جاری
۱۶۔ ہو تیرے عہد میں یہ شہر روکش لندن — ہو تیرے ملک پہ اور تجھ پہ رحمتِ باری
۱۷۔ ہمیشہ فتح و ظفر ساتھ ساتھ ہو تیرے — نصیب ہو ترے دشمن کو ذلت و خواری

حالؔی کے مقطعے

تعارف شخصیت اور پیغام

حالی عموماً غزل اور نظم کے مقطوں میں تخلص استعمال کرتے ہیں جس میں تعلّی کم اور عجز و انکسار اور مضمون سے ربط زیادہ نظر آتا ہے۔ ان مقطوں میں حالی نے اپنی شخصیت کے ساتھ ساتھ اپنے فن اور اپنے پیغام کو پہنچایا ہے۔ چناں چہ ہم نے تخلص کے اشعار کو ترتیب دے کر حالی کی آپ بیتی اور فن پر ریویو کے ساتھ ان کے پیغام کو یہاں پیش کیا ہے۔

الف۔ حالی کے کچھ منتخب اشعار ان کے فن پر یہ ہیں

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے
کچھ رنگ یہاں حالی ہے سب سے جدا تیرا

بے گانگی میں حالی یہ رنگ آشنائی
سن سن کے سر دھنیں گے قال اہل حال تیرا

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

نگہت مے پہ غش ہیں جو حالی
ان کو درد و صفا سے کیا مطلب

جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تم کو حالی
کچھ کر کے بھی دکھائے زور قلم تمہارا

غزل میں رنگت نہیں تیری حالی
الاپیں نہ بس آپ دھرپت زیادہ

شعر میں ناتمام ہے حالی
غزل اسکی بنائے گا اب کون

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامہ مدح و غزل

حالی اٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کہا کیا تو نے

حالی کی ہیں یہی اگر شیوا بیانیاں
لے گا نہ کوئی نام ظہیر و رشید کا

متاع بے بہا ہے شعر حالی
مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

جوش خم بادہ جام خالی میں ہوا
پھر ولولہ پیدا دل حالی میں ہوا

تسلیم نے کچھ اس طرح سے دی داد سخن
مجھ کو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھیں سخن ور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی

حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزم شعر میں
باری تب ان کی آئی کہ گل ہو گئے چراغ

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

ب۔ حالی کی شخصیت

اس کے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف
ہم نہ کہتے تھے کہ حالی کو نہ محفل میں بلاؤ

ڈھارس سی کچھ اے ہم قدموں سے بندھی ہے
حالی کو کہیں راہ میں تم چھوڑ نہ جانا

جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا

غیروں کو لیں گے آخر اپنا بنا کے کیا ہم
اپنوں ہی سے ہے حالی کچھ دل مکدر اپنا

معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا
یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالی مگر
نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

مشکلوں کی جس کو ہے حالی خبر
مشکلیں آساں وہی فرمائے گا

تم نے حالی کھول کر ناحق زباں
کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

یوں تو ہے امید سب کچھ پر نہ ہوں شاید معاف
وہ جو کی ہیں ہم نے اے حالی خطائیں خاص خاص

راضی ہیں ہم کو دوست سے ہو دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا

قال ترا اور حال نشۂ وحدت میں چور
اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

آئے ہو حالی پئے تسلیم یاں
آپ کو چون و چگوں سے کیا غرض

حالی تم اور ملازمت پیر مے فروش
وہ علم دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

اعتراضوں کا زمانہ کے ہے حالی پہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

بہت لگتا ہے دل محبت میں اس کی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

جھگڑوں میں اہل دیں کے نہ حالی پڑیں بس آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

بھلا حالی اور الفت سے ہو خالی
یہ سب تم صاحبوں کا حُسن ظن ہے

تم نے حالی کھول کر ناحق زباں
کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

قیاس آپ پر سب کو کرتے ہو حالی
نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خدائی

کیوں فقیہوں سے رک گئے حالی
بھید تم نے کچھ بتایا صاف

خوش ہے امید خلد پر حالی
کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حالی سے مل کے ہو گئے تم افسردہ دل بہت
اگلے سے ولولے وہ اب اس میں کہاں رہے

غیر سے اب وہ بیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں
بس کوئی دن کا اب حالی یاں سمجھو تم مہماں ہمیں

کی ہے خلوت پسند حالی نے
اب نہ دیکھو گے اس کو مجلس میں

فرصتِ عشق و جوانی الفراق
دور عیش و کامرانی الوداع

جی گئے ہم پہ رہے مردوں سے بدتر حالی
دیکھ لی ہم نے طبیبوں کی مسیحائی

کوچ کی حالی کرو تیاریاں
ہے قویٰ میں دم بدم اب انحطاط

لگ گئی چپ حالیؔ رنجور کو
حال اس کا کس سے پوچھا چاہیے

آ لگا حالی کنارے پر جہاز
الوداع اے زندگانی الوداع

گو طبیعت سے گئے سب مادے فاسد نکل
کم ہوئیں حالی نہ لیکن نفس کی بیماریاں

نہ دی حیرت نے حالی فرصت سیر جہاں اک دم
رہے ہم شہر میں ایسے کہ تھے گویا بیاباں میں

حالؔی کی صد سالہ سالگرہ کا آنکھوں دیکھا حال
صد سالہ برسی کے موقع پر

الطاف حسین حالؔی کا انتقال ۳۱، دسمبر ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں ہوا۔ یہ سال یعنی ۱۹۱۴ء ان کی سوسالہ برسی کا سال ہے۔لیکن دنیائے اُردو میں وہ جوش وخروش نہیں جو حالی کی صد سالہ سالگرہ کے جشن پر ۲۶، اکتوبر ۱۹۳۵ء کو سرزمین پانی پت پر دیکھا گیا۔ حالی ۱۸۳۵ء پانی پت میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء میں پانی پت میں حضرت بوعلی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ پانی پت وہ مقام ہے جہاں ہندوستان کی قسمت کے فیصلے کئی بار ہوئے۔ ماہنامہ زمانہ نے جو دیانگم کی مدیریت میں شائع ہوتا تھا اس صد سالہ سالگرہ کے جشن کی مکمل رپورٹ نومبر ۱۹۳۵ء میں شائع کی۔ ہم یہاں اس مفصل رپورٹ سے کچھ مطالب چن کر قارئین کے لیے بصورت آنکھوں دیکھا حال پیش کرتے ہیں۔

یہ جشن ۱۹۳۵ء کو پانی پت کے میدان جو حالی ہائی سکول اور ڈاک بنگلہ کے درمیان واقع تھا برگزار کیا یا اس میدان میں مہمانوں کے لیے خیموں کا ایک کیمپ قائم کیا گیا جس میں تقریباً سو ڈیرے نصب تھے۔ اسکول کی عمارت کے پیچھے پنڈال تیار

کیا گیا تھا اور اس کی عمارت کو ڈائینگ ہال اور جشن کی نمایش کے لیے سجایا گیا تھا۔ تقریباً چار سو مہمان حالی اسکول کے اطراف خیمہ زن تھے۔

اس جشن کی صدارت کے لیے ہز ہائی نس نواب آف بھوپال حمید اللہ خان کو منتخب کیا گیا تھا۔ بیرونی مہمانوں کی آمد ۲۴/اکتوبر سے شروع ہو گئی تھی چناں چہ علامہ اقبال، ڈاکٹر سر راس مسعود، نواب صدر یار جنگ، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، امین زبیری اور ڈاکٹر علیم وغیرہ مہمانان میں شامل تھے۔ نواب آف بھوپال حمید اللہ خان ۲۶/اکتوبر ۹ بجے صبح پانی پت کے ریلوے اسٹیشن پر پہونچے جہاں ان کے استقبال کے لیے ایک شامیانہ نصب کیا گیا تھا اور ان کے استقبال کرنے کے لیے سر راس مسعود، علامہ محمد اقبال، نواب اسمٰعیل خان اور صلاح الدین سلجوقی کونسل جنرل افغانستان موجود تھے۔ نواب نے تمام ذی وقار حضرات سے مصافحہ کیا اس موقع پر سلامی دی گئی نواب صاحب معزز اراکین کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر قیام گاہ پر تشریف لائے۔ اسی ٹرین میں سر اکبر حیدری، خواجہ حسن نظامی، مولانا شوکت علی اور دوسرے افراد بھی پانی پت وارد ہوے۔ نواب صاحب ناشتہ کے بعد حضرت بو علی قلندر رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ پہنچے جہاں قبروں پر فاتحہ پڑھ کر حالی ہائی اسکول کی عمارت کا معائنہ کرتے ہوئے پنڈال میں تشریف لائے جلسہ گاہ کی ڈائس پر کرسیاں ترتیب دی گئی تھیں۔ جلسہ میں تقریباً پانچ ہزار افراد موجود تھے۔

نواب بھوپال کی صدر نشینی کے بعد خواجہ غلام السیدین نے محمد اسلام چودھری کو تلاوت کلام پاک کے لیے مدعو کیا جس کے بعد اسکول کے طلبا نے اپنی روز آنہ دعا پڑھی حالی کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے استقبالیہ کمیٹی کی جانب سے نواب صاحب کی خدمت میں معروضہ پیش کیا۔ جس میں اسکول کی مالی مشکلات کا ذکر تھا۔ نواب صاحب کو عمدہ پھولوں کا ہار پہنانے کے بعد حالی اسکول کے ایک ٹیچر لئیق احمد نے علامہ

محمد اقبال کے فارسی استقبالیہ اشعار پیش کیے۔ ان اشعار کو ہم سلیس ترجمے کے ساتھ یہاں پیش کر رہے ہیں۔

مزاجِ ناقہ را مانندِ عرفی نیک می بینم　　چو محمل را گراں بینم حدی را تیز تر خوانم

''عرفی شیرازی کی طرح اونٹ کے مزاج کو خوب جانتا ہوں اور
جب محمل کو سنگین دیکھتا ہوں تو حُدی نغمے کو بلند آواز پڑھتا ہوں۔''

حمیداللہ خاں اے ملک و ملت را فروغ از تو　　ز الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم

''حمیداللہ خان کی وجہ سے ملک اور ملت کو بلندی نصیب ہوئی ان
کے لطف و کرم سے میری راہ میں گل اور لالہ کی نشوونما ہو رہی
ہے۔''

طوافِ مرقدِ حالیؔ سزد اربابِ معنی را　　نوائے او بجا نہا فگند شوری کہ می دانم

''حالی کی قبر کا طواف اہل فہم کو جچتا ہے کیوں کہ ان
کے کلام کی آواز لوگوں کی زندگی میں انقلاب بپا کر
دیتی ہے جس سے میں واقف ہوں۔''

بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازم　　تو بر خاکش گہُر افشاں و من برگِ گل افشانم

''آ کے فقر اور شاہی کو حالی کے حضور میں مل کر پیش کریں، تو ان
کی قبر پر جواہر نچھاور کر اور میں پھولوں کو بکھیر دوں۔''

علامہ محمد اقبال کی نظم خوانی کے بعد مولانا عبدالحق معتمد انجمن ترقی اُردو نے مولانا حالی بحیثیت شاعر نثر نگار و نقاد تقریر کی۔ خواجہ غلام السیدین نے مولانا حالی بحیثیت مصلح قوم اور ڈاکٹر ذاکر حسین امیر جامعہ دہلی نے مولانا حالی بحیثیت محب وطن تقریریں کیں۔ مقامی شعرا نے نواب صاحب کی شان میں نظمیں پڑھیں۔ حفیظ جالندھری نے ''دورِ حالیؔ'' کے عنوان سے نظم پڑھی۔ ڈاکٹر سر راس مسعود نے اعلان کیا

کہ نواب صاحب نے حالی اسکول کے لیے بیس ہزار روپیہ کا عطیہ منظور کیا، وزرائے بھوپال اور پنجاب گورنمنٹ نے بھی ایک ہزار روپے کی امداد کا اعلان کیا۔ لنچ کے بعد معززین کے پیغامات سنائے گئے کچھ انعامات نواب صاحب کے توسط سے معزز مہمانوں کو دیے گئے۔ نواب آف بھوپال نے مولانا حالی اور اُن کے احسانات کے عنوان پر تقریر کی جس کے کچھ اقتباسات یہ ہیں۔

''پانی پت کی سرزمین پر اگرچہ بارہا ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہوا ہے۔ لیکن گذشتہ صدی کی سب سے بڑی خصوصیت اور فضیلت یہ ہے کہ وہ مولانا حالی کا مولد و مدفن ہے۔ مولانا حالی ہر حیثیت سے اس کے مستحق ہیں کہ ان کے احسان شناس ہر ممکن ذریعہ سے ان کی یادگار کو قائم رکھیں تاکہ نوجوانوں میں ان کی تقلید اور تتبع کی تحریک ہو۔ بلاشبہ اُن کی سب سے پہلی اور سب سے بڑی خصوصیت اُردو کے شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ہے حقیقت میں وہ اُردو شاعری کے دَور جدید کے بانی اور موجد ہیں۔ انہوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملک اور قوم کی اصلاح میں صرف کر دیا اور اس کا نتیجہ ہے وہ غیرفانی اور عدیم المثال کتاب ''مدوجزر اسلام'' المعرف بہ مسدس حالی جس کی نسبت سرسید نے بجا فرمایا ہے کہ قیامت میں اگر خدا مجھ سے پوچھے گا کہ کیا لایا تو میں مسدس حالی پیش کر دوں گا۔ مرحوم کے مقدمہ شعر و شاعری نے شعرا کے سامنے ایک نیا اور وسیع میدان کھول دیا اور اس سے جو عظیم انقلاب ہندوستان شاعری میں پیدا ہو گیا اس کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے جس کی مثال میں دورِ حاضر کے سب سے

بڑے فلسفی شاعر اقبال کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ حالی کے کام میں تعصبِ مذہبی کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ اور ان کے پندونصائح سے تمام اہل وطن یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ سب سے بڑا سبق ہے جو ہم کو مرحوم کی زندگی سے لینا چاہیے کیوں کہ اگر ہم آپس میں رواداری کا برتاؤ کرنے لگیں تو یقینا ہمارے سارے جھگڑے مٹ جائیں گے۔ ہمارے بزرگوں نے اسی ملک میں ہزار برس تک باہم شیر وشکر رہ کر زندگی بسر کی ہے کیا وہ اپنے مذہب کے سچے پرستار نہ تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دنیا بھر کے مذہبوں کے اصل اصول ایک ہیں۔ ہر مذہب نکوکاری کی تلقین کرتا ہے، ہر مذہب ہمدردی اور رواداری کی تعلیم دیتا ہے تو پھر کیا ہم ان اصول اصلیہ کے اشتراک کے باوجود بھی لکم دینکم ولی دین کے ذرین اصول پر کاربند نہیں ہو سکتے اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ دوستی اور اتحاد کا برتاؤ نہیں کر سکتے۔"

اس تقریر کے بعد حالی اسکول میں بڑے پیمانہ پر ایٹ ہوم ہوا اور جلسہ اختتام کو پہنچا۔ راقم اس تحریر کے آخر میں یہی کہے گا۔

گلستاں میں جا کر ہر اک گُل کو دیکھا
نہ تیری سی رنگ نہ تیری سی بو ہے
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

حیاتِ جاوید-- حالیؔ کا جاودانہ شاہکار

حالی کے نثری کارناموں میں مقدمہ شعر و شاعری، یادگار غالب، حیات سعدی اور حیاتِ جاوید کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ حیات جاوید سرسید کی سوانح عمری ہے جو تقریباً نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ حالی نے سرسید کی سوانح عمری لکھنے کا کام سرسید کی زندگی میں شروع کیا لیکن اس کی تکمیل اور اشاعت سرسید کے انتقال کے دو تین برس بعد ہوئی۔ حیات جاوید کا سارے ملک میں جاودانہ استقبال کیا گیا۔ چند مشاہیر ادب نے اس کے نقایص اور متنازعہ مسائل کی نشاں دہی کی جن میں شبلی، صدر یار جنگ شیروانی، وحیدالدین سلیم کے علاوہ کئی پردہ نشین مرد بھی شامل تھے،جنہیں حالی کا ہر کام خالی اور حالی ڈفالی نظر آتے تھے۔شبلی نعمانی نے اسے کتاب المناقب مدلل مداحی کذب اور جھوٹ کی داستان کہا،صدر یار جنگ شیروانی نے شبلی کے اعتراضات پر صاد کا نشان لگایا۔

وحیدالدین سلیم جن کو حالی نے عظیم بنایا لکھا کہ جو ادعا حالی نے دیباچے میں کیا پوری کتاب میں اس کا شمہ برابر بھی حق ادا نہیں کیا۔ یہ تمام افراد سکے کے دونوں رخ یعنی سرسید کی مدح کے ساتھ ان کے بعض کاموں کی قدح بھی دیکھنا چاہتے تھے جو حیات جاوید میں کہیں جلی اور کہیں خفی حالی نے سطور اور بین السطور بیان کی ہے۔ جہاں

تک سرسید کے مذہبی خیالات اور اجتہادی روش کا تعلق ہے۔ حالی نے اُس سے اتفاق اور اختلاف کیا ہے۔ اگرچہ مدح کا پلڑا قدح کے مقابل بہت وزنی ہے لیکن حالی نے تنقید اور تنقیص کے کانٹوں سے سرسید کی پھلواری شخصیت کو تار تار نہیں کیا جو بعض اوقات غربی سوانح نگار کرتے ہیں۔ حالی نے یہ بھی تاکید کی کہ ابھی مشرقی ماحول میں کریٹکل بیوگرافی کا وقت نہیں پہنچا۔ چناں چہ آگے آنے والے اس رخ سے بھی نقاب کشی کریں گے:

> ''حالی کے قول کے مطابق اگر حیات جاوید سرسید کی زندگی میں شائع ہو جاتی تو وہ عظمت جس کی وہ مستحق تھی اس کو حاصل ہونی دشوار تھی اوّل تو جب کبھی سرسید کے سامنے ان کی لائف لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا جاتا تھا تو وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ میری لائف میں سوا اس کے لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں، کنکوے اڑائے، کبوتر پالے، ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری کافر اور بے دین کہلائے اور رکھا ہی کیا ہے۔''

سچ تو یہ ہے کہ سرسید اپنی سوانح لکھوانے کے بڑے آرزو مند تھے۔ انہوں نے کئی بار بلاواسطہ شبلی نعمانی کو اس کام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ کبھی دوست واحباب سے پیغام کبھی کسی دوست کے خواب کی تفصیل کے شبلی سرسید کی سوانح لکھ رہے ہیں۔ شبلی تک پہنچاتے تھے لیکن شبلی راضی نہ ہوئے۔ ۱۸۸۹ء میں کرنل گریہم نے انگریزی میں سرسید کی بائیوگرافی شائع کی جو بقول ایک انگلش اخباری ریویو ایک مکمل بائیوگرافی ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی تھی۔ سرسید کے دوست حاجی اسماعیل خاں نے مُنشی سراج الدین احمد مالک چودھویں صدی کو سرسید کی سوانح لکھنے پر راضی کیا۔ جنھوں نے میٹریل جمع کر کے حاجی اسماعیل خاں کو دیا جو مسودے کی شکل میں پڑا رہا چناں چہ آخر کار حالی نے بذاتِ خود چند ماہ علی گڑھ میں رہ کر سوانح کا مواد جمع کیا ور مُنشی

سراج الدین کا جمع شدہ مسودہ بھی حاصل کر کے حیات جاوید تکمیل کی۔ سرسید کی بیوگرافی لکھنا آسان کام نہ تھا۔ سرسید ایک ہمہ جہت بلکہ مختلف الجنس حیثیتوں کے مالک تھے۔ ان کے دوست اور دشمنوں کی کمی نہ تھی وہ کہیں صدیق اور کہیں زندیق سمجھے جاتے تھے۔ ان کی زندگی کے حالات غدر کے بعد تو آسانی سے دستیاب تھے مگر اس سے پہلے کے حالات کا جمع کرنا مشکل تھا۔ سرسید کی زندگی میں انقلابات کی کمی نہ تھی۔ غدر کے بعد بہت سی معلومات انگریزی فائلوں میں تھیں جنکا ترجمہ بھی ضروری تھا۔ حالی نے یہ تمام امور دقیق دیدہ ریزی اور محنت سے کی۔ سرسید کے غدر سے قبل کے کچھ حالات حالی نے سیرت فریدیہ سے لیے جو سرسید کے نانا کے احوال زندگی سے متعلق تھی اور جسے خود سرسید نے لکھا تھا۔ کچھ واقعات اور حالات رشتہ داروں اور تذکروں سے جمع کیے۔ حالی نے سرسید کو ایک سوسوالات کا سوال نامہ بھیجا تھا کہ اس پر مختصر جوابات لکھ دیں جو کبھی لکھا نہ گیا۔ حالی نے کچھ حالات اور واقعات علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق اور تصانیف احمدیہ سے حاصل کیے اس طرح قطرہ قطرہ ساغر حیات میں بھر کر اُسے جاودانہ حیات جاوید کر دیا۔ حیات جاوید کو مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کر کے پہلے حصے میں سرسید کی زندگی کے واقعات اور ان کے امور جو ابتدائے زندگی سے ان کی رحلت تک انجام ہوئے تاریخی ترتیب سے بیان کیے اور دوسرے حصے میں ان کی حیات اور ان کے کارناموں پر تبصرہ کیا گیا۔

حالی نے حیات جاوید کے نوسو صفحات پر سرسید کی حیات شخصیت اور فتوحات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی زندگی کو برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ بتایا ہے۔ حالی لکھتے ہیں۔ سرسید کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں انہیں میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے موافق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پا سکتے۔ حالی نے

بتایا ہے کہ سرسید کی زندگی ہمیں کیا نصیحت اور سبق دیتی ہے ہم یہاں ان نکات کو پیش کرتے ہیں جو ایسے جملے ہیں جن کو کھولیں تو دفاتر بھی ان کی تشریح کے لیے ناکافی رہیں۔

الف۔ زمانے کی مخالفت کو خدا کی مخالفت سمجھ کر اس کے ساتھ موافقت پیدا کرو تا کہ دنیا میں آرام سے رہو۔

حالی نے کہا ہے: چلو اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

مولانا روم کہتے ہیں: زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

''یعنی اگر زمانہ مخالف ہو تو تو بھی زمانے کے ساتھ ہو جا۔''

علامہ اقبال اس فکر کے مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''یہ بے خبروں کی نصیحت ہے کہ اگر زمانہ تمہارے خلاف ہو تو تم بھی بدل کر زمانے کے ساتھ ہو جاؤ، اگر زمانہ ساتھ نہیں دیتا تو تم زمانے سے لڑ کر زمانہ کو بدل دو۔''

حدیثِ بی خبراں است کہ بازمانہ بساز زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

ب۔ جب تم میں عمدہ حاکم بننے کی لیاقت باقی نہ رہے تو عمدہ رعیت بننے کی کوشش کرو تا کہ دونوں عمدگیوں سے ہاتھ نہ دھو بیٹھو۔ اس سے ذیل کے فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

(i) محکوم قوم قومی عزت حاصل کر سکتی ہے۔

(ii) شائستہ حکومت میں اس کا رسوخ و اعتبار بڑھ سکتا ہے۔

(iii) قوم اپنی آزادی کو قائم رکھ سکتی ہے۔

(iv) قوم میں خودداری اور سلف رسپکٹ کی تحریک ہوتی ہے اور غلامانہ خوشامد سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

ج۔ قوم کے تنزل سے قوم کے مذہب کو جو صدمہ پہنچتا ہے اس کا تدارک ہوسکتا ہے۔

د۔ مذہب کے متہم ہونے سے قوم جن آفتوں میں مبتلا ہو جاتی ہے اس کا علاج کیا ہے۔

ھ۔ قوم اور وطن کی محبت کو جزو ایمان جانو اور قوم کی خدمت کو سرداری کا تمغہ سمجھو۔

و۔ اگر دنیا میں بڑا بننا چاہو تو حرص، طمع، خود غرضی، جھوٹ، آرام طلبی اور عیش و عشرت سے دست بردار ہو جاؤ۔

ز۔ تھوڑی تعلیم بہت سا تجربہ اور بالکل سچائی یہ تینوں مل کر ایسے عظیم الشان کام کر سکتے ہیں کہ بڑے بڑے مدبروں سے نہ ہو سکے۔

ح۔ قوم کی مخالفت کو صبر و استقلال سے برداشت کریں مگر ان کی حقیقی خیر خواہی کے لیے ان کی عقلی عادت اور مرض کے خلاف کام کرنے میں کوتاہی نہ کریں۔

ط۔ تعصب سے نفرت اور دوسری قوموں سے حسن معاشرت ضروری ہے۔

ک۔ جیسا دل میں سمجھو ویسا ہی زبان سے کہو اور کر دکھاؤ۔

ل۔ وقت کی قدر کرو، اک لمحہ بے کار نہ رہو اور کام کرتے کرتے مر جاؤ۔

ایسا لگتا ہے کہ یہ سرسید کا منشور تھا اور حالی نے حیات جاوید میں ان کی حیات شخصیت کارناموں اور فتوحات کے ذیل میں یہ بتا دیا کہ سرسید نے خود ان اہم نکات پر عمل کیا اور دوسروں کو عمل کرنے کی دعوت بھی دی۔ اسی لیے تو حالی نے سرسید کے مرثیے میں کہا:

چیست انسانی؟ تپیدن از تپ ہمسایگان　　　از سموم نجد در باغ عدن پژمان شدن

یعنی انسان وہ ہے جو ہمسائے کے رنج و درد سے بے تاب رہتا ہے وہ جنت کی ہوا میں بھی محروموں کی زندگی سے افسردہ رہتا ہے۔قوم کی فکر میں زندگی گزارنا اور قوم ہی کے زندان میں گھٹ کر مر جانا اگر کوئی کر سکتا ہے تو وہ سرسید احمد خان بن سکتا ہے۔

کتابیات

۱	دیوان حالی	خواجہ الطاف حسین حالی	مطبع انصاری دہلی ۱۸۹۳ء
۲	کلیات نظم حالی (اوّل ودوم)	مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	لاہور ۱۹۶۷ء
۳	مجموعہ نظم حالی	خواجہ الطاف حسین حالی	مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ ۱۹۱۸ء
۴	مسدس حالی	مرتبہ ڈاکٹر عابد حسین	حالی پبلشنگ ہاؤس ۱۹۳۵ء
۵	جواہرات حالی	مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	حالی بک ڈپو پانی پت ۱۹۲۲ء
۶	مسدس حالی	مرتبہ انوار الحسن	تیج کمار نول کشور ۱۹۶۰ء
۷	مقالات حالی	خواجہ الطاف حسین حالی	انجمن ترقی اُردو ۱۹۵۷ء
۸	مکتوبات حالی حصہ اوّل دوم	مرتبہ خواجہ سجاد حسین	حالی پرس پانی پت ۱۹۲۵ء
۹	یادگار غالب	خواجہ الطاف حسین حالی	شانتی پریس الہ آباد
۱۰	مقدمہ شعروشاعری	مرتبہ رفیق حسین	رام دیال اگروال الہ آباد
۱۱	حیات جاوید	خواجہ الطاف حسین حالی	ترقی اُردو بیورو دہلی ۱۹۹۰ء
۱۲	یادگار حالی	صالحہ عابد حسین	انجمن ترقی اُردو ۱۹۹۵ء
۱۳	حالی کا سیاسی شعور	معین احسن جذبی	قومی کونسل برائے فروغ اُردو دہلی
۱۴	حالی مقدمہ اور ہم	وارث علوی	اُردو رائیٹرس گلڈ الہ آباد ۱۹۸۳ء

۱۵	تذکرۂ حالی	شیخ محمد اسماعیل پانی پتی	حالی بک ڈپو ۱۹۳۵ء
۱۶	چند ہم عصر	ڈاکٹر مولوی عبدالحق	کراچی ۱۹۵۰ء
۱۷	Halis Musaddas	Syeda Saiyidain Hameed	Harper Collins Publisher Delhi 2003
۱۸	دیوان حالی مع شرح	اصغر حسین لدھیانوی	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۵ء
۱۹	اُردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	۱۹۵۶ء لکھنو
۲۰	ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمان اعظمی	۱۹۷۲ء دہلی
۲۱	حالی	مالک رام	۱۹۸۰ء دہلی
۲۲	الطاف حسین حالی	خلیق انجم	۱۹۸۸ء دہلی
۲۳	حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	۱۹۷۰ء دہلی
۲۴	خواجہ الطاف حسین حالی	شہزاد انجم	اُردو اکادمی ۲۰۰۷ء
۲۵	عکس اور آئینے	سید احتشام حسین	سرفراز پریس لکھنو ۱۹۶۲ء
۲۶	فن سوانح نگاری کا ارتقا	الطاف فاطمہ	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۷۴ء
۲۷	تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۵۲ء
۲۸	حرف ادب	شجاعت علی سندیلوی	نامی پریس لکھنو ۱۹۷۸ء
۲۹	حالی کے شعری نظریات	ممتاز حسین	سعد پبلیکیشنز کراچی ۱۹۷۸ء
۳۰	اُردو کی عشقیہ شاعری	فراق گورکھ پوری	رام نرائین لال الٰہ آباد ۱۹۴۵ء
۳۱	اُردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	سرفراز قومی پریس لکھنو ۱۹۶۹ء
۳۲	تنقیدی مضامین	مرتبہ مظفر اقبال	رام نرائین لال الٰہ آباد ۱۹۶۳ء
۳۳	تنقید و تجزیہ	ابو محمد سحر	کتابستان الٰہ آباد ۱۹۶۱ء
۳۴	Famous Urdu poest & Writers	Abdul Qadir	New Book Society Lahore 1947
۳۵	تجربے اور روایت	ابو اللیث صدیقی	اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی

۳۶	تنقیدیں اور خاکے	جلیل قدوائی	اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی
۳۷	تنقیدی نقوش	ڈاکٹر عبدالقیوم	مشتاق بک ڈپو، کراچی
۳۸	ادب و آگہی	مجتبیٰ حسین	مکتبہ افکار، کراچی
۳۹	اُردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	ڈاکٹر سید محمد الحسن رضوی	سرفراز قومی پریس، لکھنو
۴۰	قدیم دہلی کالج کا کردار	شمس الہدیٰ دریا آبادی	شاہد پبلی کیشنز
۴۱	اُردو میں تنقید	محمد احسن فاروقی	سرفراز قومی پریس، لکھنو
۴۲	انسان اور آدمی	محمد حسن عسکری	مکتبہ جدید لاہور
۴۳	اُردو ادب کی تحریکیں	ڈاکٹر انور سدید	انجمن ترقی اردو، پاکستان
۴۴	غیر مدون کلام	گلدستہ انجمن	مطبوعہ مطبع اکبری، دہلی ۱۲۸۴ھ
۴۵	غیر مدون کلام	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	نومبر ۱۹۰۷ء
۴۶	غیر مدون کلام	علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ	دسمبر ۱۹۰۷ء
۴۷	غیر مدون کلام	بچوں کا اخبار	لاہور، جولائی ۱۹۰۵ء
۴۸	غیر مدون کلام	ماہنامہ مخزن	لاہور، جنوری ۱۹۴۹ء
۴۹	غیر مدون کلام	نقوش شمارہ نمبر ۹۶	جنوری ۱۹۶۳ء
۵۰	حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	دارالمصنّفین اعظم گڑھ
۵۱	حالی کا ذہنی ارتقا	غلام مصطفیٰ خان	مکتبہ کارواں لاہور ۱۹۶۶ء

ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو کہ بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے، قوم کے بیدار کرنے کے لیے اب تک کسی نے نہیں لکھی۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہوگا، مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیال گزرتے رہے ہیں، ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے، دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے۔ پہلے خیال کا یہ نتیجہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے۔

مولانا الطاف حسین حالی
(دیباچہ مسدس حالی)

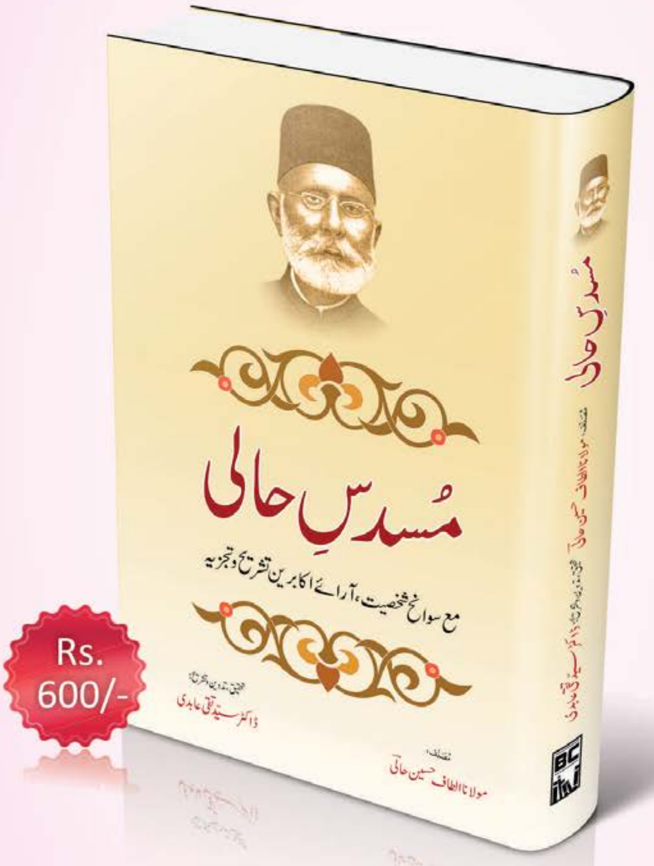

بُک کارنر
جہلم۔ پاکستان

facebook
book corner showroom
website
www.bookcorner.com.pk
email
info@bookcorner.com.pk

ISBN: 978-969-662-021-1
Rs. 999.00